پُراسرار دہشت سے بھرپور کہانیوں کا انتخاب

ماہنامہ

خوفناک کہانیاں

کراچی

Feb 2018

قیمت -/70 روپے

خالد پرنٹرز اردو بازار کراچی سے چھپوا کر شائع کیا

خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ خوفناک کہانیاں نورانی آرکیڈ میزنائن فلور رتن تلاؤ نمبر 3 کراچی: 32744391

کھٹی میٹھی باتیں

خطوط

قارئین کرام السلام علیکم!

جنوری 2018ء کا شمارہ میری پہلی کوشش تھی جسے آپ نے بہت سراہا، آپ لوگوں نے میری حوصلہ افزائی کی، میں تمام پڑھنے والوں کا شکریہ ادا کرتی ہوں۔ اور اگر کہیں مجھ سے کوتاہی ہو جائے تو اس کی نشاندہی آپ ضرور کیجئے گا اور مجھے اپنی اچھی قیمتی رائے سے ضرور نوازتے رہیے گا یا پھر بھول چوک ہو، ان تمام باتوں کو درگزر کر دیجئے گا میں چاہوں گی کہ آپ سے ہر ماہ "رسالے" کی صورت میں رابطے میں رہوں۔

ایڈیٹر

لاریب حسن

حبیبہ سکندر ،السلام علیکم ایڈیٹر صاحبہ میں نے جب جنوری کے شمارے میں اپنی کہانی عہد وفا دیکھی تو دل خوشی سے جھوم اٹھا۔ میری کہانی شائع کرنے کا بہت بہت شکریہ۔ باجی پرچہ بہت شاندار لگا۔ ویسے باجی میری دلی دعا ہے کہ "خوفناک کہانیاں" ترقی کرتے ہوئے افق پر جگمگائے اور اللہ اسے دن دگنی اور رات چوگنی ترقی دے۔ کہانیوں میں قسمت کی دیوی شائستہ صاحبہ، راجیوتی صبا ملک، عہد وفا، حبیبہ سکندر، آتش انتقام مدھو بالا اور سنہری بیگم، نورین صاحبہ کی بے حد پسند آئی۔ سلسلہ وار کہانیوں میں جل پری ساحل دعا بخاری صاحبہ نے خوب لکھی دشت دل نے متاثر کیا۔ اگلے ماہ تک کے لئے اللہ حافظ۔

حبیبہ صاحبہ: دلی اور لگاؤ اور تبصرہ بھیجنے کے لئے بہت بہت شکریہ اور امید ہے آئندہ بھی پرچے کے لئے کہانیاں لکھتی رہیں گی۔

حمیرا غلام حسین کیریو ،ایڈیٹر صاحبہ السلام علیکم! میں نے ڈر ڈائجسٹ میں خوفناک کہانیاں کا ایڈ دیکھا تو سوچا کوئی کہانی لکھی جائے اس سے میری کہانیاں ڈر ڈائجسٹ میں بھی شائع ہو چکی ہیں۔ کوئی بھی نیا پرچہ جب شروع ہوتا ہے تو لکھنے والا ہمیشہ ہی خوش ہوتا ہے کہ انہیں لکھنے کے لئے ایک اور جگہ دستیاب ہوگئی ہے اور وہ کوشش کرتا ہے کہ وہ لازمی وہاں کہانی بھیجے کیونکہ نئے پرچے والوں کی ہمیشہ کوشش ہوتی ہے کہ وہ ہر رائٹر کو شمارے میں شامل کریں۔ باجی امید کرتی ہوں کہ میری یہ کہانی آپ لازمی شائع کریں گی اور مجھے شکریہ کا موقع دیں گی۔ آخر میں سب کو سلام۔ میں نے "سانوری" بھیجی ہے۔ امید ہے اس شمارے میں ضرور شائع ہوگی۔ ویسے کہانیاں تمام ہی بہت اچھی تھیں۔ آپ کے مسائل اور ان کے حل بہت اچھا سلسلہ ہے جو کہ بہت پسند آیا ہے، رنگ دھنک میں تمام ساتھیوں نے خوب محنت کی۔ قسط وار کہانیاں بھی بہترین تھیں۔ اگلے پھر حاضر ہوں گی۔ تب تک کے لئے شکریہ۔

☆☆ حمیرا صاحبہ: خوفناک ڈائجسٹ میں موسٹ ویلکم، آپ کی کہانی "سانوری" شائع ہوگئی ہے۔ خوش ہو جائیے۔ اور ہاں آئندہ ماہ بھی کہانی بھیجنا اور خط لکھنا مت بھولئے گا۔

ساحل دعا بخاری ،السلام علیکم! آداب عرض ہے، میری کہانی جل پری لگانے کا بہت بہت شکریہ، امید ہے کہ تمام پڑھنے والوں کو سلسلہ وار کہانی پسند آئی ہوگی۔ کہانیوں میں زندہ قبرستان، ثوبیہ بیگم، زندگی کی قید ملکہ گلونہ، طلسماتی انگوٹھی روشن آرا اور آخری جنم صائمہ حمید کی پسند آئیں، آپ کے مسائل اور ان کا حل بہترین سلسلہ ہے، رنگ دھنک میں بھی تمام لوگوں نے خوب لکھا اور آخر میں پراسرار دنیا پڑھ کر تو مزہ آ گیا۔

ساحل صاحبہ: آپ کو بہت بہت مبارک ہو آپ کی سلسلہ وار کہانی شائع ہوگئی ہم امید کرتے ہیں کہ تمام قارئین کو پسند آئی ہوگی اور ہاں ہر ماہ اپنا تبصرہ لکھنا مت بھولئے گا۔ شکریہ۔

مہرین فاطمہ ،ایڈیٹر صاحبہ السلام علیکم! میں نے جب ڈر ڈائجسٹ جنوری 2018ء کا دیکھا تو اس میں خوفناک کہانیاں کا ایڈ پڑھا جسے پڑھ کر بہت خوشی ہوئی کہ چلو ڈراؤنی کہانیاں کے لئے اب ایک سے دو پرچے ہو گئے ہیں۔ اسی لئے دل نے چاہا کہ خوفناک کہانیاں میں کوئی کہانی لکھ کر بھیجی جائے۔ بس پھر کیا تھا لکھنے کے لئے بیٹھ گئی اور لکھتے لکھتے کہانی کمپلیٹ ہوگئی تو اب کہانی بھیجنے کے لئے ارسال کر دی امید ہے میری کہانی اس شمارے میں ضرور شامل اشاعت ہوگی۔ باقی کہانیوں میں اگیا بیتال، جل پری، زندہ قبرستان، بھوت، طلسماتی انگوٹھی، محافظ، آتش انتقام، ساتواں غسل اور باقی بھی تمام کہانیاں اچھی تھیں۔ آپ کے مسائل اور ان کے حل اچھا سلسلہ ہے۔ اس کے علاوہ رنگ دھنک اور پراسرار دنیا بھی پڑھا بہت اچھا لگا۔ امید ہے خوفناک کہانیاں کامیاب ہو۔

☆☆ مہرین صاحبہ: ہماری بھی یہی کوشش ہے کہ ہر نئے رائٹر کو شمارے میں لازمی جگہ دیں۔ تاکہ وہ احساس محرومی کا شکار نہ ہو۔ اور آئندہ بھی کہانی لکھیے۔ قوی امید ہے کہ ہر ماہ خلوص نامہ ارسال کر کے ضرور شکریہ کا موقع دیں گی۔ ہاں یاد آیا۔ آئندہ جب بھی کہانی ارسال کریں تو ہر تحریر الگ الگ کاغذ پر لکھا کریں۔ شکریہ۔

نظارت نصر ،ایڈیٹر صاحبہ السلام علیکم! امید ہے آپ سمیت تمام عملہ خیریت سے ہوگا۔ بعد سلام عرض ہے کہ میں نے ڈر ڈائجسٹ میں آپ کا ایڈ دیکھا "خوفناک کہانیاں" جنوری کا شمارہ مارکیٹ سے لیا اور بس پھر کیا تھا کہانی لکھنے کو دل چاہا تو لکھنا شروع کر دی۔ "سلطان" حاضر خدمت ہے۔ جب کمپلیٹ ہوئی تو آپ کو ارسال کر دی جنوری کا شمارہ دیکھا پرچہ دیکھ کر دل خوش ہوا، سب سے پہلے ٹائٹل پر نظر پڑی جو کہ زبردست تھا۔ اس کے بعد "آپ کے مسائل اور ان کا حل" اچھی کاوش ہے۔ جسے پڑھ کر دل خوش ہوا۔ دیگر کہانیوں میں امید ہے آپ شمارے میں جگہ دے کر شکریہ کا موقع دیں گی۔ سلسلہ وار کہانیوں میں دشت دل اور جل پری بہت اچھی لگی جل پری ساحل دعا بخاری صاحبہ نے بہت اچھی لکھی ہے۔ امید ہے یہ سلسلہ اسی طرح جاری وساری رہے گا۔ دیگر کہانیوں میں طلسماتی انگوٹھی، آتش انتقام، ساتواں غسل، زندہ قبرستان، اگیا بیتال، سنہری بیگم، بھیانک چڑیل، قاتل یا مقتول بہت پسند آئیں۔ دھنک رنگ میں تمام ساتھیوں نے خوب اچھی شاعری کی ہے۔ پراسرار دنیا بھی اچھا سلسلہ ہے۔ دعا ہے "خوف کہانیاں" دن دگنی رات چوگنی ترقی کرے۔

☆☆ نظارت صاحبہ: پرچے سے آپ کی محبت اور دلی لگاؤ کا شکریہ، آپ کی کہانی "سلطان" شائع ہوگئی ہے خوش ہو جائیں، اور ہاں آئندہ ماہ بھی محبت بھرا تبصرہ لکھنا مت بھولئے گا۔

ذکیہ شاہ ،ایڈیٹر صاحبہ اور تمام اسٹاف کو السلام علیکم! امید ہے مزاج گرامی ٹھیک ہوں گے۔ باجی میں جب مارکیٹ گئی تو وہاں "خوفناک کہانیاں" دیکھا۔ جب میں نے پرچہ اٹھایا تو دل نے چاہا کہ اسے پڑھا جائے۔ پرچہ خریدا سب سے پہلا ٹائٹل پر نظر پڑی ٹائٹل واقعی زبردست تھا۔ اس کے بعد آپ کے مسائل اور ان کا حل پڑھا یہ سلسلہ بہترین ہے۔ اور باقی تمام رسالوں سے ہٹ کر ہے۔ باجی امید ہے یہ سلسلہ جاری وساری رہے گا۔ آگے جا کر کہانیوں پر نظر پڑی سب سے پہلی کہانی اگیتا بیتال پڑھنا شروع کی تو بس پھر کیا تھا پڑھتے پڑھتے تمام کہانیاں پڑھ ڈالیں۔ کہانیاں واقعی بہترین تھیں۔ جن کا جواب نہیں۔ رنگ دھنک اور پراسرار دنیا بھی اچھے سلسلے ہیں۔ باجی میں نے کہانی "سلطان" خوفناک کہانیاں کے لئے بھیجی ہے امید ہے میری کہانی اس شمارے میں شائع ہوگی۔ اگلے ماہ تک کے لئے اللہ حافظ۔

☆☆ نظارت صاحبہ: خوش ہو جائیے آپ کی کہانی شامل اشاعت ہے۔ اور پرچے سے آپ کی محبت کا جواب نہیں۔ اگلے ماہ تبصرہ کا انتظار رہے گا۔

OOO

خط لکھنے کے لئے: لاریب حسن ماہنامہ "خوفناک کہانیاں" نورانی آرکیڈ میزنائن فلور رتن تلاؤ نمبر 3 کراچی

آپ کے مسائل اوران کا حل

مفتی محمد حسام اللہ شریفی

بھائی کی مطلقہ سے شادی

سوال: ایک بھائی اپنی بیوی کو طلاق دے دے تو کیا دوسرا بھائی اپنے بھائی کی مطلقہ سے شادی کرسکتا ہے؟

جواب: اپنے حقیقی بھائی کی مطلقہ سے شادی جائز ہے۔

سوال: کیا کوئی شخص کسی ایسی عورت سے شادی کرسکتا ہے جو اس کے بھائی کی بیوی ہو اور اس کی بھابھی رہ چکی ہو اور اس کے بھائی نے اس عورت کو طلاق دے دی ہو؟

جواب: اسلامی تعلیمات کے مطابق اپنے بھائی کی مطلقہ سے شادی کی جاسکتی ہے۔ اس میں کوئی ممانعت نہیں۔

غیر مسلم سے شادی

سوال: کوئی مسلمان مرد یا مسلمان عورت کسی غیر اہل کتاب مرد یا عورت سے شادی کرسکتا ہے اور اسلام نے اس کی اجازت دی ہے یعنی کوئی مسلمان مرد کسی ہندو عورت سے شادی کرسکتا ہے اور اسلام میں اس کی اجازت ہے؟

جواب: اسلام نے اس طرح کی شادی کی اجازت نہیں دی۔

سوال: کوئی مسلمان اگر اسلام سے پھر جائے اور کوئی دوسرا مذہب اختیار کرلے تو کیا اس کا نکاح باقی رہے گا یا ختم ہوجائے گا؟

جواب: ارتداد اختیار کرنے کے بعد مسلمان کا نکاح بھی ختم ہوجائے گا اور بیوی اس کے نکاح سے نکل جائے گی۔

سوال: کیا ایسی صورت میں جب کہ اہل کتاب مشرک ہیں، ان کے ہاں شادی کرنا جائز ہے؟

جواب: مشرکوں کے ہاں شادی کرنا جائز نہیں ہے۔

سوال: ایک مسلمان لڑکی کی شادی کسی ایسے شخص سے ہوسکتی ہے جو مسلمان نہ ہو عیسائی ہو یا کسی دوسرے مذہب کا پیروکار ہو؟

جواب: ایک مسلمان لڑکی کی شادی صرف مسلمان مرد سے ہوسکتی ہے کسی بھی دوسرے مذہب کے ماننے والے سے جائز نہیں۔ چاہے وہ اہل کتاب ہی کیوں نہ ہو۔

سوال: میں ایک مسلمان لڑکی ہوں۔ تقریباً ایک سال سے میری دوستی ایک عیسائی لڑکے سے ہے وہ مسلمان ہونے اور اپنے گھر والوں کو بھی چھوڑنے کے لئے تیار ہے کیا اس سے میری شادی ہوسکتی ہے؟

جواب: پہلے وہ مسلمان ہوجائے اور کچھ عرصہ اس پر قائم رہے پھر آپ کے گھر والے بھی اس شادی کے لئے تیار ہوں تو آپ اس سے شادی کرسکتی ہیں۔

سوال: کسی مسلمان مرد یا مسلمان عورت کی شادی کسی ایسے مرد یا عورت سے ہوسکتی ہے جو کسی بھی مذہب کا ماننے والا نہ ہو بلکہ لا مذہب ہو؟

جواب: لا مذہب مرد یا لا مذہب عورت سے کسی مسلمان مرد یا مسلمان عورت کی شادی نہیں ہوسکتی۔

سوال: کسی غیر مسلم بالخصوص کسی ہندو کے ساتھ مسلمان مرد یا عورت کی شادی ہوسکتی ہے یا نہیں؟

جواب: ایک مسلمان مرد یا عورت کی شادی کسی ہندو عورت یا مرد سے ساتھ جائز نہیں۔

سوال: کیا ایک مسلمان خاتون کی شادی کسی غیر مسلم سے ہوسکتی ہے؟

جواب: جی نہیں۔ ایک مسلمان خاتون کی شادی کسی غیر مسلم کے ساتھ نہیں کی جاسکتی۔

سوال: کیا ایک مسلمان لڑکی کی شادی کسی عیسائی نوجوان سے ہوسکتی ہے؟

جواب: مسلمان مرد تو عیسائی عورت سے شادی کرسکتا ہے لیکن مسلمان لڑکی کی شادی کسی عیسائی مرد سے نہیں ہوسکتی۔

سالی سے شادی

سوال: میرا شوہر نشہ کرتا ہے۔ اس لئے میں خلع لینا چاہتی ہوں۔ تنسیخ نکاح کے لئے میں نے کیس کیا ہوا ہے۔ جب کہ وہ مجھے طلاق دینا نہیں چاہتا اور میرے والدین میری بہن کی شادی میرے شوہر کے ساتھ کررہے ہیں۔ اس بارے میں اسلامی تعلیمات کیا ہیں؟

جواب: جب تک آپ کا شوہر آپ کو طلاق نہ دے دے یا خلع نہ دے دے اس وقت تک آپ کی بہن کی شادی آپ کے شوہر کے ساتھ جائز نہیں۔

سوال: بیوی کی موجودگی میں اس کی بہن یعنی سالی سے شادی ہوسکتی ہے یا نہیں۔

جواب: ایک وقت میں دو بہنوں سے نکاح جائز نہیں۔

ایک مسلمان عورت

سوال: ایک مسلمان عورت غیر مسلمان یعنی عیسائی مرد سے شادی کرسکتی ہے؟

جواب: مسلمان عورت کسی عیسائی مرد سے شادی نہیں کرسکتی۔

مسلمان لڑکی کی شادی

سوال: مسلمان لڑکی کی شادی عیسائی لڑکے کے ساتھ ہوسکتی ہے یا نہیں؟

جواب: مسلمان لڑکی کی شادی عیسائی لڑکے کے ساتھ جائز نہیں ہے۔

سوال: ایک مسلمان لڑکی نے اپنے والد سے چھپ کر ایک سکھ سے شادی کرلی۔ پھر اس لڑکی نے اپنے ماں باپ کو راضی کرلیا اور ان کے گھر آگئی۔ کیا ان کے گھر کا کھانا مسلمانوں کے لئے جائز ہے۔

جواب: مسلمان مرد کی شادی اہل کتاب کے ہاں تو ہوسکتی ہے۔ کسی اور کے ہاں نہیں اور مسلمان لڑکی کی شادی صرف مسلمان ہی سے ہوسکتی ہے کسی اور سے نہیں اور کسی سکھ یا ہندو سے کسی مسلمان لڑکی کی شادی کسی صورت میں بھی جائز نہیں اور ایسے والدین جو اپنی بیٹی کو اس طرح کے غلط قدم اٹھا لینے پر اپنے گھر میں جگہ دیں۔ ان کے مسلمان ہونے میں بھی شک ہی ہے۔ ایسے لوگوں کے ہاں کھانا پینا کسی مسلمان کے لئے ہرگز جائز نہیں۔ (کتاب فقہ)

سوال: میرے بھائی کی بیٹی نے ایک عیسائی نوجوان کے ساتھ تعلقات استوار کرلئے بعد میں لوگوں کے مشورے سے اس عیسائی نوجوان سے اس کی شادی کردی گئی جب کہ وہ شخص بدستور اب بھی عیسائی ہے۔ کیا یہ شادی جائز ہے۔

جواب: صورت مسئولہ میں پہلی غلطی تو یہ کی گئی کہ ایک مسلمان خاتون نے ناجائز تعلقات قائم کئے۔ دوسری غلطی یہ کی گئی کہ ایک عیسائی نوجوان سے تعلقات استوار کئے اور تیسری اور زبردست غلطی یہ کی گئی کہ ایک مسلمان خاتون کی شادی عیسائی سے کردی گئی۔ عیسائی مرد کے ساتھ مسلمان خاتون کی شادی کسی بھی طرح جائز نہیں ہے۔ البتہ اہل کتاب عورت کی شادی مسلمان

مرد کے ساتھ جائز ہے اگرچہ قرآن حکیم میں اس کو بھی پسندیدہ قرار نہیں دیا گیا اور اس سے بھی اجتناب کرنے کی تلقین کی گئی ہے۔

سوال: کیا مسلمان لڑکی کی شادی کسی ہندو یا کسی اور غیر مسلم سے ہو سکتی ہے۔

جواب: کسی مسلمان لڑکی کی کسی ہندو یا کسی غیر مسلم سے شادی جائز نہیں (کتب حدیث وفقہ)

لڑکیوں کی شادی پر

سوال: لڑکیوں کی شادی پر والدین لڑکے والوں سے پیسے لے سکتے ہیں؟

جواب: یہ بات اسلامی تعلیمات کے سراسر خلاف ہے۔

پہلے شوہر سے دوبارہ شادی

سوال: ایک عورت کو اس کے شوہر نے طلاق دے دی۔ اس عورت نے عدت گزارنے کے بعد ایک دوسرے شخص سے نکاح کرلیا۔ دوسرے شخص نے بغیر ازدواجی تعلق قائم کئے اس کو طلاق دے دی تو کیا ایسی صورت میں وہ عورت اپنے پہلے شوہر سے نکاح کر سکتی ہے؟

جواب: مذکورہ صورت میں وہ عورت اپنے پہلے شوہر سے نکاح نہیں کر سکتی۔ اسے کسی تیسرے شخص سے شادی کرنی ہوگی اور وہ شخص اس سے ازدواجی تعلقات قائم کرنے کے بعد جب اسے طلاق دے دے گا تو اس کی عدت گزارنے کے بعد وہ پھر پہلے شوہر سے شادی کر سکتی ہے۔

تین بھائیوں کی شادیاں

سوال: تین بھائیوں کی شادیاں ایک ہی گھر میں تین بہنوں سے ہو سکتی ہے یا نہیں؟ یعنی تینوں بھائی ایک دوسرے کے ہمزلف بھی ہوں اور وہ تینوں بہنیں ایک دوسرے کی دیورانی، جیٹھانی بھی ہوں؟

جواب: اس میں کوئی حرج نہیں۔

پھوپھی کی نند سے شادی

سوال: میری پھوپھی کی چھوٹی نند میری ہم عمر ہے۔ کیا اس سے میری شادی جائز ہے؟

جواب: اگر اس کے علاوہ کوئی ایسا رشتہ نہیں جو حرمت والا ہو تو اس سے شادی کرنے میں شرعی طور پر کوئی رکاوٹ نہیں (عالمگیری)

پہلے شوہر کے بہنوئی سے شادی

سوال: کیا طلاق شدہ عورت ایک ایسے مرد سے شادی کر سکتی ہے جس کے نکاح میں اسی عورت کے پہلے شوہر کی بہن ہو؟

جواب: یہ شادی جائز ہے۔

خالہ کی نند سے شادی

سوال: کیا خالہ کی نند یعنی خالو کی بہن سے رشتہ جائز ہے؟

جواب: جائز ہے۔ جب کہ حرمت کا کوئی اور رشتہ نہ ہو۔

نوعمر لڑکی کی بوڑھے سے شادی

سوال: نوعمر لڑکی کو بوڑھے سے بیاہ دینا کیسا ہے؟

جواب: درست نہیں ہے۔

چچا کی سالی سے شادی

سوال: کیا چچا کی سالی سے شادی جائز ہے؟

جواب: جائز ہے۔ (عالمگیری، درمختار، شامی)

سوال: چچی کی چھوٹی بہن سے شادی جائز ہے یا نہیں؟

جواب: اگر کوئی اور رشتہ حرمت کا نہ ہو تو جائز ہے۔

داماد کی بھانجی سے شادی

سوال: کیا داماد (جو خود دور کا رشتہ دار تھا) کی بھانجی سے شادی جائز ہے؟

جواب: اگر کوئی حرمت کا رشتہ نہ ہو تو جائز ہے۔

سمدھن سے شادی

سوال: ایک شخص نے اپنی بیٹی کی شادی کی۔ کچھ عرصہ بعد اس نے اپنے داماد کی والدہ سے جن کے شوہر کا انتقال ہو چکا تھا، شادی کرلی، کیا یہ شادی صحیح ہے؟

جواب: اس طرح کی شادی صحیح ہے۔

سوتیلی ساس سے شادی

سوال: ایک شخص اکبر نے خالدہ سے شادی کی۔ خالدہ کے والد کی دو بیویاں تھیں۔ خالدہ کے والد کا انتقال ہو گیا تو ایسی صورت میں کیا اکبر اپنی بیوی کی سوتیلی ماں کے ساتھ شادی کر سکتا ہے۔ جب کہ خالدہ بھی اس کے نکاح میں ہے؟

جواب: مذکورہ صورت میں یہ شادی جائز نہیں۔

سوتیلی والدہ سے شادی

سوال: والد کے انتقال کے بعد پہلی بیوی کا بیٹا والد کی دوسری بیوی یعنی سوتیلی والدہ سے شادی کر سکتا ہے یا نہیں؟

جواب: سوتیلی والدہ سے شادی جائز نہیں۔

سوتیلے ماموں سے شادی

سوال: سوتیلی والدہ کے سوتیلے بھائی سے شادی جائز ہے یا نہیں؟

جواب: جائز ہے۔

مسجد میں صفیں

سوال: ایک مسجد میں بیس آدمی موجود ہوں تو ان کو ایک ہی صف میں کھڑا ہونا چاہئے یا دو صفیں بنانی چاہئیں؟

جواب: یہ تو مسجد میں صفوں کی گنجائش پر منحصر ہے اگر ایک ہی صف میں بیس آدمی کھڑے ہو سکتے ہوں تو پھر ایک ہی صف بنانی چاہئے اور اگر گنجائش کم ہو تو دو صفیں بھی بنائی جا سکتی ہیں۔

قبضہ شدہ جگہ پر مسجد

سوال: کسی زمین پر قبضہ کر کے مسجد بنانا صحیح ہے یا نہیں اور اگر کسی ایسی مسجد میں جو زمین پر قبضہ کر کے بنائی گئی ہو نماز پڑھ لی جائے تو نماز ہو جائے گی یا نہیں؟

جواب: جو مسجد کسی زمین پر قبضہ کر کے بغیر اس زمین کے مالک کی مرضی کے بنائی گئی ہو وہ مسجد کے حکم میں نہیں ہے اور نہ وہاں نماز ہوگی۔

مسجد کا احترام

سوال: مسجد میں جماعت نہ ہو رہی ہو تو کیا اس مسجد کے قریب کے گھر میں زور سے ٹیپ وغیرہ بجایا جا سکتا ہے جبکہ وہاں شادی ہو رہی ہو؟

جواب: مسجد کا ادب واحترام ہر مسلمان پر لازم ہے۔ مسجد میں چاہے جماعت ہو رہی ہو یا نہ ہو رہی ہو، ہر صورت میں اس کا ادب کرنا چاہئے اور اس کے قریب گانا بجانا اور ٹیپ چلانا صحیح نہیں ہے۔

مسجد میں نعت خوانی

سوال: مسجد میں نعت خوانی کرانا کیسا ہے؟

جواب: اس میں کوئی حرج نہیں۔ البتہ نمازیوں کا خیال رکھنے کی ضرورت ہے۔

مسجد سے متصل مکان

سوال: کیا مسجد سے متصل مکان ہونا کوئی اچھی بات نہیں ہے؟

جواب: مسجد سے متصل مکان ہونا تو بہت ہی اچھی بات ہے کہ آدمی کو پانچوں وقت جماعت کے ساتھ نماز ادا کرنے کی سعادت حاصل ہوتی رہتی ہے۔

○○○

سانوری

حمیرا غلام حسین کیریو

اچانک کمرے میں دودھیا روشنی پھیل گئی اور ایک حسین، خوب صورت اور من موہنی دوشیزہ اپنی تمام تر رعنائی اور دلکشی کے ساتھ نظر آئی

ہر طرف خوفناک سناٹا اور گھٹا ٹوپ اندھیرے کا راج تھا۔ پورے ماحول پر اداسی چھائی ہوئی تھی۔ تاحد نگاہ آسمان بھی تاریکی کی چادر اوڑھے ہوئے تھا۔ تاریکی میں ڈوبی ہوئی گلیاں ہر قسم کے شور وغل سے بالکل عاری تھیں البتہ گلی کے کونے کھدرے میں چھپے جھینگروں کی ساز الاپتی آواز ماحول کے دہشت ناک سکوت میں شگاف ڈالنے میں کسی حد تک کامیاب ہو رہی تھی۔ کبھی ہوا کا ایک تیز جھونکا آتا جو ان گلیوں کے بوسیدہ لکڑیوں سے بنے بند دروازوں پر لگے پردوں کو جھلاتا ہوا آگے بڑھ جاتا۔ ان دروازوں کے اندر بسے لوگ اپنے اپنے بستروں میں دبکے پڑے گہری نیند سو رہے تھے۔

یہ موری پور گاؤں کے رات کا منظر تھا۔ گاؤں کے لوگ اکثر اپنے کاموں سے جلد فارغ ہو کر شام کا کھانا کھا کر جلد ہی سو جاتے تو رات کے نو بجے ہی آدھی رات کا گمان ہوتا۔ مگر گاؤں سے شہر جاتی اس سڑک پر اکثر آدھی رات کے دوران بھی گاڑیوں کا گزر ہوتا جو شاید انتہائی ضرورت کے وقت وہاں سے گزرتیں اور اس طرح "سانوری" کو اپنا شکار مل جاتا۔

آج بھی اس ویران اور سنسان سی سڑک پر کھڑی سانوری اپنے آنے والے شکار کا انتظار کر رہی تھی۔ سڑک کے آس پاس دو ڈھائی فٹ کی خاردار جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں۔ ان جھاڑیوں کے پاس ہی وہ ایک بڑے سے پتھر پر بیٹھی اپنے شکار کا رستہ تک رہی تھی۔ آج وہ ہرے رنگ کا بناری لہنگا، آتشی رنگ کا بغیر بازو بلاؤز اور اس پر ہرے ہی رنگ کا بڑا اور باریک سا دوپٹہ اوڑھے بے حد حسین لگ رہی تھی۔ دوپٹے کے دونوں پلو پیچھے کی طرف ہوتے جس کی وجہ سے اس کی قیامت برپا کرتی اور شعلہ اگلتی خوب صورتی اندھیرے میں بھی ہر کسی کو اپنی توجہ کا مرکز بنا دیتی۔ اس کے ہاتھوں میں کہنیوں سے کلائیوں تک پہنی سفید رنگ کی چوڑیاں تاریکی میں اسے مزید نمایاں کر رہی تھیں۔ چہرے کے ہر نقش میں بے پناہ معصومیت کے نشان ثبت تھے جو اسے دیکھتا اسے یہی لگتا کہ جیسے دنیا بھر کے حسین چہروں کی دل آویز معصومیت ایک اسی چہرے میں سمٹ کر آ گئی ہے۔

غرض وہ سرتاپا حسن و شباب کی پیکر تھی جس پر ایک مرد تو کیا ایک عورت کی بھی نظر پڑتی تو وہ بھی اپنی نظر اس کے حسین سراپے سے نہ ہٹا پاتی وہ ہر کسی کو اپنی اسی خوب صورتی کی بدولت اپنے جال میں پھانس لیتی، جو اسے دیکھتا وہ اپنے آپ کو بھول جاتا اور بے اختیار ہو کر سانوری کے پاس کھنچا چلا آتا۔ اس طرح وہ اپنی خوب صورتی کے پیچھے چھپا بھیانک روپ ظاہر کرتی اور بھوکے بھیڑیے کی طرح اس پر ٹوٹ پڑتی، تب جا کر وہ شخص ہوش میں آتا مگر تب تک بہت دیر ہو چکی ہوتی، اس وقت وہ مکمل طور پر سانوری کے قبضے میں ہوتا اور تڑپ تڑپ کر اس کے سامنے اپنی جان دے دیتا۔

سانوری کو اس طرح بیٹھے اور انتظار کرتے کافی وقت گزر چکا تھا۔ مگر ابھی تک وہاں سے کسی کا گزر نہیں ہوا تھا اس لئے وہ تھوڑی پریشان تھی۔ آج اسے نواں شکار کرنا تھا اس سے پہلے وہ آٹھ لوگوں کو بھیانک موت کے گھاٹ اتار چکی تھی۔ اس کے بعد یعنی اگلے دن اسے آخری شخص کے خون سے اپنے حلق کو تر کرنا تھا۔ تب جا کر اس کا مقصد پورا ہوتا اس کے بعد اسے اس دنیا میں دوبارہ کبھی نہیں آنا پڑے گا۔ ہر روز اس کی چال پہلے روز کی چال سے مختلف ہوتی وہ مختلف طریقے اپنا کر لوگوں کو اپنے جلوے دکھاتی حالانکہ لوگ اس کی خوب صورتی کو دیکھ کر تمام شک و شبہات کو بالائے طاق رکھ کر بے خود ہو کر اس کے جال میں پھنس جاتے مگر پھر بھی وہ نہایت پھونک پھونک کر قدم اٹھا رہی تھی کیونکہ اس دہشت ناک اور روح فرسا اموات سے ہی اس کی زندگی کے حسین خواب جڑے تھے جن کی تعبیر ان مراحل سے گزرے بغیر اسے نہیں مل سکتی تھی۔

یکدم سانوری کی آنکھوں میں چمک آ گئی۔ دور سے گاڑی کی ہیڈ لائٹ دیکھتے ہی وہ چوکنا ہو گئی، وہ اپنے نازک سے وجود کو سمیٹتے ہوئے ڈرامائی انداز سے سڑک پر چت لیٹ گئی اور کمر پر ہاتھ رکھے جھوٹے درد سے کراہنے لگی۔ کار سانوری کے دو گز کے فاصلے پر آ کر رک گئی۔ اس میں سے ایک چوبیس پچیس سالہ ہینڈسم اور وجیہہ شکل نوجوان پریشانی کی صورت میں کار سے ماجرہ جاننے کی کوشش میں باہر نکلا۔ اپنے سامنے ایک پری نما وجود کو اس طرح تڑپتے دیکھ کر اس کے قدم تیزی سے سانوری کی جانب بڑھنے لگے۔ وہ اس کے سامنے جا کر رک گیا۔ تب ہی سانوری نے اضطرابی کیفیت سے ٹوٹے ہوئے لفظوں میں کہا۔ ”م...... م...... مجھے بچا لو۔ میں اس تک...... تکلیف سے م...... مر جاؤں گی۔“ اس گھڑی سانوری کے چہرے پر بے پناہ درد سمٹ آیا جو شاید اس نوجوان پر جادو کر گیا۔

نوجوان نے بنا سوچے سمجھے کہ اس ویرانے میں ایک اکیلی لڑکی کا اس طرح بن سنور کے اس تکلیف کی حالت میں ہونے کا کیا مطلب ہو سکتا ہے؟ یہ شک شبہات تو اس کے ذہن کے کسی گوشے میں نہ تھے۔ سانوری کو دیکھتے ہی اس پر بھی وہی کیفیت طاری ہو گئی جس سے پچھلے لوگ دوچار ہو کر دہشت ناک موت کی بھینٹ چڑھے تھے۔

اس نوجوان کی حالت ابتر ہوتی جا رہی تھی بالکل ان لوگوں کی طرح جنہوں نے سانوری کا حسین سراپا دیکھ کر بے خود ہو کر اپنی جان گنوائی تھی۔ اب شاید اس کی باری تھی سانوری کے پہلو میں اپنی جان دینے کی۔ اسے سانوری کو اس تکلیف سے نکالنے کے لئے اس کا قرب حاصل کرنے کا اچھا موقع مل گیا تھا۔ تب ہی وہ اس کی مدد کرنے کے لئے اس پر جھکا اور اسے اٹھانے ہی لگا تھا کہ اچانک سانوری نے اسے گردن سے پکڑ لیا۔

اس لمحے سانوری کی ساری تکلیف غائب ہو چکی تھی۔ اس نے ایک فلک شگاف قہقہہ لگایا اور اس نوجوان پر جھپٹ پڑی۔ اس کے چہرے کے نقوش آہستہ آہستہ خوفناک صورت دھارتے چلے گئے۔ چہرے کا حسن و معصومیت معدوم ہوتی چلی گئی۔ خوب صورت اور دل موہ لینے والی صورت کی جگہ اب بھیانک، دل دہلا دینے والے اور ہولناک روپ نے لے لی۔ اس کے سر کے تمام بال کھل کر دو حصوں میں بٹ کر چہرے کے سامنے آ چکے تھے۔ مگر حیرت کی بات یہ تھی کہ اس کا حسین اور دلفریب سراپا جوں کا توں تھا اس کے چہرے کا اس کے نچلے دھڑ پر کچھ اثر نہیں ہوا تھا۔ نچلا دھڑ چھوڑ کر وہ ایک چڑیل کا روپ دھار چکی تھی۔ اس نے اپنے لمبے لمبے دانت اس نوجوان کی گردن میں گاڑ دیئے۔ دانت گاڑنے کے بعد اس نوجوان کو جیسے ہوش آ گیا۔ اس نے بلند آواز سے چیخنے چلانے اور ہاتھ پاؤں مارتے ہوئے اپنے آپ کو سانوری سے آزاد کرانے کی کوشش کرنے لگا مگر اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوا کیونکہ وہ پوری طرح سانوری کے قبضے میں آ چکا تھا اور جو ایک دفعہ سانوری کے جال میں آ پھنستا پھر اس کے شکنجے سے نکلنا محال ہو جاتا۔

نوجوان کے حلق سے چند دلخراش آوازیں نکلیں۔ اس کے بعد اس نے ہاتھ پیر ہلانا بند کر دیئے۔

سانوری اپنے دانت مسلسل اس کی گردن میں گاڑے اس کے جسم کا ایک ایک قطرہ خون نچوڑ چکی تھی۔ اس کے بعد اس کا سینہ چاک کر کے اس کا اندرونی اعضاء نکال کر بڑی رغبت سے کھانے لگی۔ جب وہ اپنا کام مکمل کر چکی تب وہ اٹھی اپنا منہ صاف کیا اور چہرے پر مکارانہ مسکراہٹ لئے وہ اپنے ٹھکانے کی طرف بڑھنے لگی مگر اس کے قدم اچانک رک گئے......

☆......☆......☆

”اوہ!...... یہ کیا ہوا۔“ میرے منہ سے بے ساختہ یہ آواز نکلی۔ میں نے شدید غصے میں پین کو رائٹنگ ٹیبل پر جیسے پٹخ دیا۔ میں نے آدھی کہانی لکھی تھی کہ لائٹ نے آنکھ مچولی کا کھیل شروع کر دیا۔ کتنے اچھے موڑ پر چل رہی تھی کہانی مگر ہمیشہ کی طرح آج بھی لائٹ نے مجھے اٹھنے پر مجبور کر دیا۔ ”چل اٹھ، جا...... صبح جلدی اٹھ کر کام پر بھی تو جانا ہے ویسے اچھا ہوا جو لائٹ چلی گئی ورنہ تیرا بجے سے پہلے اٹھنا تو محال تھا۔“

میں نے کہانی کے تمام صفحات کو ایک طرف کرتے ہوئے خود کلامی کی۔ ویسے بھی مجھے سونا ہی تھا اس لئے میں نے موم بتی نہیں جلائی۔ کھڑکی سے آتی چودھویں کے چاند کی ٹھنڈی اور تیز روشنی لائٹ جانے کی وجہ سے اب مجھ پر ظاہر ہوئی تھی اور بھلی معلوم ہو رہی تھی۔ میں جب لکھنے کے لئے بیٹھتا تو رائٹنگ ٹیبل کے سامنے اس کھڑکی کو بھی کھول دیتا اس طرح کھڑکی سے آتی تازہ ہوا میرے دماغ کو فریش کر دیتی۔ مگر سونے سے پہلے میں اس کھڑکی اور دروازے کو ضرور بند کر دیتا۔ میں نے تمام لائٹس کے بٹن آف کر دیئے تاکہ آدھی رات کے دوران اگر اچانک لائٹ آ جائے تو میری نیند میں خلل نہ پڑے اور بیڈ کے سائیڈ میں رکھے لیمپ کے بٹن آن کر دیئے اور کھڑکی بند کر کے میں اپنے بیڈ پر دراز ہو گیا۔

میں دن میں محنت مزدوری کرتا اور رات میں شوقیہ طور پر کہانیاں لکھتا۔ میری کہانیاں عام طور پر ڈراؤنی طرز پر مبنی ہوتیں۔ میں چند روز میں ایک ناول مکمل کرتا۔ اس کے ذریعے مجھے جتنے پیسے ملتے اس سے مجھے زندگی کی گاڑی کو آگے بڑھانے میں مزید مدد ملتی کیونکہ ایک مزدور ہونے کی وجہ سے میری اتنی آمدنی نہ تھی جو مجھے سکون سے زندگی بسر کرنے میں مدد دیتی۔ اس لئے کہانیاں لکھنے کا یہ شوق ایک طرح مجھے سہارا دیئے ہوئے بھی تھا۔ اس طرح کی کہانیاں لکھتے ہوئے میں ان میں کھو جاتا، مجھے اپنے اردگرد کا جیسے ہوش ہی نہ رہتا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ کہانی میں کھو جانے پر میں وہ تاثر ڈالنے میں کامیاب ہو جاتا کہ پڑھنے والا بھی جو کچھ پڑھ رہا ہوتا وہ سب کچھ اپنی آنکھوں کے سامنے ہوتا ہوا محسوس کرتا۔ شاید انہی وجوہات کی بنا پر میرے ناول کی بہت ڈیمانڈ تھی۔ میں اب تک بہت سارے ناول لکھ چکا تھا۔ ہر ڈائجسٹ کا ایڈیٹر میرے نام سے واقف تھا اور میرے ناول ہاتھوں ہاتھ لیتا۔ اس طرح میرا شوق بھی پورا ہوتا اور مجھے اچھا خاصا معاوضہ بھی مل جاتا۔

میری آنکھیں شدید نیند کی وجہ سے بوجھل ہو رہی تھیں۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں جلد ہی مجھے نیند بھی آ گئی۔ تقریباً آدھی رات کے قریب میری آنکھ کھلی کیونکہ میرے حلق میں کانٹے سے چبھ رہے تھے۔ میں بستر سے اٹھا، جگ میں پڑے پانی کو گلاس میں انڈیلا اور جلدی سے حلق سے نیچے اتار دیا۔ اب مجھے کچھ بہتر محسوس ہوا، میں دوبارہ اپنی جگہ پر آ کر دراز ہو گیا مگر اس پل میری نیند غائب ہو چکی تھی۔ میں نے اپنی آنکھیں زبردستی بند کیں اور نیند آنے کا انتظار کرنے لگا۔

میری کوشش کامیاب ہوئی مگر نیند کے ایک ہلکے خمار کے ساتھ ہی مجھے پازیب پہنے کسی وجود کی ”چھن چھن“ کرتی آواز سنائی دی، جس نے نیند کے جھٹکے کوئی فٹ پیچھے دھکیل دیا۔ میرا ایک ایک رونگٹا کھڑا ہو چکا تھا۔ مجھے اچھی طرح محسوس ہوا تھا کہ چھن چھن کرتی آواز تیزی سے میرے سامنے سے ہو کر گزر گئی ہو۔ میں نے اپنے منہ سے کمبل ہٹا کر گردن گھما کر

پورے کمرے کا جائزہ لیا مگر وہاں کوئی نہیں تھا۔ یہ میرا وہم نہیں تھا۔ مجھے پورا یقین تھا کہ پازیب کی یہ آواز ضرور کسی کے کمرے میں موجود ہونے کا سندیسہ ہے جب مجھے کوئی نظر نہیں آیا تو میں نے اپنی آنکھیں دوبارہ بند کرلیں اور اب اس آواز کا انتظار کرنے لگا۔

میرا شک صحیح گزرا کیونکہ آنکھیں بند کرتے ہی مجھے وہی آواز دوبارہ سنائی دی۔ میں نے اسی لمحے جھٹ سے آنکھیں کھول دیں۔ تب مجھے پازیب پہنے چھن چھن کرتی اس وجود کی سرسری سی جھلک دکھائی دی جو میرے سامنے سے تیزی سے گزر کر غائب ہوگئی۔

وہ ایک حسین اور نازک سی دوشیزہ تھی جس کے صرف آدھے چہرے کی مجھے جھلک دکھائی دی۔ جس نے سرخ رنگ کا عروسی لباس پہنا ہوا تھا اور بالکل دلہن کی طرح ہی سنوری ہوئی تھی۔ حالانکہ مجھے صرف اس کی ایک جھلک ہی دکھائی دی۔ وہ بھی صرف آدھا چہرہ، مجھے صرف اس کا آدھا چہرہ ہی دیکھ کر اتنا انداز تو ہوا کہ وہ بے پناہ خوب صورت دوشیزہ زیور سے آراستہ دلہن کے روپ میں ہے۔ اسے اپنے کمرے میں دیکھ کر میرے ذہن میں لاتعداد سوالات ابھرنے لگے جس نے مجھے اٹھا کر اس حسین پیکر کو تلاش کرنے پر مجبور کردیا۔

اس کا میرے کمرے میں داخل ہونا ایک عجیب سی بات تھی کیونکہ میں سونے سے پہلے ضرور کمرے کے دروازے کو بند کیا کرتا تھا اور مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ اس بار بھی میں سونے سے قبل کنڈی لگا کر ہی سویا تھا۔ پھر اس لڑکی کا میرے کمرے میں داخل ہونا اس کو غیر مرئی مخلوق ہی ظاہر کررہا تھا۔ خیر مجھے اس بات سے ڈر نہیں لگ رہا تھا کیونکہ میں ایک مضبوط اعصاب کا مالک ہوں اور خوف نام کا لفظ میں اپنی زندگی کی ڈکشنری میں بالکل نہیں رکھتا۔ وہ جو بھی تھی نہایت ہی حسین تھی۔ میری آنکھیں اسے دوبارہ دیکھنا چاہتی تھیں۔ میں جلدی سے بستر سے اٹھا اور اسے تلاش کرنے لگا۔ میں نے چند لمحوں میں پورا کمرہ چھان مارا مگر وہ کہیں نظر نہیں آئی۔

اچانک کھڑکی کے پردے کے پیچھے مجھے اس کے دوپٹے کا پلو نظر آیا۔ میں جلدی سے کھڑکی کے پردے کے پاس پہنچا میرا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا مگر اتنا ہی اسے جاننے اور دیکھنے کا اشتیاق میرے دل میں زور پکڑ رہا تھا میرے ہاتھ اس پردے کی طرف بڑھے ہی تھے کہ میری نظروں سے وہ پلو اچانک غائب ہوگیا۔ مجھے حیرت کا ایک شدید جھٹکا لگا۔ میں نے اسی لمحے پردے کو ایک جھٹکے سے ہٹایا مگر وہاں کسی کو نہ پاکر میرے دل میں پہلی بار خوف کی ایک لہر ابھری۔

اچانک مجھے اپنے عقب سے چھن چھن کرتی آواز پھر سے ابھرتی ہوئی سنائی دی۔ میں بجلی کی سی سرعت سے پیچھے مڑا مگر اس بار بھی میری آنکھوں نے وہاں کسی کو نہ پایا۔ اب کے بار وہ ساز اٹھاتی چھن چھناتی ہوئی آواز رکی نہیں بلکہ اسی طرح کمرے کے پرسکون ماحول کو چیرتی ہوئی بڑھتی گئی۔ مگر اس پائل کے ساز کو چھیڑنے والی ہستی میری نظروں سے اوجھل تھی۔ وہ آواز مسلسل چھن چھن کرتی جیسے پورے کمرے میں چکر کاٹ رہی تھی۔ گویا پائل کی اس دھن پر کوئی رقص کررہا ہو۔ میں اپنے چاروں طرف ہذیانی سی کیفیت سے دیکھتا جاتا مگر وہ میری نظروں سے اوجھل چھن چھناتے ہوئے پورے کمرے میں اور میرے اردگرد گھوم رہی تھی۔

مجھے یہ سب بہت عجیب سا لگ رہا تھا اب یہ آواز میرے دل ودماغ پر بہت بھاری گزر رہی تھی۔ وہ جو کوئی بھی تھی میرے سامنے کیوں نہیں آرہی تھی؟ مجھے اس طرح پریشان کرنے کا آخر اس کا مقصد کیا تھا۔ شاید وہ مجھے خوف زدہ کرنا چاہتی تھی۔ مگر اب تک مجھے ہراساں کرنے میں وہ کامیاب نہیں ہوئی تھی۔ مگر اس کی پائل کی آواز سے اب میرے کان پھٹے جارہے تھے۔ مگر اس نے اب تک اپنے آپ کو ظاہر نہیں کیا تھا وہ غائبانہ حالت میں اپنی پائل کی آواز سے مسلسل جیسے میرے اردگرد گھوم رہی تھی۔ اس کی اس حرکت پر میری حالت عجیب ہوتی جارہی تھی۔

آج میرے ساتھ جو کچھ پیش آرہا تھا وہ کسی فلم یا ایک کہانی کا خوف ناک اور بھیانک حصہ لگ رہا تھا میں

نے بہت ساری، دہشت ناک، بھیانک، خوف ناک اور روح فرسا ناول لکھے تھے۔ مگر کبھی بھی مجھے اس طرح کی کسی بھی صورتحال کا کبھی سامنا نہیں ہوا تھا۔ میرا خود بھی یہی خیال تھا کہ یہ سب باتیں صرف کہانیوں کی حد تک ہوتی ہیں۔ کہانیوں سے ہٹ کر ان کا ایسا کوئی وجود نہیں۔ اگر ہے بھی تو انسانی دنیا میں آکر ڈرانے یا کسی قسم کا نقصان پہنچانے کی ان کی ہمت تک نہیں ہوتی۔ ایسا تو بالکل ہو ہی نہیں سکتا کہ جیسے ان کے متعلق بیان کیا جاتا ہے، کوئی بھی کہانی ہمیں کتنا ہی سحر میں جکڑ لے مگر حقیقت سے ان کا دور دور تک کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

میں نے اب تک اپنے ناول میں ایسے ایسے دل خراش منظر کھینچے تھے کہ پڑھنے والا حتیٰ کہ میں خود بھی پوری کہانی لکھنے کے بعد اسے پڑھنے کے لئے بیٹھتا تو کسی ڈراؤنے سین پر میرے رونگٹے کھڑے ہوجاتے اور مجھ پر عجیب سی کیفیت طاری ہوجاتی مگر میری اس وقت کی کیفیت ان تمام پر بھاری تھی۔

اس پائل کی آواز نے مجھے ایک مضبوط اعصاب کا ہونے کے باوجود بھی میری حالت عجیب کردی تھی۔ اس سے مجھے اتنا خوف تو محسوس نہیں ہورہا تھا۔ مگر اس کی پائل کی آواز مجھ پر ایک اَن دیکھا سا بوجھ ڈال رہی تھی۔ جس سے میں اپنے آپ کو سنبھال نہیں پارہا تھا۔ نجانے وہ کون سی مخلوق تھی جس کی غائبانہ موجودگی سے مجھے اپنے کندھوں پر بوجھ سا محسوس ہورہا تھا۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ وہ مجھ پر حاوی ہونے کی کوشش کررہی ہے۔

”کک.....کون ہو تم؟.....تت.....تم مجھ سے آخر چاہتی کیا ہو؟“ میں نے ہیجانی سی کیفیت سے غیر ارادی طور پر آخر بول ہی پڑا۔ میرے اس سوال پر کوئی جواب نہیں آیا البتہ چاروں طرف پائل کی گونجتی ہوئی آواز اچانک ختم ہوگئی۔

میں اپنی اسی کیفیت سے دوبارہ بولا۔ ”تم جو بھی ہو میرے سامنے آؤ..... اگر تم یہ سمجھتی ہو کہ تم مجھے اس طرح خوف زدہ کرلوگی تو یہ تمہاری بھول ہے..... میں نہیں جانتا کہ تم کون ہو اور میرے پاس کیوں آئی ہو؟ مگر مجھے اتنا یقین ہے کہ تمہارے آنے کی کوئی نہ کوئی وجہ ضرور ہے، وہ کیا وجہ ہے یہ میں جاننا چاہتا ہوں؟ سامنے آؤ..... میں کہتا ہوں میرے سامنے آؤ.....“

میں نے اس بار جیسے چلاتے ہوئے کہا۔ میرے اتنا کہنے پر اس آواز نے کمرے میں آئے چند لمحے کے سکوت کو پھر سے توڑ ڈالا اور پھر اسی آواز سے میرے آس پاس گھومنے لگی۔ اب یہ آواز مجھ سے بالکل برداشت نہیں ہورہی تھی۔ اس نے مجھ پر نیم پاگل کی سی کیفیت طاری کردی تھی۔ میں دیوانوں کی طرح خلا میں ہاتھوں کو ٹٹولتے ہوئے پورے کمرے میں اس نظر نہ آنے والے وجود کو پکڑنے کی کوشش کرنے لگا، جس طرف سے آواز آتی میں تیزی سے اس طرف جاکر اسے اپنے ہاتھوں میں لینے کی کوشش کرتا۔ شاید اس طرح کرتے ہوئے وہ میرے ہاتھ لگتی اور میں اسے اس طرح کرنے سے باز رکھتا مگر یہ میرے پاگل پن کے سوا کچھ نہ تھا۔

آخر تھک ہار کر میں دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑتا ہوا بیٹھتا چلا گیا۔ میں اس نظر نہ آنے والی حسین پیکر سے ہار چکا تھا۔ میرا پورا جسم پسینے سے شرابور ہوچکا تھا۔ میرے دماغ کی رگیں اس آواز سے پھٹی جارہی تھیں۔ میرے یوں بے بس ہوکر اور تھک ہار کر بیٹھ جانے سے پھر سے وہ آواز آہستہ آہستہ مدھم ہوتی ہوئی ختم ہوگئی۔ مجھے اس پر بڑا غصہ آرہا تھا کہ وہ مجھ سے چاہتی کیا ہے؟ وہ مجھے کیوں پاگل کیے جارہی ہے؟ آخر اس کا مقصد کیا ہے؟ میں آواز کے از خود تھم جانے پر بھی آنکھیں بند کرکے اور گردن نیچے کیے اسی طرح بیٹھا رہا۔

مجھے ڈر تھا کہ اگر میں نے اپنی گردن اٹھائی اور پھر سے اسے تلاش کرنے کی کوشش کی تو شاید میں چھائے ہوئے اس سکوت کو پھر سے گنوا بیٹھوں گا اور اس بار وہ اپنی پائل کی آواز سے مجھے پاگل ہی نہ کردے۔

اچانک میرے کانوں میں کسی نسوانی آواز نے آہستہ سے سرگوشی کی۔ ”سانوری.....ری ری.....“ اس آواز سے جیسے میرے پورے جسم میں کرنٹ سا دوڑ گیا۔ میں نے اسی لمحے اپنی آنکھیں کھول لیں اور بجلی کی سی

سرعت سے اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ میں پہلے جتنا بہادر بننے کی کوشش کر رہا تھا اب صورتحال اس قدر بگڑ چکی تھی کہ خوف نے مجھے تھر تھر کانپنے پر مجبور کر دیا۔ تاحدِ نگاہ میری نظریں جہاں تک گئیں کوئی بھی تو نہیں تھا وہاں......

خوف کی وجہ سے اب مجھ سے چلا بھی نہیں جا رہا تھا۔ میں لرزتے قدموں کے ساتھ آگے بڑھا۔ میرے ذہن میں جھماکے سے ہونے لگے تھے کیونکہ میرے کانوں میں جو آواز گونجی تھی وہ تو میری حالیہ ادھوری کہانی کے خونی اور بھیانک کردار کا نام ہے۔ جو میری کہانی کے مطابق لوگوں کو بھیانک موت کے گھاٹ اتارنے والی ایک بے پناہ حسین دوشیزہ کے روپ میں ایک چڑیل تھی۔

اب مجھے یاد آیا کہ جب پہلی بار چھن چھن کرتے ہوئے مجھے اس کی ایک سرسری سی جھلک دکھائی دی تھی۔ وہ لڑکی بھی تو بالکل اسی طرح تھی جس طرح کہانی میں، میں نے اس کے لباس اور خوب صورتی کا نقشہ کھینچا تھا۔ ''تو کیا یہ وہی ہے؟ نہیں...... نہیں یہ نہیں ہوسکتا۔ بھلا ایک کہانی کا کردار حقیقت کا روپ کس طرح دھار سکتا ہے؟ نہیں...... یہ سانوری نہیں ہوسکتی۔''

میرا دماغ بری طرح الجھتا جا رہا تھا۔ میں ابھی تک سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ یہ حقیقت ہے یا پھر محض ایک خواب؟

میرے دماغ میں سوالات کا ایک طوفان برپا تھا اور اسی کے اندر ڈبکیاں لگاتے میں پورے کمرے کو دیکھ چکا تھا۔ مگر وہ اب بھی میری نظروں سے اوجھل تھی۔ اس پائل کی آوازوں کے بعد کان میں سانوری کے نام سے بازگشت ہوکر کمرہ ایک دم ہولناک سناٹے میں نہا گیا تھا۔

''آخر تم کون ہو؟ کیوں مجھے پریشان کر رہی ہو؟'' میں نے غصے اور ہلکے خوف کی ملی جلی کیفیت سے کہا۔

''یہ تم اچھی طرح جانتے ہو۔'' مجھے اپنے عقب سے کرخت آواز سنائی دی۔ میں تیزی سے پیچھے مڑا۔ جس نے مجھے پچھلے آدھے گھنٹے سے نیم پاگل کر کے مجھ پر ایک عجیب سی کیفیت طاری کر دی تھی۔

اب وہ میرے سامنے کھڑی تھی مگر مجھے اس کی صرف پشت نظر آ رہی تھی۔ وہی لباس جو سانوری پہنا کرتی تھی۔ لمبا بنارسی لہنگا، بغیر بازو کے بلاؤز اور سر پر باریک دوپٹہ جس کے دونوں پلو پیچھے کی طرف تھے۔ اس کی پشت دیکھ کر اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ بے پناہ خوب صورت جسم کی مالک ہے۔ پہلے تو میں اسے ڈھونڈنے کے لئے کمرے میں چکرا رہا تھا مگر اب جبکہ اس نے اپنے آپ کو ظاہر کر دیا تھا تو میرا دل ایک انجانے سے خوف سے اس طرح دھڑک رہا تھا۔ گویا ابھی باہر نکل پڑے گا۔ میں لرزتے قدموں کے ساتھ اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس کا منہ ابھی تک دوسری طرف ہی تھا۔

میں نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی طرف بڑھتا چلا جا رہا تھا۔

میری آنکھوں کے سامنے وہی منظر گھومنے لگا جو سانوری اپنے ہر شکار کا کیا کرتی تھی۔ یہ سب جانتے ہوئے بھی میرے قدموں کو نجانے کیا ہو گیا تھا کہ اس کی طرف بڑھتے ہی جا رہے تھے حالانکہ یہ ایک عجیب بات تھی کہ ایک کہانی کا کردار زندہ ہوکر سامنے کھڑا ہو۔ حالات تو مجھے چیخ چیخ کر بتا رہے تھے کہ میرے سامنے سانوری ہی کھڑی ہے مگر ایک طرف میرا دل یہ قطعی نہیں مان رہا تھا کہ ایسا بھی ہوسکتا ہے؟......

خراماں خراماں چلتے چلتے میرے اور اس کے درمیان ڈیڑھ گز کا فاصلہ رہ گیا تھا۔ تب میرے قدم از خود رک گئے۔ ''تم اچھی طرح جانتے ہو کہ میں کون ہوں؟'' ایک دفعہ پھر اس نے اپنے اسی لہجے میں کہا اور اس کے ساتھ ہی اس نے اپنا چہرہ میری طرف موڑ لیا۔ اس کا چہرہ میری طرف کرنے کی دیر تھی کہ وہ کمرہ جہاں لیمپ کی روشنی ہونے کی وجہ سے تھوڑا تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ ہر طرف سفید دودھیا روشنی پھیل گئی اب اس کی ایک ایک چیز مجھ پر صحیح طرح ظاہر ہو گئی تھی۔

میں اپنی کہانی میں جس قدر اس کی خوب صورتی کا نقشہ کھینچا تھا وہ اس سے کہیں اور زیادہ خوب صورت تھی۔ وہ اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے مسلسل مجھے

گھورے جا رہی تھی۔ میری آنکھوں کو خیرہ کر رہی تھی۔

وہ دلہن بنی ایسی لگ رہی تھی کہ کہانی والی سانوری کی خوب صورتی پر جیسے گرہن لگ گیا تھا۔ اب اس کے چہرے سے ہٹ کر میری نظر اس کے لباس پر پڑی اس کا جسم سرخ رنگ کے اس عروسی لباس کو بے پناہ حسن دے رہا تھا۔ اس کے خدوخال میں ایسی کشش تھی کہ جس کی اس پر نظر پڑے وہ دیوانہ ہی ہو جائے۔ اس کا قیامت برپا حسین جسم میرے دل و دماغ کو پاگل کئے جا رہا تھا اور میں اسے سر تا پا دیکھتا ہی جا رہا تھا۔ وہ واقعی قدرت کا ایک انوکھا شاہکار تھی۔ اسے پری یا اپسرا کا نام بھی دیا جائے تو وہ بھی اس کے حسن میں گستاخی تھی۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ میں نے اپنی کہانی میں اس کی خوب صورتی پر صرف ایک ہی سطر لکھی ہو کیونکہ وہ جس قدر حسین تھی اسے الفاظ میں ڈھالنا مشکل ہے۔ میری آنکھوں نے آج سے پہلے تمام حدوں کو پار کرتی ہوئی ایسی خوب صورتی کبھی نہیں دیکھی تھی۔ وہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالے چہرے پر ایک عجیب سی مسکراہٹ لئے اپنی پرکشش نیلگوں آنکھوں سے مسلسل دیکھے جا رہی تھی۔

''کیوں۔ کیا تم واقعی نہیں جانتے کہ ہم کون ہیں؟'' اس نے اپنے خوب صورت لبوں کو جنبش دی، اس کی آواز جیسے میرے کانوں میں گھنٹیاں سی بجانے لگی۔ میں ایک دم سے خیالوں کی دنیا سے باہر نکل آیا جیسے مجھے ایک حسین سا خواب دیکھتے ہوئے جھنجوڑ کر اٹھا دیا گیا ہو۔ میں اس حسین پیکر کو دیکھتے ہوئے اس قدر کھو گیا تھا کہ مجھے دنیا و مافیہا کی کچھ خبر نہ رہی تھی۔ مجھے پہلی بار کسی حسن نے اتنا متاثر کیا تھا۔ مگر شاید اس کے شعلہ اگلتے وجود نے میری آنکھوں پر اس کے منفی پہلو پر پردہ ڈال دیا تھا۔ شاید اس کے حسن کے پیچھے چھپے بھیانک روپ کو میں بھول چکا تھا۔ اس کی آواز نے مجھے واپس اپنی دنیا میں لا کر سانوری کی حقیقت میری آنکھوں کے سامنے کر دی۔

''بولو نا! کیا تم ہمیں نہیں جانتے۔'' اس نے دوبارہ کہا۔

''تت تت...... تم؟ س س سا......'' گھبراہٹ کی وجہ سے میری آواز حلق میں ہی پھنس کر رہ گئی۔

''ہاں میں سانوری ہوں۔'' اس نے جھٹ سے جواب دیا۔

''مم...... مگر تمہارا وجود کس طرح......''

کیوں نہیں ہوسکتا ساحل شیخ...... ہمیں اپنے سامنے پا کر اب بھی پوچھ رہے ہو کہ ہمارا وجود کس طرح ہوسکتا ہے۔'' اس نے میری گھبراہٹ سے لرزتی آواز کو بیچ میں ہی کاٹ کر میرا نام لیتے ہوئے کہا۔

''کیوں ساحل تمہیں تو ایسے وجود پر کوئی یقین ہی نہیں تھا تم تو اپنے آپ کو بہت بہادر سمجھتے تھے اب ہمیں اپنے سامنے پا کر تمہاری گھگی کیوں بندھ گئی...... بولو...... بولو نا کیوں خوف کھا رہے ہو ہم سے......'' اس نے اپنے قدموں کو تھوڑا آگے بڑھاتے ہوئے اور اپنی خوفناک نظریں میرے چہرے پر ڈالتے ہوئے بولتی جا رہی تھی۔ ''کیا تمہیں خوشی نہیں ہو رہی ہے، اپنی ادھوری کہانی کے حقیقی کردار سانوری سے ملتے ہوئے۔ تمہاری دنیا کے لوگ تو ہمیں دیکھتے ہی ہم پر مر مٹے۔ ایک تم ہو جو ہمیں دیکھ کر ہم سے خوف کھا رہے ہو......'' وہ لبوں پر دھیمی مسکراہٹ لئے، مجھ سے ہم کلام تھی۔ اس کی باتوں سے مجھے اپنے دماغ میں کن کھجورے سے دوڑتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔

''نہیں...... یہ نہیں ہوسکتا۔ تمہارا وجود قطعی نہیں ہوسکتا۔ تمہارا وجود صرف کہانی کے بے جان لفظوں میں ہے۔ اس سے ہٹ کر تمہاری کوئی حقیقت نہیں ہوسکتی۔'' میں نے حقیقت سے منہ پھیرتے ہوئے کمال ہوشمندی سے اسے ٹوکا......

''یہ تو تمہیں یقین کرنا پڑے گا کہ تمہارے سامنے سانوری ہی کھڑی ہے اور مجھے علم ہے کہ تمہارے دل و دماغ نے قبول کر لیا ہے، میں سانوری ہوں مگر تم حقیقت سے منہ پھیر رہے ہو، جس کا کوئی فائدہ نہیں ہے اور دوسری بات میں تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گی، تم پریشان مت ہو۔ میں تم سے کچھ کہنے تمہیں کچھ بتانے

کچھ سنانے آئی ہوں۔"

اب وہ جس طرح سے مجھ سے ہم کلام تھی اس نے میرے خوف کو کسی حد تک کم کیا اس کے لہجے میں مجھے اب کی بار محبت کی ایک جھلک نظر آئی جس نے میرے تیزی سے دھڑکتے دل کی دھڑکنوں کو کچھ ترتیب دیا اس کے لہجے کے دھیمے پن نے مجھے مجبور کیا کہ میں اس کی باتوں پر پریشان ہونے کے بجائے یقین کروں۔

میں اپنے دماغ سے اس کے منفی پہلو کو بھلا کر مثبت پہلو کا جائزہ لینے لگا۔

"میں سالوری اپنی دنیا سے یہاں کسی خاص مقصد کے لئے آئی ہوں مقصد یہ ہے کہ میں تمہیں ایک سچی اور نہایت ہی عمدہ طرز کی کہانی سنانا چاہتی ہوں مگر اس کہانی کے سننے کے کچھ اصول ہیں۔ ان پر تمہیں عمل کرنا پڑے گا۔ وہ یہ کہ جب میں کہانی سناؤں، بیچ میں کسی قسم کا سوال یا کوئی بھی بات، میں ہرگز برداشت نہیں کر پاؤں گی۔ میں خاص طور سے تمہیں یہ کہانی سنانے آئی ہوں تو میں چاہتی ہوں کہ تم اسے بڑے غور سے سنو! اگر تم نے کہانی سننے میں ذرا بھی خلل ڈالا تو سمجھ لو کہ بہت نقصان اٹھاؤ گے۔

جو کہانی میں تمہیں سنانے جا رہی ہوں وہ اپنی نوعیت کی ایک انوکھی کہانی ہے۔ یہ کہانی تمہیں ضرور ایسے سحر میں جکڑ لے گی جو تم سوچ بھی نہیں سکتے۔ یہ کہانی تم پر ضرور سکتہ طاری کر دے گی۔ جب میں کہانی سنا چکوں تو تم جو چاہو پوچھ سکتے ہو۔ تو تم سننا چاہو گے یہ کہانی؟" اس نے طویل گفتگو کرتے ہوئے اچانک ہی مجھ سے یہ سوال کر ڈالا۔

میرے دل میں اس کے متعلق جو بھی برے خیالات تھے میں اب انہیں بالکل مٹا چکا تھا۔ نجانے وہ مجھے کیسی کہانی سنانا چاہتی تھی۔ آخر ایسی بھی وہ کیا کہانی تھی جو مجھ پر سکتہ طاری کر دیتی۔ "اچھا اگر یہ کہانی ایسی ہیبت ناک ہے تو مجھے جلدی سے سناؤ، میں سننے کے لئے بالکل تیار ہوں۔" میں نے کہا۔

میرا خوف تو جیسے پر لگا کے اڑ گیا تھا۔ جیسے میں کسی دوسرے مخلوق سے نہیں بلکہ اپنے کسی دوست سے بات کر رہا ہوں۔ اس نے اپنے نازک سے ہاتھوں سے اپنے پیروں تک آئے لہنگے کو اٹھاتے میرے مزید قریب ہونے لگی۔ تو اس کی پائل کی آواز چھن چھن کرتے ہوئے کمرے کے سکوت میں ایک ساز برپا کر رہی تھی۔ وہ میرے اتنے قریب ہو گئی کہ اس کا حسین چہرہ بالکل میری آنکھوں کے سامنے تھا۔ "کیا تم اس بھیانک اور سچی کہانی کو سننے کے لئے بالکل تیار ہو؟" اس نے اس بار عجیب سے لہجے میں کہا۔ مجھے لگا کہ وہ مجھے خوف زدہ کرنا چاہتی ہے۔ اس لئے میں نے اس کی آنکھوں میں آئے عجیب رنگ کو نظر انداز کرتے ہوئے مختصر لفظوں میں کہا۔ "بالکل تیار ہوں۔"

"تو ٹھیک ہے۔" اس نے اسی لہجے میں یہ کہا تو میرے ماتھے پر پریشانی کی شکنیں ابھریں جسے وہ جان گئی اور لہجے کا پینترا بدلتے ہوئے مسکراتے ہوئے بولی۔ "تم پریشان بہت جلد ہو جاتے ہو مگر اچھی بات یہ ہے کہ تمہیں اپنی پریشانی پر قابو پانا بھی اچھی طرح سے آتا ہے۔ ابھی کی مثال اس بات کا جیتا جاگتا ثبوت ہے جس طرح پہلے تم مجھ سے اس قدر خوف زدہ تھے کہ تم میری کوئی بات سننا پسند نہیں کر رہے تھے مگر میری باتوں پر یقین کر کے تم نے اپنے خوف پر چند لمحوں میں قابو پا لیا۔ خیر میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اتنی طویل داستان میں کھڑے ہو کر کیسے سناؤں گی۔ اتنا بڑا کمرہ ہے کہیں پر بھی بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔" اس نے کمرے کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

"اوہ! میں تو بھول ہی گیا۔ دراصل تم نے جس طرح اپنی کہانی کی تعریف کی ہے۔ میرا دل بے چین ہو رہا ہے۔ اسے سننے کے لئے چلو ادھر بیٹھتے ہیں۔" میں نے رائٹنگ ٹیبل کے ساتھ پڑے ہوئے صوفے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا اور ہم دونوں صوفے پر بیٹھ گئے۔ تب وہ گویا ہوئی۔

"یہ ایک ایسی لڑکی کی داستان ہے جو بے پناہ

خوب صورت ہوتی ہے۔ اتنی کہ جہاں سے گزرتی وہاں ایک عجیب سی کیفیت طاری کر دیتی۔ جس محفل میں جاتی تمام لوگوں کی نگاہوں کی مرکز بنی ہوتی تمام خوب صورت چہرے اس کے سامنے پھیکے پڑ جاتے۔ اس کی خوب صورتی کو دیکھ کر ہر کوئی اس پر مرمٹتا۔ ایسی سندرتا کہ جسے اپنا ایک جلوہ دکھاتی اسے پاگل کر دیتی۔ اس کی چھلکتی ہوئی بے پناہ خوب صورتی دیکھ کر اس کے ماتا پتا کو اس کی شادی کی فکر جلد آن پڑتی ہے۔ اس لئے وہ جلد ہی اس کے لئے ایک اچھا رشتہ تلاش کر کے کسی بڑے پنڈت کے پاس جاتے ہیں اور اسے اچھا مہورت نکالنے کے لئے کہتے ہیں اور اپنی بیٹی کی قسمت کے بارے میں پوچھتے ہیں مگر پنڈت جب حساب لگاتا ہے تو وہ ایک بہت ہی عجیب سی بات کا انکشاف کرتا ہے جو اس کے ماتا پتا کے سارے خوابوں کو چکنا چور کر دیتی ہے۔ وہ اپنی بیٹی کی پری نما خوب صورتی کے باوجود ایسی قسمت دیکھ کر سر پکڑ کر رہ جاتے ہیں۔

پنڈت انہیں بتاتا ہے کہ ان کی بیٹی کی کنڈلی میں دوش ہے اس کے جسم میں زہر بھرا ہوا ہے۔ اس لئے وہ جس سے شادی کرے گی، صبح اپنے پتی کو مردہ پائے گی۔ اس کے ایسے حسن اور اس کے جسم کے اندر زہر کی بھی ایک وجہ ہے۔ "اسے شاید تو بھی جانتی ہے۔" پنڈت نے اپنی بھاری بھرکم آواز میں اس کی ماں کو متوجہ کرتے ہوئے کہا۔

لیکن پنڈت کے منہ سے اپنی بیٹی کے بارے میں ایسی حقیقت سن کر وہ گھبرا گئی تھی ماں نے نفی میں سر ہلایا کہ وہ کچھ نہیں جانتی۔ تب پنڈت نے دوبارہ کہنا شروع کیا۔

"ایک دفعہ جب تیری بیٹی سات آٹھ مہینے کی تھی وہ باغ میں پڑے جھولے میں میٹھی نیند سو رہی تھی اور تو شاید پھولوں کو پانی دے رہی تھی یا پھر انہیں ٹھیک کر رہی تھی۔ تب کہیں سے بھولی بھٹکی ایک ناگن کی اس پر نظر پڑی اور وہ آہستہ آہستہ جھولے پر چڑھ آئی اور تیری بیٹی کے سینے پر کنڈلی مار کر بیٹھ گئی، جس سے اس کی آنکھ کھل گئی۔ بچی نے اپنے سامنے اس عجیب و غریب چیز کو دیکھ کر حسب عادت مسکراتے ہوئے اسے ہاتھوں میں لینے لگی مگر تب ناگن اس کے ننھے سے ہاتھ پر لپٹتی چلی گئی مگر اسے ڈسا نہیں کیونکہ اسے اس کی معصوم صورت پر پیار آ گیا تھا۔ پھر وہ آہستہ آہستہ اس کے ہاتھ سے نکلنے لگی۔ پھر اس ناگن نے اپنی زبان تیری بیٹی کے ماتھے پر لگائی اور دھیرے دھیرے نیچے اترتی چلی گئی۔" "تب تیری نظر اس پر پڑی۔"

پنڈت کی اس بات پر اس کی ماں کو سب کچھ یاد آ گیا اور وہ کہنے لگی۔ "ہاں...... ہاں دیکھا تھا میں نے اسے بالکل سیاہ اور دھاری دار ناگن تھی وہ، میری نظر اس پر تب پڑی تھی جب وہ جھولے سے اتر رہی تھی۔ جب میں نے شور مچا کر لوگوں کو وہاں جمع کیا تو وہ وہاں سے غائب ہو چکی تھی۔ بہت تلاش کرنے کے بعد وہ کہیں نظر نہیں آئی۔ پھر میں بے اختیار جھولے کی طرف بڑھی۔ مجھے یقین تھا کہ میری بٹیا مردہ حالت میں پڑی ہوگی یا پھر تڑپ رہی ہوگی۔ مگر یہ دیکھ کر میں حیران رہ گئی کہ وہ جھولے میں پڑی کھیل رہی تھی مگر اس کے ماتھے پر تکونی شکل کا ایک سیاہ نشان تھا۔ جسے میں نے اسی وقت اپنے پلو سے ہٹانا چاہا مگر وہ ذرا بھی نہ ہٹا۔" اتنا کہہ کر اس کی ماں خاموش ہو گئی۔

پنڈت نے پھر بتانا شروع کیا۔ "وہ سیاہ نشان اس وقت تو نہیں مٹا مگر رفتہ رفتہ وہ تیری بیٹی کے جسم میں اترتا ہوا غائب ہو گیا۔ وہ نشان زہر بن کر تیری بیٹی کے جسم کی ایک ایک نس میں بھرتا چلا گیا۔ اس ناگن کی خوب صورتی بھی اس سیاہ نشان کے ساتھ اس کے جسم میں سرایت کر گئی ہے اور آہستہ آہستہ کرتی جا رہی ہے جیسے جیسے وہ بڑی ہوتی گئی اس کی خوب صورتی میں بھی اضافہ ہوتا چلا گیا۔ جب سے اس نے جوانی کی دہلیز پر قدم رکھا ہے وہ قیامت بن چکی ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ ناگن کی خوب صورتی اور زہر کی آمیزش اس کے ماتھے سے اس سیاہ نشان کو مٹا چکی ہے۔ ناگن کا زہر تیری بیٹی کے جسم میں دوڑ رہا ہے۔ وہ زہر تیری بیٹی پر تو کچھ اثر نہیں کر رہا ہے مگر وہ جس

سے شادی کرے گی صبح اسے مردہ پائے گی۔" پنڈت اپنی ساری بات بتا کر خاموش ہو گیا۔

تمام باتیں سن کر اس کے ماں باپ روتے دھوتے اس کی قسمت کو کوستے وہاں سے جانے لگے۔ تب پنڈت نے انہیں روک لیا اور کہا۔ "اگر اس زہر کو ختم کرنا ہے تو اس کے لئے بڑا ہی کٹھن عمل کرنا پڑے گا۔ تیری بیٹی کے لئے بالکل آسان ہے کیونکہ وہ جس قدر حسین ہے اسے کوئی مشکل نہیں ہوگی مگر احتیاط بہت ضروری ہے۔ وہ عمل یہ ہے کہ اسے انسانوں کی دنیا میں جا کر دس مردوں کے خون سے اپنے حلق کو تر کرنا ہے، وہ ہر رات سج سنور کر انسانوں کی دنیا میں جائے اور مردوں کو اپنے حسن کے جال میں پھنسا کر اسے مار ڈالنے کے بعد اس کے خون سے اپنا حلق تر کرے، ویسے بھی دنیا کے انسان اس کی خوب صورتی پر مر مٹیں گے۔ اس لئے اس کے لئے یہ کام کوئی اتنا مشکل نہیں ہوگا۔ اسے یہ دس خون لگاتار کرنے ہوں گے اگر بیچ میں خلا آ گیا تو یہ عمل بے اثر ہو جائے گا۔ اسے ہر رات ایک خون کرنے کے بعد پھول دیوی کے چرنوں میں نہانا ہوگا۔ اسی طرح جب وہ دس خون پورے کر چکے تو اسی رات اسے پھول دیوی کے چرنوں میں نہلا کر اسی رات اس کا دیواہ کرنا ہوگا اگر اس کا دیواہ اسی رات نہ ہوا تو اس کے جسم سے زہر کو زائل کرنے کا یہ سارا عمل پانی پانی ہو جائے گا۔ تیری بیٹی ساری عمر تنہا ہی رہے گی۔"

پنڈت نے یہ تمام باتیں اس کے ماتا پتا کے گوش گزار کر دیں، اس کے ماں باپ نے پنڈت کی باتوں پر بہت غور و فکر کیا اور سوچنے لگے کہ آخر وہ یہ بات اپنی بیٹی سے کیسے کریں؟ آخر ان دونوں کے باہمی فیصلے نے یہ طے کیا کہ وہ یہ بات اپنی بیٹی سے نہیں کریں گے۔ ان کے ذہن میں ایک یہ بھی خیال تھا کہ کیا پتہ پنڈت نے وہ تمام باتیں محض انہیں پریشان کرنے کے لئے اور ان کی بیٹی کے حسن سے جلتے ہوئے کہہ دی ہوں مگر اس کے ماں کے پاس گزرا ہوا آنکھوں دیکھا واقعہ اس بات کا ثبوت تھا کہ پنڈت کی باتوں میں واقعی سچائی ہے اس لئے وہ چاہتے ہوئے بھی اس بات سے انکار نہیں کر سکتے تھے کہ ان کی بیٹی واقعی شادی کے لائق نہیں ہے مگر ان کے دل میں نجانے کیا سمایا کہ وہ اپنے دل کو مضبوط کرتے ہوئے اپنی بیٹی سے حقیقت چھپاتے ہوئے اور خاص طور پر پنڈت کی باتوں کو آزماتے ہوئے اس کی شادی کر دی۔

مگر وہ ہوا جو پنڈت نے کہا تھا۔ صبح اس کے پتی کے منہ سے جھاگ نکل رہی تھی۔ اس کا پورا جسم سیاہ پڑ گیا تھا اور وہ پلنگ سے اوندھے منہ گرا پڑا تھا۔ اس نے اپنے پتی کو اس حالت میں دیکھا تو پریشان ہو گئی اور اسے سیدھا کیا تو وہ مر چکا تھا۔

جب حقیقت سچ بن کر اس کے ماں باپ کے سامنے آ ہی گئی تو انہوں نے اپنی بیٹی کو پنڈت کی تمام باتوں سے آگاہ کیا مگر وہ اپنے پتی کی اس ناگہانی موت پر اس قدر گھبرا گئی تھی کہ اس نے اپنے ماں باپ کی کسی بات پر یقین نہیں کیا۔ اس نے اپنے پتی کی موت کو محض ایک اتفاق سمجھا کہ سونے میں کسی بھولے بھٹکے سانپ نے اسے ڈس لیا ہوگا وہ اس بات کو ماننے کے لئے قطعاً تیار نہیں تھی کہ اس کی موت اس کی وجہ سے ہوئی ہے۔

یہ بات پنڈت، اس کے ماں باپ اور اس کے علاوہ کوئی نہیں جانتا تھا اس کی کنڈلی میں دوش ہے۔

اب بھی ہر کوئی اس سے شادی کرنے کے لئے بے چین تھا، تب ہی اس نے دوسری شادی کرنے کا سوچا، دراصل وہ یہ شادی اس لئے کرنا چاہتی تھی کہ آیا پنڈت کی بات سچ ہے یا پھر اس کے پہلے پتی کی موت واقعی ایک اتفاق تھا۔ مگر اس بار بھی پنڈت کی کہی ہوئی بات سچ ثابت ہوئی اور اگلی صبح اس کا دوسرا پتی بھی اسی حالت میں پایا گیا۔ اپنے دوسرے پتی کی بھی یہ حالت دیکھ کر اسے غم و غصے کا ایک زبردست دھچکا لگا اور اس نے اسی وقت فیصلہ کیا کہ وہ اپنے جسم سے زہر کو زائل کرنے کے لئے ضرور پنڈت کے بتائے ہوئے طریقے پر عمل کرے گی۔ اس طرح وہ ہر روز انسانوں کی دنیا میں جاتی اور ہر رات ایک نوجوان کو بہلا پھسلا کر اسے

بھیانک موت کے گھاٹ اتارتی اور ہر موت کے بعد پھول دیوی کے چرنوں میں آ کر نہاتی وہ اب تک نو قتل کر چکی ہے۔ صرف ایک خون باقی ہے......"

اتنا کہہ کر وہ خاموش ہو گئی اس کی آنکھوں میں عجیب و غریب سی چمک تھی جو اس کے دل کا حال ظاہر کر رہی تھی۔ میں حیرت کی تصویر بنے اس کے منہ سے نکلے ایک ایک لفظ کو اب تک سنتا آیا تھا اور چاہتے ہوئے بھی اپنے منہ سے ایک لفظ بھی نکال نہیں پایا تھا۔ معلوم نہیں اس میں بیچ میں نہ بولنے کی دھمکی کا عمل تھا یا پھر اس کے منہ سے لفظ بہ لفظ نکلے اپنی ہی کہانی سنانے کی وجہ سے، اس کہانی نے واقعی مجھ پر سکتہ طاری کر دیا تھا۔ اس نے یہ کہانی بالکل اسی طرح سنائی تھی جس طرح میرے ذہن نے اسے تخلیق کی تھی اور میں یہ کہانی جہاں تک لکھ چکا تھا بس اس کہانی کا اینڈ باقی تھا جو نہ ہی میں نے سوچا تھا اور نہ ہی اس کے لبوں نے اگلا تھا۔ میں نے اتنی ہی تو کہانی لکھی تھی جو اس نے مختصراً بتا دی۔

اس سے پہلے کہ میرے منہ سے کچھ الفاظ نکلتے وہ اپنی جگہ سے اٹھی، تھوڑا آگے بڑھتے ہوئے دوبارہ میری طرف منہ کئے کھڑی ہو گئی اور بولی۔ "یہ کہانی مجھے یہیں تک آئی ہے، یہ تو تمہیں پتہ ہوگا کہ یہ کہانی ابھی ادھوری ہے اس کا انت ابھی باقی ہے اور ہاں! وہ خوب صورت لڑکی کوئی اور نہیں سانوری ہی تو ہے جو تمہارے سامنے کھڑی ہے۔"

مجھے اپنا دل ڈوبتا ہوا محسوس ہوا، میرے کانوں سے دھوئیں سے نکلنے لگے۔ میں اپنے آپ کو بالکل بھی نہیں سنبھال پا رہا تھا اس کا تو انداز گفتگو ہی بدل گیا تھا وہ اب جس طرح مجھ سے ہمکلام تھی کہ اس کی آنکھوں سے وحشت ٹپک رہی تھی اس نے اپنے لہجے اور اپنی آواز کا پینترا کس خوبی سے بدل لیا تھا کہ اندازہ ہی نہیں ہو رہا تھا کہ اس نے کبھی مجھ سے نرمی سے بھی بات کی ہو۔

"تم نے جو کہانی سنی ہے وہ بالکل حقیقت پر مبنی ہے مجھے حیرت ہوتی ہے کہ تمہارے ذہن میں آخر میری یہ کہانی کیسے سمائی اور وہ بھی بالکل اس طرح کہ تمہاری کہانی کا لکھا ہوا ایک ایک لفظ میری زندگی کی داستان میں حقیقت رکھتا ہے اور اس سے بھی حیرت کی بات یہ ہے کہ تم جو بھی کہانی میں لکھتے جا رہے ہو وہی میرے ساتھ پیش ہو رہا ہے۔ مجھے پتہ ہے کہ تم کہانی کا انت میرے خاتمے پر کرتے اس سے پہلے کہ تم قلم اٹھاتے، میں کہانی کا رخ بدلنے کے لئے اپنی کہانی کے رائٹر کے سامنے کھڑی ہوں اپنی کہانی کا اختتام کرنے کے لئے۔

مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑ رہا ہے کہ میں نے تم سے جھوٹ بولا میں تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گی مگر سچ تو یہ ہے کہ جس مقصد کے لئے میں یہاں آئی ہوں پھر وہ مقصد آخر کیسے پورا ہو سکتا ہے۔ وہ کیا مقصد ہے اس کا تمہیں کچھ تو اندازہ ہو ہی چکا ہوگا؟" اس نے اسی لہجے میں مجھ سے سوال کیا۔

مگر اس سے پہلے کہ میں اپنے لبوں کو جنبش دیتا وہ خود ہی بول پڑی۔ "اچھا یہ بتاؤ کہ میں دلہن کے روپ میں بنی سنوری آخر تمہارے سامنے اور تمہارے پاس کیوں آئی ہوں، عام لباس میں بھی تو آ سکتی تھی۔ اس سوال کا بھی جواب تمہارے پاس نہیں ہے کیونکہ تم نے اپنی کہانی میں اس بات کا ذکر نہیں کیا کہ مجھے اپنا آخری شکار دلہن کے روپ میں کرنا ہے، جاننا چاہتے ہو وہ آخری شکار کون ہے؟ جس کے خون سے اپنے ہونٹ سرخ کرنے کے بعد میں اپنی زندگی ہنسی خوشی گزار سکتی ہوں۔" اس نے آگے بڑھتے ہوئے پراسرار لہجے میں کہا۔

"وہ...... وہ تم ہو......!! ہاں رائٹر ساحل شیخ! تم ہی تو ہو میرا آخری شکار......" اور گہری مسکراہٹ اس کے لبوں پر نمودار ہو گئی۔

میرا دل اچھل کر حلق میں آ پھنسا تھا اور جیسے میں سانس لینا ہی بھول گیا تھا۔ میں پہلی دفعہ اپنی موت کو اس قدر قریب دیکھ رہا تھا۔ وہ بھی اس قدر بھیانک موت کہ اس پل تصور کر کے میرا دل دہل گیا تھا۔ حیرت ہو رہی تھی کہ کس طرح اس نے مجھے اپنی باتوں میں پھنسا کر کس خوبی سے اصل بات اپنے لبوں تک لائی تھی۔ پہلے اس نے غائبانہ حالت میں اپنی پائل کی دھن پر میرے

اردگرد منڈلاتے ہوئے مجھے خوفزدہ کرنے کی کوشش کی مگر اس پل میں نے اپنے خوف پر کنٹرول پایا پھر اس نے اپنے خوب صورت چہرے اور وجود کو ظاہر کر کے مجھے اپنی باتوں کے جال میں پھنسا کر کہانی سنائی اس کے بعد بھی باتوں کو گول کرتے ہوئے آخر اس نے کہہ ہی دیا کہ ”میں بس کا آخری شکار ہوں۔“

میری موت میرے سامنے کھڑی تھی اور موت سے بھاگنے کے لئے آخری کوشش تو ہر کوئی کرتا ہے، چاہے اس کی حالت جیسی بھی ہو۔ میں اپنے آپ کو خوف سے نکالتے ہوئے اور سنبھالتے ہوئے اٹھا۔ مگر یہ کیا؟ میرے پاؤں جیسے کئی من وزنی ہو چکے تھے۔ میں اپنی جگہ سے اٹھ تو چکا تھا مگر میں چل نہیں پا رہا تھا۔ میں نے اپنے پاؤں کو حرکت دینے کی بہت کوشش کی مگر ایک انچ بھی آگے نہ بڑھ سکا اسی کوشش میں، میں لڑکھڑاتا ہوا دوبارہ صوفے پر گر پڑا۔ میں بے بسی اور لاچاری سے اسے دیکھا جا رہا تھا۔ اس کے بھیانک اور دیواروں میں شگاف ڈالتے قہقہے میرے دل کو چیرتے جا رہے تھے۔ وحشت ناک قہقہے لگاتے لگاتے اچانک وہ خاموش ہوگئی اور اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک آ گئی۔ اپنے چہرے پر خونی تاثرات اور آنکھوں میں وحشی چمک لئے اب وہ میری طرف خراماں خراماں بڑھنے لگی۔

وہ میرے بالکل قریب آ کر رک گئی۔ میں نے اپنے ہاتھوں سے مزاحمت کرنی چاہی مگر......

بھیانک سانوری نے نجانے مجھ پر کیسا جادو کر دیا تھا کہ میرا پورا جسم مفلوج ہو چکا تھا کہ میں اپنے ہاتھوں کو بھی حرکت نہیں دے پا رہا تھا۔ میرا پورا جسم سن ہو چکا تھا۔

اس نے مجھ پر ایک خونی نگاہ ڈالتے ہوئے اپنا داہنا ہاتھ آگے بڑھایا۔ مجھے علم تھا کہ وہ مجھے بھی اسی طرح مارے گی جس طرح اس نے گزشتہ لوگوں کو خطرناک موت مارا ہے۔ میں نے خوف سے آنکھیں بند کر لیں مجھے لگا کہ وہ مجھے مارنے کے لئے مجھے بھی شانوں سے پکڑ کر میری گردن میں اپنے دانت گاڑ دے گی مگر ایسا کچھ نہیں ہوا اس نے اپنے نرم وگداز اور نازک ہاتھ میرے چہرے پر آہستگی سے پھیرنا شروع کیا جس سے مجھے اپنا سر گھومتا ہوا محسوس ہوا۔ میرا جسم ڈھیلا پڑ گیا۔ میں صوفے سے نیچے گر پڑا اور میری آنکھوں میں اندھیرا چھاتا چلا گیا۔

جب میری آنکھ کھلی تو میں نے اپنے آپ کو ایک کھلے میدان میں پایا جہاں میں اوندھے منہ گرا پڑا تھا۔ میں نے اسی حالت میں ہوتے ہوئے اپنا سر اوپر اٹھایا تو میں نے دیکھا میرے چاروں طرف بڑی گہما گہمی لگی پڑی ہے لوگ میرے وجود سے بے خبر اپنے کاموں میں مصروف تھے اور کچھ ادھر ادھر چہل قدمی کر رہے تھے۔ مجھے یوں گمان ہو رہا تھا جیسے وہ مجھے دیکھ نہیں پا رہے ہے ورنہ مجھے اس طرح دیکھ کر ان کا رد عمل ضرور ہوتا۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے وہاں کسی تقریب کا انعقاد ہو رہا ہو۔

کوئی بیس پچیس فٹ کے فاصلے پر بہت ساری عورتیں جمع تھیں انہوں نے رنگ برنگی پوشاکیں پہنی ہوئی تھیں، وہ شکل وصورت میں تو عام سی تھیں مگر ان کی آنکھیں انہیں عجیب مخلوق ظاہر کر رہی تھیں۔ ایک طرف نہایت خوب صورت اسٹیج سجا ہوا تھا۔ جہاں ایک موٹا سا شخص بیٹھا ہوا تھا جو آگ کے ایک طرف بیٹھا اپنی مخصوص چیزوں کو ایک طرف کر رہا تھا۔ اس کے گرد چند لوگ کھڑے تھے، ان سب سے ہٹ کر دور ایک طرف ایک خوب صورت مورتی نصب تھی جو غالباً عورت کی تھی۔ لوگ اس کے سامنے تھال اٹھائے جس میں پھل فروٹ تھے کھڑے تھے اور کچھ لوگ ہاتھ باندھے اس مورتی کے سامنے کھڑے کچھ گا رہے تھے یا شاید کچھ پڑھ رہے تھے۔ دور ہونے کی وجہ سے ان کی آواز مجھ تک نہیں پہنچ رہی تھی۔ یہ سب دیکھتے ہوئے دفعتاً کوئی عورت پیروں میں پائل پہنے چھن چھن کرتی۔ میرے چہرے۔ کے سامنے آ موجود ہوئی۔ جس سے آنکھ کھلتے ہی اپنے اردگرد عجیب سی صورتحال کا جائزہ لینے کا سلسلہ دفعتاً رک گیا۔ میں نے اپنی نظریں اوپر اٹھائیں۔

اپنی نظریں اوپر اٹھانے اور اسے دیکھنے کے بعد جیسے میری گزشتہ دو گھنٹوں کی یادداشت واپس آ گئی اس سے پہلے میں خالی الذہن تھا مجھے کچھ نہیں معلوم تھا کہ میں یہاں کیسے اور کیوں پہنچا ہوں اور اس سے پہلے میرے ساتھ کیا پیش آیا تھا یہ بھی مجھے یاد نہیں تھا۔ آنکھ کھلنے کے بعد میں یہی دیکھ اور سوچ رہا تھا کہ میں کن لوگوں کے بیچ گھرا ہوا ہوں اور مجھے یہاں کون چھوڑ گیا ہے؟

مگر اسے دیکھنے کے بعد مجھے میرے کچھ سوالوں کے جواب مل گئے۔ میرے سامنے سانوری کھڑی تھی۔

”ہماری دنیا اور ہماری بستی میں تمہارا سواگت ہے، رائٹر ساحل شیخ۔“ وہ چہرے پر طنزیہ اور مکارانہ مسکراہٹ لئے مجھ سے ہمکلام تھی۔

میں اسے دیکھ کر جلدی سے اٹھ بیٹھا اور یہ محسوس کر کے مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ اب میں اپنے ہاتھ پاؤں کو حرکت دے سکتا تھا۔ مگر یہ خوشی اسی لمحے کافور ہوگئی کیونکہ میری موت میرے بالکل سامنے تھی اور مجھے اپنی بستی میں لا کر کچھ زیادہ ہی نڈر بھی ہو چکی تھی لیکن میں بھی چوکنا ہو کر بیٹھ گیا اور بھاگنے کی کوشش نہیں کی کیونکہ میں اسی وقت بھاگنے کی کرتا تو وہ آسانی سے مجھے پکڑ سکتی تھی۔ میں کن اکھیوں سے بھاگنے کے راستے تلاش کرنے لگا۔

”دیکھ رہے ہو میری شادی کی تیاریاں کس زور وشور سے چل رہی ہیں۔ وہ دیکھو بستی کی ساری عورتیں کس طرح میری شادی میں شریک ہونے کے لئے اور مجھے ایک نظر دیکھنے کے لئے بے تاب ہیں اور وہ منڈپ جو صرف میرے لئے سجایا گیا ہے وہیں میں کچھ دیر بعد بٹھائی جاؤں گی اور لوگ میری خوب صورتی کو ایک نظر دیکھنے کے لئے گرتے پڑتے آئیں گے اور ہاں! وہ مورتی دیکھ رہے ہو وہ پھول دیوی کی مورتی ہے آج رات اسی کے چرنوں میں مجھے نہلایا جائے گا۔ اس کے بعد......اس کے بعد میری زندگی سے اس درد کی گھٹا ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ہٹ جائے گی۔ میری کنڈلی سے دوش ہٹ جائے گا۔ میں اپنی زندگی کو ہنسی خوشی گزار سکوں گی۔ دور ہو جائے گی میری تنہائی......مگر......مگر یہ سب تب ہوگا جب میرے حلق میں تمہارا خون اترے گا......“

اس سے پہلے کہ وہ اچانک مجھ پر حملہ کر دیتی۔ میں ایک پل بھی ضائع کئے بغیر وہاں سے بھاگنے کی کوشش میں اٹھنے لگا مگر سانوری نے اسی لمحے اپنا بایاں پاؤں میرے ہاتھ پر رکھ دیا۔ مجھے ایسا لگا کہ میرے ہاتھ پر محض ایک پاؤں نہیں بلکہ کئی کلو وزنی کوئی شے رکھ دی گئی ہو جس سے مجھے اپنا ہاتھ کچلتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

”چھوڑو......چھوڑ دو مجھے......خدا کے لئے مجھے جانے دو......کیا بگاڑا ہے میں نے تمہارا۔“ میں درد کی شدت سے کراہتے ہوئے بولا۔

”کیا کہا تم نے! تمہیں چھوڑ دوں......تمہیں جانے دوں؟“ اس نے قہقہہ لگاتے گویا میرا مذاق اڑاتے ہوئے کہا۔ ”تمہیں نہیں چھوڑنا......تم نے میرے ہاتھوں تو لوگوں کو تو بھیانک موت مروا دیا اب خود بھی تو اس موت کا مزہ چکھو۔ تم نے اپنی کہانی میں تو ان لوگوں کو میرے ہاتھوں مرواتے ہوئے بھیانک منظر کھینچا مگر اب حقیقت میں بھی دیکھو! میں اپنا روپ بدلتے ہوئے کیسی لگتی ہوں اور محسوس کرو گے کہ دانت گاڑتے ہوئے خون کا ایک ایک قطرہ نچوڑنے کی تکلیف کیسی ہوتی ہے۔ میں نے اب تک جتنے بھی شکار کئے ہیں، جتنے بھی لوگوں کا خون چکھا ہے، تمہارا خون پینے میں مجھے زیادہ مزا آئے گا کیونکہ تم میرے آخری شکار ہو......آخری شکار یعنی میری کامیابی کی منزل......میری کنڈلی سے دوش ختم ہو جائے گا......آخری شکار......آخری صرف آخری......پھر ہوگا اس کہانی کا انت......صرف تمہارا خون پینے کے بعد......ہاہاہا......“

وہ مجھے یعنی اپنا آخری شکار پھنسانے کے بعد اس قدر خوشی سے سرشار تھی کہ اس کے بھیانک قہقہے ساتویں آسمان کو چھو رہے تھے اور میرے کانوں کے پردے کو پھاڑے جا رہے تھے مگر اس کے دہشت ناک، قہقہوں سے بے خبر میرے اردگرد لوگ اسی تیزی سے اپنے کاموں اور باتوں میں انہماک نظر آ رہے تھے اور

ادھر میری حالت ابتر ہوئی جارہی تھی۔

وہ جس قدر حسین تھی اب اس کے چہرے سے بھیانک پن اور کراہیت صاف جھلک رہی تھی۔ حالانکہ اس نے اب تک وہ روپ نہیں دھارا تھا جو شکار کے وقت اس پر حاوی ہوجاتا تھا۔ وہ مسلسل بھیانک، دہشت ناک اور دل دہلا دینے والے قہقہے لگاتی جارہی تھی۔ اس کے بھیانک قہقہوں کی شدت نے اس کا سر آسمان کی طرف کردیا تھا۔ تب مجھے اپنے ہاتھ پر اس کی رکھی ہوئی ٹانگ کی گرفت ذرا ڈھیلی محسوس ہوئی، میں نے موقع کا فائدہ اٹھاتے ہوئے جلدی سے اپنا ہاتھ کھینچا، میں نے دیکھا وہ مسلسل قہقہے لگاتی اپنا سر اوپر کئے جیسے کامیابی کا جشن منارہی تھی۔

اپنے آپ کو موت کے بھنور سے نکالنے کا یہ میرے پاس بہترین موقع تھا۔ میری ٹانگوں میں جتنی طاقت تھی شاید اس سے بھی زیادہ رفتار سے میں نے وہاں سے دوڑ لگادی۔

میں دوڑتے دوڑتے بہت دور نکل چکا تھا۔ میں دوڑتے ہوئے بار بار پیچھے مڑکر دیکھتا مگر وہاں گھور اندھیرے کے سوا کچھ نہ ہوتا مجھے کچھ پتہ نہیں چل رہا تھا کہ میں دنیا کے کس کونے میں ہوں۔ میں مسلسل بھاگتے بھاگتے ہانپ رہا تھا۔ میرے دل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہوکر صاف میرے کانوں سے ٹکرارہی تھیں۔ مجھے لگا کہ اب میں سانوری سے بہت دور نکل چکا ہوں، تو میں ایک جگہ رک گیا اور سانسوں کو بحال کرنے لگا۔

چاند کی ہلکی روشنی اور ہر طرف چھایا ہوا گہرا سکوت ہولناک تاثر قائم کررہا تھا۔

میں اس میدان سے نکل چکا تھا اور آگے ایک گھنا جنگل شروع ہوچکا تھا۔ مجھے گمان تھا کہ اب بھی سانوری مجھے تلاش کرتے کرتے یہاں پہنچ سکتی تھی اس لئے اپنے آپ کو روپوش کرنے کے لئے جنگل سے اچھی جگہ میرے لئے کوئی نہیں ہوسکتی تھی۔ میں جلدی جلدی آگے بڑھتا جارہا تھا۔ جنگل بہت گھنا اور تاریک تھا میں کسی ایسے درخت کی تلاش میں تھا جس پر رات گزار کر صبح کو میں گھر کی راہ لوں۔ جلد ہی مجھے ایک اونچا درخت مل گیا، میں وقت ضائع کئے بغیر تیزی سے اس پر چڑھنے لگا۔ میں درخت کی سب سے اونچی اور موٹی شاخ پر بیٹھ گیا۔ مسلسل بھاگتے دوڑتے اب مجھے سکون کا سانس نصیب ہوا تھا۔ میں اپنے آپ کو اب بالکل بحفاظت سمجھ رہا تھا۔ اسی لئے میں خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے اور آنکھیں بند کرتے ہوئے درخت سے اپنی پشت لگادی۔ شاید خطرہ ابھی ٹلا نہیں تھا ابھی تو حالات سے لڑنے کے لئے اور مشکلات کا سامنا کرنے کے لئے بہت کچھ باقی تھا اور اس رات کا بھیانک اور پرخطر حصہ بے صبری سے میرا انتظار کررہا تھا کیونکہ آنکھیں بند کرتے ہی مجھے اپنے کندھے پر کسی کھردرے سے ہاتھوں کا لمس محسوس ہوا جس نے ایک لمحے کے آئے سکون کو غارت کردیا۔

میں نے خطرے کی بو سونگھتے ہوئے اسی وقت آنکھیں کھول دیں۔ میں نے برق رفتاری سے اپنے عقب میں دیکھا وہاں کوئی نہ تھا اب میری نظریں عقب میں نیچے تک گئیں۔ جہاں نہایت ہی بھیانک اور کریہہ شکل دھارے سانوری کھڑی اس کے صرف لباس سے اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ وہ سانوری ہی ہوسکتی ہے اس کا چہرہ اس قدر بگڑ چکا تھا کہ ایک کمزور دل آدمی کی اس پر نظر پڑتی تو اس کے دل کی دھڑکنیں بند ہونا لازمی تھا۔

اس کی آنکھیں تھیں یا پھر دہکتا ہوا انگارہ۔ یوں لگتا تھا کہ آنکھوں کے ڈھیلوں کی جگہ کسی نے بھڑکتے ہوئے انگارے رکھ دیئے ہوں۔ چہرے کی صاف اور خوب صورت جلد کی جگہ جھریوں بھری سیاہ چمڑی نے لے لی تھی۔ ناک لمبی ہوگئی تھی اور گلاب کی پنکھڑی نما ہونٹ اب موٹے، سیاہ، بھدے اور پھیلے ہوئے دکھائی دے رہے تھے جو زلفیں پہلے اس کی خوب صورتی میں چار چاند لگارہی تھیں اب وہی گرد آلود ہوکر دو حصوں میں بٹی ہوئی اس کے خوفناک چہرے کے دونوں کانوں کو چھپائے ہوئے تھی۔ اس کے بالوں میں جگہ جگہ چاندی جھلک رہی تھی جو اسے عمر رسیدہ ظاہر کررہی تھی۔

غرض وہ اب دل کو لبھاتی حسین وجمیل سانوری نہیں بلکہ سو سالہ بڑھیا چڑیل لگ رہی تھی۔

حیرت انگیز طور پر میری کہانی کے مطابق اس کے بھیانک، دہشت ناک اور دل کو ہلا دینے والے چہرے کا اس کے جسم پر کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ اپنے اسی سرخ لباس میں ملبوس اور اسی طرح لیا ہوا دوپٹہ چہرے کو ہٹا کر اسے سانوری ہی ظاہر کررہا تھا۔ یہ وہی سانوری تھی جس کے چرچے اس کی دنیا میں ہر خاص وعام کے لبوں پر تھے مگر اب اس کا چہرہ اس کی ساری چھپی حقیقت کو اگل رہا تھا۔

سانوری کا اس قدر بھیانک اور کریہہ چہرہ دیکھ کر خوف کی زیادتی سے میرا رواں رواں لرزنے لگا تھا۔ میں جلدی سے اٹھ کھڑا ہوا اور لرزتے قدموں سے پیچھے ہٹنے لگا۔ میرے پیچھے ہٹنے پر وہ بھی اپنے بھیانک اور دہشت ناک وجود کے ساتھ آنکھوں میں خونی چمک اور ہونٹوں پر کریہہ تبسم لئے میرے قریب آتی گئی۔ پیچھے ہٹتے ہٹتے میری پشت ایک درخت سے جا لگی اب تو میری موت یقینی تھی میرے پاس فی الوقت بھاگنے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ وہ اپنے دانت میری گردن میں پیوست کرنے کے لئے بے تاب کھڑی تھی۔

"کیوں ساحل شیخ! تم ہم سے چھپ رہے تھے پر ہم نے تمہیں تلاش کرلیا...... تم کیا سمجھے تھے کہ ہم نے تمہیں بھاگتے ہوئے نہیں دیکھا۔ دیکھا تھا ساحل بابو دیکھا تھا...... پر ہم نے تمہیں خود بھاگنے کا ایک موقع دیا۔ ہم یہ جاننا چاہتے تھے کہ تم ہم سے آخر کہاں تک بھاگ سکتے ہو۔ مگر تم نے خوامخواہ اپنی ٹانگوں کو اتنی زحمت دی۔ بلاوجہ اپنے آپ کو تکلیف پہنچائی۔ بچ تو پھر بھی تم نہیں پائے اور نہ ہی اپنی موت سے اب بچ پاؤ گے۔ دیکھو اب بھاگنے کا خیال اپنے دل سے بالکل نکال دو کیونکہ اب تم ہماری بستی، ہماری دنیا میں ہو۔ تم یہاں سے تب تک نہیں نکل سکتے جب تک ہم نہ چاہیں ہم یہاں تمہیں اپنی شادی کی تیاریاں دکھا کر واپس تمہاری دنیا میں پہنچانے کے لئے نہیں لے کر آئے۔ ہم تو تمہیں اس لئے یہاں کھینچ لائے ہیں کہ ہمارا آخری شکار کسی بھی وجہ سے ہم سے چھوٹ نہ جائے۔ تم لوگ اپنی دنیا میں تو ہماری نظروں سے اوجھل ہوسکتے ہو مگر ہماری دنیا میں ہماری عقابی نگاہوں سے نہیں چھپ سکتے۔ میں اب مزید تم سے کوئی بحث نہیں کرنا چاہتی، بس اب جلد سے جلد اپنی خواہش اور ضرورت کو پورا کرنا چاہتی ہوں...... آؤ...... آؤ میرے پاس!!"

میری آنکھیں خوف اور دہشت سے پھیل چکی تھیں، میں سکتے کے عالم میں اسے دیکھتا جارہا تھا۔ مجھ میں اتنی بھی ہمت نہیں تھی کہ میں اپنی جان بچانے کے لئے اب ایک قدم بھی پیچھے ہٹوں یا پھر اس کے چنگل سے نکلنے کے لئے کچھ بھی کوشش کروں۔ میری موت تو جیسے مجھ سے ملنے کے لئے بے چین ہوئی جارہی تھی اور لحہ لحہ میرے قریب آتی جارہی تھی۔

سانوری کا بھیانک، کریہہ اور روح فرسا چہرہ میری آنکھوں کے بالکل سامنے تھا۔ اس نے مجھے یک لخت شانوں سے پکڑ لیا اور چہرے پر فاتحانہ مسکراہٹ لاتے ہوئے جھٹکے سے میری گردن کو اپنے منہ کے قریب کرلیا۔ ابھی اس نے میری گردن پر اپنے دانت رکھے ہی تھے کہ اسے ایک زبردست جھٹکا لگا۔ اس کے حلق سے ایک دلخراش چیخ نکلی اور وہ ہوا میں اڑتی ہوئی مجھ سے کئی فٹ دور جاگری اور تڑپنے لگی۔

اس کی دلخراش چیخ سے جیسے مجھے ہوش آگیا۔ میرے ہوش وحواس آہستہ آہستہ بحال ہونے لگے مجھے نہایت خوشی ہوئی کہ میں زندہ سلامت کھڑا تھا مگر اسی پل حیرت اور پریشانی نے بھی آن گھیرا کہ آخر یہ کیسے ہوا؟ کس چیز نے اس کے حملے کو ناکام بنادیا؟ آخر وہ کون تھا جس نے نہ صرف مجھے بچالیا بلکہ اسے یوں تڑپنے پر بھی مجبور کردیا؟ کیا یہاں سانوری اور میرے علاوہ میرا کوئی ہمدرد بھی موجود تھا جس نے مجھے موت کی آغوش میں جانے سے بچالیا؟

لیکن اس جگہ بھلا میری مدد کون کرسکتا تھا؟

اب آخری بات جو میرے ذہن میں آئی وہ یہ

تھی کہ کیا میرے گلے میں کوئی تعویذ وغیرہ ہے؟ جس نے سالوری کے حملے کو خاک میں ملا دیا۔ میرے ہاتھ بے اختیار گلے کی طرف بڑھے، میں نے بچنے کی خوشی میں حیرانی اور ہیجانی کی سی کیفیت میں گلے پر ہاتھ پھیرنا شروع کیا مگر میں نے گلے میں بھی ایسی کوئی چیز نہیں پہنی ہوئی تھی۔

مگر میں نے اپنے شک کو دور کرنے کے لئے اپنے ہاتھ گلے تک لے گیا۔ لیکن مجھے اس بات کا بھی جواب مل گیا۔ مجھے نجانے کیا ہو گیا تھا کہ وہاں سے بھاگنے کے بجائے میرے قدم آہستہ آہستہ سالوری کی جانب بڑھنے لگے، شاید مجھے اب بھی یقین نہیں آیا تھا کہ میں واقعی بچ گیا ہوں اور مجھ سے کئی فٹ دور سالوری زمین پر پڑی تڑپ رہی ہے۔ میں نے اپنے حواس پر قابو پاتے ہوئے ابھی چند قدم ہی بڑھائے ہوں گے کہ......

”رک جاؤ وہیں پر!“ ایک بھاری بھرکم کرخت سی نسوانی آواز دھماکے کی طرح میرے کانوں سے ٹکرائی۔

میرے قدم از خود رک گئے اور فوراً سے پیشتر میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ ایک عورت درخت کی اوٹ میں اس طرح کھڑی تھی کہ اس کا آدھا جسم اور چہرہ ظاہر تھا۔ میری نظر اس عورت پر پڑتے ہی وہ درخت کی اوٹ سے نکلتے ہوئے میری جانب بڑھی اور میرے قریب آ کر رک گئی۔ وہ بھاری جسم کی فربہ عورت تھی اس نے بھی سالوری ہی کی طرح لباس پہنا ہوا تھا۔ چہرے سے وہ عام شکل وصورت کی تھی مگر اس کی آنکھوں سے وحشت ٹپک رہی تھی بالکل انہی عورتوں کی طرح جن کو میں میدان میں سالوری کی شادی میں شرکت کے لئے آتے دیکھ چکا تھا۔

”تم پریشان مت ہو...... ہم تمہیں کسی بھی نقصان پہنچانے کی نیت سے نہیں آئے ہیں۔ ہم نے ہی تمہیں موت کے منہ سے نکال کر سالوری کو اس حالت میں پہنچایا، سالوری کے گھناؤنے ارادوں کو خاک میں ملایا ہے کیونکہ آج ہم تمہیں نہیں بچاتے تو بہت بڑا نقصان ہو جاتا۔ کوئی نہیں بچتا ہماری بستی میں۔“ وہ اپنی پریشانی اور کرب میں ڈوبی آواز میں کہتی جا رہی تھی۔ میں اس کی باتوں کو سمجھ نہیں پایا۔ آخر وہ تھی کون؟ میری مدد اس نے کیوں کی تھی؟ اور وہ کس نقصان کی بات کر رہی تھی؟ اس کے لہجے اور اس کی گفتگو سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ مجھے کچھ بتانے والی ہے۔

”تم وہی نوجوان ہو جس نے سالوری پر کہانی لکھی ہے اگر تم یہ کہانی نہ لکھتے تو تمہیں ہماری دنیا میں موت سے یوں لڑنا نہ پڑتا اور نہ ہی آنے والا عذاب ہم پر سوار ہوتا۔ مگر اب جبکہ تمہیں خود سالوری یہاں لے کر آئی ہے تو تمہارے ہی ہاتھوں اس بھیانک عورت کا خاتمہ ہوگا اور اس کہانی کا خاتمہ ہوگا۔ بھگوان کا شکر ادا کرو کہ ہم نے بروقت تمہاری جان بچالی، سچ تو یہ ہے کہ تمہاری جان پر ہماری بستی کے بیس لوگوں کی زندگی منحصر ہے۔“

مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ مجھ سے کیا پہیلیاں بھجوا رہی ہے کیا کہنا چاہ رہی ہے۔ ”آپ کون ہیں؟ آپ نے میری مدد کیوں کی اور جو باتیں آپ کہہ رہی ہیں خدا کے لئے اسے صاف لفظوں میں کہیں تاکہ میں آپ کی باتوں کو سمجھ سکوں؟“ وہ سوالات جو میرے ذہن میں کب سے گردش کر رہے تھے آخر ہمت کر کے میں نے وہ اگل دیئے۔

”میں کون ہوں؟ یہ تم رہنے دو، بس یوں سمجھو کہ میں تمہاری خیر خواہ ہوں، تم مجھے اپنا ہمدرد ہی سمجھو، جہاں تم ابھی کھڑے ہو، یہ جنات کی دنیا ہے اور ہم ہندو جنات سے تعلق رکھتے ہیں۔ سالوری ہماری بستی کی مشہور شخصیت ہے۔ میں اپنی بستی کی وہ واحد عورت ہوں جو سالوری کی ساری گزشتہ ماضی کی داستان اور آئندہ کے ہولناک کارنامے جانتی ہوں۔ تم نے جو کہانی لکھی ہے یا لکھ رہے تھے یہ سچ ہے کہ وہ ہو بہو سالوری کی حقیقی زندگی سے تعلق رکھتی ہے مگر حقیقت تو یہ ہے کہ یہ سالوری کی ماضی کی داستان ہے، ہاں مگر اس نے جو نو

انسانوں کو بھیانک موت کے گھاٹ اتارا وہ اس کی حالیہ زندگی کے کرتوت ہیں۔ سالوری ایک جواں سال اور نوعمر دوشیزہ نہیں بلکہ سو سالہ بلکہ اس سے بھی زیادہ عمر کی ایک بڑھیا ہے۔ میں نے آج سے پہلے سالوری کی اس حقیقت کے بارے میں کسی کو کچھ نہیں بتایا۔ مگر تم پر یہ حقیقت آشکار کرنا ضروری ہے کیونکہ تم ہی سالوری کا خاتمہ کرو گے۔

تمہاری دنیا کی طرح ہماری دنیا میں بھی جادو ٹونے اور کالا سفلی عمل کیا جاتا ہے، تمہاری دنیا کے کالے علم میں یہ فرق ہے کہ تم جنات کو اپنے وش میں کر کے اس سے اپنا کام کرواتے ہو مگر ہماری دنیا میں دیوتا کو اپنے وش میں کر کے اسے ہر کام کرنے کے لئے مجبور کیا جاتا ہے اور بستی کے معصوم اور بے گناہ لوگوں کو شیطان جنات تنگ کر کے اپنے مطلب کے مقاصد پورے کرواتے ہیں یا پھر انہیں پریشانی سے نکالنے کے بہانے لوٹا جاتا ہے۔ ہمارے یہاں بھی کچھ اچھے جنات بھی بستے ہیں اور کچھ شریر بھی۔ سب کی زندگیاں اسی طرح بسر ہو رہی ہیں جس طرح تم گزار رہے ہو۔ بس فرق صرف اتنا ہے کہ ہم جنات ہیں اور تم انسان۔ ہم تمہیں دیکھ سکتے ہیں پر ہم نظروں سے اوجھل ہیں، اس لئے انسان ہمیں نہیں دیکھ سکتے۔

سالوری کا پتا کالا جادو کر کے ہماری بستی کے لوگوں کو غلط طریقے سے استعمال کیا کرتا تھا۔ بستی کے تمام لوگ اس سے تنگ آ چکے تھے مگر زبان پر کچھ نہ لاتے تھے اگر کوئی تھوڑی بھی شکوہ شکایت کرنے کی کوشش کرتا تو اسے اسی وقت جادو کے زور سے پاگل کر دیا جاتا اسے پراسرار طریقے سے مار دیا جاتا، جب اس کا پتا اپنے مخصوص کمرے میں بیٹھا بھیانک عمل کر رہا ہوتا تو سالوری اسے چپکے سے دیکھ رہی ہوتی اس وقت وہ تقریباً چھ سات سال کی تھی۔ وہ اپنے پتا کو اس طرح کرتے دیکھ کر بہت کچھ سیکھ چکی تھی اور بعض اوقات جب اس کا پتا گھر نہ ہوتا تو بالکل اپنے پتا کی طرح بیٹھ کر منتر پڑھنے لگتی اگر اچانک اس کی ماں کی اس پر نظر پڑتی تو وہ اسے ڈانٹ ڈپٹ کر وہاں سے لے جاتی۔ سالوری کی ماں نے اپنی بچی کی یہ بات اس کے پتا کو بتائی تب سے اس کا پتا اس مخصوص کمرے کو اپنے استعمال کے بعد مقفل رکھنے لگا مگر اب اس کا کچھ فائدہ نہیں تھا کیونکہ جو کچھ سالوری دیکھ چکی تھی اتنا وہ سیکھ بھی چکی تھی اور جو کچھ وہ سیکھ چکی تھی وہ اس کے دماغ کے نہاں خانے میں مقید ہو چکا تھا۔

رفتہ رفتہ سالوری بڑی ہوتی گئی اور اس کی جوانی قیامت بن کر ہر کسی پر برسنے لگی اس کی خوب صورتی کے ہر جگہ چرچے ہونے لگے ہر کوئی اگر اس کے حسن بے پناہ کو ایک دفعہ دیکھتا تو اس کے دل میں اسے ہزار بار دیکھنے کی خواہش پیدا ہوتی۔ سالوری کی ایسی خوب صورتی کی اصل وجہ تو تمہیں معلوم ہوگی اس لئے میں اس بات کو نہیں دہراؤں گی۔ آگے بتاتی چلوں کہ سالوری سے حقیقت چھپاتے ہوئے اس کی شادی کی گئی مگر پنڈت کی بات سچ ثابت ہوئی اور سالوری کے دونوں پتی یکے بعد دیگرے مرے ہوئے پائے گئے۔ اب ہر کوئی اس کے اس بھیانک راز سے واقف ہو چکا تھا اور جان بوجھ کر اپنے آپ کو منہ کے منہ میں نہیں دھکیلنا چاہتے تھے اس کی یہ خوب صورتی اس کے کسی کام نہیں آئی اب اس سے کوئی شادی کرنا تو در کنار اس کے پاس بھٹکنا بھی نہیں چاہتا تھا۔

سالوری طبیعتاً ضدی، ہٹ دھرم اور مغرور لڑکی تھی۔ اس نے اپنی اتنی تذلیل برداشت نہیں کی، ایک دن اس نے شدید غصے کی حالت میں اپنے ماتا، پتا کو مار ڈالا اور اپنے پتا کے کمرے کو کھول کر اپنے آپ کو اسی کمرے میں ہمیشہ کے لئے محصور کر لیا۔ اس کے بعد وہ طویل سالوں تک اس کمرے کے اندر اپنے پتا کو دیکھتے ہوئے جو عمل اس نے بچپن میں سیکھا تھا اب وہ دہرانے لگی جب وہ اپنے تمام تر عمل میں مضبوط ہو گئی تب اس کا غصہ کچھ ٹھنڈا ہوا۔ ایک دن اس نے اپنے آپ کو شیشے میں دیکھا اس کی عمر ڈھل چکی تھی۔ شیشے میں ایک نوے سال کی بڑھیا نظر آئی جس کی ساری خوبصورتی معدوم ہو چکی تھی۔ جسم بھی عجیب صورت دھار چکا تھا۔ اس نے اسی وقت اپنے

ہر عمل کو کام میں لاتے ہوئے اپنے آپ کو پھر سے حسین و جوان بنا دیا مگر اس کی کنڈلی میں دوش اب بھی تھا۔

اس نے اپنی ڈھلتی عمر کو اپنے قابو میں کر کے دوبارہ اپنے آپ کو حسین و جوان سانوری تو بنا دیا مگر اس کے جادو کا زور رات کے تین بجے کے بعد سے صبح نو بجے تک اثر نہیں کرتا ہے۔

آخر ایک دن اس نے ایک زبردست فیصلہ کیا۔ ویسے تو اسے دو اہم کام کرنے تھے۔ پہلا تو یہ تھا کہ اسے اپنی کنڈلی سے دوش کو ختم کرنے کے لئے انسانوں کی دنیا میں جا کر دس لوگوں کو مارنے کا فیصلہ کیا اور اس کے بعد اپنے آپ کو سدا یونہی حسین و جوان رکھنے کے لئے اپنی ہی بستی کے بیس لوگوں کو موت کے گھاٹ اتارنا تھا۔ مگر فی الحال اس نے اپنے جسم سے زہر کو زائل کرنے کے لئے انسانوں کی دنیا میں جانے کا سوچا اس نے بستی کے لوگوں کو اعتماد میں لے لیا تھا ان کے سامنے اپنے آپ کو نہایت مظلوم ظاہر کرتی بستی کا کوئی بھی شخص اسے شادی کا کہتا تو وہ انکار کر دیتی۔ یہ فیصلہ کرنے کے بعد اس نے بستی کے تمام لوگوں کو بتا دیا کہ اس کی کنڈلی میں دوش ہے اسی لئے وہ کسی سے شادی نہیں کر رہی۔ اس نے لوگوں کو پنڈت کی بات سے آگاہ کیا اور ان سے کہا کہ وہ اس کا ساتھ دیں۔

بستی والوں نے اس کی نوجوانی کو دیکھ کر اس کا ساتھ دینے کی حامی بھرلی۔ اس طرح سانوری ہر روز سج سنور کر انسانوں کی دنیا میں جاتی اور وہاں ایک انسان کا خون پینے کے بعد رات تین بجے سے پہلے آتی اور بستی کی کچھ عورتیں اسے پھول دیوی کے چرنوں میں نہلاتیں۔ اس طرح وہ آہستہ آہستہ اپنے پہلے مقصد میں کامیاب ہوتی گئی اس کی کنڈلی سے دوش بھی ہٹتا چلا گیا اور اسے روزانہ اپنے آپ کو حسین و جوان کرنے کے لئے اپنے مخصوص کمرے میں خاص قسم کا ایک منتر پڑھنے بیٹھ جاتی، اس منتر کی بدولت رات کے تین بجے کے بعد بھی اس کی اصلیت ظاہر نہ ہوتی اور اس طرح وہ منتر واقعی اس کی عمر کو پچاس سال پیچھے لے جا رہا تھا۔ وہ ایک ایک کر کے تو لوگوں کو آسانی سے موت کے گھاٹ اتارتی چلی گئی مگر یہاں حیرت کی بات یہ ہے کہ جس طرح تم اپنی کہانی میں لکھتے چلے گئے سانوری کے قدم بھی اسی کی جانب از خود بڑھتے گئے۔ مگر اس سے پہلے کہ تم اپنی کہانی میں سانوری کے دسویں قتل کو ناکام بناتے ہوئے اس کا خاتمہ کرتے تو چالاک سانوری تمہیں ہی اپنا آخری شکار بنانے کے لئے تمہارے پاس پہنچ گئی۔

اور اس سے بھی زیادہ ہوشیاری یہ دکھائی کہ وہ تمہیں اپنی دنیا میں لے کر آئی تاکہ کسی بھی بھول چوک کی وجہ سے تم اس کے ہاتھ سے نکل نہ جاؤ۔ اب تم ہماری دنیا میں آ چکے ہو اب تم یہاں سے تب تک نہیں جا سکتے جب تک سانوری خود نہ چاہے یا پھر اس کی موت نہ ہو جائے۔

''بستی کے تمام لوگ اس کی شادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہے ہیں اور اس کی بھرپور مدد کر رہے ہیں جو تم اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے ہو۔ مگر بستی والوں کو یہ معلوم نہیں کہ جو سانوری ان کے سامنے مظلومیت کا لبادہ اوڑھے ہوئے ہے، وہ اگر یہ شادی اور اپنا آخری شکار کرنے میں کامیاب ہو گئی تو پھر اسی بستی کے بیس لوگوں کو اپنی جان بھی دینی پڑے گی جن کو یہ بھیانک طریقے سے قتل کر چکی ہے۔ اگر یہ تمہیں مارنے میں کامیاب ہو گئی تو یہ سدا یونہی حسین و جوان رہنے کے لئے اور اپنی عمر کی درازی کے لئے ہماری بستی کے لوگوں کے ساتھ یہ بھیانک کھیل شروع کر دے گی اور اپنے مقصد کے حصول کے لئے انہیں لوگوں کو ہر رات پے در پے قتل کرتی جائے گی۔ تب اس کا کوئی خاتمہ نہیں کر سکے گا۔ اس سے پہلے کہ یہ تمہیں کوئی نقصان پہنچائے تم اس کا خاتمہ کر دو تاکہ یہ اپنا گھناؤنا کام مزید جاری نہ رکھ سکے۔ میں نے اپنی تمام تر طاقتیں استعمال کرتے ہوئے سانوری کے حملے کو روکا ہے۔ مگر جب میری شکتیوں کا اثر ختم ہو جائے گا تو یہ دوبارہ اٹھ بیٹھے گی اور اگر تم نے اسے مارنے کا طریقہ نہیں سوچا تو یہ تمہیں مار ہی مارے گی اور اس کے بعد میں اس کا شکار بنوں گی اور پھر اس کے

قدم بستی کی جانب بڑھیں گے۔ میں تمہیں یہ بھی بتا دوں کہ سانوری کی موت ایک مخصوص طریقے سے ہوئی ہے۔ جو تمہارے علاوہ کوئی نہیں جانتا۔ ایک تم ہی ہو جو اس خاص طریقے سے سانوری کو ختم کر سکتے ہو۔'' اس نے یہ آخری جملہ معنی خیز لہجے میں کہا۔

اس نے سانوری کی جو ماضی کی داستان سنائی اس نے مجھے ہلا کر رکھ دیا مگر اس کے ساتھ ساتھ یہ داستان دلچسپ اور حیرت انگیز بھی تھی۔ میں اب تک سب کچھ غور سے سنتا آیا تھا لیکن اس کے چند آخری جملوں نے میری حیرت اور تعجب کو دو چند کر دیا۔ میں اس کی باتوں کو سمجھ نہیں پایا کہ میں سانوری کو ختم کروں گا اور وہ بھی بقول اس کے ایک مخصوص طریقے سے جو صرف مجھے معلوم تھا۔ مگر ایسا کوئی بھی طریقہ میرے ذہن کے گوشے میں دور دور تک بھی نہ تھا، آخر وہ کس مخصوص طریقے کی بات کر رہی تھی، میرے دماغ میں گھومتے سوالات آنکھوں سے جھلکنے لگے میں سوالیہ نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا تب وہ بول پڑی۔

''تم یہی سوچ رہے ہو نا کہ تم سانوری کا خاتمہ کیسے کرو گے؟'' وہ میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولی۔ ''اس کے لئے تمہیں اپنے ذہن پر زور دینا پڑے گا کیونکہ سانوری کو مارنے کا وہ مخصوص طریقہ تمہارے ذہن کے نہاں خانے میں موجود ہے جو فی الوقت تو تمہیں یاد نہیں اگر تم اسے یاد کرنے کی کوشش کرو گے تو وہ تمہیں ضرور یاد آ جائے گا۔ ایک وہی طریقہ ہے سانوری کو ختم کرنے کا۔ اس کے علاوہ ہم کسی بھی طریقے سے سانوری کا خاتمہ نہیں کر سکتے۔ شاید تم اب بھی میری بات کو سمجھ نہیں سکے ہو۔ میں تمہیں سمجھاتی ہوں۔

تم سانوری پر جو کہانی لکھ رہے ہو۔ ہمیں پتہ ہے کہ جو بھی کہانی لکھتے ہو اسے مسلسل لکھتے جاتے ہو اس کا انت پہلے سے نہیں سوچتے۔ مگر سانوری وہ واحد کہانی ہے جس کا انت اور سانوری کو ختم کرنے کا ایک خاکہ کہانی لکھنے کے دوران تمہارے ذہن میں آیا تھا، وہی منظر جو اس وقت تمہاری آنکھوں کے سامنے گزرا تھا اسی کو یاد کرنا ہے۔ اپنے ذہن پر زور ڈالو اور یاد کرو، اس وقت تمہارے ذہن میں سانوری کو مارنے کا وہ کیا طریقہ آیا تھا؟ جلدی کرو ساحل...... سوچو، اپنے ذہن پر زور ڈالو اگر سانوری اٹھ گئی تو بہت برا ہو جائے گا۔''

اس نے مجھ پر ایک اور حیرت انگیز بات کا انکشاف کیا۔ میں واقعی اب تک جتنی کہانیاں لکھ چکا تھا۔ ان میں سے کسی کا اینڈ پہلے سے نہیں سوچا۔ مگر سانوری وہ واحد کہانی تھی کہ میں یہ کہانی لکھنے کے دوران اس کا بھیانک خاتمہ کرنے کا ایک طریقہ اپنے ذہن میں لایا تھا مگر اس کا باقاعدہ اینڈ میرے ذہن میں بالکل نہیں تھا مگر وہ طریقہ کیا تھا؟ میں بھول چکا تھا، میرے ذہن کے کسی گوشے میں وہ منظر نہیں تھا، میں نے یاد کرنے کی بھرپور کوشش کی لیکن میرے ذہن میں کچھ نہ سمایا۔

''ساحل دیر مت کرو...... جلدی سوچو...... سانوری میری تمام شکتیوں کے ضرب سے بس اب آزاد ہونے ہی والی ہو گی، اس سے پہلے اگر تمہارے ذہن میں وہ طریقہ نہ آیا تو وہ ہم دونوں کو مار ڈالے گی۔ جلد سے جلد اپنے دماغ میں وہ طریقہ لانے کی کوشش کرو۔'' اس نے پریشانی کے عالم میں التجائیہ لہجے میں کہا۔

مجھے کچھ یاد نہیں آ رہا تھا، ذہن پر زور ڈالنے پر میرے سر میں درد بڑھ رہا تھا۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں اپنے دماغ کو بالکل خالی اور پرسکون کر لیا۔ میں دل میں خدا سے دعا مانگنے لگا کہ اچانک میرے ذہن میں وہ سب کچھ آنے لگا جو میں سوچنا چاہتا تھا۔ میں نے پھر بھی آنکھیں بند ہی رکھیں اور اس پورے منظر کو اپنے ذہن میں محفوظ اور مقید کر لیا۔

''ہم...... مجھے یاد آ گیا...... سب کچھ یاد آ گیا۔'' میں نے جھٹ سے آنکھیں کھول دیں اور خوشی سے سرشار لہجے میں بولا۔ ''سانوری کے دائیں ہاتھ کے اوپر جو سیاہ رنگ کا نشان ہے اس پر خنجر سے وار کرنے پر اس کا خاتمہ ہو گا۔''

''شاباش ساحل...... شاباش! تم بہت ہی ذہین ہو، مجھے اس بارے میں پتہ تھا کہ سانوری کا خاتمہ کس

طرح ممکن ہے مگر میں تمہیں نہیں بتا سکتی تھی کیونکہ اگر میں تمہیں بتا دیتی تو سانوری کو ختم کرنے کے سارے راستے مسدود ہو جاتے پھر اگر تم سانوری پر وار کرتے تو تمہارا کوئی وار اس پر کارگر ثابت نہ ہوتا۔ اب لو یہ خنجر...... ختم کردو اس بھیانک بڑھیا کو......'' اس نے اپنے دائیں ہاتھ کو آگے کرتے ہوئے کہا۔

میں نے آگے بڑھ کر وہ چمکتا ہوا خنجر اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ ''سانوری کے ہاتھ پر جو نشان ہے وہ تکونی شکل کا ابھرا ہوا، سیاہ نشان ہے، یہ وہی نشان ہے جو بچپن میں اس کے ماتھے پر ثبت تھا مگر جوانی میں وہ نشان اس کے دائیں بازو میں آ کر ٹھہر گیا تھا۔ جو اب مرتے دم تک نہیں ہٹے گا اور جب تک اس کے اس نشان میں خنجر سے وار نہ کیا جائے، تب تک اس کا خاتمہ ممکن نہیں۔ اب تم جاؤ اور گھونپ دو یہ خنجر اس کے جسم میں۔ مار ڈالو اسے...... جاؤ...... جج...... جج۔'' وہ اپنا جملہ ادھورا ہی چھوڑ کر میری نظروں سے اچانک اوجھل ہو گئی۔

میں نے اسے چاروں طرف دیکھا مگر وہ کہیں نظر نہیں آئی۔ مجھے پتہ تھا یہ جنات کی دنیا ہے یہاں کوئی بھی شخص جب چاہے میری نظروں سے اوجھل ہو سکتا ہے۔ مگر اپنے منہ کی بات ادھوری چھوڑ کر یوں اچانک غائب ہو جانا مجھے کچھ پریشان کر گیا۔

خیر میں اپنے ہاتھ میں پکڑے خنجر کی گرفت مضبوط کرتے ہوئے سانوری کی طرف بڑھا مگر یہ کیا؟ وہ بھی اپنی جگہ سے غائب ہو چکی تھی۔ ''کہاں گئی سانوری؟ ابھی تو یہیں تھی۔'' میں نے پریشانی کے عالم میں خودکلامی کی۔

وہ بھی اس عورت کی طرح اچانک غائب ہو گئی تھی مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ جب وہ عورت میرے ہاتھ میں خنجر دے رہی تھی۔ تب میں نے ایک نظر پیچھے مڑ کر سانوری کو دیکھا تھا وہ پہلے کی طرح تڑپ رہی تھی۔

میں سانوری کو جنگل میں ڈھونڈنے کے بجائے ایک طرف بیٹھ گیا۔ مجھے یقین تھا کہ سانوری پلٹ کر میرے پاس ضرور آئے گی وہ کسی بھی طرح مجھے نہیں چھوڑ سکتی تھی کیونکہ اس کے تمام تر مقاصد کے حصول کا محور میں ہی تھا، وہ کسی بھی پل میرے سامنے موجود ہونے والی تھی۔ میں درخت کے پاس ہی ہوشیار اور چوکنا ہو کر بیٹھ گیا کیونکہ کسی بھی لمحے سانوری آ کر مجھ پر اچانک حملہ کر سکتی تھی۔ میں درخت سے پشت لگائے اپنے اردگرد کے ماحول کا جائزہ لے رہا تھا۔

جنگل نہایت ہی گھنا تھا اور رات کی تاریکی اس پر مزید دہشت طاری کر رہی تھی۔ چاند کی روشنی اس جگہ اتنی ہی پہنچ رہی تھی کہ اس سے آس پاس کے درخت صاف دکھائی دے رہے تھے۔ ابھی میں یہ سب دیکھ ہی رہا تھا کہ ایک بھاری سی چیز میرے بالکل سامنے دھڑام سے آ گری۔ میں ایک دم سے چونک گیا۔ اب جو میری آنکھوں نے دیکھا، میرے دل و دماغ کو ہلا کر رکھ دیا۔ میں نے اپنی زندگی میں کبھی بھی ایسا روح فرسا منظر نہیں دیکھا تھا۔

اسی مہربان عورت کی لاش میرے سامنے انتہائی بھیانک حالت میں پڑی تھی۔ جس کا سر کاٹ دیا گیا تھا اور گردن سے تازہ تازہ خون نکل کر زمین پر گر رہا تھا۔ جیسے ابھی ابھی اس کا سر قلم کیا گیا ہو۔ مگر اس کے جسم میں کوئی حرکت نہیں ہو رہی تھی۔ وہ لاش بے حس و حرکت پڑی میرے دل کو دہلاتی جا رہی تھی۔ میں نے اسی وقت اپنی نظریں اس پر سے ہٹا لیں۔

اسی وقت سانوری کے بھیانک قہقہوں کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ میں فوراً اٹھ بیٹھا۔ میں نے دیکھا سانوری سامنے سے فلک شگاف قہقہے لگاتی میری طرف بڑھتی چلی آ رہی ہے۔ میں نے دیکھا اس نے بائیں ہاتھ میں کچھ چیز پکڑی ہوئی ہے اور اس چیز کو ہلاتی اور گول گھماتی ہوئی اپنی کامیابی کے جشن سے سرشار میری طرف چلی آ رہی ہے۔

اب وقت آ گیا تھا کہ میں اپنے تمام تر خوف کو دور بھگاتے ہوئے اور اپنی ہمت کو مجتمع کرتے ہوئے

سانوری کا خاتمہ کر دوں۔ اس لئے میں اپنے دل پر قابو پاتے ہوئے اس لاش کو پھلانگ کر تھوڑا آگے بڑھا اور اپنا خنجر والا ہاتھ پیچھے کر لیا تا کہ سانوری کی اس پر نظر نہ پڑ جائے۔ وہ بھیانک قہقہے لگاتی میرے قریب سے قریب تر آتی جا رہی تھی۔ جب وہ قریب آئی تو میں نے دیکھا اس کے ہاتھ میں اسی عورت کا سر تھا جسے اس نے بالوں سے پکڑا ہوا تھا اور اس کے سر سے خون ٹپک ٹپک کر زمین کو سرخ کرتا جا رہا تھا۔

میں نے اپنے دل کی دھڑکنوں پر قابو پایا اور اسی جگہ کھڑا رہا۔ سانوری مجھ سے چار فٹ کے فاصلے پر آ کر رک گئی۔ ''تمہیں جانتی تھی یہ عورت میری طاقت کو، تم دیکھو میں نے اس کا کیا حال کر دیا۔'' اس نے تکبرانہ لہجے میں کہا اور اس سر کو گول گھمایا اور اپنے ہاتھ سے آزاد کر دیا، تب وہ ہوا میں اڑتا ہوا ایک درخت سے ٹکرایا اور اس سر کے بال درخت کی شاخ سے الجھتے گئے اور سر لٹکتا رہ گیا۔

''جو مجھ سے مقابلہ کرے گا یہی حال ہوگا اس کا۔ اب تم بھی چپ چاپ اپنے آپ کو میرے حوالے کر دو۔ میری بے قراری کو مزید طول نہ دو۔ اگر یہ عورت ہمارے بیچ میں نہ آتی تو اس وقت تک میری شادی بھی ہو چکی ہوتی۔ اب تم مکمل طور پر میرے قبضے میں ہو۔ اب تو تمہاری مدد کرنے کے لئے کوئی نہیں آئے گا، کوئی نہیں بچائے گا تمہیں ..... آ جاؤ...... میرے پاس۔ آ جاؤ تا کہ ہم پھر سے حسین و جوان ہو کر اپنی زندگی کو ہنسی خوشی نئے سرے سے آغاز کریں۔'' اس نے اپنی لرزتی آواز میں اپنے چہرے کو مزید خوفناک بناتے ہوئے کہا۔

''سانوری آؤ! ختم کر دو مجھے، میں بھی بھاگ بھاگ کر تھک چکا ہوں۔ اگر میری جان جانے سے تمہارا بھلا ہوتا ہے، تمہیں خوشیاں ملتی ہیں تو آ جاؤ مجھے بھی مار ڈالو۔ ویسے بھی اب میں یہاں سے نکل نہیں سکتا۔ لہٰذا میں نے سوچ لیا ہے کہ اپنے آپ کو چپ چاپ تمہارے حوالے کر دوں۔'' میں نے اپنے دل کو مضبوط کرتے ہوئے یہ باتیں کہہ ڈالیں جس سے اس کے چہرے پر ایک مکروہ فاتحانہ مسکراہٹ ابھری اور وہ خراماں خراماں میری طرف بڑھنے لگی۔

میں نے اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے خنجر پر گرفت مضبوط کر لی۔ میرا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ نجانے اگلے پل کیا ہونے والا تھا۔

وہ میرے بالکل نزدیک آ کر رک گئی اور ایک فاتحانہ فلک شگاف قہقہہ لگایا اور مجھے شانوں سے پکڑ لیا۔ میں نے اس کے دائیں ہاتھ پر وہ نشان تلاش کیا جو جلد ہی مجھے نظر آ گیا، وہ واقعی میں تکونی شکل کا سیاہ نشان تھا اور صاف طور پر ابھرا ہوا تھا۔

''صرف آخری شکار...... اس کے بعد میں حسین و جوان ہو جاؤں گی۔'' اس نے خوشی سے چلاتے ہوئے کہا اور قہقہے لگانے لگی۔

میری نظریں اس نشان پر ہی گڑی ہوئی تھیں۔ میں نے اپنا ہاتھ پیچھے سے باہر نکالا۔ میری دھڑکنیں بے ترتیب ہو کر عجیب ہو رہی تھیں اور میرے پورے کپڑے پسینے میں بھیگ چکے تھے۔

سانوری نے اپنے بھیانک قہقہوں کی آواز بند کی اور میرے جسم کو ایک جھٹکا دیا اور جیسے ہی میری گردن میں اپنے دانت گاڑنے چاہے۔ میں نے اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے اس خنجر سے اس سیاہ نشان پر ایک بھرپور وار کر دیا۔ جس سے اسے ایک زبردست جھٹکا لگا اور وہ چیختے ہوئے کئی فٹ دور جا گری اور بری طرح تڑپنے لگی۔ میں نے دیکھا اس کے پورے ہاتھ میں خنجر گھونپنے سے آگ لگ گئی تھی۔ وہ تڑپتے ہوئے اپنے بائیں ہاتھ کو خنجر تک لے جاتی مگر اسی لمحے اسے جھٹکے سے پیچھے ہٹا لیتی۔

''تت...... تم نے مجھے دھک..... دھوکہ دیا مر...... مار ڈالا مجھے...... مم...... میں تمہیں...... نن...... نہیں چھوڑوں گی۔'' اس نے تکلیف سے کراہتے ہوئے ٹوٹے لفظوں میں کہا اور اٹھنے لگی۔ مگر درد کی شدت سے وہ دوبارہ گر پڑی۔ آہستہ آہستہ اس کے پورے جسم میں

آگ لگتی جا رہی تھی، درد کی شدت سے اس کے منہ سے نکلنے والی دردناک آواز سے پورا جنگل گونج رہا تھا۔ اس آگ نے اس کے پورے جسم کو جھلسا دیا، آہستہ آہستہ اس کی بھیانک آواز میں کمی آتی گئی اور آخرکار اس کی آواز بند ہوگئی، اس کا جسم ساکت ہوگیا اور رفتہ رفتہ آگ بھی کم سے کم تر ہوکر بجھ گئی۔ اب وہاں سیاہ رنگ کی راکھ پڑی ہوئی تھی۔ اچانک اس راکھ میں حرکت ہوئی اور وہ بھنور کی طرح گول گھومتی ہوئی آسمانوں کی طرف پرواز کرگئی۔

☆......☆......☆

میری آنکھ اچانک کھل گئی۔ میں نے اپنے اردگرد دیکھا۔ میں اپنے کمرے میں بیڈ پر دراز تھا اور مجھے ایسا ہی محسوس ہو رہا تھا جیسے میں ابھی ابھی گہری نیند سے بیدار ہوا ہوں۔ ''تو کیا۔ یہ سب خواب تھا؟'' میں نے خودکلامی کی۔

میری نظر اپنے کپڑوں پر پڑی میرا پورا وجود پسینے میں نہایا ہوا تھا۔ کمرے میں تیز ہوائیں چل رہی تھیں۔ میں نے دیکھا کمرے کی کھڑکی کھلی ہوئی تھی اور اس کے سامنے رائٹنگ ٹیبل پر پڑی میری ادھوری کہانی۔ ''سالوری'' کے صفحات اس کھڑکی سے آتی تیز ہواؤں کی وجہ سے پورے کمرے میں پھیل چکے تھے۔ میری آنکھیں تو کھل گئی تھیں مگر میرا ذہن ابھی بھی بیدار نہیں ہوا تھا۔ مجھے اب بھی ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ میں اسی جنگل میں کھڑا ہوں اور سالوری کے بھیانک قہقہے اب بھی میری سماعت سے ٹکرا رہے ہیں۔ مجھے بالکل محسوس نہیں ہو رہا تھا کہ میں نے بھیانک خواب دیکھا ہے بلکہ یوں لگ رہا تھا کہ وہ سب کچھ حقیقت تھا۔

سالوری کا خاتمہ کرنے کے بعد اور اپنی دنیا میں واپس پہنچانے کے بعد میرے اوپر نیند کا غلبہ طاری کردیا گیا ہے۔ خیر جو کچھ ہوا، اچھا یا برا، وہ ہوچکا تھا، اب میں اپنی دنیا میں تھا۔ وہ خواب تھا یا پھر حقیقت، میں اس کے گرداب سے نکل کر صحیح سلامت اپنے کمرے میں موجود تھا۔

میں نے اپنے دماغ کو موجودہ حالات سے واقف کرایا، جلدی سے اٹھا اور کھڑکی بند کردی، پھر پورے کمرے میں پھیلے صفحات سمیٹنے لگا۔ میں ایک ایک کرکے سارے صفحے اٹھا چکا تھا۔ بس تھوڑے سے ہی رہ گئے تھے جنہیں میں جلدی جلدی اٹھا رہا تھا۔ تب میری نظر ایک صفحہ کے نیچے پڑی پائل پر ٹھہر گئی جس نے مجھے چونکا کر رکھ دیا۔ میں نے جلدی سے وہ پائل اٹھائی اور اسے الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔

''یہ...... یہ تو ہوبہو وہی پائل ہے جو میں نے خواب میں سالوری کو پہنے دیکھا تھا۔'' میں نے حیرت زدہ لہجے میں خودکلامی کی۔

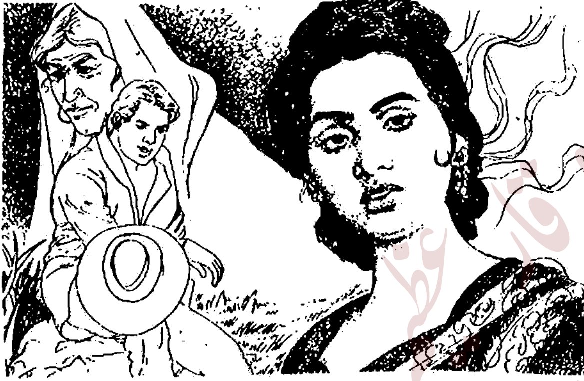
اچانک کمرے میں ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا۔ میری نظریں ازخود اوپر یہ دیکھنے کے لئے کہ میں نے تو کھڑکی بند کردی تھی پھر یہ ہوا کہ جھونکا کیونکر اور کیسے آیا؟ تب ہی مجھے کھڑکی کے پردے کے پیچھے کوئی سفید لباس میں ملبوس نظر آیا، اب میری تمام تر توجہ وہیں پر مرکوز ہوگئی۔

میرے دیکھتے ہی دیکھتے وہ وجود پردے سے باہر نکل آیا۔ اسے دیکھ کر میرے دماغ میں جھماکے سے ہونے لگے۔ میرا دل بری طرح دھڑکنے لگا اور میری آنکھیں حیرت سے پھیلتی چلی گئیں۔ سفید لباس میں ملبوس وہی عورت تھی۔ جس نے مجھے سالوری کو مارنے کے لئے خنجر دیا تھا اور پھر وہ سالوری کے ہاتھوں بھیانک موت مری تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ دھیمے انداز میں مسکرائی جیسے میرا شکریہ ادا کر رہی ہو۔

اچانک کمرے میں ایک بار پھر ہوا کا ایک زبردست جھونکا آیا اس کے ساتھ ہی وہ میری نظروں سے اوجھل ہوگئی، اب میری نظر اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی پائل پر پڑی تو وہ پائل بھی میرے ہاتھوں سے غائب ہوچکی تھی۔

آس کے بندھن

زرینہ قادری



پوری تحریر پڑھ لینے کے بعد میں سنگ مرمر کا مجسمہ بن گئی۔ میں نے اپنا دل بجھتا ہوا محسوس کیا۔

''**آپ** تو خاموش ہی رہیں جی، بہن میری ہے، مذاق بنالیا ہے ہماری غیرت کا۔ رسوائی نہ ہوگی برادری والوں میں اللہ سے توبہ۔ کیا سوچیں گے لوگ باگ...... کیا ہماری بچی پر انگلیاں نہیں اٹھیں گی۔ واہ جی واہ۔ آپا نے تو میری بچی کو راستے کا پتھر سمجھ لیا ہے۔''

''دھیرج سے کام لو بیگم، ہم لڑکی والے ہیں، کر بھی کیا سکتے ہیں۔ منگنی ٹوٹتی ہے تو ٹوٹنے دو۔ ہماری بچی ماشاء اللہ لاکھوں میں ایک ہے۔ ابھی تو وہ پڑھ رہی ہے۔ پڑھنے دو اسے۔ جب وقت آئے گا تو دیکھا جائے گا۔''

''بھاڑ میں گیا جی وقت۔ میں آج ہی کراچی جاکر آپا سے دوٹوک بات کروں گی۔''

''نہیں بیگم......'' شجاعت بیگ کے لہجے میں ترشی آگئی۔ ''تم کراچی نہیں جاؤ گی۔ یہ میرا حکم ہے''

''آپ کا حکم سر آنکھوں پر......'' عفت بیگم کچھ نرم پڑتے ہوئے بولیں مگر ان کے تیور بگڑے ہی رہے۔ ''ٹھیک ہے، میں کراچی نہیں جا رہی۔ یہ بھی تو سوچیں کہ الفت کو منگنی ٹوٹنے کی اطلاع کیونکر دیں۔ وہ بہت ہی غیور لڑکی ہے اس نے میرا دودھ پیا ہے اس کی رگوں میں آپ کا خون دوڑ رہا ہے۔ کیسے برداشت کرے گی اس المناک اطلاع کو۔''

''آسان سی بات ہے۔ تمہاری آپا کا خط اس کی

تحمل پر رکھ دو۔ مجھے میرے خون پر بڑا ناز ہے۔ الفت ایک حوصلہ مند لڑکی ہے وہ اپنے مستقبل کا فیصلہ خود کرے گی۔'' شجاعت بیگ آخری بات کہہ کر خاموش ہو گئے۔ چند لمحے کچھ سوچتے رہنے کے بعد عفت بیگم خط پکڑے میرے کمرے میں داخل ہو گئیں۔

چند ہی منٹ گزر پائے تھے کہ میں بھی پہنچ گئی والدین کو سلام کیا اور اپنے کمرے میں داخل ہو گئی۔ کتابیں میز پر رکھتے ہی خط دیکھا۔ پرچہ نکالا اور پڑھنا شروع کر دیا۔

پوری تحریر پڑھ لینے کے بعد میں سنگ مرمر کا مجسمہ بن گئی۔ میں نے اپنا دل بجھتا ہوا محسوس کیا۔ خالہ جان کے یہ الفاظ کہ ''عقیل شادی پر رضامند نہیں ہے لہٰذا بچپن کی منگنی کو منسوخ سمجھا جائے۔'' میرے ذہن پر انگارے سے دوڑنے لگے تھے لیکن میری یہ کیفیت عارضی ثابت ہوئی گو کہ دل خون کے آنسو رونا چاہتا تھا لیکن بڑی ہی ہوئی خود اعتمادی نے مجھے پرسکون کر دیا۔ میں صرف چند لمحوں میں ایک فیصلے پر پہنچتے ہوئے والدین کے سامنے پہنچی۔

''ہم...... میں جانتا ہوں، بیٹی تم کیا کہنا چاہتی ہو۔ ہم سے زیادہ تمہارے دکھ اور کون محسوس کر سکے گا۔''

''ابو'' میں مسکراتے ہوئے ابو کے قریب بیٹھ گئی۔

''آپ نہ جانے کیا سوچ رہے ہیں۔ میں تو صرف یہ جاننا چاہوں گی کہ آپ دونوں اداس کیوں ہیں۔''

''بیٹی کیا تم نے اپنی خالہ کا خط نہیں پڑھا۔''

''اوہ...... تو گویا آپ میری منگنی ٹوٹنے کے صدمے سے دوچار ہیں۔''

''تو...... تو کیا تمہیں اپنی...... اپنی منگنی ٹوٹنے کا کوئی دکھ نہیں......'' امی مجھے حیرت سے تکتے ہوئے بولیں۔

''نہیں بیگم......'' ابو فرط مسرت سے بے قابو ہو کر فوراً بول اٹھے۔ ''میری بیٹی اس قدر بزدل نہیں کہ کزن کے جاہلانہ فیصلے پر بھڑک اٹھے۔ میں تو یہ کہوں گا کہ والدین کو اپنی اولاد کی تقدیر کا فیصلہ کرنے میں جلد بازی کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہئے۔'' ابو مجھے سینے سے لگاتے ہوئے بولے۔ ''مجھے احساس ہے کہ منگنی ٹوٹنے کی اطلاع ہمارے لئے کسی سانحے سے کم نہیں ہے تاہم روگ لگانے کی ضرورت بھی نہیں ہے اللہ جو کرتا ہے اس میں اس کے بندے کی بہتری ہی ہوتی ہے۔''

''امی......'' ابو کے قریب سے اٹھ کر میں امی سے لپٹ گئی۔ ''ابو ٹھیک ہی تو کہہ رہے ہیں آپ دونوں ہنستے مسکراتے رہیں ہونی تو ہو کر رہتی ہے۔'' غرض یہ کہ میں نے طرح طرح کی مثالیں دے کر دونوں کو ہر طرح سے مطمئن کر دیا رات میں اپنے بستر پر لیٹتے ہی میرے ذہن پر ایک طوفان سا اٹھ کھڑا ہوا بچپن کا زمانہ کسی فلم کی طرح میرے ذہن پر لہرانے لگا۔

میں اور عقیل ایک ساتھ پڑھے کھیلے تھے۔ دریا کنارے بیٹھ کر ہم بچکانہ انداز میں بہترین مستقبل کے پروگرام بناتے تھے عقیل مجھ سے بہت محبت کرتا تھا اس کی صرف ایک عادت مجھے کھلتی تھی وہ یہ کہ میں جو بھی گھروندا بناتی، عقیل اسے ڈھا دیا کرتا تھا اس کی وہ فطری عادت آج جوانی میں اپنا اثر دکھا گئی۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ ایک دن عقیل میرے ارمانوں کا محل بھی ڈھا دے گا۔

''آہ! عقیل یہ تم نے کیا کیا......'' سسکتے لہجے میں کہتے ہوئے میں بے اختیار رو پڑی۔

☆......☆......☆

''الفت...... اری الفت...... یہ کیسی رونی شکل بنا رکھی ہے'' یہ آواز میری دوست رضیہ کی تھی اگر وہ مجھے مخاطب نہ کرتی تو شاید میں کیاریوں میں کھلے پھولوں ہی کو تکتی رہتی۔

''آں......'' میں چونکی ''کک...... کچھ نہیں رضیہ...... یونہی ذرا سر میں درد ہے۔''

''غلط...... سر ہی میں درد ہوتا تب بھی مجھ سے باتیں کئے بغیر تمہیں چین نہ ملتا۔ کالج بھی دیر میں پہنچی ہو اور سر کو سلام بھی نہ کیا کچھ تو ہے۔ دیکھو! میری طرف دیکھو۔ اگر تمہارے ذہن پر کوئی وزن ہے تو اسے اتار پھینکو۔ مجھے بتاؤ کہ آخر تم اتنی اداس کیوں ہو......''

میں نے اداس نظریں اٹھائیں اور اپنی بہت ہی عزیز سہیلی کو دیکھا۔ ایک ہمدرد کو قریب پا کر میں نے ایک آہ سرد بھری اور پھر ضبط کا وہ بند میرے آنسوؤں کے ذریعے ٹوٹ گیا۔ جسے میں نے محض ابو اور امی کا حوصلہ بڑھانے کے لئے جوڑا ہوا تھا۔ ''الفت......'' رضیہ نے مجھے لپٹا لیا۔ ''تم...... تم رو رہی ہو! خدارا بتاؤ۔ بتاؤ مجھے آخر معاملہ کیا ہے......''

میں نے دوپٹے کے پلو سے اپنے آنسو پونچھے اور کتاب سے خط نکال کر رضیہ کو تھما دیا پورے کالج میں ہماری دوستی چودھویں کے چاند کی روشنی کی طرح مانی جاتی تھی۔ رضیہ نے عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھا اور پھر خط پڑھنے لگی۔

''ہوں...... تو یہ بات ہے۔ تمہارا چہرہ اس بات کی غمازی کر رہا ہے کہ تم عقیل کو دل کی گہرائی سے چاہتی ہو۔ ارے دفعان کرو عقیل کو۔ تم وہ سدا بہار پھول ہو جس کے گرد کئی بھنورے بھنبھناتے ہوئے پھریں گے۔''

''نہیں رضیہ...... ایسی باتیں نہ کرو۔ عورت اپنی زندگی میں صرف ایک بار ایک ہی کو چاہتی ہے۔ مم...... میرا آغاز بھی عقیل اور اختتام بھی عقیل ہے میں یہ صدمہ برداشت بھی کر لوں گی لیکن میرے ابو امی اس قدر حساس ہیں کہ وہ اندر ہی اندر گھٹ کر مر جائیں گے۔''

''ہوں۔ تو پھر عورت سے شیرنی بن جاؤ۔ اس عزم کے ساتھ میدان عمل میں کود پڑ کر اپنا حق چھین لو۔ عقیل تمہارا منگیتر ہے۔ تمہیں یہ حق حاصل ہے کہ اسے جائز اور باوقار طریقے سے حاصل کرو۔''

''لل...... لیکن کیسے۔ کیا کر سکتی ہوں میں......'' میں روہانسی آواز میں بولی۔

''اری پگلی جو تم کر سکتی ہو وہ انکل اور آنٹی بھی نہیں کر سکتے۔ عجیب اتفاق ہے میرے کزن کی سالگرہ کی تقریب کا ہماری لئے بلاوا ابھی آ گیا ہے یوں تو میں تقریب میں شرکت کے لئے کل جانے والی تھی لیکن اب آج ہی جاؤں گی اور تم میرے ساتھ چلو گی......''

رہنے بھی دو رضیہ۔ کیا ابو اور امی مجھے جانے کی اجازت دیں گے۔''

''ضرور دیں گے۔ یہ تم مجھ پر چھوڑ دو۔ آخر مجھے بھی تو وہ اپنی بیٹی ہی سمجھتے ہیں چلو اٹھو، پیریڈ شروع ہوا چاہتا ہے بالکل فریش ہو جاؤ۔ کراچی پہنچ کر تمہیں کیا کرنا ہے یہ تمہیں میں راستے میں سمجھا دوں گی۔'' رضیہ کے الفاظ میں کچھ ایسا ٹھہراؤ تھا کہ میرا ذہن ہلکا پھلکا ہو گیا اور ڈوبی ہوئی امنگیں پھر سے ابھر کر مچلنے لگی تھیں۔

رضیہ کی ذرا سی کوشش سے مجھے اجازت مل گئی اور ہم مختصر سے سامان کے ساتھ بذریعہ بس تین گھنٹے سے پہلے ہی کراچی پہنچ گئیں۔ بس نے ہمیں گرومندر کے اسٹاپ پر اتار دیا تھا اور ہم سڑک پر بہتے ہوئے ٹریفک کے سیلاب کو حسرت بھری نظروں سے دیکھتی رہیں۔ گو کہ ہمیں زیادہ دور نہیں جانا تھا، نہ ہی ہمارے پاس کوئی وزنی سامان تھا کہ ہمیں ٹیکسی رکشہ کی ضرورت پڑتی۔ صرف دو طرفہ ٹریفک کے سیلاب سے گزرنا تھا اور سامنے ہی والی سڑک ہمیں سولجر بازار میں واقع رضیہ کے بھائی کے گھر پہنچا دیتی۔

موسم بھی بہت ہی پیارا تھا۔ آسمان کو مٹیالے بادلوں نے گھیرا ہوا تھا ہواؤں کی سرد خنکی بتا رہی تھی کہ بارش ہوگی۔ جو کچھ بھی تھا یہاں بھی رضیہ کی بے باکی کام آ گئی۔ ایک شریف النفس ٹریفک سارجنٹ نے بڑی آسانی سے سڑک پار کروا دی۔ ٹھیک اسی لمحے بادل گرج اٹھے اور ہلکی ہلکی بارش شروع ہو گئی لیکن تیز ہونے سے پہلے ہی ہم ایک قریبی بنگلے کے گیٹ پر پہنچ گئیں۔ رضیہ نے کال بیل پر انگلی کا دباؤ ڈالا تو چند ہی لمحوں بعد ایک خوبصورت سی دبلی پتلی لڑکی نے دروازہ کھولا۔

''ارے رضیہ تم......'' وہ رضیہ سے لپٹ پڑی جب رضیہ نے میرا تعارف کروایا تو وہ مجھ سے بھی والہانہ انداز میں لپٹ گئی۔ چند ہی لمحوں بعد ہم شاندار

سے ڈرائنگ روم میں بیٹھی ہوئی تھیں بیرونی طور پر بادلوں کے باعث جو سرمئی اندھیرا پھیلا ہوا تھا وہ ڈرائنگ روم کی روشنی سے بہت ہی سرور آور ثابت ہوا۔

''بھائی جان کہاں ہیں بھابی.....'' رضیہ تولیے سے اپنا چہرہ سہلاتے ہوئے بولی۔ ایک تولیہ میرے پاس بھی تھا۔

''میں یہاں ہوں سرخ مرچ.....'' ایک مردانہ آواز سن کر ہم تینوں آواز کی طرف متوجہ ہو گئیں۔ وہ ایک خوبصورت سا لمبا تڑنگا جوان تھا جو اپنی قمیض کے بٹن لگاتے ہوئے دائیں جانب کے کمرے سے برآمد ہوا تھا۔

☆......☆......☆

ڈنر پر رضیہ نے بھائی صاحب اور بھابی کو میرے متعلق سب کچھ بتا دیا تھا انہوں نے میرا حوصلہ بڑھانے کے لئے کسی قسم کے دکھ کا اظہار نہیں کیا تھا بلکہ رضیہ کے مرتب کردہ نفسیاتی پروگرام کو سراہتے ہوئے مجھے میری کامیابی کا یقین دلایا اور دعا بھی کی۔

صبح میں نے رضیہ کے مرتب کردہ پروگرام پر عمل شروع کر دیا۔ رکشہ پکڑا اور دس منٹ کے اندر ہی جمشید روڈ نمبر 2 کے ایک بنگلے میں پہنچ گئی۔ پھاٹک کھلا تھا دو ملازم بھی اپنے اپنے کام میں مصروف تھے۔ میں ان پر اچٹتی سی نظر ڈال کر دھڑکتے دل سے اندرونی حصے میں داخل ہو گئی۔ مجھے صرف یہ خدشہ لاحق تھا کہ کہیں عقیل سے ملاقات نہ ہو جائے لیکن ایسا نہیں ہوا۔

مجھے اس طرح غیر متوقع طور پر اپنے سامنے پا کر خالہ جان تصویر حیرت بن گئیں۔ ''السلام علیکم خالہ جان۔'' میں نے جب مسکراتے ہوئے سلام کیا تو وہ چونک پڑیں اور لپک کر مجھے اپنے سینے سے لگا کر خوب پیار کیا، دعائیں دیں اور صوفے پر بٹھاتے ہوئے میرے ساتھ بیٹھ گئیں۔

''تت..... تمہیں اچانک سامنے پا کر مجھے اپنی بصارت پر یقین نہیں آ رہا۔ خیر سناؤ تمہاری امی ابو کیسے ہیں اور..... اور تمہارا سامان کہاں ہے۔''

''وہ خیریت ہی سے ہیں خالہ جان۔ کیا خالو گھر پر نہیں ہیں.....'' میں ان کے سوال کا آخری حصہ گول کرتی ہوئی بولی۔

''نہیں ہیں بیٹا وہ تو صبح ساڑھے آٹھ بجے ہی دفتر چلے جاتے ہیں۔ کب پہنچی ہو کراچی اور..... اور تمہارا سامان.....''

''الجھن نہ کھایئے خالہ جان۔ میں گزشتہ شام اپنی دوست رضیہ کے ساتھ اس وقت پہنچی ہوں جب ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی میرا بریف کیس رضیہ کے بھائی کے گھر میں رکھا ہے۔''

''کیا کہہ رہی ہو الفت۔ کل سے آئی ہو اور اپنا گھر چھوڑ کر غیروں کے گھر جا ٹھہری ہو۔''

''اس میں تعجب کی کیا بات ہے خالہ جان۔ آپ نے..... آپ نے تو اپنائیت کے رشتے ہی توڑ دیے ہیں۔'' میں نے ذرا سی جھجک کے بعد کہہ ہی دیا۔

''الفت..... میری بیٹی طنز کے نشتر نہ چلاؤ رشتہ میں نے نہیں بلکہ موذی کانٹے عقیل نے توڑا ہے یقین جانو بیٹی ہم دونوں میاں بیوی عقیل سے بولتے بھی نہیں ہیں اجنبیوں کی طرح گھر میں آتا ہے، بھکاریوں کی طرح کھاتا ہے اور اجنبیوں کی طرح چلا جاتا ہے۔

یہ بیماری ہاکی اس کی رگ رگ میں سما گئی ہے آٹوگراف لینے والی لڑکیوں نے اس کے دماغ میں بھس بھر دیا ہے راجہ اندر سمجھنے لگا ہے خود کو۔ ہمارے لاکھ سمجھانے پر بھی وہ بچپن کا رشتہ ماننے پر تیار نہیں ہوا کاش وہ تمہیں ایک بار دیکھ لینے کے بعد کوئی فیصلہ کرتا۔ بچپن بچپن ہوتا ہے اور جوانی جوانی ہوتی ہے۔ بہت دردناک موضوع ہے۔ یہ کوئی اور بات کرو.....'' خالہ جان کے چہرے پر حقیقی کرب محسوس کر کے میں نے حوصلہ پکڑا۔

''خالہ جان کیا آپ منگنی توڑنے کے خلاف تھیں۔''

''تمہارے خالو ابا بھی منگنی توڑنے کے حق میں نہیں تھے نہ ہیں۔ کیا ہم بدنصیب ہیں کہ اپنی چاند سی الفت کو چھوڑ دیں۔''

میری امنگ بھر آئی میرے اعتماد میں ایک ٹھہراؤ سا پیدا ہو گیا فرط مسرت سے میری سانسیں چڑھنے لگیں۔

''تو پھر میرا پروگرام سن لیں خالہ جان۔'' میں اپنی اندرونی مسرت کو دباتے ہوئے بولی۔ ''بگڑی بنانے والا اللہ ہے۔ اللہ نے چاہا تو آس کے بندھن جڑے ہی رہیں گے۔'' پرعزم لہجے میں کہتے ہوئے میں نے اپنے پروگرام سے خالہ کو آگاہ کرنا شروع کر دیا۔

''میری بچی۔'' خالہ جان مجھ سے لپٹ پڑیں۔ میری پیشانی چومنے لگیں۔ ''تم..... تم پالو گی..... پالو گی عقیل کو الفت، میری دعائیں..... میرا تعاون تمہارے ساتھ رہے گا۔ اللہ کرے کہ آس کے بندھن جڑے ہی رہیں۔ یہ..... یہ دو باعزت خاندانوں کا بندھن ہے۔ اللہ ہمیشہ قائم و دائم رکھے۔''

☆......☆......☆

نیشنل اسٹیڈیم انسانوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ عورتیں، مرد، بچے اور بوڑھے میچ شروع ہونے سے پہلے ہی اسٹیڈیم میں پہنچ چکے تھے۔ اس ہاکی میچ کی بڑی دھوم تھی۔ پاکستانی کھلاڑی اور مغربی جرمنی فائنل کھیلنے والے تھے۔ عقیل بھی قومی ٹیم میں اپنی بہترین کارکردگی کا مظاہرہ کرنے والا تھا۔ یہی وجہ تھی میں نے ہزار کوششوں کے بعد رضیہ سمیت پہلی نشست حاصل کی تھی۔

پانچ بجے میچ شروع ہو گیا لیکن مجھے میچ سے کوئی دلچسپی نہیں تھی میری نظریں تو دراز قد اور مردانہ حسن وجاہت کے شاہکار عقیل پر جم کر رہ گئی تھیں۔ خوب نکھار دیا تھا جوانی نے عقیل کو رضیہ بھی عش عش کر اٹھی۔ میری پیاسی نظروں کی تو پیاس ہی نہیں بجھ رہی تھی میچ ختم ہو گیا قومی ٹیم پانچ گول سے جیت گئی۔ پہلا گول عقیل ہی کی اسٹک سے ہوا تھا۔ انٹرویل کے بعد دوسرا گول بھی عقیل نے کیا اور میچ ختم ہونے سے پہلے تیسرا گول بھی عقیل ہی سے ہوا۔ ہیرو کی حیثیت پا گیا عقیل جے جے کار ہو گئی اس کی۔ لڑکیوں کے غول نے عقیل کو گھیر لیا تھا۔

کیلیں دفنانے کے لئے

کم سے کم پندرہ روز کے لئے مکان کو بالکل خالی کر دیا جائے۔ پھر سات روز تک ہر روز سات سات بار اذانیں بعد نماز عشاء بلند آواز سے دی جائیں۔ پھر آٹھویں، نویں اور دسویں روز تینوں دن متواتر بلند آواز سے سورہ بقرہ (2) (زوال کے علاوہ) صبح سے شام تک کسی وقت بھی ہر روز ایک بار پڑھی جائے۔ اس کے بعد گھر کے تین کونوں میں تین کیلیں کم سے کم آدھ گز زمین میں گڑھا کر کے دفن کی جائیں۔ چوتھا کونہ اس لئے خالی چھوڑ دیں کہ جو بلائیں گھر پر ہوں ان کو بھاگنے اور فرار ہونے کا راستہ مل جائے۔ چوبیس گھنٹے کے بعد چوتھی کیل بھی دفن کر دی جائے۔ انشاء اللہ تعالیٰ وہ گھر ہمیشہ کے لئے ہر قسم کے خطرات جن و شیاطین و سحر اور آسیب سے پاک ہو جائے گا۔ نیا مکان بناتے وقت اس عمل کو ہرگز نہ بھولیں۔

''اٹھو الفت۔ یہی موقع ہے ضرب لگانے کا۔'' میری محویت کو رضیہ کی آواز نے توڑا۔ ''خبردار۔ بہکنا نہیں۔ لگا دو ایک کاری ضرب عقیل کی خوش فہمی پر۔'' میں پرعزم ہو کر اٹھی اور بدقت تمام راستہ بنا کر عقیل تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئی۔

''سنئے مسٹر۔'' عقیل کو مخاطب کرتے وقت مجھے اپنی تمام قوت گویائی مجتمع کرنی پڑی تھی میرے دل پر طوفان سا گردش لینے لگا تھا اگر رضیہ میرے شانہ بشانہ نہ ہوتی تو شاید میرا حوصلہ پست ہو جاتا عقیل چونک کر میری طرف متوجہ ہو گیا۔ کیا دے رہی ہیں یہ لڑکیاں آپ کو۔'' میں نے بات پوری کر دی۔ میں نے محسوس کیا کہ میری سراپا کا اچٹتا سا جائزہ لیتے ہی عقیل کی

آنکھوں میں چکا چوند سی پیدا ہوئی۔ اس کے لبوں پر دلفریب سی مسکراہٹ بکھری اور وہ دیگر لڑکیوں کو نظر انداز کر کے میرے سامنے جم گیا۔

”محترمہ یہ مجھے کچھ دے نہیں رہیں بلکہ آٹوگراف لے رہی ہیں میرے......“

”آٹوگراف۔“ میں طنزیہ بولی۔ ”ایسا کیا تیر مارلیا آپ نے۔ تین گول ہی تو کیے ہیں آپ نے۔ جبکہ آپ کا ایک منچو قسم کا ساتھی بھی دو گول کر چکا ہے......“

”کیا بک رہی ہو لڑکی۔ اگر میں...... میرا کھیل آپ کو پسند نہیں آیا تو کیا لینے آئی ہیں آپ میرے پاس۔“ عقیل اتنی ساری لڑکیوں کے درمیان اپنی ہتک پر چراغ پا ہو گیا۔

”میں تو آپ کے منچو ساتھی کی پیٹھ تھپکنے جا رہی تھی وہی میری نظروں میں قومی ہیرو ہے اپنا ڈیل ڈول دیکھئے اور اس غریب کا دیکھئے۔ تبھی ہیرو تو آپ تب کہلاتے جب پانچوں گول آپ نے کیے ہوتے۔“ کہنے کے بعد میں عقیل کو دم بخود چھوڑ کر بلاوجہ ہی دوسرے دبلے پتلے کھلاڑی کی طرف بڑھتی چلی گئی۔

”وہ مارا“ رضیہ میرا ہاتھ دباتے ہوئے بولی۔

”تڑپے گا۔ رات بھر بستر پر تڑپتا رہے گا تمہارا ایک ایک لفظ اس کی بڑھی ہوئی خود اعتمادی پر کاری ضرب لگاتا رہے گا۔“

”دوسرے روز صبح دس بجے ہی میں عقیل کے دفتر میں پہنچ گئی۔ اردلی نے مجھے روکنے کی ضرورت نہ بھی سمجھی۔ میں نے جان بوجھ کر خود کار دروازے کو آواز کے ساتھ کھولا۔

”تم......“ مجھے سامنے پا کر عقیل بوکھلا کر اٹھ کھڑا ہوا میں نے محسوس کیا کہ عقیل کی آنکھوں میں سرخی اور چہرے پر تھکاوٹ ہے۔ ”بلا اجازت کیسے آ گئیں......“

”ناراض نہ ہوئیے۔ بڑی مشکلوں کے بعد آپ کا پتہ معلوم کیا ہے میں دراصل اپنے کل کے رویے پر آپ سے معافی مانگنے آئی ہوں۔ پلیز عقیل صاحب معاف کر دیجئے۔“ قدرتی طور پر میرے لہجے میں معصومیت سما گئی تھی۔

”تت...... تشریف رکھئے۔“ عقیل کا چہرہ چاندنی کی طرح دمک گیا۔

”شکل وصورت اور حسن وجمال آپ کا ایسا ہے کہ آپ کو دل میں بسا لیا جائے لیکن باتیں ایسی کٹیلی کرتی ہیں کہ دل کرتا ہے کہ آپ کی چٹیا پکڑ کر سڑک کے کسی کھلے ہوئے مین ہول میں دھکیل دوں......“

”اوہ۔ تو گویا میں نے آپ کی تلاش میں اپنا وقت ہی ضائع کیا۔ لگتا ہے آپ نے مجھے معاف نہیں کیا۔“ میں اٹھتے ہوئے بولی حقیقت یہ تھی کہ میں عقیل کی نظروں کی تاب برداشت نہ کر پائی تھی۔ میرا دل دھک دھک کرنے لگا تھا۔ پندرہ برس بعد عقیل کو اپنے اتنے قریب پا کر میں بکھری جا رہی تھی۔

”بیٹھ جائیے آپ۔ میں نے آپ کو معاف کر دیا ہے۔ کیا پینا پسند کریں گی آپ۔“

”جو آپ پلانا چاہیں گے۔“ میں مسکراتے ہوئے بیٹھ گئی۔ ویسے بھی عقیل میرا آئیڈیل تھا میرے حسین سپنوں کی تعبیر تھا۔ اسے اپنی طرف مائل پا کر میں کوئی موقع گنوانا نہیں چاہتی تھی۔ میں مسلسل چالیس منٹ تک عقیل کے ساتھ رہی اس دوران ہمارے درمیان کافی سے زیادہ بے تکلفی ہو گئی۔ میرا نام سن کر عقیل چونکا بھی تھا لیکن شاید بہت جلد اس نے اپنے کسی خدشے کو ذہن سے جھٹک بھی دیا تھا اور جب میں رخصت ہونے لگی تو اس نے دوسرے روز کی ملاقات پر بے حد اصرار کیا اور میں نے مزار قائد کے پارک میں ملنے کا وعدہ کر لیا۔ میں نے ابو اور امی کو خط لکھ دیا تھا کہ رضیہ کی بھابی مجھے مزید روک رہی ہیں اور شاید مجھے چند روز مزید رکنا پڑے گا اور ان چند دنوں میں ہماری خوشگوار ملاقاتوں کا ایسا سلسلہ شروع ہوا کہ عقیل میری ایک لمحہ کی جدائی بھی برداشت نہ کر پاتا۔

☆......☆......☆

میرا مقصد حل ہو چکا تھا۔ ویسے بھی والدین سے

جدا ہوئے مجھے کئی روز گزر چکے تھے میری وجہ سے رضیہ بھی کالج سے غیر حاضر ہو چکی تھی۔ لہٰذا میں نے فیصلہ کر لیا کہ عقیل سے کل میری آخری ملاقات ہو گی وہ جو بچپن کی منگنی کو مذاق سمجھ کر توڑ چکا تھا کل سے جدائی کی آگ میں سلگتا رہے گا۔ تب اسے احساس ہو گا کہ خاندانی پرم پرا کیا ہوتی ہے۔

آخری ملاقات میں مجھے رضیہ اور بھابی نے اس قدر بنا سنوار دیا کہ عقیل مجھے مسحور ہو کر دیکھتا رہ گیا۔ میں اسے بالکل خوابوں کی شہزادی لگی۔ صرف اسی پر ہی کیا منحصر تھا، فریئر ہال کے اوپن ائیر سرسبز و شاداب پارک میں جتنے لوگ بھی تھے پلکیں جھپکائے بغیر مجھ ہی کو تکتے رہ گئے تھے۔

”عقیل صاحب! آج میں بہت جلدی میں ہوں چند روز سے آپ مجھ سے کچھ کہنا چاہ رہے تھے آج کہہ دیں۔“

عقیل میرا مقصد سمجھ نہ پایا اور تھوڑی سی ہچکچاہٹ کے بعد اپنے جذبات کو کھلی کتاب کی طرح میرے سامنے ظاہر کر دیا۔ ”الفت“ اپنے تمام عشقیہ یا وارفتگی والے جملے ادا کرنے کے بعد اس نے کہا۔ ”اس روز کی ملاقات اور پھر کئی کئی گھنٹوں کی جدائی نے مجھے اختلاج قلب میں مبتلا کر دیا ہے تم...... تم صرف ہاں کر دو تو میں جلد سے جلد تمہیں اپنی زندگی کا حصہ بنا سکتا ہوں میں...... میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں الفت۔“

میرا دل بلیوں اچھلنے لگا، میرے خون کا دورانیہ تیز ہونے لگا، میں نے بڑی مشکل سے خود کو سنبھالا اور...... ”عقیل صاحب! مجھے افسوس ہے کہ میں آپ سے شادی نہیں کر سکتی۔ میرے والدین نے بچپن ہی میں میری منگنی کر دی تھی۔“

میرے جواب نے عقیل کے سدا بہار چہرے کو خزاں رسیدہ کر دیا۔ اس کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں اور وہ صحرا میں بھٹکنے والے ہرن کی طرح ہانپنے لگا مجھ سے اس کی یہ حالت دیکھی نہیں جا رہی تھی۔ میں اس سے اپنی اور اپنے والدین کے دکھ واذیت کا انتقام تو لینا نہیں چاہ رہی تھی میں تو صرف پندرہ برس پرانے وہ بندھن، آس کے بندھن جوڑنے پہنچی تھی جنہیں عقیل نے سرد ہوا کے حقیر جھونکے کی طرح بکھر کر رکھ دیا تھا۔

”مم...... مگر الفت“ عقیل کے لہجے میں لرزش اور وجود پر بھونچال سا طاری ہو گیا تھا۔ ”بب...... بچپن تو نا...... نا سمجھی کا زمانہ ہوتا ہے۔“

”ہوا کرے عقیل۔ لیکن میرے ماں باپ تو نا سمجھ نہیں تھے ناں۔ ہر غیور اور شریف زادی کا ایمان ہونا چاہئے کہ والدین کے فیصلے پر سعادت مندی سے سر جھکا دے۔ نا سمجھی کا زمانہ تو جوانی ہے عقیل صاحب اور آپ نے یہ محاورہ سنا اور پڑھا ہو گا کہ جوانی اندھی ہوتی ہے، اندھے فیصلے کروا دیتی ہے۔“

”انکار نہ کرو الفت۔ میں...... میں مر جاؤں گا الفت۔ تمہاری جدائی مجھے مار ڈالے گی۔ میری منگنی بھی بچپن میں میری خالہ کی بیٹی سے ہوئی تھی اتفاق ہے کہ اس کا نام بھی الفت ہے لیکن...... وہ فیصلہ میرے والدین کا تھا میں...... میں اپنے مستقبل کا فیصلہ کرنے کے قابل تو اب ہوا ہوں۔ میں نے اپنی بچپن کی منگنی توڑ دی ہے۔“

”واہ عقیل صاحب واہ کس ڈھٹائی سے اپنے ظلم کا اظہار کر رہے ہیں آپ۔ کبھی آپ نے سوچا کہ...... آپ کے انکار نے آپ کی منگیتر کے دل ودماغ کے کتنے ٹکڑے کر دیئے ہوں گے، بولئے...... کبھی سوچا آپ نے کہ اس مظلوم لڑکی کے والدین کے خرمن حیات پر کتنی برقیں گری ہوں گی۔ کاش مجھے آپ کے کٹھور ہونے کا پہلے سے علم ہوتا۔ بہرحال آپ سے میری یہ آخری ملاقات ہے۔ کم از کم اپنے والدین کے اصول توڑنے کا میں تصور بھی نہیں کر سکتی۔“ ترش لہجے میں کہتے ہوئے میں لاپرواہی سے اٹھ کر بیرونی راستے کی طرف بڑھتی چلی گئی۔

☆......☆......☆

”الفت۔ میری بہن، میری بیٹی چپ ہو جاؤ۔ کیسا روگ لگا لیا ہے اپنی جوانی پر اٹھو، ذرا چل کر آئینے

میں اپنی صورت دیکھو۔ ہائے اللہ گلابی رنگت کو عنابی بنادیا ہے تم نے، روتے روتے اپنی آنکھیں سجادیں ہیں تم نے...... کامیاب ہونے کے باوجود بلک رہی ہو۔"

"بھابی" میں لپٹ پڑی رضیہ کی بھابی سے......

"عقیل میرا منگیتر ہے۔ وہ مجسم پتھر بنا بینچ پر بیٹھا مجھے ویران ویران نظروں سے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ میرے رویے نے، میرے الفاظ نے اسے مردہ بنا کر رکھ دیا تھا۔ وہ...... وہ مر جائے گا بھابی......"

"مریں اس کے دشمن۔ شانت ہو جاؤ میری بہن۔ تم نے کوئی جرم نہیں کیا۔ اینٹ کا جواب پتھر سے پتہ چل گیا ہوگا اسے کہ دل توڑ دینا کس قدر اذیت ناک عمل ہے۔ تم نے تو ٹوٹے بندھن جوڑے ہیں۔ اپنی اور اپنے والدین کی آس کے بندھن جوڑنے کی کوشش کی ہے۔"

"الفت۔ میری بہن......" بھابی جان میرا سر اپنی گود میں لیتے ہوئے بولی۔ "چند گھنٹے۔ صرف چند گھنٹے انتظار کرلو۔"

"چلی جانا بیٹی۔" ایک نسوانی آواز سن کر ہم سب آواز کی طرف متوجہ ہوگئے۔ وہ...... میری خالہ ماں ہی تھیں۔ "پہلے چل کر مردے کی جان تو ڈال دو۔" خالہ جان کو یوں اچانک سامنے پا کر جہاں میرا چہرہ خوش آئند تصور سے دمک اٹھا تھا وہیں خالہ جان کے چہرے پر کرب کے آثار محسوس کر کے میرا دل دھک سے ہو کر رہ گیا۔

"خالہ جان" میں سسکتی آواز میں چلاتی ہوئی اٹھی اور خالہ سے چمٹ گئی۔

"جیتی رہو بیٹی۔ عقیل کو زندہ دیکھنا چاہتی ہو تو چھوڑ دو اپنی ضد اور چلو میرے ساتھ وہ بے ہوش پڑا ہے۔ عالم مدہوشی میں اس کے لبوں پر صرف تمہارا نام مچل رہا ہے۔ کیا منزل پالینے کے باوجود اپنے قدموں کے نشانات مٹانا چاہتی ہوں۔"

"نن...... نہیں...... نہیں خالہ ماں ایسا نہ کہیے۔"

"جاؤ، میری پیاری بہن جاؤ۔" بھائی صاحب کی آنکھیں خوشی کے جذبات سے بھیگی ہوئی اور آواز میں لرزش تھی۔ بھابی اور رضیہ بھی مسرت کے آنسو سمیٹنے میں معروف تھیں۔ "مسیحا بن کر جاؤ اور تمام مسرتوں کو سمیٹ لو۔" میں خالہ ماں کے ساتھ چل دی۔ مجھے یقین تھا کہ بھائی، بھابی اور رضیہ بھی ہمارے تعاقب میں لگ جائیں گے۔

خالہ ماں کی کار بنگلے کے باہر ہی موجود تھی۔ کچھ دیر بعد جب میں خالہ ماں کے ساتھ عقیل کے کمرے میں پہنچی تو عقیل کو اپنے بیڈ پر بے سدھ پا کر خالو وغیرہ کی موجودگی کا احساس کیے بغیر یا انہیں سلام کیے بنا عقیل عقیل پکارتی مجنونانہ انداز میں عقیل پر جھک گئی۔

"عقیل م...... میں...... میں آگئی ہوں عقیل...... آنکھیں کھولیے۔ خدارا آنکھیں کھولیے۔ میں...... میں وہی کچھ کروں گی جو...... جو آپ کہیں گے۔"

"الفت" یک بیک عقیل نے آنکھیں کھول دیں اس کے لہجے میں ایک ایسا تابناک کرب تھا کہ میں تڑپ کر رہ گئی۔ "تم...... تم آگئیں الفت۔"

"ہاں...... ہاں عقیل میں...... میں لوٹ آئی ہوں۔" مجھ پر شادی مرگ کی سی کیفیت طاری تھی۔

"و...... وعدہ کرو...... م...... مجھے چھوڑ کر نہیں جاؤں گی۔"

"چپ بے شرم۔" خالو ابا عقیل کو پیار سے ڈانٹتے ہوئے بولے۔ "جانتے ہو الفت کون ہے...... یہ...... یہ نالائق تمہاری خالہ کی بیٹی اور تمہاری بچپن کی مانگ ہے۔"

"کیا" عقیل کا چہرہ فرط مسرت سے گلاب کی طرح کھل اٹھا۔

"ہاں بیٹا۔ یہ وہی الفت ہے جس سے تم نے تمام بندھن توڑ لئے تھے۔ اللہ کے کروڑہا احسان ہیں کہ الفت نے خود ہی اپنی ذہانت سے اپنی اور اپنے والدین کی آس کے بندھن ٹوٹنے نہیں دیئے۔"



اجنبی مہربان

شکیلہ اعظم



اس نے کنڈی گرادی اور دروازے کے دونوں پٹ کھول کرڈاکیا کے سامنے آ کھڑا ہوا۔

مصنف نے اپنا سر جھٹکا اور خود کو ہوش کی دنیا میں رکھنے کی بھرپور کوشش کی لیکن تمام تر کوششوں کے باوجود نیند کی دیوی اسے اپنی شفقت بھری گود میں لے چکی تھی اور قلم اس سے چھوٹ کر میز پر جا گرا تھا جس پر تازہ مسودے کے ہیپر پڑے تھے اور وہ کرسی سے ہی سر لگائے خراٹے لینے لگا تھا۔ نیند کو اس بات سے ہرگز غرض نہیں کہ آپ جو کام کررہے ہیں وہ آپ کی زندگی کے لئے کتنا ضروری ہے نیند تو ہمیشہ زوروں کی آتی ہے اور زور آور اپنا آپ منوانا جانتا ہے۔ اس نے بھی وہی کیا اب گردوپیش سے بے خبر ہو کر سو چکا تھا۔

وہ ایک مصنف تھا...... بہت کامیاب، نہیں بس اوسط درجے کا، گزر بسر کے لئے کہانیاں لکھتا اور جو تھوڑی بہت آمدنی ہوتی اس سے اپنا پیٹ پالتا۔ اپنا اس لئے کہ کسی اور کا پیٹ پالنا اس کے ذمے نہ تھا۔ وہ تنہا ہی تھا تنہا سے یہ مراد نہیں کہ آسمان سے گرا تھا بلکہ وہ بھی کسی والدین کی آنکھوں کا تارا تھا اور وہ بھی اکلوتا اب جبکہ اس کے والدین عدم آباد سدھار چکے تھے تو وہ دنیا میں تنہا ہی تھا۔ شادی اگرچہ اس نے کی تھی لیکن وہ کامیاب نہ ہو سکی تھی اور بیوی دو سال بعد ہی طلاق لے کر میکے جا بیٹھی تھی لیکن وہ دو سالوں میں اسے ایسا سبق سکھا گئی تھی کہ دوسری شادی تو دور کی بات وہ کسی عورت پر نظر التفات بھی ڈالنا پسند نہ کرتا تھا۔

وقت کا پہیہ گھومتا ہے اور کوئی اسے گھومنے سے نہیں روک سکتا۔ یہی وجہ تھی کہ وقت کے پہیے نے گھومتے گھومتے اسے زندگی کے چھیالیسویں سال پر لا پہنچایا تھا اور اب تو شادی کا سوچنا بھی درکنار تھا کیونکہ تنہا رہنے کی وجہ سے وہ اپنے آپ کو جوان نہ رکھ سکا تھا اور جتنا تھا اس سے دس سال زیادہ ہی دکھائی دیتا تھا لیکن اسے ان چیزوں سے غرض نہیں تھی وہ تو بس ان تعریفوں پر ہی اندر سے جوان ہو اٹھتا تھا جو کبھی کبھار خطوں کی محفل میں قارئین اس کی کر دیتے تھے۔ وہ کسی شاہکار کا خالق بننا چاہتا تھا جو اسے شہرت کی بلندیوں تک پہنچا دے۔ وہ سارا دن گھر میں بیٹھا چائے پیتا اور سگریٹیں پھونکتا ہوا نئے سے نیا پلان ترتیب دینے میں مشغول رہتا کہانی لکھنا اس کا مشغلہ تھا۔

آج سے کئی سال پہلے جب وہ اپنے باپ کی کمائی پر گزر بسر کرتا تھا لیکن اب کہانی لکھنا اس کی مجبوری بن چکا تھا کیونکہ آمدنی کا ذریعہ تو کوئی نہ کوئی چاہئے تھا سو وہ سارا دن گھر بیٹھا صفحے سیاہ کرتا رہتا جن کے جواب میں رسالے کا ایڈیٹر اسے ہفتے دو ہفتے کا خرچ بطور عنایت دے دیتا اور وہ اتنے میں ہی خوش رہتا۔ وہ ایسے لوگوں میں شامل تھا جو ترقی کے زیادہ خواہشمند نہیں ہوتے پوچھا کسی نے ”میاں جی کیسے ہو، گزر بسر کیسی ہے۔ بولے ٹھیک ہوں اور ویسا ہوں جیسا اس نے رکھا ہے۔“ اور یہ کبھی نہ سوچا کہ خود بھی اپنے آپ کو بہتر رکھا جاسکتا ہے۔

گھڑی مسلسل چیخ رہی تھی اس وجہ سے نہیں کہ کسی نے اسے تکلیف پہنچائی تھی بلکہ اس وجہ سے کہ اسے ٹائم فکس الارم پر لگایا گیا تھا اور لگانے والا خود گھوڑے گدھے بیچ کر سو چکا تھا اور وہ اپنے پیسے حلال کرنے کے لئے مسلسل چیخ رہی تھی، دو تین، پانچ منٹ پورے ہونے پر مصنف کے جسم میں ہلکی سی حرکت پیدا ہوئی اور وہ کسلمندی سے آنکھیں ملتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا ساری رات کرسی سے ٹیک لگا کر سونے کی وجہ سے کمر تختہ بن چکا تھا اور مسلسل ایک ہی زاویے میں رہنے کی وجہ سے ٹانگیں اکڑ چکی تھیں اس نے بمشکل تمام گھڑی کا بٹن آف کیا اور کسی ٹوٹے ہوئے شہتیر کی طرح چارپائی پر گر گیا اور اپنی خمار آلود آنکھوں سے کمرے کا جائزہ لے کر پھر سے آنکھیں موند کے لیٹ گیا۔

ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا تھا لیکن آج، آج نجانے کیوں اس کے دل میں شدت سے یہ خواہش جاگی کہ کوئی آئے اور اس سے کہے۔ ”اٹھیئے جی ناشتہ تیار ہے اب اٹھ بھی جایئے، جلدی سے منہ ہاتھ دھو لیجئے میں بس ناشتہ لگا رہی ہوں۔“ شاید کل رات کہانی کے ہیرو کی گم گشتہ محبوبہ کا سحر تھا اسے اپنی شادی کے بعد کے حالات یاد آتے تو وہ سر جھٹکتا ہوا استغفار پڑھ کر اٹھ کھڑا ہوا اور سیدھا کچن نما کمرے میں چائے بنانے چلا گیا کہ منہ دھونا اس کے نزدیک ایسا ہی تھا جیسے ”میں کپڑے بدل کر جاؤں کہاں اور بال بناؤں کس کے لئے“ اس لئے وہ کپڑوں اور بالوں سے بے نیاز ہی اٹھتا تھا گھر میں کھچڑی پکے نہ پکے اس کے بالوں میں کھچڑی ضرور پک چکی تھی اور اسے عمر رسیدہ ثابت کرنے میں پیش پیش تھی۔

تقریباً دو تین گھنٹے بعد جب مصنف ضروری حاجات اور ناشتے سے فارغ ہو کر ایک دفعہ پھر اپنی کرسی سنبھالنے والا تھا کہ باہر کا دروازہ زور زور سے بجا، وہ اٹھ کر دروازے کی سمت بڑھ گیا۔ ”کون ہے بھئی؟“ اس نے دور سے ہی ہانک لگائی۔

”میں ہوں صاحب ڈاکیا آپ کا خط آیا ہے۔“

اس نے کنڈی گرا دی اور دروازے کے دونوں پٹ کھول کر ڈاکیا کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ ”یہ لیں۔“ اس نے ہاتھ بڑھاتے ہوئے لفافہ اسے دیا۔

”کیا منی آرڈر ہے؟“ اس نے موہوم سی امید سے پوچھا۔

”نہیں صاحب کہا تو ہے خط ہے“ ڈاکیا نے مصروف انداز میں کہا اور یہ جا وہ جا ہوا اور وہ دروازے میں کھڑا ہی رہ گیا۔ پھر اس نے آہستگی سے دروازہ بند کیا اور مایوسی سے سر ہلاتا ہوا اندر آ بیٹھا گھر کا معمولی

سودا سلف بھی اختتام پذیر تھا اور اس کی جیب بھی خالی ہونے کو تھی۔ اس نے بے دلی سے لفافہ چاک کیا۔

آداب!

ہردلعزیز مصنف صاحب سلام مسنون!

میں آپ کے چاہنے والوں میں شامل ہوں۔ آپ ہر وقت گھر میں کیوں گھسے رہتے ہیں؟ کبھی گھر سے باہر نکل کر دیکھیں۔ شاید کوئی کہانی آپ کو مل جائے جو آپ کو تھوڑی بہت شہرت عطا کر دے۔ ویسے بھی حقیقی کہانیوں نے مصنفوں کی زندگیاں بدل دی ہیں۔

فقط آپ کا منتظر

اداس نگر کا خاموش پنچھی

لفافے سے نکلنے والا کاغذ اسے حیران کر گیا۔ ”یہ کون اس کا چاہنے والا ہے“ آج سے پہلے اسے کسی بھی قاری کی طرف سے کوئی ایسا خط موصول نہیں ہوا تھا جو اسے گھر سے نکلنے کی دعوت دے رہا ہے اس نے ایک دفعہ پھر سطور پر نظر ڈالی لیکن اس اجنبی چاہنے والے کا کوئی اتہ پتہ نہ مل سکا کہ اس نے کہاں سے اسے خط لکھا ہے خط پر کوئی مہر بھی نہ تھی یعنی اسی شہر سے خط آیا تھا اور کسی قریبی ڈاکخانے سے اس نے سر کھجاتے ہوئے ایک دفعہ پھر خط کی سطور پر نظر ڈالی لیکن بامعنی جملہ ملنے نہ پایا۔ سادہ سے لفظوں میں اسے گھر سے باہر نکلنے کی ترغیب دی گئی تھی جیسے پرندے گھونسلوں سے اڑ کر رزق تلاش کرنے جاتے ہیں گویا اسے بھی گھر سے نکل کر کہانی تلاش کرنا چاہئے لیکن بہرحال اسے تو اپنے خرچے کی فکر تھی اس لئے وہ ذہن میں کچھ باتیں رکھتے ہوئے اور کچھ نکالتے ہوئے دوبارہ سے کہانی لکھنے بیٹھ گیا۔ جس سے اسے کچھ پیسے ملنے کی امید تھی۔ پھر کہانی مکمل کرتے کرتے اسے تین دن لگ گئے وہ ویسے بھی کند ذہن تھا لیکن ایک لائن کو پانچ منٹ تک سوچ کر اسے لفظوں سے مزین کر دیتا کہ پڑھنے والا بعض اوقات تو عش عش کر اٹھتا پھر پیسے آنے میں مزید تین دن لگ گئے اب جبکہ وہ فارغ البال ہو چکا تھا تو ایک دفعہ پھر اس کا ذہن اس خط کی طرف چلا گیا۔

”ہوں! ایسا بھی کر دیکھتے ہیں۔“ اس نے کہا اور اپنی کھٹارہ بائیک کو درست حالت میں لانے کی کوشش کرنے لگا کہ صبح اس نے سفر کا ارادہ باندھا تھا رات کو وہ جلد سو گیا موسم ابر آلود تھا اس نے آسمان کی طرف نگاہ اٹھاتے ہوئے کہا ”لگتا ہے رات کو بارش ہوگی۔“

لیکن بارش رات کو نہ ہوئی بلکہ جب وہ اٹھ کر ناشتے سے فارغ ہو کر جانے کے لئے بالکل تیار تھا بارش نے برسنا شروع کر دیا۔ ”سر منڈاتے ہی اولے پڑنا“ اس نے اپنی حالت پر فقرہ کسا اور واپس کمرے میں آ بیٹھا۔ موسلادھار بارش دو تین گھنٹے جاری رہنے کے بعد رم جھم جھڑیوں میں بدل گئی۔ کبھی رک جاتی اور کبھی پھر شروع ہو جاتی۔ مصنف پریشانی سے باہر کی طرف دیکھتا کہ آج اس نے مہینے بعد باہر نکلنے کا سوچ ہی لیا تھا تو قدرت کو منظور نہ ہوا۔ سارا دن بادل کسی انجانے دکھ پہ آنسو برساتے رہے اور شام ڈھلے تھک ہار کر ہواؤں میں اڑ گئے۔

موسم صاف ہو چکا تھا گھڑی چھ بجا رہی تھی باہر خوب صورت ہوا چلنے لگی۔ ”اب کہاں جاؤں“ مصنف نے سر کھجاتے ہوئے سوچا اور برآمدے میں آ کر کھڑا ہو گیا تھوڑی دیر تک پرکیف ہوا نے اسے ایسا مسحور کیا کہ وہ سوچے بنا ہی کہ ”کہاں جاؤں“ بائیک پر جا بیٹھا اور اپنے گھر کے اکلوتے دروازے کی کنڈی چڑھاتے ہوئے باہر نکل آیا ایک عجیب سی کشش تھی اس موسم میں یا نجانے اس ندا میں کہ وہ سوچنا نہ چاہتا تھا کہ اس ڈھلتی شام میں وہ گھر سے کیوں نکل آیا۔

وہ دھیرے دھیرے بائیک چلانے لگا۔ ایک عرصہ بعد اسے بائیک پر بیٹھ کر کے ایسے سہانے موسم کی ٹھنڈی ہوا کھاتے ہوئے عجیب سا لطف آ رہا تھا وہ دھیرے دھیرے گنگنانے لگا اور اپنے جوانی کے دنوں کے تصور میں کھو گیا۔ جب وہ اپنی نئی نویلی بائیک کو محبوبہ کی طرح چاہتا تھا وہ ایسے ہی اس کا دیوانہ تھا جیسے آج کل لوگ ”الشوریہ رائے“ کے دیوانے ہیں۔ وہ سڑک پر آنے کے بجائے گلیوں میں سے بائیک لے کر

گزرنے لگا اسے اچھا لگا گھروں سے آتی ہوئی آوازیں بچوں کی چہل پہل خوشنما خوشبوئیں اس کے دل میں ایک خواہش جاگی لیکن اس نے اسے داب لیا کہ وہ ایسے حسین موسم کو اپنی حسرتوں پر آنسو بہا کے ضائع نہیں کرنا چاہ رہا تھا بائیک چل رہی تھی وہ گنجان علاقے سے گزر کر خاصے ویران سے علاقے میں چلا آیا تھا۔ آہستہ آہستہ آبادی کم ہو رہی تھی لیکن وہ ''ہے جذبہ جنوں تو ہمت نہ ہار'' چلا جا رہا تھا۔ اچانک اس کی بائیک کو ایک جھٹکا لگا اور وہ رک گئی۔

مصنف نے چونک کر نظریں ادھر ادھر گھمائیں اجنبی جگہ تھی کہیں دور تک مکان نظر نہ آ رہا تھا اندھیرا ہر سو مسلط ہو چکا تھا لیکن وہ اپنے خیالات کی روشنی میں چلا جا رہا تھا اب جب حقیقت کی آنکھ کھلی تو وہ ہڑبڑا اٹھا آس پاس بندہ نہ بشر تھوڑی سی بھی آبادی کہیں دور دور تک نہ تھی ٹوٹی پھوٹی سڑک اور وہ تنہا اور اس کی تھکی ہوئی بائیک جو حقیقتاً بہت زیادہ تھک چکی تھی اور اب آرام کی غرض سے رک گئی تھی۔ مصنف اس کی عادت سے واقف تھا اور جانتا تھا کہ وہ تین گھنٹے تک وہ فریش ہو گی رات کے آٹھ تو پہلے ہی ہو چکے تھے اس نے پریشانی سے آس پاس دیکھا اور بے چین دل کے ساتھ بائیک سے اتر کر اپنے اس نو یافتہ چاہنے والے کو کوسنے لگا جس کی بدولت وہ یہاں تک پہنچ چکا تھا اسے اپنی عقل پہ بھی غصہ آ رہا تھا کہ کسی نے اسے بے وقوف بنایا اور وہ بن گیا۔ اب نجانے کیا ہو گا اس نے سوچتی ہوئی نگاہ ادھر ادھر ڈال کر سگریٹ سلگا دی۔

بیٹھے ہوئے اسے ابھی چند لمحے ہی گزرے تھے کہ سامنے کی طرف سے کوئی چلتا ہوا نظر آیا۔ مصنف نے اپنی آنکھوں کو آنے والے پر لگا دیا۔ آنے والا دھیمی رفتار سے چل رہا تھا ابھی اس کا سراپا واضح ہوا تھا عکس نہیں وہ کوئی مرد تھا اندھیرے نے اس کی شکل اب تک چھپا رکھی تھی مصنف کے دل نے غیر ارادی طور پر تیزی سے دھڑکنا شروع کر دیا۔ آنے والے کے قدموں کی چاپ ہرگز سنائی نہ دے رہی تھی اسے لگ رہا تھا کہ وہ ہوا پہ چلتا ہوا آ رہا ہے یا الٹا چل رہا ہے دھیرے دھیرے مصنف کے مساموں نے ٹھنڈا پسینہ اگلنا شروع کر دیا حالانکہ فضا خنک تھی تھوڑی بہت شوخ ہوا اب بھی چل رہی تھی لیکن اجنبی جگہ اور آنے والے کا پراسرار وجود جو چلنے کے باوجود ابھی تک یہاں نہ پہنچ سکا تھا بلکہ ہر دفعہ دیکھنے پر مصنف کو وہ اپنی جگہ سے صرف ایک انچ ہٹا ہوا لگتا گھپ سیاہ اندھیرے میں وہ بغیر چاپ کے قدموں والا کسی سیاہ دیو کی طرح لگ رہا تھا۔ آہستہ آہستہ اندھیرے نے مصنف کو اتنی مہلت دی کہ وہ اس کے کپڑوں کا رنگ جاننے لگا چونکہ اس کی آنکھیں اندھیرے سے مانوس ہو چکی تھیں اور ہر طرف سے سیاہی نظر آ رہی تھی لیکن سامنے سے آنے والے کے کپڑوں کے رنگ میں ذرا ذرا اندھیرے سے لڑنے کی مزاحمت تھی اور مصنف کو کچھ یاد آ رہا تھا جیسے برائی کے آگے نیکی اور اندھیرے کے آگے روشنی ''اوہ'' اس کے ذہن میں جھماکا ہوا یقیناً اس نے سفید رنگ کا سوٹ پہنا ہوا تھا۔

مصنف کے رونگٹے کھڑے ہو گئے کہ آنے والا اس سے محض دس قدم دور رہ گیا تھا لیکن اس کے قدموں کی آواز بدستور غائب تھی وہ کیوں اتنی احتیاط سے چل رہا ہے؟ اسے کس سے خطرہ ہے یا وہ اپنی آمد سے کسی کو بے خبر رکھنا چاہتا ہے؟ مگر کون؟ یہاں تو کوئی نہیں ہے سوائے میرے اور میں بھی یہاں بغیر کسی منصوبے کے آ گیا ہوں۔ اگر میں اسے دیکھ رہا ہوں تو یقیناً وہ بھی مجھے دیکھ رہا ہو گا اس نے دھڑکتے دل سے سوچا محض دس قدم، مصنف نے نگاہیں اٹھا کر دیکھا ''ہیں'' اسے جھٹکا لگا وہ ابھی بھی اتنے ہی فاصلے پر تھا مگر مسلسل چل رہا تھا۔

مصنف نے اپنی ریڑھ کی ہڈی میں کلبلاہٹ محسوس کی۔ خوف کی صورت میں ایک سرد لہر اس کے جسم میں سرایت کر گئی اس کی آنکھیں حلقوں سے باہر کو تھیں وہ زبان دانتوں تلے دبائے ہوئے تھا کہ کوئی آواز منہ سے نکل جائے۔ وہ کھڑی بائیکل پر بیٹھا ہوا تھا لیکن اسے پتا ہی نہ چلا کہ کب وہ اضطراری کیفیت میں بائیک سے

اتر کر نوارد کے سامنے کھڑا ہو چکا تھا وہ یوں رستے میں کھڑا تھا کہ سڑک کے بالکل وسط میں تھا آنے والا اس سے نہ ٹکراتا یہ تو بالکل غیر ممکن تھا۔

مصنف نے دل میں سوچا کہ اوہ ایک طرف کو ہو جاتا ہے بائیک کو ساتھ لے کر یقیناً اس سے آواز پیدا ہو گی اور وہ مجھے جان لے گا مصنف نے محض سوچا اور اس پر عمل کرنا وہ اس وقت اپنے بس کی بات محسوس نہ کر رہا تھا اس لئے اس نے خود ہی اپنی سوچ کی تردید کر دی اور وہیں کھڑا رہا۔ ''کیوں نہ میں لائٹر جلا کر دیکھوں'' مصنف کے خوفزدہ دماغ میں ایک اور خیال نے جنم لیا اس نے لائٹر نکالنا ہی چاہا کہ ایک مہیب سرد سی آواز نے اسے لرزنے پر مجبور کر دیا۔

خاموش قدموں والا عین اس کے سر پر کھڑا تھا۔ مصنف نے اپنی حالت غیر ہوتی ہوئی محسوس کی وہ اس سے یہاں تنہا کھڑے ہونے کا مقصد پوچھ رہا تھا۔

مصنف نے دل میں سوچا شاید یہ کوئی سنتری ہے لیکن اس کی عقل نے زور و شور سے اس کی نفی کر دی۔

''میں آپ سے مخاطب ہوں'' وہ پھر سے بولا۔

مصنف نے خود پر قابو پایا۔ ''میں یہاں اجنبی ہوں۔ یہاں سے گزر رہا تھا کہ میری بائیک خراب ہو گئی۔'' وہ سرسراتے لہجے میں بولا۔

''ہوں۔'' آنے والے نے ہنکارہ بھرا۔ ''تو کیا تم نے اسے ٹھیک کرنے کی کوشش نہیں کی۔''

''بہت کی۔'' مصنف نے جھوٹ بولا کیونکہ وہ اسے یہ نہیں بتانا چاہتا تھا کہ اس کی بائیک لاعلاج ہو چکی ہے۔

''اچھا تو پھر تم ساری رات یونہی کھڑے رہو گے کیا؟ میرے ساتھ چلو یہاں تھوڑے فاصلے پر میرا گھر ہے'' اس نے آفر کی۔

مصنف نے اجنبی کو بغور دیکھا اس کی اندھیرے سے مانوس آنکھیں یہ دیکھنے میں کامیاب ہو گئیں کہ وہ ایک معقول شخص ہے اس کی عمر کچھ زیادہ نہیں وہ اٹھائیس سے اوپر کا ہرگز نہیں اس کی آواز بھی مصنف کو مناسب

روحانی ترقی کے لئے

حالات جب پیچیدگی اختیار کر لیتے ہیں اور مسئلہ کسی طرح حل نہیں ہوتا تو انسان کے اوپر جمود طاری ہو جاتا ہے۔ اس جمود کی وجہ سے اس کے اندر فہم و فراست اور قوت ارادی مفلوج ہو جاتی ہے۔ باوجود کوشش کے وہ کسی نتیجہ پر نہیں پہنچتا۔ کاروبار زندگی میں ناکام رہتا ہے۔ اس کا اثر روحانی اور جسمانی صحت پر بھی پڑتا ہے۔ یہ صورت حال خود اس کے لئے اور گھر کے دوسرے افراد کے لئے عذاب بن جاتی ہے۔ اس سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے چاندی کی انگوٹھی پر 16 خانے بنوا کر ان میں نو کا ہندسہ کندہ کرا لیا جائے اور یہ انگوٹھی پہننے سے پہلے اس پر 16 مرتبہ لا الٰہ الا انت سبحانک انی کنت من الظلمین پڑھ کر دم کر لیں اور اسے سیدھے ہاتھ کی چھوٹی انگلی کے برابر والی انگلی میں پہن لیا جائے تو انشاء اللہ مسائل حل ہو جائیں گے۔

لگی جو پہلی دفعہ بولنے پر ایسے لگی تھی جیسے غار کا دہانہ صدیوں بعد کھلے تو اس میں سے کثیف بھاری ہوا ایک عجیب سی آواز کے ساتھ باہر نکلتی ہے۔

مصنف نے چند ثانیے غور کیا تھوڑی دیر پہلے وہ جس شخصیت سے اس بری طرح خوفزدہ تھا اب وہ شخصیت اسے محو گفتگو تھی وہ جانتا تھا کہ اس کی بائیک کم از کم تین چار گھنٹے تک چلنے والی نہیں۔ اب یہاں اندھیرے میں کھڑے رہنا اس کے بس کی بات نہیں تھی اور جب ایک شخص اسے ساتھ چلنے کی آفر کر رہا تھا تو وہ کیونکر انکار کرتا۔

''آپ کی پریشانی بجا ہے جناب!'' وہ مودب لہجے میں بولا۔ ''لیکن یقین جانیے میرے گھر میں گزری ہوئی رات آپ کی زندگی کی گزشتہ راتوں سے بہتر ہو گی اور آپ اسے کبھی فراموش نہیں کر سکیں گے میں کوئی

راہگیر لٹیرا ہرگز نہیں آپ مجھ پر یقین کیجئے۔" وہ اتنے اپنائیت بھرے لہجے میں بولا تو مصنف بغیر کوئی لفظ کہے اس کے ساتھ چلنے کو تیار ہو گیا۔ مصنف اپنی بائیک سنبھالے اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔

خراماں خراماں ہوا بھیگی بھیگی سی تھی دن بھر کی بارش اپنی آغوش میں ہوا کو لئے ہوئے آہستہ آہستہ موسم کو خنکی بخش رہی تھی مصنف نے عجیب سی تر و تازگی کا احساس محسوس کیا اس نے واضح طور پر اپنے قدموں کی آواز محسوس کی اور اپنی بائیک کے چلنے کی بھی لیکن اجنبی اب بھی دبے قدموں چل رہا تھا۔ مصنف نے اس کی طرف دیکھا وہ اطمینان سے چل رہا تھا اس کے کپڑوں کی ہلکی ہلکی سرسراہٹ فضا میں ضرور تھی مصنف نے اس ماحول میں عجیب سا سحر محسوس کیا۔ "آپ کس پیشے سے منسلک ہیں جناب؟" وہ بولا۔

مصنف اپنے خیالات سے چونکا۔ "میں ایک مصنف ہوں کہانیاں لکھتا ہوں۔" مصنف نے یہ کہتے ہوئے ایک عجیب سا فخر محسوس کیا اس کی آواز میں خود بخود تفاخر آ گیا۔

"کیا واقعی؟" اجنبی نے حیرت و خوشی سے ملی جلی کیفیت سی کہا "کیا آپ واقعی مصنف ہیں جناب؟ ایک دفعہ پھر کہہ دیجئے مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا کیا آپ واقعی کہانیاں لکھتے ہیں؟ گویا آپ وہی ہیں جن کا مجھے برسوں سے انتظار تھا جن کے لئے میں روز یہاں آتا تھا۔"

مصنف اجنبی کی بے قراری پر متعجب ہوا۔ "ہاں میں مصنف ہوں لیکن اس میں اتنی حیرت والی کون سی بات ہے اور آپ برسوں سے کس کا انتظار کر رہے ہیں" مصنف نے یکبارگی کئی سوال کیے۔

"ہاں" وہ چونکا۔ مصنف کو لگا کہ اسے اپنی بے قراری پر افسوس ہونے لگا ہے "بات یہ ہے جناب" اس نے کہنا چاہا۔

اچانک ایک درخت کے پیچھے سے کوئی چار پائے والی چھوٹی سی مخلوق نکل کر تیزی سے ان کے آگے سے گزر گئی مصنف ہراساں ہو کر رک گیا اور چونک اٹھا۔ اس کے اچھلنے کی آواز کے تھوڑی دیر بعد ہلکی سی میاؤں کی آواز نے مصنف کو ہنسنے پر مجبور کر دیا وہ جس چیز سے خوفزدہ ہوا تھا وہ ایک بلی تھی۔

"آپ ہنس رہے ہیں جناب؟" اجنبی نے حیرت سے پوچھا۔ "حالانکہ میں نے بزرگوں سے سنا ہے کہ کالی بلی راستہ کاٹ جائے تو یہ کوئی اچھی بات نہیں ہوتی" مصنف نے اپنی مسکراہٹ روکتے ہوئے کہا۔

"تمہیں کیسے یقین ہے کہ وہ کالی بلی ہی تھی؟ حالانکہ سارے گہرے کلر اندھیرے میں کالے ہی دکھائی دیتے ہیں۔"

"نہیں جناب!" وہ زور دے کر بولا "وہ کالی بلی ہی تھی" اور پھر میاؤں کی آواز اس کی آواز پھر سے سرد ہو گئی۔

مصنف نے ایک دفعہ پھر اپنے اندر بے چینی محسوس کی۔ "اس کی آواز......" اس کی آواز مصنف کچھ سوچ نہ سکا اس نے اپنے ذہن پر کہر جمی ہوئی محسوس کی کالی سیاہ رات ویران سڑک اور اک اجنبی کا ساتھ۔ مصنف نے اپنے ہاتھوں سے لکھی ہوئی کئی تحریریں یاد کیں اور خوف سے جھرجھری لے کر رہ گیا وہ اب بالکل خاموش تھا اور خاموشی ہمیشہ کسی بڑے طوفان کا پیش خیمہ ہوتی ہے مصنف کو عجیب سی وحشت ہونے لگی اس کے قدموں کی آواز مسلسل فضا میں ارتعاش پیدا کر رہی تھی۔ مصنف کی بائیک بھی اپنی موجودگی کا بھرپور احساس دلا رہی تھی اور فضا کی ہولناک خاموشی، مصنف کو دوبارہ اس سے یہ پوچھنے کی ہمت نہ ہوئی کہ اسے کس کا اتنے برسوں سے انتظار تھا اور کیوں تھا؟ وہ خود ہی اندازے لگاتا رہا اور خود ہی جھٹلاتا رہا۔

"لیجئے جناب میرا گھر آ گیا" آخر اجنبی کی آواز نے فضا کا سکوت توڑا۔

مصنف نے چونک کر دیکھا سڑک کے دائیں طرف ایک چھوٹا سا مکان موجود تھا اور اس سے تھوڑے فاصلے پر بھی کچھ گھر تھے جن کی روشنیاں گل ہو چکی تھیں

اور وہ اندھیرے میں عجیب سا منظر پیش کر رہے تھے البتہ ایک دو گھروں میں ہلکی ہلکی روشنی تھی جس کی وجہ سے مصنف آس پاس کا حدود اربعہ دیکھنے میں کامیاب ہوا تھا۔ "آیئے جناب!" اس نے کہا اور گھر کی طرف بڑھا مصنف بھی اس کے پیچھے سڑک سے اتر کر چلا۔

گھر کا دروازہ کھلا تھا مصنف کو اس کی بے فکری پہ حیرت ہوئی جو گھر کھلا چھوڑ کر نجانے کس کی تلاش میں نکل پڑا تھا اور اس کی مدد کا پیش خیمہ بنا تھا۔ گھر مکمل طور پہ اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا مصنف نے دہشت محسوس کی۔ "کیا گھر میں روشنی کا انتظام نہیں؟" مصنف اپنے لہجے کی ناپسندیدگی چھپا نہ سکا۔

"ہاں روشنی...... روشنی ہی روشنی ہے جناب آپ آ گئے ہیں تو ہر طرف روشنی ہی ہے" وہ بشاش لہجے میں بولا۔ مصنف نے کوئی شے گھسٹنے کی آواز محسوس کی اس کا دل دھڑکا کیا اجنبی کے قدموں کی بھی آواز نہ آتی تھی کہ وہ اندازہ لگا سکتا کہ وہ کس طرف گیا ہے لیکن اس نے اپنے کانوں اور آنکھوں کی مدد سے یہ اندازہ قائم کیا کہ سامنے کوئی کمرہ ہے اور اس میں کسی شے کے گھسٹنے کی آواز آ رہی ہے آہستہ آہستہ وہ آواز تیز ہونے لگی مصنف نے اپنے ہاتھ پاؤں سرد ہوتے محسوس کیے موت اسے اپنے سر پر منڈلاتی ہوئی نظر آنے لگی ابھی وہ کوئی بھاری بھرکم چیز اٹھائے گا مصنف نے سوچا اور لا کر اس کے سر پہ......

"لیجئے جناب تشریف رکھیے" اجنبی کی آواز نے مصنف کے خیالات کو فنا کیا مصنف چونکا اس نے پیچھے ہاتھ گھمایا وہ کرسی تھی اس کی جان میں جان آئی وہ کرسی پر ڈھے سا گیا ویسے بھی وہ بہت تھک گیا تھا کچھ سفر سے اور کچھ اس انجانے خوف سے جو مسلسل اس کے سر پر مسلط تھا اس کا خیال تھا کہ اجنبی اس سے کچھ کھانے پینے کے لئے پوچھے گا اور وہ ہاں کہہ دے گا۔

"ہاں تو جناب آپ مصنف ہیں اس نے خود ہی بات شروع کی۔

"جی ہاں"

"آپ کہانیاں لکھتے ہیں یقین جانیے مجھے یہ جان کر بے انتہا خوشی ہوئی" اجنبی نے کہا۔

"جانتے ہیں کیوں؟ وہ لہجے میں سسپنس پیدا کرتے ہوئے بولا۔

"کیوں؟" مصنف گنے چنے الفاظ استعمال کر رہا تھا۔

"وہ اس لیے کہ مجھے اپنی کہانی لکھوانی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ میری کہانی ساری دنیا پڑھے سارے لوگ جان لیں کہ میں کیسے......" وہ پھر سے رک گیا۔

مصنف نے بے چینی محسوس کی۔ "آپ کیا؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں میں کچھ، آپ کس قسم کی کہانیاں لکھتے ہیں؟" وہ بات بدلتے ہوئے بولا۔

"جس طرح کی آپ لکھوائیں گے جناب" مصنف شگفتگی سے بولا۔

کہانی کا سن کر مصنف کے سارے حواس بیدار ہو گئے تھے کیونکہ وہ فارغ تھا اور اس کے ذہن میں ابھی تک کوئی نئی کہانی یا اس کا پلان ترتیب نہیں پایا تھا وہ اسے اپنی خوش بختی سمجھ رہا تھا کہ بیٹھے بیٹھے اسے کہانی مل رہی ہے اسے ویسے بھی بہت شوق تھا کہ لوگ آ کر اسے اپنے حالات و خیالات بتائیں اور وہ انہیں کہانی کی صورت میں ڈھال دے تاکہ اسے ذہن پر زیادہ زور بھی نہ دینا پڑے وہ ہمہ تن گوش ہوا۔

"کہیے نہ جناب کہ آپ اپنی کون سی کہانی لکھوانا چاہتے ہیں" مصنف نے فوراً پوچھا۔

"ہوں" وہ چونکا "نہیں میں اپنی کہانی نہیں بلکہ میں تو اپنے ایک دوست کی کہانی سنانا چاہتا ہوں وہ دوست میری جان تھا آپ یوں سمجھ لیجئے کہ اس میں اور مجھ میں کوئی فرق نہیں بلکہ وہ اور میں ایک جان اور دو قالب تھے۔" وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے جنونی لہجے میں بولا۔

مصنف چونکا اسے اجنبی کا لہجہ ایک دفعہ پھر تبدیل ہوتا محسوس ہوا "خیر میری طرف سے اپنی کہانی سنا دیا

اپنے دوست کی مجھے اس سے کیا مجھے تو کہانی سے غرض ہے" مصنف نے لاپرواہی سے کہا" آپ اپنے دوست کے لئے "تھا" کا لفظ استعمال کر رہے ہیں، کیا اب وہ اس دنیا میں نہیں ہے؟" مصنف نے لہجے میں مصنوعی ہمدردی بھرتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں" وہ کاٹ دار لہجے میں بولا "اب وہ اس دنیا میں نہیں ہے۔"

"اس کی آواز" مصنف نے اپنے خوف کو جھٹلایا۔"ایسا کچھ نہیں ہے" کہہ کر خود کو تسلی دی اور اس کی طرف پوری طرح متوجہ ہو گیا۔

"وہ ایک اوسط گھرانے میں پیدا ہوا لیکن چونکہ والدین نے اسے بہت منتوں اور دعاؤں سے حاصل کیا تھا اس لئے اس کی پرورش بہت ناز ونعم سے ہوئی۔ والدین کا وہ پہلا اور آخری چراغ تھا ان کے گھر اس کے بعد اولاد پیدا نہ ہوئی۔ وہ والدین کی آنکھ کا تارا تھا اس کا نام انہوں نے خاور رکھا۔ خاور بہت لاڈ سے پرورش پانے لگا اس کا باپ تھوڑا بہت کالا علم جانتا تھا اور اس کے ذریعے اپنی حالت بدل کر رکھ دینا چاہتا تھا وہ ہر وقت چھوٹے موٹے چلوں میں مصروف رہتا تھا خاور کو ان باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی کہ وہ کبھی بھی اپنے باپ سے اس کے کام کے متعلق کچھ نہ پوچھتا۔ اس کے باپ کے پاس آس پاس کی عورتیں بھی آتی تھی کہ وہ انہیں تعویذ دیتا اور ان سے پیسے بٹورتا جس سے ان کی گزر بسر ہوتی خاور کی ماں ایک سیدھی سادھی عورت تھی وہ اکثر اس کے باپ کو اس کام سے روکتی کہ اسلام میں اسے ناجائز قرار دیا گیا ہے لیکن وہ اس کی بات پہ کان نہ دھرتا۔ خاور کو اپنے باپ سے بے حد پیار تھا ہوتا بھی کیوں نا کہ وہ اس کے منہ سے نکلنے سے پہلے اس کی فرمائش پوری کر دیتا اور اسے کبھی کسی چیز کی کمی نہ ہونے دیتا" چاند نے دھیرے دھیرے بادلوں کی اوٹ سے منہ نکالا اور اپنی زرد روشنی زمین پر پھیلا دی مصنف نے فوراً گھر کا جائزہ لیا اور جائزہ لینے سے پہلے اجنبی پر نظر ڈالنا نہ بھولا۔

اُف وہ چونک اٹھا اجنبی سر تا پا سفید کپڑوں میں ملبوس تھا اس کے کپڑوں کا کوئی سرا سمجھ نہ آتا تھا کم از کم وہ قمیض شلوار تو نہ تھی بلکہ اسے لگتا تھا جیسے مردے کو دو چادریں لپیٹ دی جاتی ہیں ایسے ہی وہ دو چادروں میں لپٹا ہوا تھا وہ بالکل اس کے سامنے کرسی رکھ کر بیٹھا ہوا تھا اس کے چہرے کے نقش نین متناسب تھے لیکن عجیب سی سختی لئے ہوئے وہ بالکل جذبات سے عاری مخلوق دکھائی دے رہا تھا۔ چہرے پر ایک ہی زاویہ لئے ایک ہی رخ پر بیٹھا کسی روبوٹ کی طرح بولے جا رہا تھا۔

مصنف نے ایک جھرجھری لے کر اس سے نظریں ہٹا لیں اور کوشش کی کہ آئندہ اسے نہ دیکھے نجانے کیوں اسے خوف محسوس ہو رہا تھا حالانکہ اس کے سامنے اس جیسا انسان ہی تو بیٹھا تھا اور اس کی برسوں کی خواہش پوری کر رہا تھا لیکن مصنف کا دل چاہا کہ کاش وہ یہاں سے غائب ہو جائے۔ لیکن ایسا ممکن نہ تھا۔

اجنبی کی آواز سنائی دی۔" اسی عیش و آرام میں خاور نے جوانی میں قدم رکھا۔ اس نے خوب قد کاٹھ نکالا وہ متناسب قد کاٹھ کا مالک تھا لیکن آزاد فطرت واقع ہوا تھا اس کی ماں نے بہت زور لگایا کہ وہ جلد سے جلد شادی کر لے لیکن وہ کسی قیمت پر بھی راضی نہ ہوا وہ شادی کر کے پھنسنا نہیں چاہتا تھا وہ ابھی زندگی کو آزادرہ کر گزارنا چاہتا تھا۔ باپ کی کمائی پر عیش کر کے اس کا باپ بھی اس کے حق میں تھا وہ اپنے بیٹے کو اتنی جلدی شادی جیسے عمر بھر کے وبال میں پھنسانا نہیں چاہتا تھا اس لیے اس کی ماں کی ایک نہ چلی۔ خاور تو عیش پرستوں میں مشغول رہتا اور اس کا باپ تعویذ گنڈوں اور چلوں میں۔

آخر ایک دن اس کے باپ کو وہ نسخہ مل ہی گیا جس کی اسے تلاش تھی۔ وہ ایک چلہ تھا جو اس نے کاٹنا تھا وہ زیادہ تر ایک کمرے میں ہی بند رہتا۔ وہیں سارے عمل کرتا اس کمرے میں اس کی اجازت کے بغیر کوئی آ جا نہیں سکتا تھا سوائے خاور کے اس نے اس چلے کے ذریعے ایک بیر کو قابو کرنا تھا جو پھر اس کے ہر حکم کی

تعمیل کرتا اور اس کے وارے نیارے ہو جاتے۔ چلہ ایک مخصوص تاریخ کو کاٹنا تھا جس کا اسے انتظار تھا ابھی وہ تاریخ نہیں آئی تھی کہ ان کے قریبی رشتے داروں میں سے کسی کی فوتگی ہو گئی خاور کے باپ نے جانے سے صاف انکار کر دیا کہ صرف دو دن بعد اس نے چلہ کاٹنا تھا اور وہاں سے اتنی جلدی واپسی ممکن نہ تھی جس بات کا اس نے برسوں انتظار کیا تھا تو وہ کیوں کہیں چل دیتا۔ خاور بھی جانے پر رضامند نہ تھا وہ ایسے موقعوں سے دور ہی بھاگتا تھا اسے ایسی جگہوں پر جانے کا قطعی شوق نہ تھا سو اس کی ماں اکیلی ہی چلے جانے پر مجبور ہو گئی وہ ان دونوں باپ بیٹے سے بہت تنگ تھی کہ ان کے مزاج اس سے قطعی نہ ملتے تھے۔ اس نے خاور کی بہت منتیں کیں کہ اس بڑھاپے میں وہ اکیلی دوسرے شہر کا سفر کیسے کرے گی؟ لیکن خاور نے صاف انکار ہی کیے رکھا اور گھر سے نکل گیا اس وقت واپس آیا جب اس کی ماں جا چکی تھی۔

خاور کا باپ چلے کی تیاری میں مصروف ہو گیا اور خاور اپنے عیش و آرام کے پیچھے بھاگتا رہا وہ اماوس کی رات تھی اور اس نے چلہ کاٹنا تھا خاور صبح سے گھر سے غائب تھا باپ نے جبوراً گھر کا دروازہ کھلا چھوڑا کہ خاور نجانے کب واپس آ جائے اور اپنے کمرے میں آ کر چلہ کاٹنا شروع کر دیا۔ یہ بہت سخت عمل تھا اور اس کی جان جا سکتی تھی لیکن وہ اپنے کمرے کا دروازہ نہ بند کر سکا کہ خاور اسے دیکھ کر اطمینان کر لے اور پریشان نہ ہو وہ جانتا تھا کہ اس کا بیٹا بہت سمجھدار ہے وہ اسے عمل میں مصروف دیکھ کر چپ چاپ اپنے کمرے میں چلا جائے گا اسے مخاطب نہ کرے گا اور اسی اطمینان نے اسے آرام سے چلہ کاٹنے پر مجبور کر دیا اور وہ آس پاس سے بے نیاز ہو کر عمل میں مصروف ہو گیا۔"

مصنف نے نگاہیں پھیر کر آسمان کی طرف دیکھا چاند واپسی کے سفر پر گامزن تھا اس کی زرد روشنی ماحول کو عجب سی کیفیت بخش رہی تھی ویران اجاڑ اندھیرے گھر میں وہ ایک کرسی پر بیٹھا ہوا تھا اور اس کے سامنے بیٹھا ہوا اجنبی شخص اس کے سامنے نجانے کس کی زندگی کے راز کھول رہا تھا۔ گھر میں تین کمرے تھے مصنف نے باری باری سب کی طرف دیکھا تو نجانے کیوں اسے آخری کمرے کی طرف دیکھ کر ایسا لگا جیسے یہی وہ کمرہ ہے جس کا وہ ذکر کر رہا ہے لیکن نہیں اس نے سر جھٹکا وہ تو اپنے دوست کی کہانی سنا رہا ہے۔ اور یہ تو اس کا اپنا گھر ہے۔

"خاور کو اس کی زندگی کی سب سے بڑی خوشی ملی اسے کسی سے محبت ہو گئی وہ بے پناہ خوش تھا اس کا محبوب اسی شام اسے ایک جھلک دکھلا کر اپنے گھر میں جا چھپا تھا اور وہ ابھی تک اس کی راہ میں بیٹھا تھا کہ شاید وہ ایک بار پھر آ جائے لیکن جب رات کافی بیت گئی تو اسے اپنی بیوقوفی کا احساس ہوا کہ وہ لڑکی ذات اپنے گھر سے کیسے نکلے گی وہ اپنی عقل کو کوستا ہوا گھر کی طرف چل دیا اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ اڑ کر گھر پہنچ جائے اور اپنے باپ کو یہ خوشخبری بتائے کیونکہ اس کا باپ اس کا بہترین دوست بھی تھا وہ جلدی جلدی گھر پہنچا اور اپنے باپ کو آواز بھی دینے لگا۔ "بابا" وہ چلاتا ہوا اس کے کمرے کی طرف آ گیا اور پھر اپنی خوشی میں اس بات سے انجان کہ اس کا باپ عمل کر رہا ہے۔

بھاگ کر جا کر دائرے میں داخل ہو گیا اس کے باپ کو ایک جھٹکا لگا اس نے اپنی خون آلود آنکھیں کھولیں اور قہر زدہ آواز میں بولا "خاور دائرے سے نکل جا" لیکن خاور نے اس کی بات پر غور نہ کیا تو وہ اٹھ کر اسے دھکا دیتے ہوئے خود بھی دائرے سے باہر آ گرا اس کے باپ کو تو غیر مرئی مخلوق سے سزا اسی وقت مل گئی جبکہ خاور ان کے اثر سے اپنے حواس کھو بیٹھا جب اس کی ماں واپس آئی تو دو بری خبریں اس کی منتظر تھیں وہ نیم پاگل سی ہو گئی وہ اور باقی سب لوگ یہی سمجھتے رہے کہ خاور باپ کے صدمے سے حواس کھو بیٹھا ہے اور اس کا باپ قدرتی موت مرا ہے لیکن اصل بات کوئی نہ جانتا تھا حتیٰ کہ اس کی ماں بھی نہیں۔ خاور زیادہ دنوں تک زندہ نہ رہ سکا اور اپنے باپ کے پیچھے ہی چل دیا اس دہرے

صدمے نے اس کی ماں کو توڑ کر رکھ دیا وہ پاگل ہوگئی اور سارا دن گلیوں میں چیختی چلاتی رہتی۔ ”میرے خاور کو کیا ہوا تھا اس کا باپ کیسے مرگیا“ لیکن کسی کے پاس اس کے سوالوں کا جواب نہ تھا۔“

مصنف نے گھڑی پر نظر ڈالی صبح کے چار بج چکے تھے اسکے جسم میں ساری رات بیٹھنے کی وجہ سے تشنج کی سی کیفیت تھی چاند بالکل آخری دموں پر تھا ستارے اپنی روشنی کھورہے تھے کہ مصنف کو ایک سوال نے چونکا دیا جو وہ فوراً اپنی زبان پر لے آیا۔

”اگر کوئی نہیں جانتا تھا کہ خاور کیسے مرا تو تم کیسے جانتے ہو۔“ اس نے پرتجسس لہجے میں پوچھا اور اجنبی کی طرف دیکھا لیکن گھبرا کر فوراً ہی نظر پھیر لی کہانی کا عکس اس کے چہرے پر عیاں تھا۔

”ہاں کوئی بھی نہیں جانتا تھا لیکن خاور تو جانتا تھا اس نے آخری دم تک بہت کوشش کی کہ اپنی ماں کو بتا سکے لیکن اس کی زبان نے اس کا ساتھ نہ دیا اور وہ چل بسا اس کی ماں بھی پاگل پن میں زیادہ دنوں تک زندہ نہ رہ سکی اور تین ماہ بعد ہی مرگئی۔

مصنف کیا تم جانتے ہو کہ انسان کے دل میں جو خواہش بہت شدت سے پیدا ہو وہ مرنے کے بعد بھی ختم نہیں ہوتی“ اجنبی نے کہا۔

”ہاں“ مصنف نے جواب دیا۔

”تو جان لو مصنف کہ خاور کے دل میں بھی مرتے دم تک خواہش زندہ تھی کہ وہ دنیا کو بتا سکے کہ وہ کیسے مرا اس کی موت کا ذمہ دار کون تھا اس کا باپ، وہی باپ جو اسے جان سے زیادہ چاہتا تھا۔“

”یہ تو ٹھیک ہے“ مصنف نے کہا ”لیکن تمہیں کیسے پتہ چلا کہ خاور کے دل میں یہ خواہش موجود تھی؟“ اجنبی بولا۔

”مجھے پتہ ہے مجھے سب پتہ ہے“ اس کے لبوں پر پراسرار مسکراہٹ پھیل گئی جو نجانے کیوں مصنف کو اندر تک ہولا گئی“ کیونکہ میں ہی خاور ہوں“ اجنبی نے کہا۔

اور مصنف کو اپنے آس پاس دھماکے ہوتے سنائی دیئے خوف کے مارے اس کے حواس نے کام کرنا چھوڑ دیا اور وہ اندھیروں میں ڈوبتا چلا گیا۔

مصنف کی آنکھ فجر کی اذانوں سے کھلی۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا اور حیرت سے اپنے آس پاس کا جائزہ لینے لگا پھر اسے شدید دھچکا لگا وہ اسی کرسی پر بیٹھا تھا اور اس کے سامنے والی کرسی خالی تھی اور اس کرسی پر ایک لفافہ اور ایک کاغذ پڑا ہوا تھا۔

آداب!

ہردلعزیز مصنف صاحب سلام مسنون!

آپ کی آمد کا بہت شکریہ! مجھے یقین ہے کہ آپ میری کہانی ضرور لکھیں گے اور لوگوں کو ضرور بتائیں گے کہ کالا علم جس سے آپ دوسروں کو نقصان پہنچاتے ہیں وہ آپ کی اور آپ کے عزیزوں کی بھی جان لے سکتا ہے۔ لہذا اس برے فعل سے بچیں۔ آپ کی بائیک ٹھیک ہوچکی ہے اور یقین جانیے کہ اب زندگی میں کبھی خراب نہ ہوگی کیونکہ اب آپ نئی بائیک خرید لیں گے لفافہ میں ایک خطیر رقم موجود ہے جو کہ آپ کی ترقی کے لئے کافی ہے اور اب آپ ایک کامیاب اور بڑا مصنف کہلائیں گے کیونکہ پیسے کے بغیر دور جدید میں آگے بڑھنا اور شہرت پانا ممکن نہیں میری کہانی ضرور شائع کرادیجئے گا۔

فقط آپ کی آمد کا شکرگزار

خاور

مصنف کو اپنا سر چکراتا ہوا محسوس ہوا اسے یقین تھا کہ اب وہ یہاں ایک لمحہ بھی رکا تو اسے خود کو سنبھالنا مشکل ہوجائے گا اس لئے وہ تھوڑی دیر بعد بائیک سنبھالے دوبارہ انہی راستوں پر گامزن تھا جہاں سے وہ آیا تھا۔ اس کا ذہن گزرے ہوئے واقعات پر غور کرکے خوف سے دہل رہا تھا اور عقل ایک نئی کہانی مل جانے پر اجنبی مہربان کی شکرگزار تھی۔



دولت

ایس حبیب خان



”اس بچی کو ہمیں دے دو بہت دولت ملے گی“ اس روز میری طبیعت ٹھیک نہ تھی بات آئی گئی ہوگئی۔ آج پھر وہی خواب مجھے دکھا ہے

ڈائننگ ہال میں میز پر کھانا لگ چکا تھا اور وہاں موجود سب شیراز آفریدی کے منتظر تھے۔ شیراز آفریدی شہر کے رئیسوں میں سے ایک تھے۔ وہ چار بہنوں سحرش، سروش، فریال اور نیلوفر کے اکلوتے اور سب سے چھوٹے بھائی تھے۔ شیراز آفریدی نے جیسے ہی اپنی تعلیم مکمل کی بہنوں نے اپنے ارمان نکال لئے اور خوبصورت ”درشہوار“ کو دلہن بنا کر اپنے گھر لے آئیں۔ شیراز آفریدی بہنوں کا بڑا احترام کرتے تھے اس لئے ہر کام میں بہنوں سے مشورہ ضرور کرتے تھے جب ان کے گلشن حیات میں پہلا پھول کھلا۔ ان کی بچی جو چھ دن کی ہوگئی تھی اس کی رسم عقیقہ ادا کرنے اور نام تجویز کرنے کی غرض سے بہنوں کو بلا بھیجا تھا اس لئے اس وقت کھانے کی میز پر سب ان کے منتظر تھے۔

”ارے بھئی کیا بھوک ہڑتال کا ارادہ ہے جو آپ لوگ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں“ انہوں نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

”یہ اچھی کہی شیراز میاں، بھوک ہڑتال پر تو تم نے بٹھایا ہے“ بڑی بہن نے مسکرا کر کہا ”چلو بھئی ہڑتال ختم“ انہوں نے مسکرا کر نوالہ توڑتے ہوئے کہا۔

ان کا نوالہ ہاتھ سے چھوٹ گیا جس کی وجہ ایک اچانک بلند چیخ تھی۔ درشہوار کی طبیعت کچھ ٹھیک نہ تھی اس لئے وہ اپنے کمرے میں تھیں سب دوڑتے ہوئے

کمرے میں گئے وہاں اندھیرا تھا شیراز آفریدی نے لائٹ جلائی تو درشہوار بستر پر بیٹھی آنکھیں بند کیے۔ ”نہیں نہیں“ کی گردان کیے جارہی تھیں۔

”کیا ہوا؟“ شیراز آفریدی نے ان کو ہلا کر پوچھا تو وہ آنکھیں کھول کر سراسیمہ نظروں سے چاروں طرف دیکھنے لگیں ”آخر کچھ بتاؤ تو کیا ہوا؟“

”میری بچی“ درشہوار نے صرف اتنا ہی کہا۔

”یہ رہی تمہاری بچی“ فریال بیگم پالنے سے بچی کو اٹھا کر لے آئیں بچی بہت خوبصورت تھی اور قابل رشک صحت کی مالک بھی درشہوار نے اسے جھپٹ کر بانہوں میں لے لیا، جیسے کوئی اسے چھیننا چاہ رہا ہو ”لگتا ہے کوئی ڈراؤنا خواب دیکھ لیا ہے“ درشہوار نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

فریال بیگم شیراز آفریدی کی سب سے بڑی بہن تھیں، باقی لوگ تو آج آئے تھے مگر فریال بیگم بچی اور درشہوار کی دیکھ بھال کے لئے پہلے ہی آ گئی تھیں درشہوار ذہنی طور پر فریال بیگم سے بہت قریب تھیں اور انہیں ”آپا جان“ کہہ کر بلاتی تھیں اور اپنی ہر بات انہیں ضرور بتاتی تھیں۔

”درشہوار!“ سب کے جانے کے بعد فریال بیگم نے انہیں مخاطب کیا۔ ”جی آپا“ کہہ کر درشہوار فریال بیگم کی جانب دیکھنے لگیں۔ ”میں نے اس روز بھی تمہیں ایسے ہی پریشان دیکھا تھا جب یہ بچی ایک دن کی تھی کیا اپنی پریشانی کی وجہ مجھے نہیں بتاؤ گی؟“ فریال بیگم فکر مندی سے بولیں تو درشہوار نے کہنا شروع کیا۔

”اس بچی کے پیدا ہونے سے پہلے میں عجیب عجیب خواب دیکھا کرتی تھی مگر میں نے انہیں اہمیت نہ دی مگر جب میری بچی ایک دن کی ہوئی تو میں نے پھر خواب دیکھا بہت بھیانک میں نے دیکھا کہ کمرے کے ایک کونے کی زمین پھٹ گئی اور اس میں سے ایک موٹا تازہ سانپ نکلنا شروع ہوا۔ خدا جانے وہ کتنا لمبا تھا۔ پھر اس نے تہہ در تہہ کنڈلی ماری اور پیچھے ہو کر اپنا رخ میری رف کر لیا اور پھر اس کی سرسراہٹ بھری آواز سنائی دی۔

”اس بچی کو ہمیں دے دو بہت دولت۔ ملے گی“ اس روز میری طبیعت ٹھیک نہ تھی بات آئی گئی ہو گئی۔ آج پھر وہی خواب مجھے دکھا ہے۔ زمین کا پھٹنا، سانپ کا نکلنا، سرسراہٹ اور آواز۔ ”اس بچی کو ہمیں دے دو بہت دولت م لے گی“ جیسے ہی سانپ نے بچی کی طرف رخ کیا میری چیخ نکل گئی اور آنکھ کھل گئی“

فریال بیگم تشویش میں پڑ گئیں کہ ایک بار ہوتا تو بات الگ تھی لیکن بار بار ایسا نظر آتا کچھ نہ کچھ تو تھا کوئی گڑبڑ ضرور ہے پھر انہوں نے درشہوار کو تسلی دی۔ ”تم بے فکر ہو جاؤ میں کل ہی اس کا حل نکالتی ہوں تم آرام کرو اب میں چلتی ہوں انشاء اللہ سب اچھا ہی ہو گا“

اگلے دن ظہر کے بعد وہ ڈرائیور کے ساتھ روانہ ہو گئیں ان کی واپسی عصر تک ہوئی۔ وہ سیدھی درشہوار کے پاس آئیں۔ ”آپا جان سب ٹھیک تو ہے؟“ درشہوار یہ کہتی ہوئی آگے بڑھیں۔

”سب کچھ ٹھیک ہے! یہ دیکھو“ انہوں نے کالے رنگ کے دھاگے بچی کی صحت مند کلائیوں میں باندھ دیئے ”یہ اسے نظر بد سے بچائیں گے“ اور ایک تعویذ اٹھا کر بچی کے گلے میں پہنا دیا۔ ”اللہ کے کلام کی برکت سے یہ ہر بلا سے محفوظ رہے گی“ تو درشہوار نے سکون کا سانس لیا۔

”اچھا اب میں چلتی ہوں ایک دن رہ گیا ہے عقیقہ میں ابھی بہت کام ہیں“ کہتی ہوئی چلی گئیں۔

عقیقہ کی دعوت بڑی پر تکلف تھی ہر کوئی شیراز آفریدی کے ذوق کی داد دے رہا تھا آج بچی کا نام بھی رکھنا تھا شیراز آفریدی اور درشہوار نے اپنے پسندیدہ نام پیش کر دیئے لیکن قرعہ فال پھپھیوں کے نام نکلا اور انہوں نے باہمی مشورہ سے بچی کا نام ”دلکش“ رکھ دیا۔

وقت جیسے پر لگا کر اڑ گیا اور پندرہ سال کب بیت گئے پتا ہی نہ چلا۔ ایک دن درشہوار کی سب سے چھوٹی نند نیلوفر اپنے بچوں کو لے کر بھائی کے گھر آئی ہوئی تھیں بچوں کی چھٹیاں تھیں ان کے تین بچے تھے۔ علیشبا، افشاں اور بیٹا دانیال، سب دلکش سے چھوٹے تھے ان کی بڑی بیٹی علیشبا دلکش کی ہم عمر تھی اور دوست بھی جب یہ

لوگ آتے تو روز نت نئے پروگرام بنتے تھے۔ اس وقت بھی سب ایک کمرے میں جمع تھے اور فلم دیکھنے کے ساتھ ساتھ پکنک پوائنٹ پر بھی بات جاری تھی۔ دانیال کو چڑیا گھر جانے کی لگی ہوئی تھی افشاء ایڈونچر پسند تھی وہ ایسی جگہ جانا چاہتی تھی علیشبا کو فلمیں دیکھنا پسند تھیں اور دلکش ساحل سمندر پر جانے کی متمنی تھی۔ بحث ختم ہوئی تو فلم بھی ختم ہو چکی تھی۔ کافی رات ہو گئی تھی۔

”دلکش! تم یہیں سو جاؤ، رات بہت ہو گئی ہے“ علیشبا کے اسرار پر دلکش وہیں رک گئی ابھی دلکش کی آنکھ جھپکی ہی تھی کہ وہ چونک کر اٹھ بیٹھی۔ پھر لائٹ جلا کر چادر اٹھائی بیڈ کے نیچے جھانک کر واپس بستر پر بیٹھ گئی۔ علیشبا بھی اٹھ گئی ”رات میں تم کون سا خزانہ دریافت کر رہی ہو؟“ علیشبا نے پوچھا۔

”میری آنکھ لگی ہی تھی کہ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میرے برابر میں کوئی نرم اور گلگلی شے ہے اور میری آنکھ کھل گئی میں سمجھی کوئی بلی ہو گی۔“

”پاگل ہو“ علیشبا نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ ”تمہیں نیند میں لگا ہو گا۔ سو جاؤ“ اور دلکش نے چادر سر تک کھینچ لی اور دوبارہ بستر پر لیٹ گئی مگر یہ پہلی بار نہ تھا اس سے پہلے بھی اسے ڈراؤنے خواب نظر آتے تھے۔ جب وہ اپنے کمرے کے علاوہ کہیں اور سو جاتی اسے لگتا کہ کوئی اس کا گلا دبا رہا ہو یا وہ زمین کے اندر نیچے ہی نیچے جا رہی ہو۔ کئی بار اس نے دیکھا کہ اس کے ہاتھ میں تھالی ہے اس پر کپڑا ڈھکا ہوا ہے جب وہ کپڑا اٹھاتی تو تھالی میں سانپ ہی سانپ ہوتے۔

دلکش نے ان سب باتوں کا ذکر اپنی ماں سے نہیں کیا تھا کہ کہیں وہ خوفزدہ نہیں نہ ہو جائیں۔ ادھر دوسری طرف درشہوار کو تسلی تھی کہ تعویذ کی برکت سے دلکش تمام مصیبتوں سے محفوظ ہے لیکن انہیں یہ خبر نہ تھی کہ وہ تعویذ دلکش نہ جانے کب کا اتار چکی تھی ایک ماہ گزر گیا اور چھٹیاں ختم ہو رہی تھیں۔ نیلوفر جاتے ہوئے درشہوار سے گلے مل رہی تھیں اور بولیں ”لگتا ہے شیراز سیاں سے ملے بغیر ہی جانا پڑے گا تو وہ شہر سے باہر ہیں اور ان کی واپسی کی کوئی خبر نہیں“ دلکش بولی ”پھپھو آج نہ جائیں۔“ نیلوفر بولیں ”اب کے تم شیراز کے ساتھ آ جانا“ اور دلکش کو گلے لگانے کے لئے آگے بڑھیں تو چونک گئیں۔

”یہ تمہارے ماتھے پر نشان کیسے ہیں؟“

”نیلوفر آپا یہ نشان پیدائشی ہیں بچپن میں یہ نشان ہلکے تھے مگر جیسے جیسے یہ بڑی ہوتی گئی یہ بھی گہرے ہو گئے ہیں“ درشہوار بولیں دلکش کے ماتھے پر دونوں بھنوؤں کے بیچ میں لہری بناتی ہوئی دو لکیریں تھیں وہ گہری ہوتی جا رہی تھیں اور کچھ ابھری ابھری بھی لگنے لگی تھیں۔ ”خیر اللہ نظر بد سے بچائے اور اپنی پناہ میں رکھے۔“ انہوں نے بھتیجی کو دعا دی اور چلی گئیں۔

ایک دن شیراز آفریدی نے درشہوار کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ”شاہ زین احمد اور ان کے گھر والے ہمارے ہاں آنا چاہتے ہیں“

”کیوں کوئی خاص بات ہے؟“ درشہوار نے حیرانی سے سوال کیا۔ تو شیراز آفریدی نے ہاتھ میں پکڑی ہوئی کتاب رکھتے ہوئے کہا ”ہاں بات دراصل یہ ہے کہ ان کے صاحبزادے شاہ زین تعلیم مکمل کر کے انگلینڈ سے لوٹ آئے ہیں اور وہ رشتے کے سلسلے میں ہماری دلکش کو دیکھنا چاہتے ہیں“

”شیراز ابھی تو ہماری بیٹی نے تعلیم بھی مکمل نہیں کی یہ سب اتنی جلدی؟“ درشہوار سوالیہ انداز میں بولیں۔ ”میرے خیال میں کوئی حرج نہیں رشتہ بہت اچھا ہے آنے دیجئے۔ شادی تو ہم پڑھائی مکمل ہونے کے بعد ہی کریں گے میں نے انہیں آئندہ ہفتہ آنے کی رضامندی دے دی ہے“ شیراز آفریدی نے جواب دیا۔ ”ٹھیک ہے اگر آپ مطمئن ہیں تو میں بھی خوش ہوں“ درشہوار نے ان کی تائید کر دی۔

شاہ زیب احمد اور شیراز آفریدی کے خاندان کے دیرینہ مراسم تھے ان کے بزرگوں نے جو تعلق قائم کیا تھا اسے آنے والی نسل نے بھی برقرار رکھا ہوا تھا اس لئے شاہ زیب احمد اور شیراز آفریدی اس گہری دوستی کو رشتہ

داری میں بدل جانے کے خواہاں تھے۔

شاہ زیب احمد اپنے بیٹے شاہ زین اور اہل خانہ کے ساتھ آ چکے تھے دلکش نے جوں ہی کمرے میں قدم رکھا اور جس نے اسے دیکھا دیکھتا ہی رہ گیا کیونکہ وہ اپنے نام سے زیادہ دلکش تھی کتابی چہرہ شانہ پر جھولتی ہوئی ناگنی زلفیں اس کی بادامی آنکھوں کی چمک ایسی تھی گویا دو ہیرے آنکھوں میں ڈال دیئے ہوں۔ کمان آبرو کے ساتھ آنکھیں جدھر اٹھتیں ایک سحر سا طاری کر دیتی تھیں دیکھنے والوں کو لگتا ان آنکھوں سے کوئی رشتہ جڑ گیا ہو اور وہ دوبارہ اس کو دیکھنے پر مجبور ہو جاتے۔ شاہ زیب احمد اور گھر والوں کے ساتھ شاہ زین نے بھی فوراً اپنی پسند کا عندیہ دے دیا۔

شاہ زیب احمد سے سوچنے کے لئے وقت لے کر شیراز آفریدی نے بہنوں اور سب کی رضامندی سے طے کیا کہ منگنی کی رسم کے لئے چاند کی چودہ تاریخ مناسب رہے گی۔ درشہوار کے والدین گزر چکے تھے ایک بڑی بہن ملک سے باہر تھیں لے دے کے بس سسرال والے ہی تھے کیونکہ وہ خوش اخلاق تھیں اس لئے نندوں کی چہیتی تھیں اور انہیں سسرال اور میکے میں کبھی فرق محسوس نہ ہوا۔ منگنی کی تقریب میں صرف خاندان کے لوگ شامل تھے۔

منگنی کے تمام مہمان پہنچ چکے۔ سرمئی بادلوں کے ٹکڑے آسمان پر تیر رہے تھے مہکی مہکی گلابی شام مدہوش کن تھی اور گلابی جوڑے میں ملبوس دلکش بھی گلاب کی کلی لگ رہی تھی اس کی صراحی دار گردن میں ہار یوں لگ رہا تھا کہ گویا صرف بنا ہی اس گردن کے لئے ہو۔ گداز کلائیوں میں پیلے کنگنوں کی الگ بہار تھی۔ ہیرے کی بندیا اور انگوٹھی پہنا کر منگنی کی رسم ادا کر دی گئی کیونکہ صرف خاندان کے لوگ ہی تھے اس لئے تقریب جلدی ختم ہو گئی تھی۔ مہمان جا چکے تھے اور دلکش اپنے کمرے میں جا کر لیٹ گئی اسے بہت تھکن ہو رہی تھی اس لئے لیٹتے ہی نیند آ گئی۔

رات کا جانے کون سا پہر ہو گا جب دلکش کی آنکھ کھلی اس کا سانس دھونکنی کی طرح چل رہا تھا اور سر سے پیر تک پسینے میں شرابور تھی۔ خوف کے مارے اس سے اٹھا بھی نہیں جا رہا تھا سوتے میں اس نے دیکھا کہ ایک موٹا سانپ اس کی گردن میں بالکل ہار کی طرح لپٹا ہوا ہے اس کی گرفت اتنی سخت تھی کہ دلکش کو اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہو رہا تھا اس کی کلائیوں میں بالکل کنگنوں کے انداز میں سانپ بل کھا کر لپٹے ہوئے تھے ان کی گرفت بھی اتنی سخت تھی کہ ہڈیاں چٹختی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں حیرت کی بات یہ تھی کہ یہ سب خواب تھا مگر وہ دباؤ اور تکلیف اسے حقیقت میں ابھی بھی ہاتھوں اور گلے پر محسوس ہو رہی تھی اور ماتھے پر بھی ایک سوئی سی چبھتی محسوس ہو رہی تھی دلکش نے دوبارہ لیٹ کر سونے کی کوشش کی لیکن نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی اسے جھرجھریاں سی آ رہی تھیں جانے کب اس کی آنکھ لگی اور وہ سو گئی۔

اگلی صبح ناشتے کی میز پر دلکش کو نا پا کر درشہوار اسے بلانے اس کے کمرے میں پہنچیں تو دلکش سر تک چادر لپیٹے ابھی تک سوئی ہوئی تھی انہوں نے چادر ہٹائی تو دیکھا دلکش کا منہ سرخ ہو رہا تھا پھر اس کی پیشانی کو چھوا تو وہ انگارے کی طرح جل رہی تھی اسے بہت تیز بخار تھا انہوں نے گھبرا کر شیراز آفریدی کو اطلاع کی اور فوراً ڈاکٹر کو بلوایا ڈاکٹر نے چیک کیا اور کہا ''تشویش کی کوئی بات نہیں یہ دوا دے رہا ہوں شام تک طبیعت ٹھیک ہو جائے گی'' مگر پھپھیاں اس بات پر مصر تھیں کہ دلکش کو نظر لگ گئی ہے جس کی وجہ سے اس کی یہ حالت ہوئی اور انہوں نے دلکش کی نظر بھی اتار دی دوا کا اثر تھا یا واقعی نظر لگی تھی کہ شام تک بخار خاصا کم ہو گیا۔

دو چار دن ہی کچھ بہتر گزرے کہ دلکش کی طبیعت پھر خراب ہو گئی۔ شیراز آفریدی نے ڈاکٹروں کی لائن لگا دی۔ ڈاکٹر پر ڈاکٹر بدلے گئے مگر اس کی طبیعت نہ سنبھلی۔ دنیا بھر کے ٹیسٹ کروائے گئے مگر بیماری کی وجہ سمجھ میں نہ آ سکی۔

ایک روز درشہوار نے دلکش سے کہا۔ ''یہ کیسی منگنی

تھی جس نے تمہیں اس حال کو پہنچا دیا؟''

دلکش سے ماں کی یہ حالت دیکھی نہ گئی اور اس نے منگنی کی رات کا سارا خواب ماں کو بتا دیا۔ یہ سب سن کر درشہوار سن ہو کر رہ گئیں ان کی نظر فوراً دلکش کے گلے کی طرف اٹھی۔ انہوں نے سوال کیا ''تمہارا تعویذ کہاں ہے؟'' دلکش بولی۔ ''وہ تو میں بہت پہلے اتار چکی اور وہ تو اب نہ جانے کہاں ہو۔''

''میرے خدا! اب کیا ہو گا! آپا جان بھی یہاں نہیں ہیں'' اپنی بچی کی حالت اور تعویذ نہ ہونے کا سن کر درشہوار بہت مایوس ہو گئی تھیں ڈاکٹر، حکیم، صدقہ خیرات دنیا بھر کے جتن کر لئے مگر دلکش کی حالت نارمل نہ ہوئی اور وہ کمزور ہوتے ہوتے ڈھانچے کی صورت بننے لگی اس کے ماتھے پر بنی دو لہراتی لکیریں سرخی مائل سے بالکل سیاہ ہو گئیں اور ابھر کر جلد سے اوپر ہو گئی تھیں اور غور کرنے پر یوں لگتا تھا جیسے یہ چھوٹے چھوٹے دو سانپ ہوں۔

ایک روز کوٹھی کے گیٹ کے باہر سے مستقل ''بین'' کے بجنے کی آواز سنائی دے رہی تھی درشہوار اس وقت دلکش کے ساتھ لان میں بیٹھی تھیں وہ روز دلکش کو لے کر آ جاتی تھیں تا کہ اس کی طبیعت پر اچھا اثر پڑے۔ انہوں نے چوکیدار کو آواز دی ''چوکیدار! یہ کیسا شور ہے؟'' چوکیدار بولا ''بیگم صاحبہ ایک جوگی ہے جو کہ بین بجا رہا ہے وہ کہہ رہا ہے کہ یہاں کوٹھی میں کوئی سانپ موجود ہے۔''

لفظ سانپ درشہوار کی کمزوری بن گیا تھا وہ چونک کر بولیں ''اسے اندر بلاؤ ہم خود پوچھتے ہیں اس سے۔''

''جوگی اندر آ گیا تمہیں کیسے معلوم کہ یہاں سانپ ہو سکتا ہے؟'' درشہوار نے پوچھا۔ جوگی بولا۔ ''مائی یہاں ایک ایسی بوٹی کی خوشبو محسوس ہو رہی ہے جو صرف وہاں پیدا ہوتی ہے جہاں زمین زہریلی ہو جاتی ہے؟''

درشہوار نے حیرت سے کہا ''زمین کیسے زہریلی ہو سکتی ہے؟'' جوگی بولا ''سانپ جہاں ہوتا ہے اپنا جھاگ پھینک دیتا ہے جس کی وجہ سے وہ جگہ جہاں وہ

آیت کریمہ سے مشکلات کا حل

تسخیر الخلائق کے لئے: ایک مرتبہ روزانہ مع اول و آخر درود شریف دس دس بار پڑھے یا کم سے کم اس آیت کریمہ مبارک کو ہر روز 360 مرتبہ روزانہ اول و آخر تین تین بار درود شریف ورد میں رکھے تو خلقت کا ہجوم ہو۔

حاضرات کے لئے: اگر مرض کی صحیح تشخیص نہ ہو اور یہ کہا جائے کہ اس کے اوپر جنات کا یا آسیب کا سایہ ہے تو مریض کو سامنے بٹھا کر پہلے ایک مرتبہ سورہ یاسین (36) پڑھے پھر بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ یا حَفِیْظُ یَا حَفِیْظُ یَا حَفِیْظُ. لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ سُبْحٰنَکَ اِنِّیْ کُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ نہایت سکون سے گیارہ مرتبہ پڑھے اور مریض پر دم کرے۔ اگر مریض پر جنات کا اثر ہے تو دم کرتے وقت ظاہر ہو جائے گا۔ یہ تصدیق ہونے کے بعد کہ مریض جنات کا اثر ہے، گیارہ مرتبہ یا حفیظ پڑھ کر ایک مرتبہ پھر دم کریں۔ مریض اپنی اصلی حالت میں آ جائے گا۔

مکان و دکان کی حفاظت کے لئے: جس مکان و دکان میں جن و شیاطین یا آسیب وغیرہ کا اثر ہو تو پیر، بدھ یا جمعرات کے دن بساعت مشتری یا زہرہ پوری سورہ بقرہ (2) اور آیت کریمہ لا الٰہ الا انت سبحانک انی کنت من الظلمین 787 بار اس جگہ بیٹھ کر درمیانی آواز سے پڑھے اور ایک گھڑا اس پانی کا بھر کر اپنے قریب رکھ لے اور جب سورہ ختم ہو جائے تو اس پانی پر دم کر کے مکان اور دکان کی دیواروں پر چھڑکے اور اس طرح چھڑکے کہ پانی زمین پر نہ گرے اور ساعت کا حساب سورج نکلنے کے وقت سے لگائے۔

جھاگ پڑتے ہیں وہ زمین زہریلی ہو جاتی ہے اور وہاں یہ بوٹی اگ آتی ہے۔"

"تم بین کیوں بجا رہے تھے؟" انہوں نے پھر سوال کیا' سانپ اگر یہیں ہوگا تو بین کی لے پر باہر نکلے گا پھر ہم اسے پکڑ کر لے جائیں گے۔" جوگی نے صاف بتا دیا۔

"امی اندر چلیں اب مجھ سے مزید کھڑا نہیں ہوا جا رہا ہے" دلکش نے کہا۔ دلکش کی آواز پر جوگی نظر اٹھا کر دلکش کی طرف دیکھا اور "حیرت سے چونک گیا۔

درشہوار بولیں۔ "یہ بچی بہت بیمار ہے" اور دلکش کو تھام کر اندر جانے کے لئے قدم بڑھائے۔ "رک جا مائی!" جوگی نے آواز دی تو درشہوار کے قدم رک گئے اور انہوں نے مڑ کر کہا "کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"اس بچی کی بیماری کبھی بھی کسی کے سمجھ نا آئے گی"

درشہوار سنجیدہ ہو کر جوگی کے قریب آ گئیں۔

"کیوں سمجھ نہیں آ سکتی......" جوگی بولا "اس کے ماتھے کو دیکھو! یہی اس کی بیماری کی وجہ ہے اس کے ماتھے پر دونوں لکیروں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جوگی مزید بولا۔

"انہیں نکلوا دے تو یہ تیری بچی تندرست ہو جائے گی۔

درشہوار نے دلکش کو اندر جانے کا اشارہ کیا اور پھر جوگی کی طرف متوجہ ہو گئیں کیونکہ اس نے انہیں بہت کچھ بتایا اور ایسی باتیں بھی بتائیں جو انہیں یقین دلا رہی تھیں کہ دلکش کی بیماری کے پیچھے ایسی ہی کوئی وجہ ہے؟" "کون کر سکتا ہے ہماری بچی کا علاج؟" انہوں نے پوچھا۔

"مائی تیری بچی کا علاج میں کروں گا۔ ابھی مجھے جانا ہے، تو ہمارا انتظار کر، میں پھر آؤں گا" اور وہ جوگی چلا گیا۔

درشہوار کو پورا یقین تھا کہ جوگی نے جو بھی کہا ہے سب صحیح ہے انہوں نے شیراز آفریدی کو بھی ساری بات بتا دی پہلے تو وہ ان باتوں کو ماننے کے لئے تیار نہ ہوئے مگر جب درشہوار نے اپنا خواب، منگنی کی رات کا دلکش کا خواب اور تعویذ کا بتایا تو یہ سب سن کر وہ سوچ میں پڑ گئے۔ ابھی تک تو انہوں نے دلکش کی بیماری اس کے سسرال والوں سے چھپا کر رکھی تھی لیکن آخر کب تک آگے انہیں پتہ چل جانا تھا پھر نہ جانے رشتے پر کیا اثر پڑتا اور پھر ماہر سے ماہر ڈاکٹر آزمائے گئے لیکن نتیجہ صفر تھا یہ سب سوچ کر انہوں نے اس علاج پر رضامندی ظاہر کر دی۔

دلکش کی طبیعت بحال ہونے کے بجائے اور خراب ہوتی جا رہی تھی کئی روز گزر گئے تھے لیکن ابھی تک اس جوگی کی واپسی کی کوئی خبر نہ تھی درشہوار کو جوگی کی آمد کا شدت سے انتظار تھا اور وہ انہی سوچوں میں گم تھیں کہ اچانک بین کی آواز نے ان کی سوچوں کو منتشر کر دیا۔ وہ تیزی سے باہر کی جانب لپکیں اور جوگی کے سامنے پہنچ کر بے تابی سے بولی۔ "جلدی سے بتاؤ میری بیٹی کا علاج کب کرو گے؟"

جوگی نے جواب دیا۔ "جان کو جوکھم میں ڈال کر یہ کام کیا ہے یہ بچی بہت بڑی مصیبت میں ہے اس لئے اس پر ترس آ گیا یہ دیکھ" جوگی نے اپنی پوٹلی سے ایک گول ڈبہ نکالا۔ "یہ کام بڑے دھیان سے کرنا ہوگا نہیں تو بڑی مشکل ہو سکتی ہے" درشہوار کی بے تابی عروج پر تھی "تم بتاؤ تو سہی ہمیں کرنا کیا ہے؟"

جوگی نے ڈبہ کھولا۔ اس میں ایک طرح کا سفوف تھا۔ ایسے لگتا تھا جیسے چمکدار ذرات ہوں۔ ہلاؤ تو لگتا جیسے چمکتی ہوئی کوئی لہر اٹھ رہی ہو پھر جوگی نے پوٹلی سے ایک سلائی بھی نکالی اور بولا "مائی! میری بات دھیان سے سن، رات میں جب یہ بچی سو جائے تو اسی سلائی سے یہ سفوف اس کی پیشانی پر بنے ان سانپوں پر لگا دینا۔ اس کے بعد ڈبہ کھول کر اس کے سرہانے کے قریب رکھ دینا۔ سفوف لگا کر سلائی بھی ڈبہ میں رکھ دینا۔ یاد رکھنا ڈبہ کو کھلا رکھنا، یہ سانپ زندہ ہو جائیں گے اور زندہ ہو کر صرف اسی سفوف کی بو کو پہچانیں گے اور بچی کے ماتھے سے اتر کر یہ اسی بو کی وجہ سے ڈبہ میں چلے جائیں گے۔ بہت دھیان کی بات ہے ورنہ بچی کے لئے مشکل ہو سکتی ہے۔" جوگی نے تاکید کر دی۔

درشہوار بولیں۔ "ہم سمجھ گئے، ہم دھیان رکھیں گے۔ تم نے ہماری مدد کی ہے۔ تم بتاؤ ہم تمہاری خدمت کریں؟" جوگی بولا۔ "مائی سب خیر ہے تو اس بچی کی فکر کر یہ بہت بڑی مصیبت میں ہے، چلی جا" اور بغیر کچھ مانگے پوٹلی سنبھال کر چلا گیا۔

آدھی رات کے وقت جب دلکش سو چکی تھی۔

درشہوار نے وہی کیا جو انہیں جوگی نے بتایا تھا۔ ڈبہ کو کھول کر انہوں نے اس کے سرہانے کی سائیڈ ٹیبل پر رکھ دیا اور لائٹ بند کر کے وہ کمرے سے چلی گئیں آدھی رات کے بعد دلکش کی آنکھ کھل گئی اسے لگا کہ اس کے ماتھے پر بہت بوجھ ہو رہا ہے اسے شدید پیاس لگ رہی ہے کمرے میں اندھیرا تھا اور کمزوری کی وجہ سے اٹھنے کی ہمت بھی نہیں ہو رہی تھی اس کو معلوم تھا کہ سائیڈ کی ٹیبل پر پانی کا گلاس موجود ہوگا اس نے اندھیرے ہی میں ہاتھ بڑھا کر گلاس ڈھونڈنے کی کوشش کی اور اس کا ہاتھ گلاس سے ٹکرایا اور پانی بھرا گلاس وہیں الٹ گیا اور جو ڈبہ درشہوار رکھ کر گئی تھیں وہ بھی نیچے گر گیا اور اس میں موجود ذرات پانی میں بہہ گئے دلکش مایوسی سے دوبارہ لیٹ گئی کیونکہ پانی کا گلاس تو الٹ گیا تھا۔

درشہوار کو اکیلی دلکش کا سوچ کر نیند نہیں آ رہی تھی رات انہیں بہت لمبی لگ رہی تھی اور وقت تھا کہ کاٹے نہیں کٹ رہا تھا صبح ہوتے ہی وہ دلکش کے کمرے کی طرف بھاگیں اور وہاں پہنچ کر ان کی فلک شگاف چیخوں سے دلکش کا کمرہ گونجنے لگا۔ درشہوار کی چیخیں دہلا دینے والی تھیں۔ اس لئے شیراز آفریدی بھی دوڑ کر کمرے میں پہنچ گئے اور کمرے میں پہنچ کر انہوں نے قیامت سے پہلے قیامت دیکھ لی تھی۔

دلکش کی رنگت بالکل نیلی پڑ چکی تھی۔ اس کے منہ سے جھاگ بہہ رہے تھے۔ اس کے ماتھے پر بنے سانپ اب ماتھے سے غائب تھے۔ "جوگی نے کہا تھا سانپ زندہ ہو کر ڈبہ میں چلے جائیں گے" لیکن ڈبہ تو گر گیا تھا اور سفوف بھی پانی میں بہہ کر ضائع ہو گیا تھا صرف دلکش کے ماتھے پر اس سفوف کے ذرات لگے تھے اس لئے ان سانپوں نے زندہ ہو کر دلکش کو ہی ڈس لیا تھا۔ اب ایسا کچھ ہو چکا تھا جو سننے اور بیان کرنے سے باہر تھا۔

درشہوار اور شیراز آفریدی کی دنیا اندھیر ہو چکی تھی اور دلکش ان دونوں کو رونے کے لئے چھوڑ کر چلی گئی تھی۔ درشہوار کو کسی چیز سے دلچسپی نہ رہی اور ان کی دنیا سمٹ کر ان کے اس کمرے تک محدود ہو گئی جہاں دلکش نے اپنے آخری لمحے گزارے تھے۔ وہ دیوانہ وار بیٹی کو پکارتی رہتیں ڈاکٹر نے کہہ دیا اگر ان کا یہی حال رہا تو یہ صدمے سے پاگل ہو جائیں گی۔

شیراز آفریدی نے سوچا کہ وہ اس کمرے کو بالکل تبدیل کروا دیں گے۔ سب سے پہلے کمرے کی دیواریں توڑی گئیں اور دیوار ٹوٹنے سے کمرہ ہال سے جا ملتا دیوار ٹوٹ چکی تھی اور کمرے کی کھدائی ہونا تھی فرش تقریباً شام تک پورا کھد چکا تھا ایک کونہ باقی رہ گیا تھا ابھی وہ توڑا جا رہا تھا کہ زمین میں اچانک زوردار آواز پیدا ہوئی اور کدال کی نوک کسی سخت چیز سے ٹکرائی۔ دوبارہ چوٹ مارنے پر پھر ایسی ہی آواز پیدا ہوئی۔ اس بات کی اطلاع شیراز آفریدی کو دی گئی تو وہ وہاں گئے۔

"آرام سے پورا ٹکڑا توڑو اور دیکھو کیا مسئلہ ہے؟" انہوں نے ہدایت دی اور پھر سب دیکھنے والوں کے منہ حیرت سے کھلے رہ گئے زمین سے برآمد ہونے والی شے ایک دیگ تھی ڈھکن کھولنے پر وہاں موجود لوگوں نے دیکھا کہ دیگ کے اندر سونے، ہیرے، جواہرات موجود تھے۔ درشہوار بھی وہاں آ گئیں ان کی نظر جیسے ہی اس طرف گئی انہوں نے دیگ کا ڈھکنا دیکھا اس پر بالکل وہی سانپ نما لکیریں بنی ہوئی تھیں جیسی دلکش کی پیشانی پر تھیں ان کا دماغ گھوم گیا اور ان کے کانوں میں سرسراہٹ کے ساتھ ایک آواز بھی سنائی دی۔

"دلکش ہمیں مل گئی یہ دولت تم لے لو"

درشہوار کا خوفناک خواب حقیقت کا روپ بن کر ان کے سامنے تھا اس سے زیادہ ان میں تاب نہ تھی اور وہ چکرا کر وہیں گر پڑیں اور ہوش سے بیگانہ ہو گئیں۔



جل پری

ساحل دعا بخاری

دوسری قسط

اس کے لبوں پر مسلسل منتر جاری تھا۔ لاش میں موہوم سی جنبش ہوئی۔

اس کے منتر پڑھنے میں مزید تیزی آ گئی۔ ہوا تیزی سے چکرانے لگی۔

شام نے اپنے پر سمیٹ لئے تھے اور رات اپنا اندھا چہرہ لئے نکل آئی تھی۔ اندھیرا نابینا عقاب کی مانند فضا میں چکراتا پھرتا تھا۔ سیاہ آسمان پہ ستاروں کی جھلملاہٹ تھی۔ جنگل کے قد آدم تن آور درختوں کے قدموں میں خاموشی محو استراحت تھی۔ قدموں کی چاپ پہ اس نے ناگواری سے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ وہ ایک نسوانی وجود تھا۔ اس کے دائیں کندھے پہ انسانی لاش جھول رہی تھی۔ اس نے خشک گھاس کے اوپر لاش کو لٹا دیا۔ پھر لکڑیاں اکٹھی کر کے لاش کے پاس رکھیں۔ ایک گول دائرہ کھینچا اور ایک چھلکتی بالٹی سمیت لاش کے پاس بیٹھ گئی۔ اس نے گھور کر لکڑیوں کو دیکھا۔ ایک شعلہ سا لپکا اور لکڑیاں جل اٹھیں۔ نارنجی الاؤ میں لڑکی کا سیاہ سوٹ، لاش اور لاش کے گلے پہ بندھی سفید پٹی عیاں تھی۔ وہ زیر لب بڑبڑا رہی تھی۔ آگ کی لپٹیں فضا میں تحلیل ہوتی جا رہی تھیں۔ کافی دیر بعد روزانہ کی طرح خاموشی دوشیزہ کے اس عمل سے اکتا کر دبے پاؤں چلتی دور کہیں چلی گئی۔

کچھ دیر بعد لڑکی نے اپنا دایاں ہاتھ خون کی بالٹی میں ڈبویا اور آگ میں جھٹک دیا۔ آگ مزید بھڑک اٹھی۔ وہ گاہے بگاہے یہ عمل دہرانے لگی۔ اس کے خون میں لبریز ہاتھ جھٹکنے سے آگ کا الاؤ مزید روشن ہو جاتا تھا۔ خون کی بالٹی خالی ہونے تک اس کا جاپ بھی مکمل ہو چکا تھا۔ اس نے بالٹی کے پیندے میں بچ جانے والا خون اور انگاروں کی راکھ لاش کی گردن پہ ڈال دی۔ پٹی وہ پہلے ہی کھول چکی تھی۔ اس نے لاش کے گرد چند چکر لگائے اور دھیرے سے اس کے قدموں میں جھک گئی۔

اس کے لبوں پر مسلسل منتر جاری تھا۔ لاش میں موہوم سی جنبش ہوئی۔ اس کے منتر پڑھنے میں مزید تیزی آ گئی۔ ہوا تیزی سے چکرانے لگی۔ طوفانی انداز میں درختوں کو جڑوں سے اکھیڑنے کی کوشش کرنے لگی۔ ادھر ادھر جھولتے درخت ہوا کے آگے بے بس تھے۔ ہوا کی سیٹیاں بجاتی ”شائیں شائیں“ میں جیسے ہزاروں بدروحیں مل کر بین کر رہی تھیں۔ ماتم کر رہی تھیں۔ نوحہ کناں تھیں۔ لڑکی لاش کے قدموں میں گھٹنوں کے بل بیٹھی تھی۔ اس نے دونوں ہاتھ پوجا کے انداز میں جوڑ رکھے تھے۔ آنکھیں بند تھیں اور ہونٹوں کی باڑھ سے منتر اڑ اڑ کر خشک پتوں کی طرح ہوا میں تحلیل ہوتا جا رہا تھا۔ ہوا اس کی پشت پر بکھرے بالوں کو بھی جڑ سے اکھیڑنا چاہتی تھی۔

لاش ایک دم اٹھ بیٹھی۔ درختوں سے بے چینی سے سر پٹختی ہوا ٹھٹک کر رک گئی۔

”ورشام آقا کی جے ہو۔“ اس نے ہاتھ جوڑے پرنام کیا۔

”ورشام کرانتی سے بہت خوش ہے۔ کرانتی نے اسے نیا جیون دان کیا ہے۔ مانگ کیا مانگتی ہے؟ حالانکہ مجھے ابھی سب کچھ نئے سرے سے شروع کرنا ہوگا۔ مگر

میں پھر بھی تجھے جو مانگے گی دوں گا۔“

وہ گردن پہ ہاتھ پھیر رہا تھا۔ ”آپ مجھ سے شادی کرلیں نا۔“

وہ جادوگر پرتاب کی بیٹی تھی اور شروع ہی سے اسے پسند کرتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ جب اسے درشام کی موت کا علم ہوا تھا تو وہ فوراً وہاں پہنچی تھی اور ایک خاص عمل کے ذریعے اس نے اسے پھر سے زندہ کرلیا تھا۔

”یہ تو میری خوش نصیبی ہوگی۔“ وہ کھل کے ہنسا......

☆......☆......☆

شادی کے بعد وہ واپس ہندوستان چلے گئے تھے۔ کچھ عرصہ وہاں گزار کر دونوں بنگال چلے گئے۔ وہاں اس نے ایک خاص چلہ کرنا تھا۔ کرانتی نے بھی درحقیقت ایک جاپ کرنا تھا۔ وہ جنگل کے پاس واقع ایک چھوٹی سی بستی میں مقیم تھے۔ کرانتی اپنے والدین کی دوسری اولاد تھی۔ مہیش اس سے بڑا تھا۔ وہ صحیح معنوں میں شیطان کا چیلہ تھا۔ وہ انتہائی سفاک تھا۔ اس کی خوراک صرف انسانی گوشت تھا۔ وہ نوجوان لڑکیوں کو پھانستا اور ان سے اپنی ہوس اور بھوک کی آگ بجھاتا۔ اس کا یہ کھیل جاری ہی رہتا، مگر شائنہ کے ہاتھوں وہ اپنے انجام کو پہنچ گیا۔ وہ مسلم تھی اور سچ مچ مہیش کی محبت میں مبتلا ہوگئی تھی۔ جب اسے اس کی اصلیت کا علم ہوا تو وہ شاکڈ رہ گئی تھی۔ وہ ہمیشہ اپنے ساتھ ایک خنجر رکھتی تھی۔ مہیش نے اس کے سامنے خود کو مسلمان ظاہر کیا تھا۔ اور جب اس نے اپنا اصل روپ دکھایا تو وہ اس قدر متحیر ہوئی کہ کوئی ردعمل بھی ظاہر نہ کرسکی۔ جب وہ اسے بے بس کر کے اس پہ حاوی ہوا تو وہ ایک دم حواسوں میں لوٹی تھی۔ اس نے خنجر نکالا اور مہیش کے سینے میں گھونپ دیا۔ مہیش کی بادامی قمیض خون سے سرخ ہوگئی اور وہ سینے پہ ہاتھ رکھے اسے پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھتا رہ گیا۔ خنجر چونکہ شائنہ کے دادا کا تھا جو اس خنجر کے ذریعے کافی عملیات کرچکے تھے۔ لہٰذا جادوگر ہونے کے باوجود مہیش کی موت کا سبب بن گیا۔ شائنہ نے اس کے قتل کا اعتراف کرلیا تھا تاہم چونکہ اس نے یہ قتل اپنے دفاع میں کیا تھا۔ لہٰذا اسے معاف کردیا گیا۔

پرتاب کرانتی کو لے کر افریقہ چلا گیا اور پھر ملکوں ملکوں گھومنے کے باوجود اپنے اکلوتے بیٹے کو نہ بھول پایا۔ اس نے کرانتی سے وچن لیا کہ وہ شائنہ سے مہیش کے قتل کا انتقام ضرور لے گی۔ شائنہ کی شادی بنگال میں ہوئی تھی اور اب کرانتی کو ایک کٹھن جاپ کر کے اس سے بدلہ لینا تھا۔ جبکہ درشام کے ارادے کچھ اور ہی تھے۔ جو فی الحال واقعہ کے اسرار تلے دبے پڑے تھے۔ تاہم وقت جلد ہی انہیں بے نقاب کرنے والا تھا۔

☆......☆......☆

وہ ایک گھنا جنگل تھا۔ کیکر کے درخت کسی عجیب احساس کے تحت دم سادھے ہوئے تھے۔ تاریکی نے چاروں اور اپنے پنجے گاڑ رکھے تھے۔ سناٹا اپنی محبوبہ ”خاموشی“ کا ہاتھ تھامے سارے جنگل میں چکراتا پھرتا تھا۔ کرانتی ایک قدیم درخت کی جڑوں کے پاس بیٹھی جاپ میں مصروف تھی۔ درخت کے چوڑے تنے میں جڑوں کے پاس ایک کھوہ سی تھی۔ تاریخ میں کھوکھلا تھا۔ اس کھوکھلے حصے میں درخت کے اندر ایک چراغ جل رہا تھا۔ اس چراغ کے زرد شعلے میں ایک عجیب و غریب عکس بنتا مٹتا تھا اور سسکیاں ابھرتی تھیں۔ کرانتی نے اپنے جاپ کا آغاز کردیا تھا۔ اسی جنگل کے دوسرے حصے میں ایک نسبتاً کھلے حصے میں درشام بھی اپنے چلے کا آغاز کررہا تھا۔ اس نے حصار کھینچ کر ایک چھوٹی سی مورتی نکالی اور ہاتھ میں پکڑی بوتل میں موجود سیال اس پر انڈیلنے لگا۔ پھر اس نے تیزی سے بڑبڑانا شروع کردیا۔ عمل مکمل کر کے اس نے تیز دھار چاقو سے اپنے دائیں ہاتھ کی انگلی پر کٹ لگایا اور ہاتھ سے خون کی دھار بہہ نکلی۔ خون مورتی پر گرنے لگا۔ پھر اس نے پاس پڑی راکھ اٹھا کر انگلی پر رگڑی اور مورتی اور باقی سامان تھیلے میں ڈال لیا۔ اس کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل چکی تھی۔

☆......☆......☆

وہ سوتے سے ایک دم ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ اس نے دھک دھک کرتے دل کے ساتھ سوئے ہوئے تیمور کو دیکھا اور بے اختیار اس کے لبوں سے ایک پرسکون سانس خارج ہوئی تھی۔ اس نے خواب میں مہیش کی بہن کو دیکھا تھا جو اس کو اس سے چھین کر لے جارہی تھی۔ تیمور سے اس کی شادی گزشتہ سال ہوئی تھی۔ مہیش اس کی زندگی کی ایک بڑی غلطی جسے وہ بھول چکی تھی۔ اب اس کی زندگی کا محور صرف تیمور کی ذات تھی۔ اور وہ اسے کھونے کا تصور بھی نہیں کرسکتی تھی۔ وہ بستر پہ لیٹ گئی اور کچھ ہی دیر میں سوگئی۔ اس کی آنکھ تیمور کی آواز پہ کھلی تھی۔ وہ اٹھی اور فریش ہوکر ناشتہ تیار کرنے لگی۔ گوبھی بھرے پراٹھے اچار والے آملیٹ کے ساتھ تیمور کے فیورٹ تھے۔ تیمور ایک مقامی کمپنی میں جاب کرتا تھا۔ اس کے والدین بھی اچھے تھے اور شائستہ ان کی پسندیدہ بہو تھی۔ وہ پراٹھا بیل رہی تھی جب دروازے پر دستک ابھری۔

”تیمور ذرا دیکھنا کون ہے؟“ اس نے ٹی وی لاؤنج میں بیٹھے تیمور کو مخاطب کیا۔

”یس باس“ وہ شگفتہ انداز میں بولتا چلا گیا۔

”بابو جی! دودھ لوگے کیا؟“

ایک نوعمر لڑکی سرخ ساڑھی میں ملبوس ہاتھ میں بالٹی لئے کھڑی تھی۔ اس کے چہرے کی معصومیت سیدھی دل میں گھس جاتی تھی۔

”اے بابو جی!“ لڑکی نے اس کی آنکھوں کے سامنے شوخی سے چٹکی بجائی۔ وہ ایک دم گڑبڑا گیا۔

”آں، ہاں......“ اس نے دودھ کی بالٹی اس کے ہاتھ سے لے لی اور اندر بڑھ گیا۔ یہ اس کی سپنا سے پہلی ملاقات تھی۔

☆......☆......☆

”شانی! کیوں نہ تم سپنا کو اپنی ہیلپ کے لئے رکھ لو؟ اس طرح تمہیں آرام کے لئے زیادہ وقت ملے گا۔ ان دنوں ویسے بھی تمہیں زیادہ آرام کی ضرورت ہے۔“ وہ کام ختم کر کے نڈھال سی بیٹھی تھی جب تیمور اس کے لئے چائے لے آیا۔ ہر روز تازہ دودھ صبح شام انہیں سپنا کے ذریعے مل جایا کرتا تھا۔

”اب آئی تو بات کروں گی۔“ وہ خود ان دنوں کافی تھک جاتی تھی۔ اگلی صبح سپنا آئی تو اس سے دودھ کی بالٹی لیتے شائنہ نے اس سے بات کی۔

”کیوں نہیں جی!“ وہ مسکرادی اور اس دن سے اس نے گھر کا تقریباً سارا کام سنبھال لیا۔ چند روز یونہی دبے پاؤں گزر گئے۔ اس روز موسم قدرے خراب تھا۔ تیمور کے جانے کے بعد شائنہ کا دل گھبرایا تو وہ یونہی ٹہلنے کی غرض سے باہر نکل گئی۔ سورج بادلوں کی زد میں تھا اور تیز ہوا کے جھکڑ چل رہے تھے۔ ان کے گاؤں سے قدرے ہٹ کر ایک وسیع باغ تھا۔ وہ باغ ایک بیوہ عورت کا تھا۔ صنوبر بی بی بے حد نرم مزاج تھی۔ شائنہ اکثر اس کے باغ میں جاتی رہتی تھی۔ اس وقت بھی وہ باغ میں پہنچی تو صنوبر بی بی پھلوں کی باسکٹ اٹھائے نکل رہی تھی۔ اسے دیکھ کر رک گئی۔

”آؤ شائنہ! تمہاری طبیعت کیسی ہے اب؟“ اس نے باسکٹ وہیں گھاس پر رکھ دی اور خود بھی اس جگہ بیٹھ گئی۔

”جی صنوبر بی بی! بس ٹھیک ہی ہوں۔“ شائنہ زمین پر بیٹھ کر گھاس کی پتیاں نوچنے لگی۔

”یہ کھاؤ۔ ارے تمہاری مہمان چلی گئی؟“ صنوبر بی بی نے اسے ایک سنگترہ چھیل کر دیا۔

”کون مہمان؟“ شائنہ نے سنگترے کی قاش منہ میں رکھی۔ ”ارے وہی سانولی سلونی سی کیا نام بتایا تھا تیمور نے......؟“

”ہاں سپنا۔ ارے وہی جو ناک میں نتھنی پہنے رکھتی ہے۔ تیمور کے ساتھ اکثر یہاں آتی ہے۔ کافی شوخ لڑکی ہے۔“

”نہیں صنوبر بی بی! وہ مہمان تو نہیں وہ تو خانہ بدوشوں کی لڑکی ہے۔“

”اچھا؟ مگر تیمور کے ساتھ اتنا کیوں پھرتی ہے؟ برا نہ ماننا شائنہ! تم میری چھوٹی بہنوں کی طرح ہو۔ میں آج شام میں تمہاری طرف آنے والی تھی۔ گاؤں میں چہ میگوئیاں ہورہی ہیں۔ تیمور اگرچہ سمجھا ہوا ہے مگر

عورت اگر خود ہی گلے کا ہار بننا چاہے تو مرد کو جھٹکتے دیر نہیں لگتی۔" جلا ہوا سنگترہ شائنہ کے ہاتھوں سے چھوٹ کر نیچے جا گرا۔ ان کے سر پہ سایہ فگن سنگتروں کے بلند قامت پیڑوں پر پرندوں نے ایک دم شور مچایا تھا۔ اس کے کان سائیں سائیں کر رہے تھے۔

"ابھی زیادہ دیر نہیں ہوئی۔ تیمور شوہر ہے تمہارا۔ اس پر مکمل حق رکھتی ہو تم۔ اسے سپنا سے نہ ملنے دو۔ مجھے تو ویسے بھی وہ ذرا اچھی نہیں لگی۔" صنوبر بی بی نے اس کی ہمت بندھائی تو وہ بمشکل اثبات میں سر ہلا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

"ابھی زیادہ دیر نہیں ہوئی۔" اس کے دل نے چپکے سے سرگوشی کی تھی۔ تیز ہوا بار بار اس کے قدموں کو اکھیڑنے کی کوشش میں معروف تھی۔ گھر تک پہنچتے پہنچتے اس کے قدم نڈھال ہو چکے تھے۔ اندر آتے اسے گھر کی چھت پہ ریلنگ کے پار نرگس کی جھلک سی دکھلائی پڑی تھی اور اس کے قدم بے اختیارانہ سیڑھیوں کی جانب بڑھ گئے۔ اوپری پورشن خالی پڑا تھا۔ پھر وہاں کون ہوسکتا تھا؟ اس نے دھک دھک کرتے دل کے ساتھ بمشکل سیڑھیاں طے کی تھیں۔ اسٹور روم کا دروازہ نیم وا تھا اور اندر سے دھواں نکل رہا تھا۔ اس نے دروازہ پورا کھول دیا۔ عجیب سی بو کا ایک ناگوار جھونکا اس کی سانسوں سے ٹکرایا تو وہ بے اختیار ابکائیاں لیتی واپس پلٹی۔ وہ ریلنگ تھامے نڈھال کھڑی گہرے گہرے سانس لے رہی تھی جب اس نے تیمور کی سرد آواز سنی۔

"تم نے آج چائے نہیں پی؟"

"تت تم...... آفس نہیں گئے؟" وہ ٹھٹکی تھی۔ وہ بہت بری طرح ٹھٹکی تھی۔ اس کا دل نجانے کیوں یک لخت سکڑ کر پوری قوت سے پھیلا تھا۔

"یہ اب آفس نہیں جاتے۔" سپنا کے لہجے میں عجیب تفاخر تھا۔ "تت...... تیمور......؟" اس نے بے یقینی کے سپاٹ چہرے کو دیکھا۔ "میں سپنا کی نگرانی میں ایک عمل کر رہا ہوں۔ جس سے میں ہمیشہ جوان رہوں گا۔" وہ سرد سے لہجے میں بتا کر واپس اسٹور روم میں گھس گیا۔ سپنا پہلے ہی اندر جا چکی تھی اور شائنہ نے اندر جا کر دیکھا کہ گیس کے چولہے پہ ایک کڑاہی دھری تھی جس میں عجیب سا ملغوبہ دھرا تھا۔ "یہ...... یہ سب کیا ہے تیمور؟" اس کی حیرت بڑھتی جاتی تھی۔ ہوا کے جھونکے اپنے ساتھ گرد و غبار کے مرغولے اٹھا کر گاہے بگاہے آ رہے تھے۔ "اس میں بلی کی چربی......" وہ مزید نجانے کیا کیا بتا رہی تھی جب شائنہ کا ہاتھ سپنا کے رخسار کو دہکا گیا۔ "بکواس بند کرو۔ ہم مسلمان ہیں اور ہمارا ایمان ہے کہ جو اللہ نے طے کر دیا ہے وہی ہوگا۔ کوئی بھی ان ہونے ٹونکوں سے ہمیشہ جوان نہیں رہ سکتا۔"

وہ چونکی تھی جب اس کے بال تیمور کی مٹھی میں جکڑے گئے تھے۔ "تمہاری ہمت کیسے ہوئی سپنا پہ ہاتھ اٹھانے کی؟ اور تم ابھی اپنی شکل گم کرو۔ دفع ہو جاؤ ادھر سے۔" وہ ششدر سی پھٹی پھٹی آنکھوں سے تیمور کے چہرے پہ پھیلے بیگانگی کے سایوں کو دیکھے گئی۔ "کول تیمور...... میں چھوڑ آتی ہوں اسے۔" سپنا نے اس کا بے جان وجود تھام لیا اور اسے گھسیٹتے ہوئے سیڑھیوں تک لائی۔

"چھوڑ دو مجھے ذلیل عورت۔" اس نے ایک دم سپنا کے ہاتھ جھٹکے۔ "مہیش یاد ہے تمہیں؟" شائنہ ٹھٹک کر اس کے تاثرات دیکھنے لگی۔ "میں اس کی بہن ہوں۔ تم نے میرے بھائی کو قتل کیا تھا اور میں تمہارے سامنے تمہارے شوہر کو ماروں گی۔ ابھی دیکھو۔" سپنا ایڑھیوں کے بل گھومی اور چلائی۔ "تیمور بابو......!"

اس کے قریب آتے ہی شائنہ چلانے لگی۔

"تیمور! یہ تمہیں مار دے گی......" تیمور نے ایک حقارت بھری کاٹ دار نگاہ اس پہ ڈالی اور آنکھیں بند کر کے کھڑا ہو گیا۔ سپنا نے کچھ بڑبڑا کر دونوں پر پھونک ماری۔

"اب تم اپنی جگہ سے نہیں ہل سکتے۔" وہ کھل کر ہنسی شائنہ نے آگے بڑھنا چاہا مگر...... وہ اپنی جگہ سے جنبش تک نہ کر سکی۔ اس کا جیتا جاگتا وجود گویا پتھر میں ڈھل گیا تھا۔ اس کا دل پوری شدت سے اندر تک لرز اٹھا۔ وہ پلکیں تک جھپک نہیں پا رہی تھی۔ سپنا نے ہاتھ ہوا میں لہرایا اور اگلے ہی لمحے اس کے ہاتھ میں ایک تیز دھار خنجر چمک رہا تھا۔

"ایسا...... ایسا ہی خنجر تھا نا! جس سے تم نے مہیش کو مارا تھا۔" اس نے خنجر بت بنی شائنہ کے سامنے لہرایا۔

"اب تماشا دیکھو۔" وہ تیمور کی جانب پلٹی۔ شائنہ چلانا چاہتی تھی، اسے روکنا چاہتی تھی، اس سے تیمور کی زندگی مانگنا چاہتی تھی۔ مگر اس کا پورا وجود تو پتھر میں ڈھل چکا تھا۔ وہ صرف دیکھ سکتی تھی۔ خوف کو محسوس کر سکتی تھی۔ تیمور کو اپنی زندگی کو کھونے کا خوف...... کرب کو دل پہ روح پہ جھیل سکتی تھی۔ مگر...... کیا واقعی وہ یہ سب "جھیل" سکتی تھی؟ سپنا نے آگے بڑھ کر خنجر تیمور کے سینے میں گھونپ دیا۔ درد کی ایک چبھتی، بے انتہا چبھتی نوکیلی لہر شائنہ کے دل کو کاٹتی چلی گئی۔ سپنا نے خنجر نکالا تو وہ خون میں تر تھا۔ اور دل کے پاس سے تیمور کی شرٹ خون سے بھیگ چکی تھی۔ تاہم وہ خود بدستور آنکھیں بند کیے مجسمے کی مانند کھڑا تھا۔ شائنہ کے دل نے بے اختیار آنکھیں بند کرنے کی دعا مانگی تھی مگر وہ تو پلکیں تک نہ جھپک سکتی تھی۔

ہوا مٹھیاں بھر بھر مٹی ادھر ادھر پھینک رہی تھی۔ تبھی ہوا کا ایک رحم دل جھونکا شائنہ کے بال اس کے چہرے پہ اس کی آنکھوں پہ لپیٹ گیا۔ یوں وہ اس سفاک منظر کو دیکھنے سے بچ گئی اور جب ہوا نے اس کے بال چھوڑے اور وہ لہرا کر پیچھے پھیلے تو سپنا تیمور کا دل ہتھیلی پہ رکھے اس کو دیکھ رہی تھی اور پھر اس کی آنکھوں کے سامنے وہ تیمور کا دل چبا چبا کر کھا گئی۔ پھر اس نے شائنہ کو پھونک ماری اور اس کا بوجھل بدن ایک دم ہلکا پھلکا ہو گیا اور وہ بری طرح لڑکھڑا کر رہ گئی۔ اس کی ٹانگیں اس کا بوجھ سہارنے سے انکاری ہو گئیں۔ ہوتا ہے نا ایسا...... اور ایسا ہی ہوتا ہے کہ جن پر آپ کو مان ہوتا ہے ایسا گہرا مان کہ وہ آپ آپ کے "اپنے" ہیں، اس قدر اعتبار کہ آپ کو یقین ہوتا ہے کہ پوری دنیا، حتیٰ کہ آپ خود اپنے ساتھ برا کر سکتے ہیں مگر "وہ" نہیں...... اور یہی ہماری سب سے بڑی بھول ہوتی ہے۔ ایک ایسی بھول ہے جسے ہم زندگی بھول نہیں سکتے۔ اگر آپ لاکھ بھولنا بھی چاہیں تب بھی یہ "بھول" اپنا آپ کبھی بھولنے نہیں دیتی...... کہ یہ صدمہ ہی ایسا گہرا ہوتا ہے کہ آپ "شاکڈ" رہ جاتے ہیں۔ جس پر آپ کو اس قدر مان اور اتنا اعتبار ہو اور وہی آپ کو سب سے زیادہ دکھ دے آپ جس کے بارے میں سمجھتے ہیں کہ پوری دنیا آپ کے ساتھ برا کر سکتی ہے مگر ایک وہ نہیں، جب "وہی" آپ کے ساتھ پوری دنیا سے زیادہ برا کرے، آپ کو اتنا دکھ دے، اتنی اذیت دے کہ جس قدر پوری دنیا مل کر بھی نہ دے سکتی ہو، تو آپ حیران ہونے کے علاوہ اور کچھ کر بھی نہیں پاتے، آپ کو حیرت کا ایک ایسا شاک لگتا ہے کہ آپ ٹھیک سے حیران بھی نہیں ہو پاتے۔ کبھی کبھی یہ "شاک" تمام عمر پہ محیط ہو جاتا ہے۔ روز و شب ماہ و سال حتیٰ کہ زندگی گزرتی چلی جاتی ہے مگر آپ اس "ایک لمحے" میں معلق رہتے ہیں...... ہوا کا ایک تند جھونکا اسے چھو کر گزرا تھا۔ اور یہ "چھونا" ہی قیامت ہو گیا۔ وہ بری طرح لڑکھڑائی اور چونکہ وہ سیڑھیوں کے پاس ہی کھڑی تھی سو سیڑھیوں پہ لڑھکتی چلی گئی۔ اس کے سیڑھیوں سے گرتے ہی فرشتہ اجل نے اس کے لبوں سے "جام اجل" لگا دیا جسے وہ چپ چاپ پی گئی اور یہ سب کو پینا ہی پڑتا ہے۔ آپ نہ چاہیں تب بھی۔

☆......☆......☆

وہ اماوس کی اندھی رات تھی، جس کی بینائی کا چاند اس سے چھن چکا ہے۔ اور اندھی رات، اندھی محبت کی طرح بھول بھلیوں میں ٹھوکریں کھاتی پھرتی تھی۔ وہ ٹٹول ٹٹول کر قدم رکھتی آگے بڑھ رہی تھی جب اس کے کانوں میں کسی کی درد بھری سسکیاں ٹکرائیں۔ رات کے قدم زمین کی دلدل نے جکڑ لیے۔ اس کا دل بے ساختہ لرز اٹھا۔ "ورشام! مم...... مجھے چھوڑ دو پلیز......" کرانتی کی سہمی لرزتی آواز پہ رات نے سانس تک روک لیا۔

"سوری ڈیئر...... لیکن مرنا تو تمہیں پڑے گا۔ تم نے اپنی ساری سکھیاں محفوظ کرنے کے خیال سے جس

ہیرے میں خلل کی تھیں وہ ہیرا اس وقت میرے قبضے میں ہے۔ سوسوری ڈیئر! لیکن میں ہمیشہ تمہیں گلے میں لٹکائے نہیں رکھ سکتا۔'' درشام کے ہلکے پھلکے لہجے میں سفاکیت محسوس کرتے ہی رات نے دل پہ ہاتھ رکھ لیا۔

''تم یہ کیوں بھول رہے ہو کہ اگر آج تم زندہ ہو تو میری وجہ سے۔'' کراہتی بے بسی سے کراہی۔ ''بھولنا پڑتا ہے ڈارلنگ! بھولنا پڑتا ہے۔'' اور پھر ایک گھٹی گھٹی سی چیخ ابھری اور چند گھڑی، زندگی اور موت کے بیچ معلق ہانپتی سانسیں...... مچلتی، ماہی بے آب کی مانند تڑپتی سانسیں...... اور پھر خاموشی...... طویل ترین خاموشی...... رات ہراساں سی آگے کو بڑھ گئی اور دن کے آتے ہی رات نے اسے سارا واقعہ کہہ سنایا۔ جواباً دن نے بھی شائنہ کی روداد سنا ڈالی۔ ''وہ بہت بے بس تھی۔ درشام نے اسے مار ڈالا۔

''دوسروں کو بے بس کر کے حظ اٹھانے والے خود بھی کبھی نہ کبھی بے بس ہو جاتے ہیں۔'' دن نے لاپروائی سے کہا اور رات کو الوداعی انداز میں ہاتھ ہلاتے ہوئے یاسیت بھرے انداز میں گویا ہوا تھا۔ ''اگر کسی بے بس کی ''بے چارگی'' پہ رحم کرو گی تو کل اللہ بھی تم پہ رحم کرے گا، وگرنہ لوگوں سے بے رحمی برتتے ہوئے تم اللہ سے کیسے رحم کی امید رکھ سکتی ہو؟'' رات کے قدم تھم گئے۔ وہ چونک کر پلٹی اور پھر اثبات میں سر ہلا کر مسکراتے ہوئے آگے بڑھ گئی۔

☆......☆......☆

سانس کی ڈور پہ چلتی آگ
کب تک روح میں ڈھلتی آگ
کتنے شہر اجاڑ گئی
راکھ بدن پر ملتی آگ
آج کا روز تھا، حشر کا روز
کاش! اس روز نہ جلتی آگ
دریاؤں کو چھاننک چکی
پیاس کی گود میں پلتی آگ
آ پہنچی ہے دار کے پاس
عشق کے پھول مسلتی آگ
جلا کر سب کچھ راکھ کرے گی
خود بھی ازل سے جلتی آگ
بے چینی دے کر کوئی بھی چین نہ پائے
وہ دیکھو! ہاتھ پہ ملتی آگ''

اس کا وجود شعلوں میں گھرا تھا نارنجی زرد آگ کے فلک بوس شعلے...... جو اس کے دل، اس کے دماغ، اس کے وجود اور اس کی روح کو جلائے دیتے تھے۔ سلگائے دیتے تھے۔ راکھ کئے دیتے تھے...... ''ماہ شب!'' ثمران نے بے قراری سے اسے پکارا۔ اس نے ذرا سی گردن ترچھی کی تو اس کے چمکدار سیاہ بالوں نے اوپر سر ابھارا اور پھر ساکت ہو گئے۔ اس نے اضطراب میں گھرے ثمران غنی کو دیکھا۔ ایک نگاہ، غلط انداز ڈالی جو نہ تو طیش کی حامل تھی نہ تحیر کی...... اس میں صرف بے بسی و بے چارگی تھی۔ ''مم...... مجھے معاف کر دو۔'' درشام کی آواز پہ لرزہ طاری تھا۔ جواباً ثمران کی بھرپور ٹھوکر اسے خاک چاٹنے پہ مجبور کر گئی۔ وہ اٹھا اور اوندھے پڑے درشام کو روئی کی طرح دھنکنے لگا۔ وہ اس وقت سوچنے کی سمجھنے کی صلاحیتوں سے ماورا ہو چکا تھا۔ اسے صرف یہ علم تھا کہ ماہ شب کو دکھ دینے والا یہ شخص ہے۔ اس کی کانچ کی سی آنکھوں میں نمی کا سبب یہ شخص ہے اس کے دل کو اذیت کے کربناک شکنجے میں جکڑنے والا یہی ہے۔ ''ثمران ...... ثامی!'' ماہ شب کی پکار پہ وہ رک گیا۔ وہ خود بھی ہانپ رہا تھا۔ اور درشام تو صرف چیخنے کے علاوہ اور کچھ کر بھی نہ پایا تھا۔ اس کے سارے منتر، ساری شکتیاں ماہ شب کے سامنے منجمد ہو گئی تھیں۔ اور اس وقت وہ ایک عام انسان تھا۔ وہ اسے کھینچ کر ندی کے کنارے تک لے گئی۔ اس نے ندی کی سمت منہ کر کے اجنبی زبان میں کچھ کہا۔ اگلے ہی لمحے ثمران کی بصارتوں نے ایک حیرت ناک منظر دیکھا۔ لاتعداد مچھلیاں اور دیگر آبی مخلوق کنارے پہ جمع ہو گئی۔ ماہ شب نے اسی زبان میں پھر کچھ کہا اور وہیں وہ سب درشام پہ جھپٹ پڑے۔ اس کے حلق سے چیخ تک نہ نکلنے پائی تھی

اور محض چند لمحوں میں اس کی ہڈیاں تک غائب تھیں۔ اس کام سے فارغ ہو کر آبی مخلوق سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔ اس کے اشارہ کرنے پر وہ سب پانی میں کود گئیں۔ ''چھپاک، چھپاک، چھپاک......'' پانی کی بوندیں اوپر ابھرتیں اور پھر پانی میں مدغم ہو جاتیں۔ کتنی ہی دیر تک پانی میں لہریں بے چین رہی تھیں۔ ثمران تھکے تھکے سے انداز میں ندی کنارے بیٹھ گیا۔ اور ماہ شب بھی اس کی تقلید کی تھی۔ ان کے پاس ایک دوسرے سے کہنے کو کچھ بھی نہ تھا۔ وہ اسے تسلی دینا چاہتا تھا۔ مگر سارے الفاظ اس کے غم کے آگے ہیچ تھے۔ دنیا کی کسی ڈکشنری میں وہ الفاظ نہیں جو سب کچھ کھونے والے شخص کو دوبارہ پہلے مقام پر، اسی جگہ لا کر کھڑا کر سکیں۔ ماہ شب کی دنیا لٹ گئی تھی۔ اور جس کی پوری کائنات لٹ جائے، سب کچھ چھن جائے، آپ چاہ کر بھی اسے تسلی نہیں دے پاتے۔ کتنے ہی لمحے چپ چاپ سر جھکائے خاموشی سے گزر گئے۔ پھر ماہ شب نے چہرہ ہاتھوں پہ گرا کر گھٹنوں پہ ٹکا لیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ ہچکیوں سے اس کا پورا وجود لرز رہا تھا۔ وہ اسے بے بسی سے دیکھتا رہا اور اضطراری انداز میں سب چکنا تا رہا کہ اس کے علاوہ وہ اور کر بھی کیا سکتا تھا؟ کچھ نہیں...... وہ کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔

☆......☆......☆

صدیوں سے راہ تکتی ہوئی وادیوں میں گم
اک لمحہ آ کے ہنس گئے، میں ڈھونڈتا پھرا
تم پھر نہ آ سکو گے، بتانا تو تھا مجھے
تم دور جا کے بس گئے میں ڈھونڈتا پھرا

وہ ندی کنارے پر پانی میں لٹکائے بیٹھی تھی۔ چودھویں کا چاند فراخ دلی سے اپنی ساری چاندنی نچھاور کر رہا تھا۔ اس کا اجلا سفید فراک اور سفید چاندنی کی سی دمکتی رنگت سے گویا کرنیں سی پھوٹ رہی تھیں۔ اس کی نظریں ساکت پانی پہ جمی تھیں۔ بہ ظاہر سپاٹ نظریں مگر جن کی تہہ میں دکھ مضطرب سا سر پٹکتا تھا۔ ثمران اس سے کچھ فاصلے پہ گھٹنوں کے گرد ہاتھ لپیٹے بیٹھا اس کو تک رہا تھا۔ اس کا ہر عضو، ہر مسام، روم روم بصارت میں ڈھلا ماہ شب کو تک رہا تھا۔ اس کی بھری، عشق کی سرحدوں کو چھوتی نظریں عقیدت و احترام کے احرام باندھے اس کے چہرے، اس کے وجود کا طواف کر رہی تھیں۔ ''ماہ!'' محبت سے لبریز پکار پہ اس نے سر گھمایا۔ اس کی صراحی دار گردن اور چہرہ ہیرے کی مانند جگمگایا تھا۔

''کیا سوچ رہی ہو؟'' وہ محض نفی میں سر ہلا کر رہ گئی۔ ''ماہ! تم پانی میں پانی کی طرح تحلیل ہو سکتی ہو؟''

''ہاں، کیوں؟'' اس نے استفسار کیا۔

''ماہ! ہو سکتا ہے کہ...... میرا مطلب ہے کہ اس درخت کی شاخوں میں خون گردش کرتا تھا نا! تو ہو سکتا ہے کہ شاہ لبریز بھی اس میں تحلیل ہو گیا ہو اور زندہ ہو......'' ماہ شب نے بری طرح چونک کر سر اٹھایا۔ چاند کی ساری روشنی یکدم اس کی آنکھوں میں سمٹ آئی تھی۔ ''یہ...... یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا۔ ایسا...... ایسا واقعی ممکن ہے۔ بلکہ یقیناً شاہ لبریز خون میں تحلیل ہو گیا ہوگا۔ اوہ ثامی! یو آر سو گریٹ......'' خوشگوار حیرت کی لذت سے اس کی آواز لڑکھڑا رہی تھی۔ ''خوشی سے بھرپور لہجے میں ڈگمگاہٹ تھی۔ ''شاہ لبریز زندہ ہے۔ ثامی میرا شاہ لبریز زندہ ہے۔'' وہ خوشی سے بے قابو ہوتی اس کا بازو جھنجھوڑنے لگی۔ وہ مسکراتے ہوئے خوشی سے جھلملاتی اس کی آنکھیں دیکھنے لگا۔ اداسی کہیں فضا میں تحلیل ہو گئی تھی۔ ندی کے تین اطراف کھڑی فصلیں خوشی کی چاندنی میں نہا کر جھومنے لگی تھیں۔ ندی کا شفاف پانی یکا یک چاندی میں ڈھل گیا تھا۔ آم سفیدے اور سنبل کے بلند قامت پیڑ مسکرا رہے تھے۔ چاند کی روشنی یک لخت ہزاروں گنا بڑھ گئی تھی اور ہوا بھی خوشی کے گیت گاتی اپنا آنچل لہراتی نکل آئی تھی اور سب صرف اسی لئے تھا کہ اس کے سامنے موجود، اس کی زندگی، اس لڑکی کا وجود خوش تھا، اس کے لبوں پہ ایک بھرپور مسکراہٹ بکھر گئی تھی۔

☆......☆......☆

''ثامی! کیا ہو گیا ہے تمہیں؟'' وہ سفیدے کے

خوشبودار پیڑ کے تنے سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ خاموشی کے وجود میں پرندوں کی گاہے بگاہے ابھرتی آوازیں دراڑیں ڈال دیتی تھیں۔ پیڑ خاموش تھے۔ بہار آخری سانسوں پہ تھی اور خزاں اپنا زرد وجود لئے دھیرے دھیرے درختوں کی رگوں اپنے نوکیلے پنجے گاڑ رہی تھی۔ خودرو گھاس پہ زرد اور خشک پتوں کا ڈھیر تھا، جو ہر سو بکھرا پڑا تھا۔ رومان اس کے پاس آ کر دھپ سے گھاس پہ بیٹھا۔

"تجھے کیا ہونا ہے؟" اس نے سر جھکا تھا۔

"اس قدر کھوئے کھوئے اور آدم بیزار کیوں ہو گئے ہو؟" رومان نے اسے گھورا۔ "کچھ نہیں یار!" وہ پھیکے سے انداز میں مسکرا دیا۔ "ثامی......؟" رومان کا انداز تنبیہی تھا۔

"مجھ سے بھی چھپاؤ گے؟ کیوں خود سے لڑ رہے تھے؟ آخر کون سی جنگ چھڑی ہے تمہارے اندر؟"

"کہا نا کچھ نہیں ہوا مجھے۔" وہ ایک دم گیلی لکڑی کی طرح چٹخا تھا۔

"ثامی؟"

"کیا ہے، کیا چاہتے ہو، جب کچھ ہے ہی نہیں تو کیا جاننا چاہتے ہو تم؟"

"وجہ......" رومان نے اس کی سیاہ گھور آنکھوں میں وجہ کھوجی تھی اور وہ ایک دم پژمردہ سا ہو گیا۔ اس نے تھکے تھکے سے انداز میں سفیدے کے تنے سے ٹیک لگالی اور گویا ہوا۔

"یارا میں...... میں اس کے بغیر رہ نہیں پا رہا۔ میں نے بہت کوشش کی ہے، بہت لڑا ہوں خود سے...... مگر...... میں خود کو اس سے محبت کرنے سے روک نہیں پاتا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ میرے لئے نہیں کسی اور کے لئے بنی ہے۔ اس کے وجود، اس کے دل اور اس کی روح پر کسی اور کا حق ہے۔ پھر بھی...... پھر بھی کیوں؟" اس نے بے بسی سے دائیں ہاتھ کا گھونسہ بھینچ کر گھٹنے پہ مارا تھا۔ "محبت ایسی ہی قابض اور منہ زور ہوتی ہے۔ بنا دستک دیئے زبردستی اندر گھس آتی ہے اور پھر ہمیشہ کے لئے دل میں ڈیرہ جمالیتی ہے۔ یہ بھی نہیں دیکھتی کہ جس کی پرستش کر رہی ہے وہ کسی اور کے لئے ہے، کسی اور کا ہے...... یہ تو بس خود کو دیکھتی ہے۔ اپنی طلب، اپنی چاہ کے علاوہ اسے کچھ درکار نہیں اور محبت کی چاہ کیا ہے؟ "وہ" خوش رہے۔ باقی پوری دنیا حتیٰ کہ انسان کا اپنا وجود بھی جائے بھاڑ میں محبت کی دنیا ایک اسی شخص سے شروع ہو کر اس پہ ختم ہوتی ہے۔"

"ثمران! تم ایک محبت کے پیچھے باقی سب کی محبتیں فراموش کیوں کر رہے ہو؟ آنٹی انکل، رومیہ اور......"

"اور تم۔"

ثمران مسکرایا تھا۔ مگر وہ خالص مسکراہٹ نہیں تھی۔ وہ درد کی انتہاؤں کو چھوتی مسکراہٹ تھی۔ "پتہ نہیں کیوں آج کل کچھ بھی اچھا نہیں لگتا یارا! کتنی عجیب بات ہے رومی! کہ ہم اپنے سارے جذبات ساری محبتیں اس شخص کے نام کر دیتے ہیں جنہیں ہماری پرواہ ہماری محبتوں کی ضرورت بھی نہیں ہوتی۔ اس کے لئے ہمارے جذبات......" اس نے سفیدے کا ایک زرد پتہ اٹھالیا۔ "ان پتوں کی طرح بے وقعت ہوتے ہیں۔ خزاں کی زد میں آئے ان زرد پتوں کی طرح...... جنہیں کسی بھی لمحے گرا دینا مشکل نہیں...... جیسے یہ درخت ان پتوں کو دامن جھاڑ کر گرا دیتے ہیں۔" وہ یاسیت سے بول رہا تھا رومان کو بے اختیار دکھ ہوا۔ "تم ایسے کیوں بول رہے ہو؟"

"کیونکہ اس کے نزدیک میرے جذبات، میری محبت اس خزاں رسیدہ پتے کی سی ہے۔ جسے وہ کسی بھی لمحے اکتا جانے پہ جھاڑ سکتی ہے۔

اسے کہوں ناز اداواں دا......

اسے کہوں مان وفاواں دا......

ای پیلے پتے درختاں دے

سانوں رہندا خوف ہواواں دا......

اس نے سفیدے کا زرد پتہ ہتھیلی پہ رکھ کر پھونک ماری۔ پتہ اڑ کر ہوا کا سہارا ڈھونڈنے کی سعی کرنے لگا۔ لیکن خشک پتوں کو کون سہارا دیتا ہے بھلا؟ ہوا نے ہاتھ جھٹک کر اپنا دامن چھڑا لیا۔ پتہ بے یار و مددگار زمین بوس ہو گیا...... خاموشی اداسی کا آنچل اوڑھے کران کے بیچ آن بیٹھی...... "چل ثامی! گھر چلتے ہیں۔" رومان نے اسے بازو سے پکڑ کر اٹھایا اور وہ ایک طویل سانس خارج کرتا اٹھ گیا۔ اداسی چپ چاپ اس کے ساتھ چل دی تھی۔

☆......☆......☆

"ثمران!" وہ بیڈ پہ لیٹا قصص الانبیاء کا مطالعہ کر رہا تھا۔ جب ایک دم ماہ شب نمودار ہوئی تھی۔

"تم...... بیٹھو۔" وہ ایک دم سیدھا ہو بیٹھا۔ اور احتراماً پاؤں سمیٹ لئے۔ "یہ کیا پڑھ رہے ہو؟"

"انبیاء کرام علیہم السلام کے واقعات ہیں۔" ثمران نے کتاب کو شیلف میں رکھا۔ "تم بتاؤ کیا رہا؟"

ماہ شب نے رات کو ایک عمل کیا تھا۔ جس میں اسے شاہ لبریز کے بارے میں پتہ چلنا تھا۔ "وہ واقعی زندہ ہے۔ مگر بہت اذیت میں ہے۔ وہ اس درخت سے تب تک نہیں نکل سکتا، جب تک کہ کوئی درخت کو کاٹ نہ دے اور...... میں جا رہی ہوں۔ دعا کرنا کہ وہ درخت جلد مل جائے۔" وہ سفید باریک دوپٹہ ہاتھ پہ لپیٹتی مضطرب سی تھی۔

"کیا تمہیں نہیں پتہ کہ وہ درخت کہاں ہے؟" ثمران کا انداز پر استعجاب تھا۔ "نہیں۔ وہ درخت ڈھونڈنا پڑے گا۔ گو کہ میرے پاس جسمانی طاقت ہے اور میں تھوڑی ہی دیر میں جہاں چاہوں جا سکتی ہوں۔ میرے پاس پراسرار علوم بھی ہیں۔ مگر یہ محدود ہیں۔" وہ دائیں ہاتھ کی انگلیوں سے پیشانی مسل رہی تھی۔

"کب جاؤ گی؟" وہ اٹھ کر اس کے مقابل جا بیٹھا۔

"آج ہی۔"

"میں بھی تمہارے ساتھ چلوں۔" وہ فیصلہ کن لہجے میں اسے حیران کر گیا۔

"تم؟"

"کیوں، میرے سر پہ سینگ ہیں جو میں تمہارے ساتھ نہیں جا سکتا؟" وہ چڑ کر بولا۔

"نہیں مگر تم...... نہیں، میں ایسا نہیں کر سکتی۔" وہ سختی سے گویا ہوئی تھی۔ ثمران کے چہرے پہ سایہ سا لہرا گیا۔ جب وہ بولا تو اس کا لہجہ مدھم تھا۔ سرگوشی سے مشابہ...... "ماہ! کیا اتنا حق بھی نہیں دو گی؟" سیاہ آنکھیں شکوہ کناں تھیں۔

"اوکے...... تم بھی چلو۔" وہ اسے تاسف سے دیکھ رہی تھی۔

"ابھی نہیں ماہ! میں رومیہ کو رومان کے سنگ رخصت کر لوں۔ چند دن تو انتظار کر لوں گی نا پلیز......؟" لجاجت سے بولتا وہ اسے عرق ندامت میں شرابور کر گیا۔ "کر لوں گی بابا! تم بھی نا ثامی! حد کرتے ہو۔ تم اطمینان سے ان کی شادی کی تیاریاں کرو۔" وہ ہلکے پھلکے لہجے میں بولتی وہاں سے غائب ہو گئی تھی۔

☆......☆......☆

رومان کی شادی کی ڈیٹ فکس ہو گئی تھی اور اس خوشی میں گاؤں بھر میں مٹھائی بانٹی گئی تھی۔ "کتنے کنجوس ہو تم۔"

ثمران نے رومان کے کندھے پہ دھپ ماری۔

"ارے! میں نے کون سی کنجوسی دکھائی ہے؟" وہ کندھا سہلاتا کراہا کہ ثمران کا ہاتھ خاصا بھاری تھا۔ "پورے گاؤں کو تم نے اپنی شادی کی خوشی میں مٹھائی کھلائی ہے۔ لیکن مجھے نہیں۔"

"ابے سالے! سب سے زیادہ تو تمہارے گھر بھجوائی ہے۔"

"اے! یہ سالا کسے کہا تو نے؟ اب اگر تو نے یہ نامعقول لفظ بولا نا تو میں تیرا سر توڑ دوں گا۔" وہ خطرناک تیوروں سے اس کی جانب بڑھا۔

"اوکے، اوکے...... سوری۔" رومان نے ہاتھ اٹھا کر مصالحت آمیز انداز میں کہا تھا۔

"تمہیں پتہ ہے کہ میں مٹھائی نہیں کھاتا۔ بٹ

آئس کریم چلے گی۔" اور کچھ دیر بعد وہ دونوں آئس کریم کھا رہے تھے۔

"ثانی! مجھے آج صفیہ آنٹی نے بلایا تھا۔" رومان کے سنجیدہ لہجے پہ وہ ہاتھ روک کر اسے دیکھنے لگا۔

"وہ کہہ رہی تھیں کہ میں تم سے سارہ کے سلسلے میں بات کروں۔" وہ ایک طویل سانس لے کر رہ گیا۔ امی بابا نے اس سے بات کی تھی۔ وہ اس کی شادی سارہ سے کرنا چاہتے تھے مگر اس نے انکار کر دیا تھا۔ "یار! تم انکار کیوں کر رہے ہو؟ کیا کمی ہے سارہ میں؟" وہ سر جھکائے آئس کریم کے کرسٹل باؤل میں چمچ گھما رہا تھا۔ آئس کریم پگھلتی جا رہی تھی۔ "بات کمی کی نہیں ہے رومی! لیکن میں شادی نہیں کر سکتا۔" اس کا لہجہ مدھم مگر مضبوط تھا۔

"تم جانتے ہو ثانی! کہ تمہاری محبت سراب ہے۔" رومان تلخ ہوا۔ ثمران کا آئس کریم گھولتا ہاتھ رک گیا۔ "محبت کبھی بھی سراب نہیں ہوتی۔" وہ ایک ایک لفظ پہ زور دے کر بولا۔ "اور مسٹر رومان نصیر! محبت صرف "پا" لینے ہی کا نام نہیں ہے۔ اگر وہ مجھ سے محبت نہیں کرتی، مجھے مل نہیں سکتی تو میں اس سے محبت کرنا چھوڑ دوں؟ یہ محبت تو نہ ہوئی۔ یہ تو تجارت ہوئی، سودے بازی ہوئی۔ محبت، "غرض" سے پاک ہوتی ہے۔ رہا شادی کا سوال، تو تم اچھی طرح جانتے ہو کہ میں منافق ہوں، نہ ہی خائن...... شادی کے بعد میاں بیوی ایک دوسرے پہ مکمل حق رکھتے ہیں۔ مگر میرے دل میں صرف وہ ہے اور وہ جب میں کسی اور لڑکی کو دل میں جگہ نہیں دے سکتا تو اسے زندگی میں کیسے شامل کرلوں؟ دل میں اور، زندگی میں کوئی اور...... نیور......" وہ قطعی انداز میں کہتا، کرسی دھکیلتا لمبے لمبے ڈگ بھرتا چلا گیا۔ رومان لب بھینچے بیٹھا تھا۔

☆......☆......☆

دوپہر کی دھوپ آنگن میں بکھری تھی۔ وہ جامن کے پیڑ تلے چارپائی پہ لیٹا سوچوں میں گم تھا جب صفیہ چلی آئی۔ "ثمران بیٹا! مجھے بازار تو لے چلو۔ فرنیچر کا آرڈر دینا ہے اور رومیہ کو بھی کچھ چیزیں لینی ہیں۔"

"جی!" وہ اٹھ گیا۔ فرنیچر کا آرڈر دے کر وہ لوگ باہر نکلے تھے کہ صفیہ خالہ کو ان کی ایک دوست مل گئیں۔ ان کے بے حد اصرار پر صفیہ رومیہ کے ہمراہ ان کے گھر چلی گئیں۔ "ثمران تم بھی آ جاؤ، کھانا کھا کر جانا۔"

"نہیں خالہ! پھر کبھی سہی۔ میں چلتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے۔ شہریار ہمیں چھوڑ آئے گا۔" صفیہ کی بات پہ وہ اثبات میں سر ہلاتا رخصت ہو لیا۔ اس کے گھر تک پہنچتے پہنچتے آسمان پر آوارہ بادل منڈلانے لگے تھے۔ عثمان غنی ڈیرے پر گاؤں کے دیگر مردوں کے ساتھ بیٹھے تھے۔ وہ سیدھا گھر چلا گیا۔ تیز ہوا کے جھکڑ چلنے لگے۔ اور پھر بارش کی بوندیں تشنہ زمین کو سیراب کرنے لگیں۔ وہ برآمدے کے سفید ستون سے کندھا لگائے گرتی برستی بوندوں پہ نگاہ جمائے ہوئے تھا۔ ہوا کے قدم تھم چکے تھے اور وہ ساکت کھڑی بارش میں نہا رہی تھی۔ جب بھی ہوا اپنی دراز زلفوں کو جھٹکتی تو بارش کی بوندیں اس کے بالوں سے سیدھی ثمران پہ جا پڑتیں۔ اس کا نیوی بلیو ٹراؤزر اور گرے پپ کلر کی ٹی شرٹ پہ جا بجا بارش کے چھینٹے تھے۔ دستک کی آواز پہ پہلے تو وہ یہ سمجھا کہ ہوا کی کارستانی ہے۔ مگر مسلسل ہوتی دستک پہ وہ دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ آسمان پر بجلی کڑکی تھی۔ اس نے دروازہ کھول دیا۔ اندر آتی سارہ کو دیکھ کر اس کا حلق تک کڑوا ہو گیا۔ اس نے ایک ڈھکی ہوئی ٹرے اٹھا رکھی تھی۔ بھیگے وجود کے ساتھ دوپٹہ سلیقے سے شانوں پر پھیلائے وہ اس سے مخاطب تھی۔

"رومیہ کہاں ہے؟ وہ میں یہ لائی تھی۔" وہ اس سے ویسے ہی چڑا ہوا تھا۔ اور اس کی ساری جھلاہٹ لہجے کی کڑواہٹ میں سمٹ آئی۔

"لے جاؤ یہ ہمیں کوئی ضرورت نہیں ہے تمہاری عنایات کی۔ اگر تم یہ سمجھتی ہو کہ تم اس طرح سے مجھے جیت لو گی تو یہ محض تمہاری خوش فہمی ہے۔" اس نے ترشی سے کہتے ٹرے جھٹکی۔ ٹرے الٹ کر پختہ فرش سے جا ٹکرائی اور کرسٹل کا باؤل ایک چھناکے سے ٹوٹ گیا۔ اس کی کرچیاں اور گاجر کا حلوہ بکھر گیا۔ وہ بت بنی کھڑی رہ گئی۔ بادلوں نے کسی بات پہ تلملا کر بجلی کو پوری قوت سے چابک رسید کی تھی۔

"دفع ہو جاؤ ادھر سے۔" بجلی بری طرح تڑپتے ہوئے دور تک لڑھکی اور سیدھی سارہ کے دل پہ آن گری۔ اس کے چہرے پہ زلزلے کے آثار نمودار ہوئے اور وہ میکانکی انداز میں چلتی نیچے بیٹھ کر کرچیاں چننے لگی۔ کانچ کا ایک نوکیلا ٹکڑا اس کی انگلی میں کھبا، اور بڑی زور سے چبھا تھا۔ بھل بھل بہتے خون کو دیکھ کر بھی اسے ذرہ بھر تکلیف نہ ہوئی تھی۔ وہ مٹھی دبائے اٹھی۔

"میں مانتی ہوں کہ میں آپ سے محبت کی گنہگار ہوں۔ لیکن...... میں نے کبھی ان آنکھوں میں آپ کو پانے کے خواب نہیں سجائے۔" وہ بری طرح ہونٹ کچلتی بول رہی تھی۔ اس کی انگلی سے نکلتا خون بارش کے پانی کے ساتھ مل کر بہہ رہا تھا۔ "اور اگر کوئی خواب ان میں اترا بھی تو میں نے فوراً ہی نوچ کر پھینک دیا۔ کیونکہ میں اپنی حیثیت سے واقف ہوں اور اپنی اوقات میں رہنا بخوبی جانتی ہوں۔ میں نہیں جانتی کہ جو راز میں خود سے بھی چھپائے ہوئے تھی وہ آپ پہ کیسے عیاں ہو گیا۔ مگر اللہ کی قسم میں نے کبھی اس طرح نہیں سوچا۔" اس نے ایک نگاہ نادم سے کھڑے ثمران پہ ڈالی۔ اور ایک دم پلٹ کر بھاگ گئی۔ وہ پشیمان سا کھڑا تھا۔

☆......☆......☆

چاند تاریکی کا سینہ چیرتے نمودار ہوا تو تاریکی اپنا زخم وجود لئے چلاتی ہوئی بھاگ اٹھی۔ چاند اپنی روشنی زمین پر نچھاور کرتا مسکرا رہا تھا۔ گاؤں سے پرے درختوں کا ایک جھنڈ تھا۔ یہ جنگلی کیکر کے درخت تھے۔ ان درختوں کے بیچ ایک شخص موجود تھا۔ اس نے ایک سرخ رنگ کا دوپٹہ نکال کر زمین پر رکھ دیا۔ پھر اس پہ ذرا سا راکھ نما سفوف چھڑکا۔ دوپٹے نے آگ پکڑ لی۔ وہ تیزی سے بڑبڑاتے دوپٹے کے گرد چکرانے لگا۔ چاند نے تعجب سے آنکھیں پٹپٹاتے ہوئے یہ منظر دیکھا تھا۔ سفید چاندنی میں نہائی رات بھی ششدر تھی۔ آج اسے بصارت ملی ہوئی تھی۔ لہٰذا وہ کھلی آنکھوں سے سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ دوپٹہ بھڑ بھڑ جل رہا تھا مگر آس پاس کی جھاڑیاں اور گھاس محفوظ تھی۔ جب دوپٹہ مکمل راکھ میں تبدیل ہو چکا تو اس نے راکھ سمیٹ کر ایک چوڑے منہ کی شیشی میں محفوظ کر لی اور وہاں سے چل دیا۔

☆......☆......☆

21 ستمبر کو مہندی تھی۔ ثمران نے برقی قمقموں اور پھولوں سے گھر سجایا تھا۔ صحن میں ہی اسٹیج بنایا گیا تھا۔ ساری آرائش ہلکے زرد اور انگوری کلر میں کی گئی تھی۔ قدرتی پھولوں سے سجا جھولا خوشبوئیں لٹا رہا تھا۔ رومیہ انگوری اور زعفرانی مغلئی طرز کا لباس پہنے بے حد حسین لگ رہی تھی۔ اس کے پاس بیٹھے رومان نے وائٹ شلوار کرتہ پہن رکھا تھا۔ گلے میں اس نے دھنک رنگ دوپٹہ ڈال رکھا تھا۔ ان کے سامنے ٹیبل پہ پھولوں کے تھال میں مہندی کی کٹوری اور دیگر لوازمات اردگرد رکھے تھے۔ ماحول میں خوشیاں بکھری ہوئی تھیں۔ دھنک رنگ آنچل لہرا رہے تھے۔ مختلف خوشبوئیں ایک دوجے کے گلے ملتیں چکرا رہی تھیں۔ آوازیں اور نقرئی ہنسی فل والیوم ڈیک پہ بجتے میوزک کے باوجود نمایاں تھیں۔ ثمران سفید کرتہ شلوار میں ملبوس بازو کہنیوں تک فولڈ کیے کام میں مصروف تھا۔ قدرے بڑھی ہوئی شیو کے ساتھ وہ قدرے تھکا تھکا سا محسوس ہو رہا تھا۔ مگر اس کی سیاہ آنکھوں کی چمک مسکرا رہی تھی۔ وہ صائم کو کھانا لگوانے کے متعلق ہدایات دے کر پلٹا تو ٹھٹک گیا۔ آم کے پیڑ جو کہ ننھے ننھے بلبس سے سجا ہوا تھا۔ اس کے تنے سے ٹیک لگائے سارہ کھڑی تھی۔ ایپل گرین فراک میں ملبوس سارہ سلیقے سے دائیں شانے پہ باریک ایپل گرین دوپٹہ اوڑھے کھڑی تھی۔ گھنے سیاہ بال اس نے بائیں کندھے پہ ڈال رکھے تھے۔ زیور کے نام پہ اس

نے صرف چھوٹا سا لاکٹ گلے میں پہن رکھا تھا۔ اور اس سادہ سے حلیے میں بھی بنا کسی میک اپ کے وہ بلاشبہ بہت خوب صورت لگ رہی تھی۔ اگر وہ ماہ شب کا اسیر نہ ہوتا تو اس کا انتخاب یقیناً سارہ ہی ہوتی۔ اس کے قدم سارہ کی جانب بڑھ گئے۔ سارہ نے چونک کر اسے دیکھا تھا۔ ''آئم رئیلی ویری سوری۔'' سارہ کا روم ساعت میں ڈھل گیا۔

''اگر تم مل جاؤ، زمانہ چھوڑ دیں گے ہم......''

ڈیک پر بجتا گانا کہیں پس منظر میں چلا گیا۔ ''فار وہاٹ؟'' اس کی سرمئی آنکھیں متغیر ہوئیں۔ ''بنا تیرے کوئی دلکش نظارہ ہم نہ دیکھیں گے۔'' دلکش سا نغمہ کا فسوں فضا میں چھایا ہوا تھا۔ ''وہ اس دن میں تم سے زیادتی کر گیا۔ اصل میں......''

وہ اسے امی بابا کے متعلق بتانے لگا کہ وہ اس کی شادی کے لئے زور دے رہے تھے۔ ''جو تم کو نا پسند ہو، دوبارہ ہم نہ دیکھیں گے......''

''لیکن سارہ! میں...... میرے دل میں ماہ شب کی محبت کا بسیرا ہے۔ تم بہت اچھی لڑکی ہو۔ سائی اگر میں ماہ شب کو دل سے نہیں نکال سکتا۔ یہ میرے بس سے باہر ہے۔ پلیز مجھے معاف کر دینا۔'' وہ مدھم لہجے میں بولتا اسے کرب کے سمندر میں دھکیل گیا۔ وہ آنکھیں بند کر کے نمکین سمندر کو آنکھوں ہی میں جذب کرنے لگی۔ اس کے حلق میں کچھ پھنسنے لگا تھا۔ ایک گولہ سا۔ ''تیری صورت نہ ہو جس میں...... وہ شیشہ توڑ دیں گے ہم...... اگر تم مل جاؤ زمانہ چھوڑ دیں گے ہم......'' فل والیوم میں بجتا گانا کھیوں کی بھنبھناہٹ میں بدل گیا تھا۔ خود پہ قابو پا کر اس نے ثمران کو دیکھا۔ اس کے سیاہ بال لاپروائی سے پیشانی پہ بکھرے تھے۔ دلکش ہونٹ بھینچے تھے۔ مغرور ناک بار بار جلتے بجھتے ننھے بلبس کی روشنی میں چمکتی تھی اور سیاہ آنکھیں اس کو دیکھ رہی تھیں۔ ''اٹ اوکے ثمران! آپ گلٹی فیل نہ کریں۔ میں سمجھ سکتی ہوں کہ محبت کو لاکھ کوشش کے باوجود دل سے کھرچا نہیں جا سکتا۔ میں بھی تو آپ سے محبت کرنا نہیں چھوڑ سکتی۔'' بولتے بولتے اس کا لہجہ سرگوشی میں ڈھل گیا۔

''ہم دوست تو بن سکتے ہیں۔ اچھا وہ زائرہ غالباً تمہیں ڈھونڈ رہی ہے۔'' وہ بات مکمل کر کے پلٹ گیا۔ وہ بھرپور انداز میں مسکرا دی۔ محبت یہ نہیں کہ آپ اپنی غرض دیکھیں...... محبت تو بس محبوب کی خوشی دیکھتی ہے۔ محبت کی تکمیل یہ نہیں کہ آپ جس سے محبت کریں، اسے پالیں...... محبت کی تکمیل تو یہ ہے کہ آپ جس سے محبت کرتے ہوں اس کے دل میں جگہ پالیں۔ اور ابھی ثمران اسے دوست کہہ گیا تھا اور دوست ظاہر ہے دل ہی میں رہتے ہیں۔ طمانیت بھری سانس اپنے اندر اتارتی اسٹیج کی جانب متوجہ ہو گئی۔ جہاں ثمران رومیہ کو مہندی لگا کر مٹھائی کھلا کر اب رومان کو تنگ کر رہا تھا۔

☆......☆......☆

''رانجھا رانجھا کردی وے میں آپے رانجھا ہوئی، رانجھا رانجھا سدو، وے مینوں ہیر نہ آکھو کوئی......''

خوبصورت گانا فضا میں لہراتا پھرتا تھا۔ نکاح کے بعد پیور ریڈ اور سلور لہنگے میں ملبوس رومیہ کو سلور شیروانی جس پہ گہرے اور لائٹ گولڈن نفیس سا کام ہوا تھا۔ پہنے رومان کے پہلو میں بیٹھا دیا گیا۔ رومیہ پر ٹوٹ کے روپ آیا تھا۔ اور مسکراہٹ رومان کے چہرے سے جدا نہ ہو رہی تھی۔ سارے انتظامات مکمل کروا کے وہ پلٹا تو صفیہ کو روتے دیکھ کر ان کے پاس چلا آیا۔ ''یہ کیا امی! یہ کیا امی! آپ کو تو خوش ہونا چاہئے۔ اور پھر رومان کا گھر کون سا دور ہے۔ دیکھئے گا وہ بہت خوش رکھے گا۔'' انہیں بازو کے گھیرے میں لے کر وہ رسانیت سے بولا تھا۔ وہ نم پلکوں سے مسکرا دیں۔

''بابا کہاں ہیں؟ چلیں رومان کو سلامی وغیرہ دے آئیں۔'' دودھ پلائی اور جوتا چھپائی وغیرہ کی رسمیں ثمران کی کزن ثانیہ آپی اور سارہ نے ادا کی تھیں۔

ماہ شب کو اسٹیج پہ نمودار ہوتے دیکھ کر وہ دم بخود رہ گیا۔ اور سب لوگ اسے دیکھ کے دنگ تھے۔ اگرچہ سبھی اس کے بارے میں جانتے تھے مگر زیادہ تر لوگ اس کے وجود کو افواہ ہی گردانتے تھے۔ خود وہ بھی ظاہر ہونا پسند نہیں کرتی تھی۔ اور اب......؟ ریڈ اور گولڈ پیکنگ میں لپٹا گفٹ پیک رومیہ کو تھماتی ماہ شب نے اسے دیکھا اور اسے حیرت سے اپنی جانب تکتا پا کر کھل کر مسکرا دی۔ اب وہ رومان کو گولڈن اور سلور ریپنگ پیپر میں لپٹا گفٹ تھما رہی تھی۔ ثمران نے لوگوں کی تحیر آمیز چہ میگوئیوں سے بے نیاز تھا۔ انداز میں بیٹھی اپنے مخصوص سفید فراک میں ملبوس ماہ شب کو دیکھا اور بے ساختہ مسکرا دیا...... ماہ شب کو مسکرا کر وکٹری کا نشان بناتے دیکھ کر اس نے بوکھلا کر ارد گرد دیکھا۔ سارہ نجانے کب اس کے پاس آ کھڑی ہوئی تھی۔ وہ بری طرح گڑبڑا گیا اور لاشعوری طور پر پلٹ گیا۔ ماہ شب کا قہقہہ بے ساختہ تھا۔ ماہ شب اسٹیج سے سیدھی اس کے پاس آئی تھی۔ ''تم بہت اچھی لڑکی ہو۔ سارہ! شروع میں مجھے تم اچھی نہیں لگی تھیں مگر اب......'' سارہ نے حیرت سے اسے دیکھا۔

''آپ بھی بہت بہت اچھی ہیں اور بے حد خوش قسمت بھی۔'' وہ دھیرے سے کہتی نگاہ جھکا گئی۔

''کتنی عجیب بات ہے نا! کہ ہم قسمت کے پیمانے بھی اپنی مرضی سے بھرا کرتے ہیں۔''

''یہ لو! میری طرف سے ایک گفٹ۔ آئی وش! کہ تم اسے ہمیشہ پہنے رکھو۔ شاید یہ تمہارے کسی کام آ جائے۔'' ماہ شب کی آنکھوں میں تفکر کی پرچھائیاں تھیں۔ اسے نڈھال سی سارہ کسی جنگل میں بھٹکتی نظر آ رہی تھی۔ اس نے سونے کا وہ لاکٹ خود سارہ کے گلے میں پہنا دیا۔ چین سے تین دائرے یوں لٹکتے تھے کہ دو برابر تھے اور تیسرا اور درمیانی دائرہ ان سے ذرا نیچے تھے۔ ان دائروں میں قیمتی جڑاؤ پتھر تھے۔ نیلگوں مائل سبز پتھر......

اسی اثناء میں رخصتی کا شور اٹھا۔ امی بابا کے بعد رومیہ ثمران کے گلے لگ کر خوب خوب روئی کہ ثمران تک کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ بالآخر رومان کو ہی میدان میں کودنا پڑا۔

''مامی! میری شکل کیا جونی لیور سے ملتی ہے؟'' ثمران نے رومیہ کا سر سہلاتے ہوئے اس بے موقع بے سروپا سوال پہ گھورتے نفی میں سر ہلا دیا۔ ''کیا میں بگ شو، ٹریل اسٹیج اور گریٹ علی کا مکسچر ہوں۔؟''

''نہیں۔'' ثمران کو غصہ آیا۔

''تو پھر میں گوشت پوست سے عاری ڈر ڈائجسٹ کا کوئی ڈھانچہ ہوں، بلا زت ہوں، بد روح ہوں؟''

''کیا بکواس ہے؟'' وہ زچ ہوا تھا۔ ''تو یار! جب میں ان میں سے کچھ بھی نہیں ہوں یعنی خطرناک بھی نہیں ہوں، خوفناک بھی نہیں ہوں تو یہ محترمہ کیوں اتنا رو رہی ہیں؟'' اس کے دہائی دیتے انداز پہ جہاں حاضرین کے لبوں پر مسکراہٹ بکھری تھی وہیں رومیہ بھی جھینپ کر ثمران سے الگ ہو گئی۔

''آج سے پہلے میری کوئی بہن نہیں تھی۔ مگر آج سے سارہ میری بہن ہے۔ چلو سارہ! بہنوں والی تمام رسمیں تم پوری کرو گی۔'' رومان نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا تو رشتوں اور محبتوں کو ترستی ہوئی وہ نازک سی لڑکی جذباتی انداز میں رو پڑی۔ ثمران نے قرآن پاک کے سائے میں رومیہ کو رخصت کیا تھا۔

☆......☆......☆

تمام رسموں سے فارغ ہو کر اور اپنی جیب میں موجود تمام رقم سارہ اور بھابی کو نیگ کے نام پر دے کر وہ اندر آیا تھا۔ طویل فوٹو سیشن سے تھکی رومیہ ریلیکس انداز میں بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ وہ پھولوں کی پتیوں پہ بیٹھی تھی اور گلاب اور موتیے کے تازہ پھولوں کی لڑیاں اسے گھیرے ہوئے تھیں۔ قدموں کی آہٹ پہ بوکھلا کر وہ سیدھی ہوئی اور خود میں سمٹ کر بیٹھ گئی۔ وہ پھولوں کی جھالروں میں سے راستہ بنا کر اس کے مقابل بیٹھ گیا۔ ''السلام علیکم!'' رومیہ نے سلام کا جواب زیر لب دیا تھا۔ ''یہ تمہارا رونمائی کا گفٹ۔ حالانکہ میں نے کہا بھی تھا کہ میں

پہلے بھی کئی بار تمہارا منہ دیکھ چکا ہوں۔ پھر رونمائی دینے کی کیا تک بنتی ہے؟ مگر امی اور بھابی نے میری ایک نہیں چلنے دی۔'' اس نے سرخ مخملی کیس سے ایک نازک نفیس سا گولڈ کا جگر جگر کرتا بریسلیٹ نکال کر اس کے ہاتھ میں پہنایا اور ساتھ ہی استحقاق سے بھرپور جسارت کر ڈالی۔ رومیہ مارے گھبراہٹ کے ایک دم ہاتھ چھڑا گئی۔ اس کا دل کنپٹیوں میں دھڑک رہا تھا اور ہتھیلیاں پسینے میں بھیگ گئی تھیں۔ رومان نے دلچسپی سے اس کے گریز کو دیکھا تھا۔ ''مجھے یقین کر لینے دو رومیہ! یہ سب خواب نہیں ہے۔ یہ روپ، یہ لڑکی اور اس کے سینے میں دھڑکتا دل سب کچھ آج میرے نام ہوگیا ہے۔ تمہیں آج پورا پورا میرے لئے سجایا گیا ہے۔'' اس کے لہجے میں شدتیں مچل رہی تھیں۔ آنکھوں میں محبتوں کا ایک جہان آباد تھا۔ اس نے رومیہ کا ہاتھ تھاما تو وہ ذرا کسمسائی۔ ''جب تم سینے میں دھڑکتے دل سمیت میری ہو تو پھر یہ تعرض کیوں؟'' اور رومیہ کی مزاحمت جھاگ بن کر بیٹھ گئی۔ عشق، حسن کی خودسپردگی پہ نہال ہوگیا۔ جام وصل کے پہلے ہی گھونٹ نے اسے مدہوش کر ڈالا۔ رومیہ نے ہاتھ کی پشت پہ رومان کے ہونٹوں کے دہکتے لمس کو دھک دھک کرتے دل کے ساتھ محسوس کیا تھا۔

☆......☆......☆

چاند کہیں پاتال کی کھائیوں میں دبا پڑا تھا اور رات ستاروں کی روشنی میں چلتی اسے تلاش کر رہی تھی۔ جہاں سے وہ اس وقت گزر رہی تھی، زمین کا وہ ناہموار حصہ بنجر پڑا تھا۔ اور جھاڑیاں وغیرہ اگی ہوئی تھیں۔ زمین ناہموار ہونے کی وجہ سے رات کے قدم ڈگمگا سے جاتے تھے۔

''رمیز! اس طرح واقعی دولت مل جائے گی؟'' ارشد کی آواز میں بے یقینی سی بے یقینی تھی۔ رات ٹھٹک کر رک گئی۔ ''اور کیا؟ بس تو جلدی سے بچے کو ہوش میں لا۔ میں سورتی نکال رہا ہوں۔'' شیرخوار بچہ ہوش میں آتے ہی حلق پھاڑ کر رونے لگا۔ رمیز نے آدھ فٹ کی سورتی نکال کر نیچے رکھی۔ ارشد نے بچے کے حلق پہ چھری چلا دی۔ فضا دہل اٹھی تھی۔ رات عالم دہشت میں لرزاں کلیجہ تھام کر رہ گئی۔ ارشد کے ہاتھوں میں ننھا شیرخوار زندگی کے لئے بری طرح مچلا...... موت کو دیکھ کر بری طرح تڑپا اور پھر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ساکت ہوگیا۔ بچے کے حلق سے بہتے گرم خون میں وہ مورتی کو نہلانے لگے۔ ساتھ ہی ساتھ وہ کوئی منتر بھی بار بار دہرا رہے تھے...... رات آگے بڑھ گئی۔ اس کا دل خون کے آنسو رو رہا تھا۔ ملگجے اندھیرے میں دن کو آتے دیکھ کر اس نے کرب سے ہونٹ کچلتے تمام ماجرا بیان کیا تھا۔ ''دوسروں کی تمناؤں، خواہشوں کو خوشیوں کو کچل کر اپنی خوشیاں حاصل کرنے والا بالآخر خود بھی اسی مقام پر پہنچ جاتے ہیں۔ ان کی خوشیاں اور سکون بھی چھین لیا جاتا ہے۔ انہیں اپنے ہر ظلم کا حساب دینا پڑتا ہے۔ حساب دینا کون چاہتا ہے؟ مگر حساب پھر بھی لیا جاتا ہے۔'' دن یاسیت سے بول رہا تھا۔ رات مسکرا کر آگے بڑھ گئی۔ اور دن سورج کی سنہری رتھ پہ سوار ہوگیا۔ اس کے سفر کا آغاز تھا۔

☆......☆......☆

''یہ...... تم کیا کہہ رہے ہو؟'' اکمل کی بات پہ مامی بھونچکا رہ گئیں۔ ''میں سچ کہہ رہا ہوں چاچی! میں نے خود زائرہ کو رمیز کے ساتھ جاتے دیکھا ہے۔'' ان کے ہاتھ پاؤں کانپنے لگے اور وہ نیچے گرتی چلی گئیں۔ سارہ پانی لائی جو بمشکل ان کے حلق میں ٹپکایا گیا۔ انہوں نے ہمیشہ سارہ کے کردار کی دھجیاں اڑائی تھیں اور آج ان کی اپنی بیٹی ان کی عزت کی دھجیاں اڑا کر چل دی تھی۔ اس صدمے نے ان کی قوت گویائی سلب کر لی۔ شاید وہ خود ہی کچھ بولنا چاہتی تھی۔ سارہ نے ان دنوں ہر چیز کو پس پشت ڈال کر صرف ان کی خدمت کی تھی۔ صائمہ چند دن رہ کر چلی گئی تھی۔ سارہ نے اپنی ماں کا سارا زیور بیچ دیا اور ان کا علاج کروانے لگی۔ رومان نے واقعی ان دنوں اس کا بھائی بن کر دکھایا تھا۔ اور ثمران نے ایک پرخلوص دوست

ہونے کا دعویٰ سچ کر دکھایا تھا۔ پھر ڈاکٹرز کی ٹریٹمنٹ، سارہ کی لگن اور سب کی دعاؤں نے انہیں ٹھیک کر دیا تھا، وہ آہستہ آہستہ بولنے لگی تھیں۔

☆......☆......☆

''ثمران! یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟'' سارہ کا دل کسی نے مٹھی میں لے کر بری طرح بھینچ ڈالا تھا۔ وہ آم کے پیڑ تلے کھڑے تھے۔

''ہاں سارہ! مجھے ماہ شب کے ساتھ جانا ہے۔ آج یا کل...... لیکن تم فی الحال کسی کو نہیں بتاؤ گی۔ میں یہ صرف تمہی کو بتا رہا ہوں۔ رومان تک کو نہیں بتایا۔ اگر کسی کو بتایا تو وہ مجھے جانے سے روکیں گے۔ اور میں یہ نہیں چاہتا۔''

''لیکن ثمران آپ لوگ وہ درخت ڈھونڈیں گے کیسے؟'' سارہ کا لہجہ بے حد مضطرب تھا۔

''یہ دیکھو! ماہ شب نے پتہ نہیں کہاں سے یہ تصویر حاصل کی ہے۔'' وہ کسی جزیرے کی تصویر تھی۔ ٹھاٹھیں مارتا نیلا سمندر اور گھنے درخت...... وہ ساحل کا منظر تھا۔ ساحل کے بالکل ساتھ ناریل کے دو درخت گلے مل رہے تھے۔ ان کے تنے ایک دوسرے میں پیوست تھے اور شاخوں پہ گمان ہوتا تھا گویا کوئی بہت بڑی چمگادڑ اڑ رہی ہو۔

''اچھا سارہ! شاید ہم آخری بار مل رہے ہیں۔ اگر میری کوئی بات کبھی بری لگی ہو تو سوری۔ اگر زندگی اور حالات نے ساتھ دیا تو پھر ملیں گے، ورنہ پھر روز محشر......'' سارہ کی آنکھوں کے ساحل پہ نمی نے پاؤں دھرے تھے۔

جاتے ہوئے کہتے ہو کہ قیامت کو ملیں گے
کیا خوب! کہ قیامت کا ہے گویا کوئی دن اور......''

''سارہ!'' وہ جاتے ہوئے دھیرے سے پلٹا تھا۔ سارہ نے برستی آنکھوں کو جلدی سے رگڑ ڈالا۔ ''میں جانتا ہوں کہ سارہ! کہ تم مجھے روکنا چاہتی ہو۔ میں تمہارے جذبات سے ناواقف نہیں ہوں سارہ! لیکن میں ماہ کو مشکل میں اکیلے نہیں چھوڑ سکتا۔ اگر میں کسی مشکل میں گھرا ہوں، تو کیا تم میری مدد نہیں کرو گی؟ مجھے اکیلا چھوڑ دو گی؟'' سارہ کا سر بے اختیار نفی میں ہل گیا۔ اس کے رخساروں پر آنسو پھسل رہے تھے۔ اور وہ اضطراری انداز میں گلے میں پہنے نیکلس کے پتھروں کے نیچے لٹکتی موتیوں کی جھالر پہ ہاتھ پھیر رہی تھی۔ ''پھر میں بھی اسی طرح مجبور ہوں محبت سے۔ ارے! یہ نیکلس......؟'' اسے لگا تھا کہ نیکلس کے پتھر سے کوئی شعاع سی نکلی ہو۔

''یہ مجھے ماہ شب نے گفٹ کیا ہے۔ میں آپ کے لئے بہت سی دعائیں کروں گی ثمران! اپنا بہت سا خیال رکھئے گا۔ اور یہ کبھی مت بھولئے گا کہ یہاں بہت سے لوگوں کو آپ کی ضرورت ہے۔ ان کی زندگی آپ کے بنا ادھوری ہے۔ وہ خود آپ کے بنا ادھورے ہیں اور وہ بے چینی سے آپ کے منتظر ہیں۔''

وہ بھیگی آنکھوں سے بھرائے لہجے میں بول رہی تھی۔ اس کی بائیں آنکھ کے بائیں کونے پہ پلکوں کی جھالر پہ ایک شفاف موتی اٹکا تھا۔ جو اس کے پلکیں جھپکنے کے باوجود وہیں اٹکا رہا...... ثمران نے انگلی کی پور پہ وہ موتی چن لیا۔ سارہ کا دل اس لمس پہ سکڑ کر پھیلا تھا۔ ''تم میرے لئے ضرور دعا کرنا۔ کیونکہ دل سے نکلی دعا میں اتنی طاقت ہوتی ہے کہ وہ تقدیر تک بدل سکتی ہے۔ اللہ کو ہم بہت پیارے ہیں سارہ! پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ ہماری دعا قبول نہ کرے...... مجھے ویسے بھی اب صرف دعاؤں ہی کی ضرورت ہے۔ اپنا خیال رکھنا اور رونا مت۔'' وہ اپنے ہاتھوں سے اس کے آنسو صاف کرتا اس کا گال تھپتھپا کر چلا گیا۔ وہ دل پہ ہاتھ رکھے درخت سے لگ کر بیٹھتی چلی گئی۔

☆......☆......☆

''اٹھ جاؤ اب۔ میں ناشتہ لا رہی ہوں۔'' رومیہ نے رومان کو ایک بار پھر اٹھایا۔ ''بڑی ظالم بیوی ہو یار! سونے بھی نہیں دیتیں۔'' وہ شکوہ کناں نظروں سے اسے تکتا اٹھ بیٹھا۔ ''اگر تم پانچ منٹ تک نہ آئے تو پھر ناشتہ نہیں ملے گا۔'' وہ کمبل تہہ کر کے چلی گئی۔ رومان واقعی

پانچ منٹ بعد ناشتے کی ٹیبل پہ تھا۔ زینب، سلیمن اور رومان پہلے سے ٹیبل پہ تھے۔ جبکہ رومیہ سلوٹی بھالی کے ساتھ کچن میں موجود تھی۔ ''کتنی دیر ہے سلوٹی؟ مجھے کہیں جانا ہے۔'' رومان نے اخبار سے نظریں ہٹا کر پوچھا۔

''بس......'' سلوٹی نے پراٹھے لا کر رکھے اور خود بھی بیٹھ گئی۔ رومیہ آملیٹ لے آئی تھی۔ ''مجھے تو اچار دے دو۔'' رومیہ نے اچار کی پیالی زینب کو پکڑائی۔ ''مجھے تو دستر خوان پہ بیٹھ کے کھانا اچھا لگتا ہے کہ ہمیشہ اسی طرح بیٹھ کر کھایا ہے۔ اب تم لوگوں نے یہ اچھا شہری رواج نکالا ہے۔'' وہ پراٹھے پہ اچار رکھ کر کپ میں چائے ڈالنے لگیں۔

''ٹھیک ہے امی کل سے ہم یہ ٹیبل ہٹا دیں گے۔'' رومیہ نے دہی کی پیالی ان کی جانب بڑھائی۔

اسی پل دروازہ زور زور سے دھڑ دھڑایا جانے لگا۔ دستک میں اک اضطراب نمایاں تھا۔ ''میں دیکھتا ہوں۔'' رومان اٹھا۔ گھبرایا ہوا شہیر کھڑا تھا۔ ''ثمران بھائی غائب ہیں۔ ان کے کمرے کا دروازہ اندر سے بند تھا۔ کوئی جواب نہ ملنے پر کھڑکی توڑ کر دیکھا تو وہ اندر نہیں تھے۔'' رومان شہیر کو ہاتھ سے ہٹاتا بھاگ کر ثمران کے گھر کی جانب لپکا۔ جبکہ شہیر اندر سلیم کو بتانے بڑھ گیا۔ اس کی بات سن کر سبھی اٹھ کھڑے ہوئے۔ سلوٹی نے ہوش کھو کر گرتی رومیہ کو تھاما تھا۔

☆......☆......☆

رومان کے ہاتھوں میں کاغذ لرز رہا تھا۔ ''رومان! یہ کیا ہے؟'' عثمان اندر آئے۔ رومان نے خاموشی سے کاغذ ان کی جانب بڑھا دیا۔ وہ اس وقت بولنے کی سکت خود میں نہ پاتا تھا۔ عثمان غنی کی نظریں کاغذ پہ لکھے لفظوں پر پھسلنے لگیں۔

''بابا جان! آپ سے اور امی سے میرا رشتہ ایک بیٹے سے زیادہ ایک دوست کا رہا ہے۔ لیکن میں اس کے باوجود آپ کو اپنے جانے کا نہیں بتا سکا۔ ماہ شب کے بارے میں آپ سب لوگ جانتے ہیں۔ اسے شاہ لبریز کو اس آدم خور درخت سے آزاد کروانا ہے۔ اور میں اسے کسی بھی مشکل میں اکیلا نہیں چھوڑ سکتا۔ بابا! اگر میں آپ لوگوں کو یا رومان کو بتاتا تو آپ لوگ لازماً مجھے روکتے۔ اور میں آپ کی حکم عدولی نہیں کر سکتا تھا۔ اسی لئے میں نے یہی مناسب سمجھا کہ آپ کو بنا بتائے چلا جاؤں۔ میری اس غلطی کے لئے مجھے معاف کر دیجئے گا۔ اور دعا کیجئے گا کہ آپ کا بیٹا کامیاب لوٹے۔ کسی بھی مقام پہ حوصلہ نہ ہارے گا۔ امی کا خیال رکھیے گا۔ اور رومیہ کا بھی۔ آپ کی دعاؤں کا طالب۔ ثمران غنی۔'' ان کی آنکھوں میں نمی پھیلتی جا رہی تھی۔ ''تم نے ٹھیک سوچا تھا ثمران! اگر تم بتاتے تو ہم تمہیں نہ جانے دیتے۔ مگر اب مجھے تمہارے آنے تک تمہاری ماں اور رومی کا خیال رکھنا ہے۔'' وہ آنکھیں رگڑتے باہر نکلے ان کے گھر میں تقریباً پورا گاؤں جمع تھا کہ ثمران سبھی کو عزیز تھا۔ وہ بڑوں کا چہیتا تھا۔ نوجوانوں کا دوست اور بچوں کے لئے وہ بچہ بن جاتا تھا۔ عورتیں صفیہ کو بمشکل سنبھال رہی تھیں۔ رومیہ الگ روئے جاتی تھی۔ ''یہ کیا رو رہی ہو پتر؟ صفیہ! چپ کرو۔ ثمران اب بھی ٹھیک ٹھاک ہے۔ وہ......'' عثمان سب بتانے لگے۔

''یہاں بھی وہ دوسروں کی مدد پہ کمربستہ رہتا تھا۔ تو اب بھی اسی لئے گیا ہے۔ ہم کو اس کے لئے دعا کرنی چاہئے۔'' دینو چاچا کی تقلید میں سب نے ہاتھ اٹھا دیئے تھے۔ ویسے یقین کریئے، یہ حقیقت ہے کہ جو لوگ اللہ کی مخلوق کی مدد کرتے ہیں، اللہ ان کی مدد ضرور کرتا ہے۔ بلکہ اللہ تو ہر کسی کی مدد کرتا ہے۔''

☆......☆......☆

سفر میں شام ڈھلنے تک تو میرے ساتھ جاؤ
نئے منظر ابھرنے تک تو میرے ساتھ رہ جاؤ......
لہو روتی ہوئی آنکھیں، تیرے قدموں سے لپٹی ہیں
میرے آنسو ٹھہرنے تک تو میرے ساتھ رہ جاؤ......
تمہیں معلوم ہے...... مجھ کو خزاں سے خوف آتا ہے
سو یہ موسم گزرنے تک تو میرے ساتھ رہ جاؤ
پھر اس کے بعد جب چاہو، جہاں چاہو، چلے جانا......!
میری سانسیں بکھرنے تک تو میرے ساتھ رہ جاؤ......''

وہ سیڑھیوں پہ بیٹھی آسمان پہ جانے کیا دیکھ رہی تھی۔ ثمران اس کی زندگی سے چلا گیا تھا۔ مگر اس کے دل سے نہیں گیا تھا۔ اور کیا ہی اچھا ہو جو زندگی سے جانے والے دل سے بھی چلے جایا کریں۔ یادوں سے بھی چلے جایا کریں...... پھر زندگی کس قدر سہل ہو جائے نا...... ''سارہ!'' مامی کی پکار پہ وہ اٹھ کر اندر بڑھ گئی۔

''بیٹھ جا! مجھے تیری بڑی فکر ہے کوئی اچھا لڑکا مل جاتا تو تیری شادی کر دیتی۔''

''مجھے شادی نہیں کرنی مامی!'' وہ قطعیت سے بولی۔ ''مجھے معاف کر دینا سارہ بیٹی! میں نے بہت دکھ دیئے ہیں تجھے۔''

''مامی! مجھے گناہگار نہ کریں۔ میرے دل میں ایسی کوئی بات نہیں۔ مجھے آپ سے کوئی شکوہ نہیں۔'' وہ ان کے پاؤں دبانے لگی۔ اس رات مامی نے اس سے بہت سی باتیں کی تھیں۔ اس کے بچپن کی، اس کے ماں باپ کی، صائمہ اور زائرہ کی اور بھی بہت سی باتیں۔ رات ایک بجے وہ لوگ سوئی تھیں۔ اگلی صبح سارہ نے نماز کے لئے مامی کو اٹھانا چاہا، مگر...... ان کا ساکت وجود اس پہ سکتہ طاری کر گیا۔ کچھ دیر بعد اس کی چیخوں نے لوگوں کو متوجہ کیا تھا۔ زرینہ خالہ نے مامی نیم وا آنکھوں پہ ہاتھ پھیر کر بند کر دیا۔ وہ سفر آخرت پہ روانہ ہو چکی تھیں۔ موت کی سختی نے ان کا سارا خون گویا نچوڑ لیا تھا۔ لیکن اس کے باوجود ان کا زرد چہرہ پر سکون تھا۔

☆......☆......☆

سورج ڈوب رہا تھا۔ اس کی نیم جان کرنیں اس کھنڈر سے لپٹی سسک رہی تھیں۔ یہ کھنڈر ویرانے میں تھا۔ کسی زمانے میں یہ محل رہا ہوگا۔ اب اپنی زبانی اپنی تباہی کی داستان سنا رہا تھا۔ بیرونی دیواریں بھی ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھیں۔ کمروں کی کھڑکیاں اور دروازے ٹوٹ چکے تھے۔ بالائی منزل کے کئی ایک کمروں کی چھتیں تک فرش بوس تھیں۔ خالی کمروں میں چمگادڑوں نے ڈیرہ ڈال رکھا تھا۔ جا بجا مکڑیوں کے جالے تنے تھے...... ناگوار بو رچی ہوئی تھی۔ نچلی منزل کے دو کمروں کے دروازے تقریباً ٹھیک حالت میں تھے۔ ان میں سے ایک کمرے میں ہراساں سی زائرہ فرش پر بچھے میٹرس پہ لیٹی تھی۔ رمیز کا معمول تھا کہ وہ دن بھر تو وہیں موجود رہتا تھا۔ مگر رات بھر کے لئے غائب ہو جاتا۔ رمیز کے ہمراہ گھر چھوڑ کر آنے کے بعد وہ قدم قدم پہ پچھتاتی تھی۔ مگر اس بات کا تو پچھتاوا ہوتا ہے کہ پچھتاوا ہمیں ہمارا کچھ بھی لوٹا نہیں سکتا۔ اسے اس ویران کھنڈر سے بے پناہ خوف آتا تھا۔ اس نے رمیز کی منت کی تھی کہ یہاں نہ رہے۔ مگر جواباً اس کا بھرپور تھپڑ اس کا خون تک ٹھنڈا گیا تھا۔ وہ اب ایک پنجرے میں بند ایسی چڑیا تھی جس کی رہائی کے لئے پنجرہ کھول بھی دیا جاتا تو وہ کٹے ہوئے پروں کے ساتھ اڑنے سے محروم ہی رہتی۔ اور یہ قفس تو اس نے خود منتخب کیا تھا۔ دفعتاً اسے آہٹ محسوس ہوئی۔ ایسی نادیدہ آہٹیں اسے قدم قدم پہ سنائی دیتی تھیں۔ بھاری قدموں کی آہٹیں...... کسی ملبوس کی سرسراہٹیں...... اب بھی بھاری قدموں کی گونج دروازے کے باہر سنائی دے رہی تھی۔ ''اگر یہ کھنڈر آسیب زدہ کہلاتا ہے تو غلط نہیں کہلاتا۔'' آنکھیں بند کرکے اس نے سوچا۔

آہٹ کبھی قریب ہوتی اور کبھی دور ہوتی جاتی۔ گویا کوریڈور میں کوئی چہل قدمی کر رہا تھا۔ اب کے چاپ قریب سے ابھری تو وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ یہ حرکت لاشعوری تھی۔ اس سے کوئی شعوری مقصد وابستہ نہ تھا۔ وہ چلتے ہوئے دروازے کے قریب پہنچ گئی۔ اس نے چٹخنی گرا دی۔ اس نے دروازہ کھول دیا۔ ''چرررر......'' کی آواز سناٹے کو چیرتی دور تک چلی گئی۔ اس نے قدم باہر نکالے...... تاریک راہداری میں کوئی آگے جا رہا تھا۔ اس کا صرف سایہ ہی دکھتا تھا۔ وہ بنا کچھ بھی سوچے

سمجھے اس کے پیچھے چل پڑی۔ جب وہ عین اس کے عقب میں پہنچ چکی تو وہ شخص لمحہ بھر کو رکا...... یکلخت وہ ایڑیوں کے بل اس کی طرف گھوم گیا۔ زائرہ کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ وہ کسی معمول کی طرح کھڑی رہی۔ اس شخص نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ اس کی سیاہ ترین آنکھیں تاریکی میں بھی چمک رہی تھیں۔ اس کی آنکھوں میں جھانکنے کی مدت ایک سیکنڈ کا بھی عشر عشیر تھی۔ مگر اس مختصر ترین مدت میں بھی زائرہ کو لگا کہ اس شخص کی نگاہیں اس کے اندر برچھیاں سی گھسو رہی ہیں۔ یکا یک وہ پلٹا اور پھر چلنے لگا۔ زائرہ پہ گویا فسوں پھونک دیا گیا تھا۔ وہ "زومبی" کے سحر زدہ معمول کی مانند اس کے پیچھے چلتی گئی۔ وہ شخص ایک شکستہ کمرے میں داخل ہوا۔ کھڑکی کے پٹ نجانے کب سے غائب تھے۔ اور اب تو اینٹیں بھی اکھڑ چکی تھیں۔ خالی کمرہ بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔ فرش پر گرد کا قالین بچھا تھا۔ اور گرد پہ چوہوں اور چمگادڑوں کی غلاظت بکھری پڑی تھی اور ناگوار بو در و دیوار سے لپٹی تھی۔ اس شخص نے زمین پر اکڑوں بیٹھ کر دیوار کے پاس کچھ چھیڑ چھاڑ کی۔ ایک گڑگڑاہٹ ابھری اور دیوار کے ساتھ ایک خلا نمودار ہو گیا۔ اس نے کھڑے ہو کر زائرہ کو دیکھا اور خلا میں اتر گیا۔ زائرہ مشینی انداز میں چلتی جونہی خلا میں داخل ہوئی۔ ایک ہلکی سی آواز کے ساتھ خلا بند ہو گیا۔ اب سپاٹ دیوار کو دیکھ کر کوئی بھی نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہاں کوئی خلا تھا بھی......

☆......☆......☆

تمہارے یوں بچھڑنے کا مداوا ہو بھی سکتا تھا
ذرا جو تم ٹھہر جاتے، کوئی تدبیر کر لیتے!

وہ دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ اس کی بند پلکوں سے آنسوؤں کے شفاف موتی قطار در قطار ٹوٹ رہے تھے۔ صائمہ آپی اپنے شوہر اور بچوں سمیت یہیں شفٹ ہو گئی تھیں۔ "سارہ!" رومان کی آواز پہ اس نے بے ساختہ آنکھیں رگڑ ڈالیں۔ "رومان بھائی! میں...... میں ثمران کے پیچھے جانا چاہتی ہوں۔" اٹل لہجے میں کہتی وہ اس پہ کوہ حیرت گرا گئی۔ وہ سناٹے میں رہ گیا۔

"یہ کیا کہہ رہی ہو تم؟" فرط حیرت کے سبب اس کی آواز پھنسی پھنسی سی تھی۔

"ہاں! میں نے رات خواب میں انہیں...... بہت برا خواب تھا وہ بہت برا۔"

وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ رومان ابھی بھی سناٹے میں تھا۔ اس نے خود بھی تو کچھ ایسا ہی خواب دیکھا تھا۔ تو کیا واقعی ثمران کسی مشکل میں تھا؟ "یہ خواب تو بس ایسے ہی ہوتے ہیں۔ وہ بالکل ٹھیک ہوگا۔" اس نے سارہ سے زیادہ خود کو تسلی دینا چاہی۔

"وہ ٹھیک نہیں ہے رومان بھائی! وہ ٹھیک نہیں ہے۔"

وہ اس کا ہاتھ جھٹکتی چلا اٹھی۔ اس کی بصارتوں پہ ثمران کا زخم زخم وجود چپک کر رہ گیا تھا۔ وہ تب سے کانٹوں پہ لوٹ رہی تھی۔ اس کی سانسیں صحرا کی سلگتی ریت کی مانند خشک ہو چلی تھیں۔ "میں خود بھی جانا چاہتا ہوں مگر...... ہم جانتے ہی کب ہیں کہ وہ جنگل کہاں ہے؟" وہ بے بسی سے گویا ہوا۔

"میں...... مجھے پتہ ہے۔ وہ جنگل "یانگ لائی" کہلاتا ہے۔ یہ مقامی زبان کا لفظ ہے جس کا مطلب ہے آدم خور جنگل۔" وہ اسے بتانے لگی۔

"تمہیں کیسے پتا چلا؟" رومان متعجب ہوا۔

سارہ نے گود میں رکھی کتاب رومان کی جانب بڑھا دی۔ سیاہ مخملی جلد والی اس کتاب سے وہ بخوبی واقف تھا۔ وہ ثمران کی...... اس کے عزیز از جان دوست کی ڈائری تھی۔

☆......☆......☆

رومیہ صفیہ کو زبردستی کھانا کھلا کر کپڑے دھونے لگی۔ عثمان حسب معمول ڈیرے پہ تھے۔ کپڑے چھت پہ پھیلاتے اسے ثمران یاد آ گیا۔ اور وہ تو اسے قدم قدم پہ یاد آتا تھا۔ زندگی بہت مشکل ہو گئی تھی۔ وقت لگتا تھا کہ کسی بوڑھے پیڑ کی صورت ایک ہی جگہ ساکن ہو گیا

ہے۔ رومان ثمران کی بات کرتے اکثر آنکھیں نم کر لیتا تھا۔ وہ سبھی ایک دوسرے سے چھپ چھپ کر روتے تھے۔ رومان کی آواز پہ وہ ہاتھ پونچھتی نیچے اتری۔

"آئیم سوری آنٹی! مگر میرا جانا بہت ضروری ہے۔"

"کہاں جانا ہے؟" وہ امی کے پاس بیٹھ گئی۔

"ثمران کا اور میرا ایک مشترکہ دوست ہے۔ شمالی علاقہ جات میں، اس کے گھر والے قبیلے کی لڑائی میں مارے گئے ہیں۔ تم ذرا آ کر میری پیکنگ تو کر دو۔ چند دن تو لگ ہی جائیں گے۔" وہ اثبات میں سر ہلاتی اٹھ گئی۔ اس کی مدد کرواتے وہ مسلسل بول رہا تھا۔ "صفیہ آنٹی اور انکل کا خیال رکھنا اور اپنا بہت سارا خیال رکھنا۔"

"کیا ہے تم تو ایسے کہہ رہے ہو جیسے طویل مدت کے لئے جا رہے ہو۔" وہ جھنجھلا گئی۔ اس کی بات پہ رومان ایک دم چپ ہوا تھا۔ "ہو سکتا ہے ایسا ہی ہو۔" وہ دھیرے سے بولا۔

"بکواس نہیں کرو۔" اس کے گھورنے پہ وہ مسکرا دیا۔ وہ سارا دن رومان نے پورے گاؤں میں پھر کر گزارا۔ سورج زوال پذیر ہوا۔ شام سرمئی آنچل میں لپٹ کر نکل آئی۔ اس کی سرمئی آنکھوں میں غضب کی اداسی تھی۔ اور پھر جلد ہی شام پہ رات غالب آ گئی۔ رومان کافی دیر تک رومیہ سے باتیں کرتا رہا۔ پھر وہ سو گئے۔ اگلی صبح رومیہ اٹھی تو رومان بستر پہ نہیں تھا۔ وہ سمجھی کہ باہر ہوگا۔ لیکن اس کا دل کسی انہونی کا اعلان کر رہا تھا۔ تبھی اس کی نظر بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پہ پڑے کاغذ پر پڑی۔ اس نے جھپٹ کر کاغذ اٹھایا تو اس پہ رکھا پیپر ویٹ لڑھک کر نیچے جا گرا۔ ابھی اندھیرا تھا اور لائٹ بھی غائب تھی۔ وہ غبارے کی طرح دھم دھماتے دل کے ساتھ باہر نکلی۔ برآمدے کے سفید، گول طویل ستون سے ٹیک لگا کر اس نے کاغذ کی اکلوتی تہہ کھولی۔ اس کی بے یقین نظریں الفاظ پہ تیزی سے پھسلنے لگیں۔

"جان سے عزیز رومیہ! سب سے پہلے اس بات کی یقین دہانی کراتا چلوں کہ میرے دل میں ہمیشہ صرف تمہاری حکمرانی رہے گی۔ میں اور سارہ ثمران کو ڈھونڈنے جا رہے ہیں۔ مجھے افسوس ہے کہ مجھے بھی تم لوگوں کو آگاہ کرنے کے لئے ثمران ہی کا طریقہ اپنانا پڑا۔ بہت مشکل سفر درپیش ہے۔ یہاں سے تو ہم بائی ایئر ہی جائیں گے لیکن ہمیں سمندری سفر بھی کرنا پڑے گا۔ اور تمہیں پتہ ہی ہے کہ مجھے سمندر سے ڈر لگتا ہے۔ بہرحال ثمران کے لئے تو میں کچھ بھی کر سکتا ہوں۔ اور اس سفر میں وہ نازک سی لڑکی سارہ بھی میرے ساتھ ہوگی۔ حالانکہ میں نے بہت کوشش کی کہ وہ مجھے اکیلے جانے دے۔ مگر میں اسے اس خطرناک ارادے سے باز نہ رکھ سکا۔ لوگ جو بھی کہیں روی اگر تم کو اپنے رومان پر اعتماد ہے نا؟ میں جب بھی آیا، ثمران کے ساتھ ہی آؤں گا، تم دعا کرنا کہ وہ جلد مجھے مل جائے اور ہم قانون کی نظروں سے بچے رہیں۔ کیونکہ ہمارے پاس محدود وسائل ہیں اور زیادہ سفر ہمیں غیر قانونی کرنا ہوگا۔ بہرحال اللہ نے اتنی ہمت دے رکھی ہے کہ ہر طرح کے حالات سے نمٹ سکوں۔ اپنا بہت سا خیال رکھنا کیونکہ تم، تمہارے پاس "میری" امانت ہو۔ باقی لوگوں کا خیال رکھنے کا کہنا ہی نہیں۔ وہ تو تم رکھو گی ہی۔ کسی بھی مقام پہ ہمت مت کھونا۔ حوصلہ نہ ہارنا۔ کیونکہ تم ثمران کی بہن اور میری بیوی ہو۔ دو بہادر لوگوں کی ہمت تم میں ہونی چاہئے۔ اللہ حافظ۔ صرف اور صرف تمہارا......

"رومان......!" کاغذ اس کے لرزتے ہاتھوں سے پھڑپھڑا کر گرا تھا۔ وہ شدت غم سے بے دم ہو کر دل پہ ہاتھ رکھے ستون سے لگ کر بیٹھتی چلی گئی۔ اس کی آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔ اسے لگا کہ یہ اندھیرا اسے نگلنے والا ہے۔ وہ اندھیرا اسے واقعی نگلنے والا تھا۔

(جاری ہے)

بددعا

ثوبیہ تبسم

میرے مرنے کے بعد بھی تم میری بددعا کے حصار میں رہو گے اور

میری بددعا ہے کہ خدا کرے تمہیں بھی اولاد کی خوشیاں نصیب نہ ہوں"

حسن کے آج رہا ہونے کا دن تھا۔ تین سال پہلے اسے چوری کے جرم میں سزا ہوئی تھی سزا سے پہلے وہ اپنے چچا، چچی کے پاس رہتا تھا لیکن ان کا رویہ حسن کے ساتھ اتنا برا تھا کہ حسن کا دل کبھی نہیں مانتا تھا کہ وہ اس کے چچا تھے ویسے بھی حسن دراز قد، گورا چٹا اور چمکدار سیاہ بالوں والا ایسا خوبصورت نوجوان تھا کہ لوگ اسے دیکھتے ہی رہ جاتے تھے۔ جبکہ اس کے نام نہاد چچا اس کی خوبصورتی کا چوتھائی بھی نہیں تھے بعض دفعہ حسن خود بھی سوچتا تھا کہ اس کے چچا شکل وصورت میں اس سے میل کیوں نہیں کھاتے۔ اپنی خوبصورتی اور چچا کی سخت مزاجی اور بے توجہی نے حسن کو ایسی راہیں اختیار کرنے پر مجبور کر دیا تھا جو شاید اچھے حالات میں وہ کبھی اختیار نہ کرتا۔ تعلیم اس نے صرف میٹرک تک حاصل کی تھی۔ جس کی بناء پر اسے کوئی جاب بھی نہیں مل سکتی تھی۔ وہ غریبی سے اس قدر تنگ آ چکا تھا کہ راتوں رات امیر بننے کے طریقوں کے بارے میں اکثر سوچتا رہتا اور چوری بھی ایسا ہی ایک طریقہ تھا۔ لیکن یہ طریقہ بھی کامیاب نہ ہوا کیونکہ باوجود تمام تر احتیاط کے اس کروڑ پتی کی تجوری میں ایسا کوئی سکیورٹی سسٹم فٹ تھا کہ جوں ہی اس نے تجوری کھولی تو ایک لوہے کا پنجرہ اس پر آ گرا اور وہ اس میں قید ہو گیا اس کی تمام پلاننگ اور احتیاط دھری کی دھری رہ گئی۔ چوری کرنے کے نتیجے میں اسے 4 سال کی قید ہوئی لیکن اس نے اپنا چال چلن جیل میں اس قدر اچھا رکھا کہ اس کی ایک سال کی سزا معاف ہو گئی۔ جس کے نتیجے میں 3 سال کے بعد آج وہ رہا ہو رہا تھا۔ جہاں پر اسے اپنے رہا ہونے کی خوشی تھی وہاں پر وہ فکرمند بھی تھا کیونکہ اس کا چچا پہلی ملاقات میں ہی اسے کہہ گیا تھا کہ اب اس کے لئے اس کے گھر میں کوئی جگہ نہیں ہے اب وہ اس کے گھر کا رخ بھی نہ کرے۔ حسن کو جہاں پر اپنے چچا سے چھٹکارا مل جانے کی خوشی تھی وہاں پر اسے اپنے قیام کی بھی فکر تھی کیونکہ اس کے پاس کوئی رقم نہیں تھی۔ جیل سے رہائی کے وقت جیلر نے اسے تھوڑی سے رقم دیتے ہوئے اچھی زندگی گزارنے کی نصیحت کی جسے سنتے ہوئے وہ جیل سے باہر آیا۔ باہر نکل کر اس نے تازہ ہوا میں گہری گہری سانسیں لیں اور ایک طرف چل پڑا جیلر نے اسے جو رقم دی تھی وہ اتنی کم تھی کہ اس سے وہ صرف دو وقت کا کھانا کھا سکتا تھا دوپہر کا وقت ہو گیا اسے بھوک لگ رہی تھی چنانچہ وہ ایک درمیانے درجے کے ہوٹل میں آ گیا اس نے کھانا کھایا چائے پی اور اللہ کا شکر ادا کرتا ہوا باہر آ گیا بازار میں گزرتے ہوئے اس کی نظر اچانک ایک بک اسٹال پر پڑے ہوئے اخبار پر پڑی تو وہ ایک دم سے چونک گیا کیونکہ اخبار پر اس کی تصویر چھپی ہوئی تھی اور ساتھ ہی چھوٹی سی خبر لکھی ہوئی تھی۔ ''حسن بخت جہاں بھی ہو وہ اس پتے پر رابطہ کرے۔'' حسن یہ خبر پڑھ کر سوچ میں پڑ گیا کہ اس کی ضرورت کس کو آ پڑی کہ اس کی تصویر اخبار میں شائع

کروادی گئی ہے اس نے پتہ نوٹ کرلیا تھوڑی دیر کے بعد وہ اسی پتے کے مطابق ایک درمیانے درجے کے مکان کے دروازے پر کھڑا تھا اس کے بیل دینے پر ایک آدمی باہر آیا۔ ”کیا بات ہے بھئی، کیوں بیل دی ہے؟“ اس آدمی نے غصے سے کہا۔

”اندر بتاؤ کہ حسن بخت آیا ہے“ حسن نے بھی ماتھے پر بل ڈالتے ہوئے کہا تو وہ آدمی اسے گھورتا ہوا اندر چلا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد واپس آیا۔

”چلو تمہیں اندر بلایا ہے“ اس نے کہا۔ حسن اس کے ساتھ اندر چلا گیا ایک کمرے میں اسے چھوڑ کر وہ آدمی واپس چلا گیا۔ اندر کمرے میں کرسیوں پر دو آدمی بیٹھے تھے، حسن کو دیکھتے ہی اٹھ کھڑے ہوئے۔ ”آؤ آؤ، حسن بخت۔ بہت انتظار کروایا تم نے“ ان میں سے ایک نے کہا۔

حسن نے کہا ”مجھ سے ایسا کیا کام پڑ گیا کہ میری تصویر اخبار میں شائع کروادی تم لوگوں نے“

”آرام سے بیٹھو پھر بات کرتے ہیں جلدی کیا ہے؟ بیٹھو۔“ اسی آدمی نے کہا حسن خاموشی سے ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

”پہلے ہم اپنا تعارف کروادیں میرا نام مراد ہے اور یہ شالی ہے ہم دونوں بھی تمہارے پیشے سے تعلق رکھتے ہیں اور تمہاری طرح بڑا ہاتھ مارنے کے چکر میں رہتے ہیں اس مقدمے کی وجہ سے اخبار نے تمہیں بہت کوریج دی جس کی وجہ سے ہمیں پتہ چلا کہ تم ہم سے بہادر ہو، اسی وجہ سے اتنی رکاوٹوں کے باوجود تم اس کروڑ پتی کی تجوری تک تو پہنچ ہی گئے تھے آگے تو تمہاری قسمت تھی۔ بہر حال اس دفعہ ہم نے ارادہ کیا ہے کہ تمہیں بھی ساتھ ملا لیا جائے اور ایسی جگہ کا پتہ چلایا ہے کہ اگر وہاں تمہارا کام بن جائے تو وہاں سے اتنا کچھ مل سکتا ہے کہ ہماری آنے والی نسلیں بھی سنور سکتی ہیں اور ہم ہمیشہ آرام سے زندگی بسر کر سکتے ہیں۔ اس کام کے لئے جو میں تمہیں ابھی بتاؤں گا تم جیسے خوبصورت آدمی کی ضرورت تھی اور ہم نے یہ بھی پتہ چلا لیا تھا کہ تم کس دن رہا ہونے والے ہو۔ چنانچہ ہم نے اخبار میں تمہاری تصویر اس لئے شائع کروائی تا کہ تم فوری طور پر ہم سے رابطہ کرلو۔ اب تم بتاؤ کہ تم ہمارا ساتھ دو گے یا نہیں؟ مراد نے مسلسل بولتے ہوئے کہا اور خاموش ہوگیا۔

حسن جواب تک خاموشی سے بیٹھا اس کی بات سن رہا تھا اس کے بات ختم ہوتے ہی کہنے لگا ”تم نے ساری تفصیل میرے سامنے بیان کردی لیکن میں ابھی سزا کاٹ کر نکلا ہوں یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ اب میں چوری کرنا چھوڑ دوں۔“

تمہارا کیا بھوکوں مرنے کا ارادہ ہے؟ ہم جانتے ہیں کہ تمہارے پاس اس وقت نہ رہنے کے لئے کوئی ٹھکانہ ہے اور نہ ہی کوئی رقم۔ اتنی جلدی نوکری تو تمہیں مل نہیں سکتی۔ ویسے بھی میٹرک پاس کو آج کل کون پوچھتا ہے؟ اس کے علاوہ ہمیں تمہارے ماضی کے بارے میں سب کچھ پتہ ہے۔ ہمیں معلوم ہے کہ تمہارے کیا کیا خواب ہیں؟ اس لیے تو تم یہ کام چھوڑ ہی نہیں سکتے“ شالی نے اب اس کو آئینہ دکھایا۔ حسن تھوڑی دیر تک سوچتا رہا۔

”ٹھیک ہے! میں تیار ہوں۔ بولو کرنا کیا ہے؟“ شالی کی تمام باتیں حسن کے دل کو لگیں اور اس نے یہ سوچ کر ہاں کردیا کہ ایک دفعہ پھر ٹرائی کرنے میں کیا حرج ہے ہوسکتا ہے کہ قسمت ساتھ دے اور اتنا مل جائے کہ میرا مستقبل کسی حد تک سنور جائے۔

”اس کے لئے ہمیں خان گڑھ جانا ہوگا وہاں کے چوہدری نیر دز بخت جو اپنے ملازموں کے ساتھ بالکل اکیلے رہتے ہیں تم ان کے پاس جاکر خود کو ان کا بیٹا ظاہر کرنا اور کسی بھی طریقے سے ان سے اتنی دولت ہتھیا لینا کہ ہم تینوں آسانی کے ساتھ اس ملک سے نکل کر کہیں اور جاکر اپنا مستقبل سنوار سکیں۔“ مراد نے بتایا۔

”لیکن وہ مانیں گے کیسے کہ میں ان کا بیٹا ہوں۔ یہی تو پہلی مشکل بات ہے یہ کہ ان کا ماننا بہت مشکل ہے دوسری مشکل بات، اگر وہ مان بھی جائیں تو کیا اتنی جلدی مجھے اتنا روپیہ فراہم کردیں گے؟“

حسن نے پوچھا۔

”پہلی مشکل بات اتنی مشکل نہیں ہے وہ خود مانیں گے کہ تم ان کے بیٹے ہو کیونکہ ہماری تحقیقات کے مطابق ان کا ایک بیٹا کہیں بچپن میں کھو گیا تھا تم خود کو وہی بیٹا ظاہر کرنا جب وہ یہ بات مان لیں گے تو پھر تمہارا ان سے رقم حاصل کرنا اتنا مشکل کام نہیں ہے ہمیں ویسے بھی کوئی اتنی جلدی نہیں ہے تم حالات کا مشاہدہ کرکے آرام وسکون سے یہ کام کرنا“ مراد نے اس کی تسلی کروائی ان کے بیٹے کا نام حسن بخت تھا جو اتفاق سے تمہارا بھی نام ہے اور شکل وصورت میں تو تم رئیس زادے لگتے ہو۔“

”ٹھیک ہے! تیار ہوں میں۔ لیکن فی الحال تو میں بہت تھک چکا ہوں۔“ اس نے کہا۔

”ہاں! تم ساتھ والے کمرے میں آرام کرلو۔ باقی تفصیلات بعد میں طے کریں گے“ مراد نے کہا تو حسن اٹھ کر ساتھ والے کمرے میں چلا گیا۔

دوسرے دن کافی دن چڑھ آیا جب حسن کی آنکھ کھلی پہلے تو اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا لیکن پھر اس کو رات کی تمام باتیں یاد آئیں تو وہ ایک دم سے اٹھ بیٹھا اور فوراً باہر نکل گیا دوسرے کمرے میں صرف مراد بیٹھا تھا ”اٹھ گئے تم؟“ مراد نے اسے دیکھتے ہی پوچھا۔ ”رات کو ہم تمہیں اٹھانے کے لئے آئے تھے مگر تم بہت گہری نیند سو رہے تھے۔“

”ہاں کافی عرصے سے بستر پر سکون کی نیند نہیں سویا تھا شالی کہاں ہے؟“ حسن نے پوچھا۔

”وہ ناشتہ لینے گیا ہے بس آتا ہی ہوگا تم جب تک منہ ہاتھ دھولو۔“ مراد نے جواب دیا تو حسن اثبات میں سر ہلاتا ہوا باتھ روم میں گھس گیا جب باہر نکلا تو شالی آچکا تھا۔

”آجاؤ بھئی، گرم گرم حلوہ پوری ہے“ شالی نے اسے بلایا ناشتے کے بعد مراد نے کہا۔

”اب ذرا کام کی بات ہوجائے۔ ہم نے آج شام روانہ ہونا ہے تم اپنے لئے کچھ خریداری کرلو۔“

”ٹھیک ہے چلو“ حسن نے کہا اور تینوں بازار چلے گئے۔

کافی ساری شاپنگ کرکے تھکے ہوئے وہ دوپہر تک گھر آئے اور کھانا وغیرہ کھانے کے بعد آرام کرنے لگے کیونکہ شام کو انہوں نے روانہ ہونا تھا۔ شام کو جب حسن نہا دھو کر تیار ہوا تو وہ اپنے آپ کو آئینے میں پہچان نہ سکا۔ ”واقعی اچھا لباس شخصیت کو بدل کر رکھ دیتا ہے“ اس نے سوچا کمرے سے باہر آیا تو مراد اور شالی بھی اسے دیکھتے رہ گئے۔

”واہ زبردست! یار تم تو واقعی رئیس زادے لگتے ہو“ مراد نے توصیفی نگاہوں سے حسن کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”ہاں! جو ہوں وہی لگنا چاہئے اب جلدی نکلو ہمیں دیر ہورہی ہے“ حسن نے جواب دیا اور تینوں روانہ ہوگئے۔

تقریباً دو گھنٹے تک ان کا سفر جاری رہا آخر کار وہ خان گڑھ پہنچ ہی گئے اس وقت کافی شام ہوچکی تھی حویلی سے ذرا دور حسن نے گاڑی رکوادی۔ ”بس، یہیں روک دو اور میری ایک بات ذرا غور سے سن لو۔ تم دونوں میں سے کوئی بھی میرے ساتھ کو ٹھیک کرنے کی کوشش نہیں کرے گا اگر مجھے ضرورت محسوس ہوئی تو میں خود ہی تمہارے ساتھ رابطہ کرلوں گا۔ کیونکہ معلوم نہیں وہاں کیسے حالات پیش آئیں ٹھیک ہے، سمجھ گئے ہو دونوں۔“ حسن نے انہیں ہدایت کی۔

”ہاں ٹھیک ہے، ہمیں تمہاری بات سمجھ میں آگئی ہے اب تم جاؤ“ مراد نے کہا اور گاڑی واپس موڑ لی۔

حسن تھوڑی دیر تک وہاں کھڑا رہا پھر حویلی کی طرف چل پڑا۔ حویلی کے قریب پہنچ کر اس نے دو تین دفعہ زور سے دستک دی پھاٹک کی چھوٹی کھڑکی کھلی اور ایک آدمی نے باہر جھانکا ”کیا بات ہے بھئی اس وقت......؟“ اس آدمی نے پوچھا۔

”چوہدری صاحب کو بولو حسن بخت ان سے ملنا چاہتا ہے“ حسن بارعب لہجے میں کہا تو چوکیدار جو اس

کے لہجے اور شاندار شخصیت سے کچھ متاثر ہوگیا تھا بغیر کچھ کہے اندر چلا گیا تھوڑی دیر کے بعد پھاٹک کھل گیا۔

''آؤ صاحب اندر آجاؤ۔'' حسن اندر داخل ہوگیا۔ حویلی کا لان نہایت خوبصورت اور وسیع وعریض تھا حسن حویلی کی خوبصورتی کو دل ہی دل میں سراہتا ہوا اندر کی جانب بڑھتا چلا گیا۔ اندرونی دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا تو ایک ملازم اس کے پاس آیا اور کہنے لگا۔ ''آیئے میرے ساتھ میں آپ کو چوہدری صاحب کے کمرے تک پہنچادوں ان کی طبیعت ذرا ٹھیک نہیں ہے اس لئے وہ اپنے کمرے میں ہیں حسن اس کے ساتھ چل پڑا پوری حویلی پر نہایت گہرا سکوت طاری تھا ملازم اسے لئے ایک کمرے کے دروازے پر پہنچا۔ ''یہ چوہدری صاحب کا کمرہ ہے'' ملازم نے کہا اور واپس مڑ گیا حسن اندر داخل ہوا اور سامنے بیڈ پر بیٹھے اس ادھیڑ عمر اور شاندار آدمی کو دیکھتے ہی حیران ہوگیا کیونکہ حیرت انگیز طور پر چوہدری فیروز کی شکل حسن سے ملتی جلتی تھی۔ چوہدری صاحب کی آنکھوں میں بھی حسن کو دیکھ کر حیرانگی کے تاثرات ابھرے وہ چونک کر بولے۔

''تم کون ہو؟ تمہاری شکل تو میرے بیٹے حسن سے ملتی جلتی ہے۔''

''جی ہاں! ابا جان'' حسن نے جواب دیا۔ ''میں ہی آپ کا بیٹا حسن بخت ہوں'' اس نے منصوبے کے تحت کہا۔

''تم میرے بیٹے حسن ہو؟ لیکن وہ تو بچپن میں کھو گیا تھا تم حسن کیسے ہوسکتے ہو؟ لیکن تمہاری شکل میں میری بہت مشابہت بھی ہے تم واقعی میرے بیٹے حسن بخت'' چوہدری فیروز کی حالت عجیب ہوگئی خود ہی سوال جواب کرتے وہ ایک دم سے حسن سے مخاطب ہوئے۔

''جی ہاں! میں آپ کا وہی بیٹا ہوں جو بچپن میں کھو گیا تھا لیکن آج اس نے بڑی مشکلوں سے اپنا گھر پایا ہے'' حسن نے بھی جذباتی انداز میں کہا۔

''آؤ میرے بیٹے میرے گلے لگ جاؤ۔''

چوہدری صاحب نے بے تابی سے اپنے بازو پھیلا دیئے۔ حسن ان سے لپٹ گیا ان کے گلے لگے ہوئے اسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ اپنے سگے باپ سے ملا ہو اس کا اپنا دل بھر آیا تھا۔ چوہدری صاحب کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے لیکن وہ کچھ بول نہیں رہے تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد حسن ان سے الگ ہوا۔

''اب بس کریں ابا جان! اب آپ کیوں رو رہے ہیں؟ اب تو میں آ گیا ہوں'' حسن نے انہیں تسلی دیتے ہوئے کہا۔

''بس اچانک ہی خوشی مل گئی تو میں اپنے آپ پر قابو نہیں پاسکا بیٹے تم تھک گئے ہوگے میں ملازم کو کہہ دیتا ہوں وہ تمہیں تمہارے کمرے تک پہنچادے گا اب باقی باتیں صبح ہوں گی'' چوہدری صاحب نے کہا اور بیڈ کی سائیڈ پر لگی گھنٹی بجائی فوراً ہی ایک ملازم دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا ''حسن بیٹے کے لئے کمرہ کھول دو اور انہیں کھانا وغیرہ دو انہیں کوئی تکلیف نہیں ہونی چاہئے'' انہوں نے ملازم کو ہدایات دیں حسن اس کے ساتھ باہر نکل گیا چوہدری صاحب حیران تھے کہ آج اتنے برسوں بعد ان کا بیٹا خود ہی واپس آ گیا جیسے وہ خود گیا تھا ان کے دل میں شک بھی تھا کہ ہوسکتا ہے کہ وہ ان کا بیٹا نہ ہو البتہ وہ ایک نشانی دیکھ کر یقین کرسکتے تھے کہ وہ ان کا بیٹا ہے یا کہ نہیں۔

تھوڑی دیر تک حسن کھانا کھا کر فارغ ہوچکا تھا سارے دن کی بھاگ دوڑ سے اس پر کافی تھکن طاری ہوگئی تھی اس لئے اس نے حویلی کا جائزہ لینے کا کام صبح پر چھوڑ دیا اور لیٹ گیا۔ ''چوہدری صاحب نے تو بہت جلدی مجھے اپنا بیٹا تسلیم کرلیا ہے ورنہ میرا تو خیال تھا کہ مجھے کافی جدوجہد کرنی پڑے گی خیر آگے دیکھتے ہیں کہ کیا ہوتا ہے'' حسن سوچنے لگا انہی سوچوں میں اسے نیند آ گئی اچانک اس کی گہری نیند کسی شور سے ٹوٹ گئی پہلے تو وہ نا سمجھی کے عالم میں ادھر ادھر دیکھتا رہا پھر اسے یاد آیا کہ وہ چوہدری فیروز بخت کی حویلی میں موجود ہے اسی وقت اسے پھر رونے پیٹنے کا شور سنائی دیا۔ ''شور اس وقت اور وہ بھی حویلی میں'' اس نے ٹائم دیکھتے ہوئے سوچا گھڑی رات کا ایک بجا رہی تھی وہ کمرے سے باہر نکل آیا لیکن اسے پوری حویلی میں کوئی رونے والا نظر نہیں آیا جبکہ آہوں اور سسکیوں سے پوری حویلی اس طرح گونج رہی تھی جیسے رونے والی حویلی کے ہر کونے میں موجود ہو۔ حسن کچھ ڈر سا گیا اچانک اس کی نظر لاؤنج کی کھڑکی سے باہر لان میں پڑی تو وہ حیران رہ گیا کیونکہ باہر لان میں کچھ سائے لڑتے جھگڑتے نظر آئے جن میں سے ایک سایہ کسی بچے کا اور 3 سائے مردوں کے معلوم ہوتے تھے دیکھتے ہی دیکھتے وہ بچہ اور مرد زمین پر اس طرح گر گئے جیسے مر گئے ہوں جبکہ دو سائے اسی طرح کھڑے رہے حسن سوچنے لگا کہ اس وقت باہر لان میں کیا ہو رہا ہے؟ وہ باہر جانے لگا تو پیچھے سے اسے کسی نے پکڑ لیا۔ اس نے گھبرا کر پیچھے دیکھا تو چوہدری صاحب اس کے پیچھے کھڑے تھے ''وہ ابا جان! یہ باہر لان میں کیا ہو رہا ہے؟'' حسن نے پوچھا اور لان کی طرف اشارہ کیا تو اسی وقت اس نے اپنی زندگی کا حیران کن منظر دیکھا کیونکہ سائے غائب ہو رہے تھے دیکھتے ہی دیکھتے لان خالی ہوگیا اور آہوں سسکیوں کی آوازیں آنا بھی اچانک بند ہوگئیں حسن کا دماغ چکرا کر رہ گیا۔

''یہ سب کیا ہے؟'' اس نے گھبرا کر چوہدری صاحب کی طرف دیکھا۔

اسی وقت چوہدری صاحب روتے ہوئے حسن سے لپٹ گئے۔ ''تم...... تم واقعی میرے بیٹے ہو، مجھے پورا یقین ہوگیا ہے تم آج آئے اور وہ بھی آ گئی۔ اس نے مجھے تمہارے اپنا بیٹا ہونے کا یقین دلا دیا ہے'' اتنی بے ساختگی اور تڑپ تو اس وقت بھی ان میں پیدا نہیں ہوئی تھی جب حسن پہلی بار ان سے ملا تھا وہ حیران پریشان کھڑا رہ گیا اسی وقت انہوں نے حسن کی شرٹ کے بٹن کھولنے شروع کردیئے۔

''ارے، ارے! یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟''

حسن نے بوکھلاتے ہوئے انہیں روکنے کی کوشش کی لیکن انہوں نے اس کی شرٹ اُتار کر پھینک دی اور اس کی پشت اپنی طرف کرلی اور اس کے کندھے پر کچھ ٹٹولنے لگے۔ ''ہاں...... تم ہی میرے بیٹے ہو یہ دیکھو تمہارے کندھے پر سرخ رنگ کا کراس نشان'' واقعی حسن کے کندھے پر سرخ رنگ کا ایک کراس موجود تھا جو اس نے کئی بار خود بھی آئینے میں دیکھا تھا لیکن اسے کبھی کوئی اہمیت نہیں دی تھی لیکن اس وقت چوہدری فیروز بخت کو وہ نشان ٹٹولتے دیکھ کر وہ سوچنے لگا کہ اگر وہ واقعی چوہدری صاحب کا حقیقی بیٹا ہے تو پھر قسمت کے کیا کہنے۔ چوہدری صاحب ابھی تک اس سے لپٹے ہوئے تھے حسن انہیں دلاسا دینے لگا۔

''اچھا ہے ابا جان! آپ کو مکمل طور پر یقین آ گیا کہ میں آپ کا بیٹا ہوں۔ آئیں آپ بیٹھیں آپ کی طبیعت پہلے ہی ٹھیک نہیں ہے'' حسن نے انہیں لاؤنج میں موجود صوفے پر بٹھاتے ہوئے کہا انہیں پانی دیا پانی پینے کے بعد جب چوہدری صاحب کی کچھ حالت سنبھلی تو حسن نے پوچھا ''ابا جان یہ رونے کی آوازیں اور جو کچھ میں نے لان میں دیکھا وہ اور آپ کے الفاظ کہ تم بھی آج آئے اور وہ بھی آ گئی، ان کی کیا حقیقت ہے؟ مجھے بتائیں میرا دماغ بہت الجھا ہوا ہے۔''

''بس بیٹا! یہ سب میرے اس عمل کی سزا ہے جو میں نے جوانی کے نشے اور ضد میں آ کر کیا ابھی تم جا کر سو جاؤ اس بارے میں صبح بات کریں گے'' چوہدری صاحب نے ٹوٹے ہوئے لہجے میں کہا۔

''نہیں ابا جان! مجھے اب نیند نہیں آئے گی جب تک آپ مجھے اس حقیقت سے آگاہ نہیں کریں گے۔'' حسن نے ضد کرتے ہوئے کہا۔

''ابھی میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے ابھی میں تمہیں کچھ نہیں بتا سکوں گا'' چوہدری صاحب نے انکار کرتے ہوئے کہا تو حسن ان کی طبیعت کی خرابی کا سن کر پریشان ہوگیا۔

''ٹھیک ہے آپ اب آرام کریں آئیں میں آپ کو کمرے تک چھوڑ آؤں'' حسن نے کہا اور انہیں سہارا دیتے ہوئے ان کے کمرے میں چھوڑ آیا۔

حسن کا ذہن بہت سی سوچوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا

اسے اس بات کی بہت خوشی ہو رہی تھی کہ وہ واقعی چوہدری فیروز بخت کا بیٹا ہے بے نام ونشان نہیں ہے قسمت نے مجھے کہاں سے کہاں پہنچا دیا کہاں میرے پاس کل تک رہنے کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا اور کہاں آج میں اتنی بڑی جائیداد کا مالک ہوں واہ مراد اور شانی تم دونوں نے انجانے میں مجھ پر بہت بڑا احسان کیا ہے میں تمہیں اس کا بدلہ ضرور دوں گا۔ لیکن یہ سارا واقعہ جو آج پیش آیا وہ کیا تھا؟ خیر صبح سہی یہی کچھ سوچتے ہوئے اسے نیند آ گئی اور وہ سو گیا۔

صبح اس کی آنکھ کھلی تو دن کے 12 بج رہے تھے جلدی سے وہ اٹھا اور باتھ روم میں گھس گیا فریش ہو کر وہ کمرے سے باہر نکل آیا۔ اسی وقت ایک ملازم اس کے پاس آیا۔ ”صاحب! ناشتہ لگا دوں؟“ ملازم نے مودبانہ لہجے میں پوچھا۔

”ہاں لگا دو بہت بھوک لگ رہی ہے اور ابا جان کہاں ہیں؟“ حسن نے جواب دینے کے ساتھ ساتھ سوال بھی کر دیا۔

”وہ اسٹڈی روم میں ہیں“ ملازم نے جواب دیا اور ناشتہ لگانے چلا گیا۔ تھوڑی دیر میں وہ ناشتہ کر کے فارغ ہو چکا تھا۔

”اسٹڈی روم کہاں ہے؟“ حسن نے ایک ملازم سے پوچھا۔

”آئیں میرے ساتھ۔“ حسن ملازم کے ساتھ چل پڑا۔ ایک کمرے کے دروازے پر رک کر ملازم نے کہا ”صاحب یہ ہے اسٹڈی روم“

”ٹھیک ہے تم جاؤ۔“ حسن نے کہا اور دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا اسٹڈی روم کیا تھا ایک وسیع وعریض لائبریری تھی۔

چوہدری صاحب ایک طرف آرام کرسی پر نیم دراز تھے۔ ”آؤ حسن بیٹے! اٹھ گئے“ چوہدری صاحب نے حسن کو دیکھتے ہی پوچھا۔

”ہاں! ابا جان، اٹھ بھی گیا اور ناشتہ بھی کر لیا۔ آپ کی طبیعت اب کیسی ہے؟“ حسن نے پوچھا۔

”اب تو بالکل ٹھیک ہوں۔ بیٹھ جاؤ بیٹا، کیوں کھڑے ہو؟“ چوہدری صاحب نے کہا تو حسن ایک طرف بڑے صوفے پر بیٹھ گیا تھوڑی دیر تک خاموشی رہی پھر حسن نے بغیر کسی تمہید کے پوچھا۔

”ابا جان! میں بہت اُلجھن میں ہوں پلیز آپ مجھے بتا دیں کہ رات کے واقعے کی کیا حقیقت ہے؟“ چوہدری فیروز بخت یہ سن کر کچھ سوچ میں پڑ گئے تھوڑی دیر کے بعد گویا ہوئے۔

”سننا ہی چاہتے ہو تو سنو! میری بربادی کی یہ کہانی اس وقت کی بات ہے جب میں بالکل جوان تھا اور میرا مزاج کسی ضدی اور اڑیل گھوڑے کی طرح تھا میں اپنے ماں باپ کا اکلوتا بیٹا تھا اس لئے روپے پیسے کی ریل پیل جوانی اور خوبصورتی نے میرا دماغ خراب کر دیا تھا میرا مزاج نہایت حاکمانہ تھا اور میں جس چیز کو پسند کر لیتا تھا اسے حاصل کر کے چھوڑتا تھا اگر نہ ملتی تو اس کا حشر نشر کر کے رکھ دیتا تاکہ وہ کسی اور کے استعمال کے قابل نہ رہتی تھی میرے والدین مجھے بہت سمجھانے کی کوشش کرتے تھے لیکن میں اس وقت جوانی کے نشے میں اتنا چور تھا کہ ان کی کسی نصیحت پر کان نہ دھرتا۔ ان سب برائیوں کے ساتھ ساتھ میں عیاش بھی تھا عورت میری کمزوری تھی جو عورت مجھے پسند آ جاتی میں اسے حاصل کر کے چھوڑتا۔ لیکن میرے والدین میری اس برائی سے بے خبر تھے۔

ہمارے خاندان میں جلد شادی کر دینے کا رواج تھا لہٰذا جوں ہی میں 22 سال کا ہوا تو میری بھی شادی کر دی گئی میں نے احتجاج اس لئے نہیں کیا کہ مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا کیونکہ شادی تو مجھے کرنی ہی تھی لیکن پہلی رات ہی میں نے اپنی بیوی جہاں آرا پر واضح کر دیا کہ اس کی حیثیت میری زندگی میں بالکل ایسی ہے جیسے کسی عام سی چیز کی۔ لہٰذا وہ مجھ سے کوئی توقع وابستہ نہ کرے وہ بیچاری کیا کہتی خاموش رہی دن گزرتے رہے میری شادی کو ڈیڑھ سال ہو گیا ہمارے گھر کوئی اولاد نہ ہوئی لیکن مجھے اس کی کوئی فکر نہ تھی

میری عیاشیاں بدستور جاری تھیں انہی دنوں میرے ساتھ وہ واقعہ پیش آیا جس کی سزا میں آج تک بھگت رہا ہوں۔

ایک دن میں اپنی زمینوں کا جائزہ لینے کے لئے گیا شام ہو رہی تھی موسم بھی بڑا سہانا ہو رہا تھا زمینوں پر میرے مزارے کام کر رہے تھے جن میں کچھ عورتیں بھی تھیں میں ان کا جائزہ لے رہا تھا کہ اچانک ہوا کا تیز جھونکا آیا اور میرے سامنے کھڑی وہ واحد عورت جس نے اپنا چہرہ چادر سے ڈھانپ رکھا تھا، اس کے چہرے سے چادر ہٹ گئی، میری نظر اسی پر تھی کیونکہ وہ جسامت کے لحاظ سے بالکل نوجوان لڑکی لگ رہی تھی انتہائی متناسب جسم تھا اس کا اس کے چہرے سے چادر ہٹتے ہی جیسے میری نگاہوں کے سامنے بجلیاں کوند گئیں اتنا خوبصورت اور معصوم چہرہ میری نگاہوں سے آج تک نہیں گزرا تھا میں اس کو دیکھتا رہ گیا میری نظریں اپنے چہرے پر محسوس کرتے ہی اس کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات ابھرے اس نے جلدی سے چادر سے اپنا چہرہ ڈھکا اور دوبارہ سے اپنے کام میں مصروف ہو گئی جبکہ میرا یہ حال تھا کہ میں مسلسل اسی کو دیکھے جا رہا تھا آخر مجھ سے رہا نہ گیا اور میں اس کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔

”کیا نام ہے تمہارا لڑکی؟ ہم نے تو پہلے تمہیں اپنی زمینوں پر نہیں دیکھا۔“ میں نے اس سے پوچھا۔

”میرا نام سکینہ ہے سائیں، مجھے یہاں پر آئے ہوئے دو تین دن ہی ہوئے ہیں پہلے میری ساس یہاں کام کرتی تھی لیکن اب وہ بیمار ہے اس لئے میں یہاں آئی ہوں“ اس کا جواب دینے کا انداز یوں تھا جیسے کہہ رہی ہو کہ جاؤ اب جان چھوڑو۔ لیکن حسن جہاں مجھے نظر آ جاتا اس کی جان کیسے چھوڑتا تھا اس لئے وہیں کھڑا رہا اسی وقت ایک آدمی میرے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔

”چھوٹے سائیں! کیا بات ہے؟ سکینہ سے کوئی غلطی ہو گئی ہے کیا؟“ میں نے اسے پہچان لیا وہ میرا مزارع دینو تھا۔

”نہیں غلطی تو نہیں ہوئی ویسے ہی میں اس سے پوچھ رہا تھا کہ یہ یہاں پر پہلے تو کبھی نظر نہیں آئی“ میں نے کہا۔

”ہاں سائیں! میری ماں بیمار ہو گئی ہے تو اس کی جگہ تھوڑے دنوں کے لئے آئی ہے“ دینو نے کہا جیسے میرے سر پر پہاڑ گر پڑا۔

”یہ تمہاری بیوی ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”جی سائیں! یہ میری بیوی ہے میرا ایک بچہ بھی ہے“ دینو نے مجھے یوں بتایا جیسے کچھ جتا رہا ہو۔ میری شہرت گاؤں میں کچھ اچھی نہ تھی لیکن میرے خوف سے کوئی بھی شکایت کا حرف زبان پر نہیں لاتا تھا۔

”چھوٹے سائیں! اب ہم جائیں شام ہو رہی ہے“ دینو نے پوچھا۔

”ہاں جاؤ“ میرے منہ سے بمشکل نکلا۔ دونوں چلے گئے جبکہ میں وہاں کھڑا سوچ رہا اتنی خوبصورت اور نرم ونازک لڑکی اور دینو جیسے غریب آدمی کی بیوی جو عمر میں اس سے بڑا بھی ہے۔ حقیقت یہ تھی کہ سکینہ کی معصومیت نے میرے دل کو گھائل کر دیا تھا اور میں نے وہیں کھڑے کھڑے فیصلہ کر لیا کہ چاہے کچھ بھی ہو جائے مجھے سکینہ کو اپنی بیوی بنانا ہے مجھے اپنے فیصلے کی سنگدلی کا ذرا بھی احساس نہ تھا یہی کچھ سوچتے ہوئے میں واپس حویلی آ گیا۔

اس وقت بھی میں حویلی کے لان میں بیٹھا اسی بارے میں سوچ رہا تھا کہ میرا خاص ملازم اللہ رکھا وہاں آ گیا۔ ”کیا بات ہے چھوٹے سائیں؟ بہت پریشان لگ رہے ہیں۔“ اس نے پوچھا۔ میرا یہ ملازم میرا دست راست تھا اور میرے ہر کام میں وہ میری ہر ممکن مدد کرتا تھا۔

”ہاں میں واقعی پریشان ہوں اور میرا خیال ہے کہ تم میری بہت مدد کر سکتے ہو۔“ میں نے کہا۔

”جی سرکار! آپ کے لئے تو میری جان بھی حاضر ہے آپ بتایئے کیا پریشانی ہے؟“ اس نے جواب دیا۔

”تو پھر غور سے میری بات سنو۔ ایک لڑکی ہے سکینہ دینو مزارع کی بیوی ہے اس پر بہت بری طرح اپنا دل آ گیا ہے میں اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں تم کسی طرح اسے یہاں پر لے آؤ میں اس سے خود بات کرلوں گا“ میں نے اللہ رکھا کو ساری بات بتاتے ہوئے کہا تو وہ کچھ سوچ میں پڑ گیا۔

”ہاں چھوٹے سائیں وہ لڑکی دیکھی ہے میں نے بھی بہت حسین اور بھرپور جوانی کی مالک ہے میں نے اس لئے اس کا ذکر آپ کے سامنے نہیں کیا تھا کیونکہ وہ ایک بچے کی ماں بھی ہے۔“ اللہ رکھا نے بتایا۔

”کوئی بات نہیں بچے کا کیا ہے بس تم اسے کسی طرح میرے پاس لے آؤ“ میں نے کہا۔

”لیکن سائیں میری سمجھ میں ایک بات نہیں آ ئی کہ اتنی خوبصورت اور کنواری لڑکیاں ہیں آپ کے ایک اشارے پر کوئی بھی آپ کی ہو سکتی ہے پھر یہ سکینہ جو شادی شدہ ہونے کے علاوہ ایک بچے کی ماں بھی ہے“ اللہ رکھا نے کہا۔

”بس دل کی بات ہے جس پر بھی آجائے مجھے کوئی پرواہ نہیں ہے کہ وہ کون ہے اور کیا ہے؟ بس میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ میں اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں بس اب تم جاؤ زیادہ سوال نہیں کرو“ میں نے کہا تو اللہ رکھا سلام کرتا ہوا چلا گیا۔

دوسرے دن میرے والدین کو ایک عزیز کی شادی میں جانا پڑ گیا تو جہاں آرا بھی ساتھ چلی گئی میں نے اللہ رکھا سے کہا کہ موقع اچھا ہے سکینہ کو کسی طرح لے آؤ وہ چلا گیا تھوڑی دیر کے بعد آیا تو سکینہ اس کے ساتھ تھی اس نے مجھے سلام کیا میں نے اللہ رکھا سے کہا کہ وہ جائے اور میں سکینہ کو اپنے کمرے میں لے آیا۔ میرے کمرے میں داخل ہوتے ہی وہ چونک گئی لیکن بولی کچھ نہیں۔ ”بیٹھو سکینہ! مجھے تم سے کچھ بات کرنی ہے“ میں نے کہا تو وہ مجھے دیکھنے لگی۔

”لیکن سائیں! مجھے تو بڑی بیگم صاحبہ نے بلایا ہے“ اس نے جواب دیا۔

”نہیں، میں نے بلایا ہے، تم بیٹھو۔ آرام سے بات کرتے ہیں“ میں نے نرم لہجے میں کہا۔ یہ سنتے ہی اس کے چہرے پر غصے کے تاثرات پھیل گئے لیکن وہ آرام سے کرسی پر بیٹھ گئی۔

”کیا بات ہے؟ مجھے کیوں بلایا آپ نے؟“ وہ بولی تو اس کے لہجے میں غصہ نمایاں تھا اس غصے کے عالم میں وہ مجھے نہایت حسین لگی میں بجائے جواب دینے کے اسے دیکھنے لگا تو وہ ایک دم سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

”چھوٹے سائیں! لگتا ہے کہ آپ کو مجھ سے کوئی کام نہیں ہے لہٰذا مجھے اجازت دیں“ اس نے غصے سے کہا۔

”سکینہ! تم بہت خوبصورت ہو، مجھ سے شادی کرو گی؟“ میں نے بغیر کسی تمہید کے بات کہہ دی۔

”کیا! یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟ آپ کا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا حالانکہ میں شادی شدہ اور ایک بچے کی ماں ہوں۔“ میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

”لیکن مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ تم دینو کو چھوڑ دو اور مجھ سے شادی کرلو۔ تمہاری جگہ کسی جھونپڑی میں نہیں بلکہ اس شاندار حویلی میں ہے۔“

”بس خاموش ہو جاؤ۔ تم جیسے عیاش آدمی کو اس کے سوا بھی کچھ سوجھتا ہے جہاں کسی عورت کو دیکھا تو فوراً پھسل پڑے۔“ اس نے غصے سے کانپتے لہجے میں کہا۔

”بے شک دینو مجھ سے بڑا ہے لیکن وہ میرا شوہر ہے میرے بچے کا باپ ہے تمہاری طرح بدکردار نہیں ہے۔“ سکینہ کی باتیں سن کر میرا خون کھول اٹھا اور میں ساری نرمی بھول گیا۔

”خبردار! اب اگر تم نے ایک لفظ بھی زبان سے نکالا۔ میں نے تمہیں عزت دینا چاہی لیکن تم اس دو ٹکے کے انسان کو مجھ پر ترجیح دے رہی ہو۔ لیکن تم میری بات غور سے سن لو کہ میں تمہیں حاصل کر کے رہوں گا۔ میں تمہیں کل تک سوچنے کی مہلت دیتا ہوں اگر تم میری نہ ہو سکی تو پھر دینو کی بھی نہیں رہو گی۔“ میں نے غصے سے چلاتے ہوئے کہا۔

”میرا جواب آج بھی انکار میں ہے اور کل بھی یہی رہے گا۔“ اس نے اتنا کہا اور کمرے سے باہر نکل گئی۔

”میں تہس نہس کردوں گا سب کو۔ دیکھتا ہوں کیسے انکار کرتی ہے۔“ میں نے غصے سے کھولتے ہوئے ادھر ادھر چیزوں کو ٹھوکریں رسید کیں۔

اسی وقت اللہ رکھا گھبرایا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔ ”چھوٹے سائیں کیا ہوا؟ وہ سکینہ بڑے غصے سے گئی ہے۔ سائیں مجھے تو پہلے ہی پتا تھا کہ وہ ماننے کی نہیں جبکہ اس کو سوچنا چاہئے کہ اسے آپ جیسا خوبصورت جاگیردار کہاں ملے گا۔ لیکن سائیں کہیں وہ ساری باتیں دینو کو نہ بتا دے۔“ اللہ رکھا نے کہا۔

”مانے گی کیسے نہیں۔ اسے ماننا پڑے گا اور اگر وہ کسی کو اس بارے میں کچھ بتائے گی تو خود ہی بدنام ہو گی۔ میرا کچھ نہیں بگڑے گا۔“ میں نے غصے سے کہا۔ ”میں نے اسے کل تک کی مہلت دی ہے کل تم جا کر اس سے جواب لے کر آنا۔ اب تم جاؤ۔“ اللہ رکھا جلدی سے کمرے سے باہر نکل گیا۔

میں نے وہ سارا دن اور ساری رات شدید بے چینی میں گزاری۔ دوسرے دن شام کو اللہ رکھا میرے پاس آیا۔ ”اللہ رکھا جلدی سے بتا اس نے کیا کہا ہے؟“ میں نے اسے دیکھتے ہی پوچھا۔

”چھوٹے سائیں! وہ کہتی ہے کہ اسے کوئی پرواہ نہیں کہ تمہارا چھوٹا چوہدری کیا کرتا ہے۔ میری طرف سے کل بھی انکار تھا اور آج بھی انکار ہے۔“ اس کا جواب سنتے ہی میرے تن بدن میں غصے سے آگ لگ گئی۔

”چھوٹے سائیں! آپ چھوڑیں اس کو۔ اس شادی شدہ اور ایک بچے کی ماں میں کیا رکھا ہے۔ آپ کو ایک سے ایک حسین لڑکی مل سکتی ہے۔“ اس نے میری حالت دیکھتے ہوئے کہا۔

”ہرگز نہیں! میں اسے حاصل کر کے رہوں گا۔ وہ میری ضد بن چکی ہے۔ تم ایک کام کرو۔ تم آج رات اسے اس کے شوہر اور بچے کے ساتھ اغواء کر کے یہاں لے آؤ۔ اور تم نے یہ کام ہر صورت میں کرنا ہے اور آج ہی۔“ میں نے غصے سے کھولتے ہوئے کہا تو اللہ رکھا جلدی سے سر ہلاتا ہوا باہر نکل گیا۔

تقریباً رات کے 10 بجے وہ میرے پاس آیا۔ ”سائیں! میں انہیں لے آیا ہوں۔ سکینہ کو میں نے علیحدہ بند کیا ہے اور اس کے شوہر اور بچے کو علیحدہ۔“ اس نے مجھے اطلاع دی۔

”ٹھیک ہے۔ تم دینو کو لے کر تہہ خانے میں آؤ میں وہیں پر ہوں۔“

میں نے کہا اور تہہ خانے کی طرف چلا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد دینو کو اللہ رکھا لے کر آ گیا۔ اس کے ساتھ اس کا بچہ بھی تھا۔ دینو کی نظر جوں ہی مجھ پر پڑی وہ میرے پیروں پر گر پڑا۔ ”سائیں ہم سے کیا ایسی غلطی ہو گئی ہے جو آپ نے ہمیں اٹھوایا ہے“ اس نے کہا۔

”کوئی غلطی نہیں ہوئی۔“ میں نے اسے پکڑ کر کھڑا کیا۔ ”تم میری بات غور سے سنو اور اس پر عمل کرنے میں ہی تمہاری بہتری ہے۔ بات یہ ہے کہ ہمیں سکینہ پسند آ گئی ہے اور اتنی پسند آ گئی ہے کہ میں نے اسے اپنی بیوی بنانے کا فیصلہ کیا ہے اس لئے میں چاہتا ہوں کہ تم اسے طلاق دے دو تاکہ میں اس سے شادی کرسکوں اور اس کام کے لئے تم جتنی دولت چاہو گے میں دوں گا۔“ میں نے اسے اس کے اغواء کرنے کا مقصد بتاتے ہوئے کہا۔

وہ کچھ دیر تو اس طرح کھڑا رہا جیسے وہ کچھ سن نہ رہا ہو پھر ایک دم سے وہ مجھ پر پل پڑا۔ ”بے غیرت، کمینے، تو نے میری سکینہ پر بری نظر ڈالی جو فرشتوں کی طرح معصوم ہے۔ ہم تجھے اپنا مائی باپ سمجھتے ہیں اور تو ہماری عزتوں پر ہی ہاتھ ڈالتا ہے اور پھر چاہتا ہے کہ ہم اپنی عزتوں کی قیمت بھی وصول کریں۔“ وہ یہ سب بولتا ہوا اتنا اچانک مجھ پر حملہ آور ہوا تھا کہ میں اپنا بچاؤ نہ کرسکا اور اس کے دھکا دینے سے دور جا گرا۔ میرا سر دیوار سے ٹکرایا تو میری آنکھوں کے آگے اندھیرا سا آ گیا۔

میرے سنبھلتے سنبھلتے وہ مجھ پر آ پڑا۔

میں نے جلدی سے سر جھٹک کر اپنے حواس بحال کیے اور دینو کو دھکا دے کر پرے کیا۔ خون سے میری پیشانی تر ہوگئی اپنا خون دیکھتے ہی میں پاگل ہوگیا۔ میں جس، جس نے زندگی میں کبھی زمین کا منہ نہیں دیکھا تھا اس نیچ آدمی کی وجہ سے میں نہ صرف زمین پر گرا بلکہ میرا خون بھی نکلا۔ اس شور وہنگامے سے ڈر کر بچہ چیخ چیخ کر رونے لگا میں نے بغیر سوچے سمجھے ریوالور نکال کر بچے کو گولی ماردی بچے کو گولی لگتے دیکھ کر دینو بچے کی طرف بھاگا تو میں نے دوسری گولی دینو کو ماری پھر تو مجھ پر دہشت طاری ہوگئی میں نے اپنا ریوالور خالی کردیا ریوالور پر سائیلنسر تھا اس لئے صرف ٹھک کی آواز پیدا ہورہی تھی۔

"بس کرو سائیں وہ دونوں مرگئے ہیں" میں ایک دم ہوش میں آگیا اور پاگلوں کی طرح دینو اور اس کے بچے کی لاشوں کو دیکھنے لگا۔ "سائیں! آپ نے ان دونوں کو ماردیا ہے۔" اللہ رکھا نے پھر کہا۔

"ماردیا۔" میرے منہ سے نکلا۔ "لیکن میں نے تو اسے سمجھانا چاہا تھا لیکن...... تم نے دیکھا اللہ رکھا میرا کوئی قصور نہیں ہے وہ دونوں خود ہی مرگئے۔" میں نے پاگلوں کے سے انداز میں کہا۔ کیونکہ میں لاکھ برا سہی لیکن اپنے ہاتھوں سے میں نے کبھی کسی کو قتل نہیں کیا تھا۔ "اب کیا ہوگا؟" میں نے اللہ رکھا سے پوچھا۔

"سائیں! کچھ نہیں ہوگا۔ ویسے بھی ساری غلطی دینو ہی کی تھی اگر وہ آپ کی بات کو مان لیتا تو جان سے ہاتھ نہ دھوتا۔ آپ فکر نہ کریں میں کچھ سوچتا ہوں کہ ان لاشوں کو کہاں ٹھکانے لگایا جائے۔" اللہ رکھا نے مجھے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ میں سر پکڑ کر ایک طرف بیٹھ گیا۔

اچانک اللہ رکھا نے کہا۔ "سائیں! آپ میری مدد کریں تو ہم ان دونوں لاشوں کو راتوں رات باہر لان کھود کر اس میں دفن کردیتے ہیں۔ تہہ خانے میں دفن کر نہیں سکتے کیونکہ اس کا فرش پکا ہے لان میں تھوڑے دنوں میں پودے اور گھاس اُگ آئے گی اور کسی کو شک بھی نہیں ہوگا۔

"ہاں! تم نے ٹھیک سوچا ہے ایسا ہی کرتے ہیں۔" میں نے اس کی تائید کی چنانچہ ہم دونوں نے مل کر لان میں گڑھا کھود کر دونوں لاشوں کو دفن کردیا۔ میں بہت تھک چکا تھا اور میری حالت بہت خراب ہورہی تھی اس لئے میں نے اپنے کمرے میں آکر نیند کی گولیاں کھائیں اور لیٹ گیا میں سوچ رہا تھا کہ اب سکینہ کو کیا جواب دوں گا؟ کہ اس کا شوہر اور بچہ کہاں ہیں؟ انہی سوچوں میں مجھے نیند آگئی۔

دوسرے دن تقریباً دوپہر کو میری آنکھ کھلی تو ایک دم سے رات والے واقعات میرے ذہن میں آگئے۔ میں فوراً اٹھ کر باہر آگیا پورے لان پر نظر ڈالی لیکن رات کے حادثے کے بعد ہونے والی کارروائی کے آثار نظر نہ آئے۔ اسی وقت اللہ رکھا میرے پاس آیا۔

"سائیں! میں نے لان بالکل صاف کردیا ہے اب کسی کو پتہ نہیں چلے گا۔ تھوڑے دنوں تک دینو اور سکینہ کی ڈھنڈیا مچے گی پھر سب آرام سے بیٹھ جائیں گے۔" اس نے نہایت رازداری سے مجھے بتایا۔ تو میں نے اسے گھورا۔

"اب خاموش ہوجاؤ، اور یہ بتاؤ کہ ابا جان اور اماں واپس آگئے ہیں" میں نے پوچھا۔

"جی ہاں! وہ آگئے ہیں اور چھوٹی بیگم بھی آگئی ہیں" اس نے جواب دیا۔ اسی وقت ایک ملازم میرے پاس آیا۔

"چھوٹے سائیں! آپ کو بڑے سائیں یاد کررہے ہیں" اس نے مجھے اطلاع دی۔

"اچھا ٹھیک ہے۔" میں نے کہا اور بابا جان کی طرف چلا گیا۔

ان سے مل کر میں واپس اپنے کمرے میں آیا تو سامنے ہی بیڈ پر جہاں آرا بیٹھی تھی مجھے دیکھتے ہی اس نے مجھے سلام کیا لیکن میں نظر انداز کرکے باتھ روم میں گھس گیا۔ فریش ہوکر ناشتہ کیا اور بابا جان کے کہنے پر ان کے ساتھ زمینوں پر چلا گیا۔ وہاں پر سب دینو کی

گمشدگی کے بارے میں باتیں کررہے تھے دینو کی ماں نے بابا جان کو بتایا تو انہیں بھی فکر ہوئی۔ انہوں نے دینو کی ماں کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔ "بے فکر رہو ہم اس کا پتہ لگانے کی پوری کوشش کریں گے کہیں تمہاری کسی کے ساتھ کوئی دشمنی تو نہیں ہے؟"

"نہیں سائیں! ہم غریبوں کی کس کے ساتھ دشمنی ہونی ہے پتہ نہیں میرا بیٹا، پوتا اور بہو تینوں غائب ہیں۔" دینو کی ماں نے روتے ہوئے کہا۔

"ہوسکتا ہے کہ تمہارے ساتھ کوئی ناراضگی ہوگئی ہو۔ کیونکہ بیوی اور بچے سمیت جانا تو یہی ظاہر کررہا ہے۔ بہرحال تم فکر نہ کرو۔ میں پتہ لگواتا ہوں۔" بابا جان نے اسے تسلی دی اور تھوڑی دیر تک زمینوں کا جائزہ لے کر ہم واپس حویلی چلے گئے۔

واپس حویلی آیا تو اللہ رکھا میرے پاس آیا۔

"چھوٹے سائیں! وہ سکینہ نہ کچھ کھارہی ہے نہ پی رہی ہے بس رو رہی ہے اور کہتی ہے کہ مجھے میرے بچے سے ملوادو۔" اس نے سرگوشی میں کہا۔

"اچھا کہاں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"سائیں، حویلی کے سب سے آخری والے کمرے میں ہے۔ میں نے اسے وہاں پر اس لئے رکھا تھا کیونکہ وہاں پر کسی کا آنا جانا نہیں ہے۔" اس نے جواب دیا۔

"اچھا تم اس سے کہو کہ رات کو اس سے اس کا بچہ ملوادیا جائے گا فی الحال رات تک ٹھہر جائے" میں نے کہا۔ "بہتر سائیں جیسا آپ کہیں۔" اس نے سر ہلایا اور چلا گیا۔

رات کو جب حویلی سنسان ہوگئی سب سوگئے اور ملازم اپنے گھروں کو چلے گئے تو میں کمرے سے باہر نکلا اور حویلی کے آخری کمرے کی طرف چل پڑا۔ وہاں پہنچ کر میں نے دیکھا کہ کمرے کے دروازے کے باہر اللہ رکھا بیٹھا ہوا تھا مجھے دیکھتے ہی اٹھ کھڑا ہوا۔ "تم باہر ہی ٹھہرو" میں نے اسے کہا اور کمرے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوگیا۔ میرے اندر داخل ہوتے ہی سکینہ نے جو ایک طرف گھٹنوں میں سر دیئے بیٹھی تھی سر اٹھا کر میری طرف دیکھا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

"تم نے مجھے کیوں اغواء کروایا ہے؟ تم میرا پیچھا چھوڑ کیوں نہیں دیتے۔ تم مجھے آزاد کردو یہ تمہارا مجھ پر احسان ہوگا۔ تمہیں مجھ سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ میں تمہاری بات نہیں مان سکتی۔" اس نے نہایت لجاجت بھرے انداز میں کہا۔

"نہیں سکینہ! میں تمہیں آزاد نہیں کرسکتا میں تمہیں کیسے چھوڑ سکتا ہوں تمہیں دیکھ کر تو مجھے زندگی کا احساس ہوا ہے تم میری بات مان کیوں نہیں لیتی۔ دیکھو سکینہ، حقیقت کو قبول کرو اب تمہاری باہر کوئی حیثیت نہیں ہوگی۔ کیونکہ تم اغواء ہوچکی ہو اب تو تمہیں دینو بھی قبول نہیں کرے گا۔" میں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

لیکن وہ بھی اپنے نام کی ایک تھی، کہنے لگی۔ "بس تم مجھے آزاد کردو میں اپنے بچے کو لے کر کہیں بھی چلی جاؤں گی۔ مجھے معلوم ہے کہ دینو اور میرا بچہ بھی تمہارے پاس ہیں تم مجھے ان سے ملوادو۔" اس نے پھر وہی رٹ لگائی تو مجھے غصہ آگیا۔

"تم میری بات سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کررہی تمہاری بات پر کوئی یقین نہیں کرے گا حتیٰ کہ تمہارا دینو بھی۔ میں تمہیں کسی صورت نہیں چھوڑ سکتا تم صرف میری ہو صرف میری۔ سن لیا ہے تم نے۔" میں نے غصے سے کہا۔

"ہرگز نہیں، میں تمہاری بات نہیں مانوں گی۔ تم مجھے میرا بچہ......" اس کے منہ سے بچے کا ذکر سنتے ہی میرا غصہ عروج پر پہنچ گیا میری بات سمجھ ہی نہیں رہی بچے بچے کی رٹ لگائے ہوئے ہے۔

"مرگیا ہے تمہارا بچہ، خبردار اب تم نے بچے کا نام لیا یا دینو کا نام لیا۔ اس نے بھی تمہاری طرح بحث کی کوشش کی تھی اور جان سے چلا گیا۔" میں غصے سے پاگل ہوکر اس کی طرف بڑھا تو وہ سہم کر پیچھے ہٹ گئی۔

"نہیں تم جھوٹ بول رہے ہو۔" اس نے بے یقینی کے انداز میں کہا۔

''میں جھوٹ نہیں بول رہا تم چاہو تو ان کی لاشیں بھی دیکھ سکتی ہو۔'' میں نے نہایت سنگدلی سے کہا میرے ذہن میں یہ بات تھی کہ اسے وقتی طور پر تھوڑا صدمہ تو ضرور ہوگا لیکن پھر وقت کے ساتھ ساتھ ٹھیک ہوجائے گی اور پھر میں اس سے شادی کرلوں گا۔

''تم نے میرا بچہ، میرا دینو مار دیا، تم ظالم، وحشی انسان، تم نے میرا گھر اجاڑ دیا۔ میں نے تمہارا کیا بگاڑا تھا ظالم انسان جس کی تم نے مجھے اتنی بڑی سزا دی۔'' وہ چیخ چیخ کر رو رہی تھی اچانک اس نے اپنے آنسو صاف کیے۔

''تم نے میری گود اجاڑ دی تم نے میرا شوہر مار دیا۔ لیکن تم اپنے مقصد میں پھر بھی کامیاب نہیں ہو گے۔ میں تمہیں ساری زندگی چین سے نہیں رہنے دوں گی۔ میرے مرنے کے بعد بھی تم میری بددعا کے حصار میں رہو گے اور میری بددعا ہے کہ خدا کرے تمہیں بھی اولاد کی خوشیاں نصیب نہ ہوں۔'' اس کے لہجے میں اتنی تڑپ تھی کہ مجھ جیسا انسان بھی کانپ گیا اتنا کہتے ہی اس نے نجانے کہاں سے چھری برآمد کی اور اپنے سینے میں گھونپ لی۔ یہ سب اتنی تیزی سے ہوا کہ میں کچھ بھی نہ کرسکا۔ وہ زمین پر گر کر تڑپنے لگی میں بھاگ کر اس کے پاس گیا تو اس نے میری طرف فاتحانہ نگاہوں سے دیکھا۔

''چوہدری فیروز! تم ہمیشہ میری بددعا کے حصار میں رہو گے۔'' اس کے لبوں سے آخری سرگوشی بلند ہوئی اور پھر اس کی گردن ڈھلک گئی لیکن اس کی نگاہیں اب بھی مجھ پر جمی ہوئی تھیں۔ میں گھبرا کر اٹھا اور کمرے سے باہر نکل آیا۔ اللہ رکھا مجھے دیکھتے ہی میرے پاس آیا۔

''چھوٹے سائیں! کیا ہوا؟'' اس نے میرا متوحش چہرہ دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''اللہ رکھا وہ سکینہ نے بھی خودکشی کرلی۔'' میں نے اسے بتایا۔

''کیا؟ اس نے خودکشی کرلی۔ یہ تو بہت برا ہوا، بہت برا'' وہ بھی پریشان ہوگیا۔

''میں نے اسے صرف دینو اور اس کے بچے کے بارے میں بتایا تھا تو اس نے چھری گھونپ لی اب کیا کریں تم ہی کچھ سوچو'' میں نے اللہ رکھا کو کہا۔

''کچھ بھی نہیں ہوگا سائیں، بس اس کمرے کے فرش کو کھود کر اس میں لاش کو دفن کردیں گے میں خود یہ کام کرلوں گا۔ بس آپ جائیں اور آرام کریں'' اس نے کہا وہ واقعی میرا وفادار تھا میں نہایت سست قدموں سے چلتا ہوا اپنے کمرے میں آگیا میری حالت اس وقت اس جواری کی سی ہورہی تھی جو اپنا سب کچھ ہار گیا ہو مجھے امید نہیں تھی کہ سکینہ کا ردعمل اتنا شدید ہوگا کہ وہ اپنی جان ہی ختم کرلے گی اس کی بددعا کے یاد آتے ہی میں پھر کانپ گیا کیا واقعی وہ ایسا کرے گی لیکن مرنے کے بعد تو انسان کا اس دنیا سے اختیار اور رابطہ ختم ہوجاتا ہے پھر وہ ایسا کیسے کرے گی۔ وہ ایسا کر ہی نہیں سکتی میری حالت اس وقت بہت عجیب ہورہی تھی میں ساری رات نہیں سوسکا اور بے کار سوچوں میں کھویا رہا۔

دوسرے دن جب جہاں آراء نماز پڑھنے کے لئے اٹھی تو مجھے جاگتے دیکھ کر حیران ہوئی کیونکہ میں کبھی بھی اس ٹائم نہیں اٹھا تھا وہ ڈرتے ڈرتے میرے پاس آئی۔ ''آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟'' اس نے سہمے ہوئے لہجے میں پوچھا تو میں نے اس کی طرف دیکھا۔

''نہیں میرے سر میں شدید درد ہورہا ہے اس لئے جاگ رہا ہوں'' میں نے اسے مطمئن کرنا چاہا۔

''میں آپ کا سر دبا دیتی ہوں'' اس نے کہا اور میرا جواب سنے بغیر ہی میرا سر دبانے لگی۔ میرا ابھی اس وقت بولنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا اس لئے خاموش رہا اس کے سر دبانے سے میری آنکھیں بند ہونے لگیں اور میں ساری رات کا جاگا ہوا تھا اس لئے تھوڑی دیر میں سو چکا تھا۔

دوپہر کے وقت میری آنکھ کھلی تو رات والا واقعہ ایک دم سے میرے ذہن میں آگیا۔ میں اٹھا منہ ہاتھ دھویا اور باہر نکل آیا ایک ملازم کو کہا کہ وہ اللہ رکھا کو بلاکر

لائے۔ اللہ رکھا آیا تو میں نے اس سے سکینہ کے بارے میں پوچھا۔ ''جی ہاں! چھوٹے سائیں میں نے رات کو ہی اس کمرے میں اس کی لاش دفن کردیا تھا اس کمرے میں ویسے بھی کاٹھ کباڑ رکھا ہوا ہے اس لئے وہاں کسی کا آنا جانا نہیں ہے۔ میں نے باہر سے تالا بھی لگا دیا ہے آپ اب بالکل فکر نہ کریں بے فکر ہوجائیں اور اس واقعے کو بھولنے کی کوشش کریں۔'' اللہ رکھا نے مسلسل بولتے ہوئے کہا۔

''بہت اچھا کیا تم نے۔ بس ٹھیک ہے اب تم جاؤ۔'' میں نے کہا تو وہ سلام کرتا ہوا چلا گیا۔

دن گزرتے رہے لیکن اب میری طبیعت پہلے سے بہت مختلف ہوگئی تھی اب میں جس عورت کو بھی دیکھتا تھا سکینہ کی صورت میری نگاہوں کے سامنے آجاتی اور میری طبیعت خراب ہونے لگتی۔ آہستہ آہستہ میں جہاں آراء کی طرف مائل ہونے لگا کیونکہ وہ واحد عورت تھی جس کے پاس جاکر مجھے سکون ملتا تھا جہاں آراء بھی خوش رہنے لگی۔ لیکن اب میری زندگی میں سکون نہیں تھا۔

تھوڑے عرصے کے بعد میرے گھر پہلا بیٹا پیدا ہوا۔ جس رات میرا بیٹا پیدا ہوا، اس رات اچانک پوری حویلی آہوں اور سسکیوں سے گونجنے لگی ان آوازوں میں اتنی تڑپ تھی کہ دل کانپنے لگتا تھا۔ باہر لان میں اچانک سائے نمودار ہونے اور غائب ہونے لگے۔ ہم سب گھبرا گئے اسی وقت میرا دھیان سکینہ کی طرف گیا تو کیا وہ واقعی مجھے چین سے نہیں رہنے دے گی۔ میں نے فوراً سوچا۔

ساری رات نہایت خوف اور دہشت سے گزری صبح ہوتے ہی میرے بابا جان گاؤں کے ایک عامل کو لے کر آئے وہ عامل ایک نورانی صورت بزرگ تھے انہوں نے پوری حویلی میں گھوم کر اس کا جائزہ لیا پھر باہر لان کے وسط میں بیٹھ کر اپنے اردگرد ایک حصار کھینچا اور سب حویلی کے ملازموں کو اور ہمیں ہدایت کی کہ باہر کوئی نہ آئے۔ ہم سب حویلی کے اندر رہ کر کھڑکیوں سے باہر دیکھنے لگے وہ بزرگ کافی دیر تک پڑھتے رہے پھر اچانک ہوا چلنے لگی اور حویلی کے دروازے کھڑکیاں زور زور سے بند ہونے لگے سب خوف اور دہشت سے اپنی اپنی جگہ دبکے رہے وہ بزرگ ایک طرف دیکھ کر کوئی بات کرنے لگے ہمیں کوئی نظر تو نہیں آرہا تھا اور نہ ہی بزرگ کی آواز آرہی تھی اس لئے ہم کوئی اندازہ نہیں لگا سکتے تھے کہ باہر کیا ہورہا ہے؟ وہ کافی دیر تک بات کرتے رہے پھر انہوں نے سر ہلایا اور یوں ہاتھوں سے اشارہ کیا جیسے کسی کو جانے کا کہہ رہے ہوں۔ اسی وقت ہوا چلنا بند ہوگئی تھوڑی دیر کے بعد وہ اندر آئے تو میرے بابا جان نے بے چینی سے ان کی طرف دیکھا میں بھی گھبرا گیا تھا کہ وہ کہیں میرے بارے میں بابا جان کو نہ بتادیں۔

''میری ساری عمر ان کاموں میں گزری ہے چوہدری صاحب لیکن میں معذرت چاہوں گا کہ میں آپ کی کوئی مدد نہیں کرسکتا'' انہوں نے کہنا شروع کیا۔ ''یہ سب جورات کو آپ کے ساتھ پیش آیا اور جس نے ایسا کیا میں نے اسے بلایا تھا اور اس سے اس کا سبب پوچھا تو اس نے مجھے ساری بات بتادی ہے۔ وہ واقعی بہت مظلوم ہے اور اس کے ساتھ واقعی انتہائی ظلم کیا گیا ہے یہ اس کی بددعا ہے جو ساری زندگی آپ لوگوں کے ساتھ رہے گی۔ میں نے خود بھی اس بارے میں حساب لگایا ہے واقعہ اگر میں کچھ کروں گا تو اس کا کچھ نہیں بگڑے گا بلکہ ہوسکتا ہے کہ میرے ساتھ ساتھ آپ لوگوں کو اور زیادہ نقصان پہنچے ہاں اگر وہ آپ کو معاف کردے تو پھر آپ لوگ اس کی بددعا کے حصار سے نکل سکتے ہیں۔ لیکن وہ اس بارے میں کوئی بات سننے پر تیار نہیں ہے۔ لہٰذا آپ لوگ اب صرف اللہ سے اپنے گناہوں کی معافی مانگیں، شاید اللہ اسے معاف کردے جو اس ظلم کا ذمہ دار ہے اب مجھے اجازت دیں۔'' بزرگ بابا نے مسلسل بولتے ہوئے کہا اور باہر نکل گئے۔ انہوں نے میرا نام نہیں لیا تھا لیکن وہ بات کرنے کے دوران مسلسل میری طرف دیکھ رہے تھے ان کے جانے کے

بعد بابا جان نے مجھ سے اس بارے میں دریافت کیا لیکن میں نے کچھ بھی قبول کرنے سے انکار کردیا۔ کیونکہ بابا جان بہت رحمدل تھے اور ہوسکتا تھا کہ وہ میرے اس عمل سے ناراض ہوکر مجھے جائیداد سے ہی عاق کردیتے۔

”ہاں! میں نے ظلم کیا تھا اور مجھے اس ظلم کی سزا ضرور ملنی چاہئے میں نے ان بے گناہ انسانوں کو صرف اپنی ضد اور نفسانی خواہش کو پورا کرنے کے لئے موت کے گھاٹ اتارا۔ میں اسی قاتل ہوں“ رات کو میں نے جہاں آراء کے مسلسل پوچھنے پر اسے بتاتے ہوئے کہا وہ بھی بالکل خاموش بیٹھی تھی۔ ”چوہدری صاحب! واقعی آپ نے بہت ظلم کیا ہے اب آپ صرف اللہ سے اپنے گناہوں کی معافی مانگیں۔ اب صرف وہ ہی آپ کو معاف کرسکتا ہے“ تھوڑی دیر کے بعد اس نے کہا۔

”ہاں! میں ایسا ہی کروں گا۔ شاید اللہ کو مجھ گناہگار پر رحم آجائے۔“ میں نے ٹھنڈی سانس بھری۔

اس دن کے بعد حویلی میں کوئی ایسا واقعہ پیش نہیں آیا جو ہمیں مزید پریشان کرسکے لیکن جس دن احمد ایک سال کا ہوا اس رات ہماری حویلی پھر آہوں اور سسکیوں سے گونج اٹھی لان میں سائے بننے اور بگڑنے لگے ساری رات ہم نے نہایت عذاب میں گزاری لیکن ہمیں اس بزرگ کی ساری باتیں یاد تھیں اور ہم چاہنے کے باوجود بھی کچھ نہیں کرسکتے تھے۔ تھوڑے عرصے کے بعد میرے بابا کا انتقال ہوگیا ان کے انتقال پر مجھے پتہ چلا کہ وہ کتنے ہردلعزیز تھے تب میں نے جانا کہ پیار، محبت، رحمدلی اس دنیا کا سب سے بڑا ہتھیار ہے اور میرے بابا جان اس ہتھیار سے پوری طرح لیس تھے ان کی وفات کے بعد اب گاؤں کا چوہدری میں تھا میں نے خود کو بالکل تبدیل کرلیا۔ میرا غصہ ضد سب ختم ہوگیا تھا میں نے سب بُرے کام چھوڑ دیئے تھے پانچوں وقت نماز شروع کردی تھی ہر نماز کے بعد میں رو رو کر اللہ سے اپنے گناہوں کی معافی مانگتا تھا۔ میرا سلوک ہر کسی کے ساتھ بہت اچھا ہوگیا تھا سب لوگ میری اس کایا پلٹ پر حیران تھے لیکن میں نے صحیح معنوں میں اب زندگی کا مزا چکھا تھا۔

بابا جان کے انتقال کے تھوڑے عرصے کے بعد میرے گھر ایک اور بیٹا پیدا ہوا۔ اس رات پھر ہماری حویلی میں شور ہنگامہ مچا رہا میں نہایت پریشان تھا میں نے فیصلہ کیا کہ ایک دفعہ پھر کسی اور عامل کو بلا کر دیکھا جائے۔ میں نے اللہ رکھا سے کہا تو وہ دوسرے دن ہی ایک عامل کو لے کر آیا۔ اس نے باہر لان میں حصار کھینچا اور اس میں بیٹھ کر عمل شروع کردیا ابھی اسے عمل شروع کیے تھوڑی دیر ہی ہوئی تھی کہ حویلی رونے پیٹنے کی آواز سے گونج اُٹھی اتنی تیز ہوا چلنے لگی کہ سارے دروازے کھڑکیاں کھل گئے ساری چیزیں ہوا سے اڑنے لگیں اتنا شور مچا کہ خدا کی پناہ اچانک میری نظر باہر لان میں عامل پر پڑی تو وہ یوں ہوا میں اُچھل رہا تھا جیسے اسے کوئی اُٹھا اُٹھا کر پٹخ رہا ہو اچانک جہاں آراء کی چیخ گونجی میں گھبرا کر کمرے کی طرف بھاگا کمرے میں داخل ہوتے ہی میرے رونگٹے کھڑے ہوگئے میرا ایک دن کا بیٹا ہوا میں الٹا لٹکا ہوا تھا جہاں آراء چیختے ہوئے بے ہوش ہوگئی تھی سب ملازم اور میری امی سہمے ہوئے تھے اچانک میری امی جان بھی بے ہوش ہوگئیں۔ ”خدا کے لئے سکینہ میرے بچے کو کچھ مت کہنا تمہیں تمہارے بچے کا واسطہ“ میں گڑگڑایا۔

”تم آئندہ کسی کو نہیں بلاؤ گے۔“ سکینہ کی آواز فضا میں گونجی اس کی آواز سنتے ہی سارے ملازم چیختے ہوئے باہر بھاگے۔

”ٹھیک ہے میں آئندہ کسی کو نہیں بلاؤں گا۔ میرا وعدہ، میرے بچے کو چھوڑ دو“ میں نے فوراً کہا اسی وقت اچانک ہوائیں بند ہوگئیں رونے کی آوازیں ختم ہوگئیں اور میرا بچہ آرام سے زمین پر اس طرح آگیا جیسے اسے کسی نے آرام سے لٹا دیا ہو۔ فضا میں نہایت خاموشی اور گہرا سکوت طاری ہوگیا میں نے باہر لان میں دیکھا تو وہاں عامل بے ہوش پڑا تھا۔ میں نے جہاں آراء کو ہوش دلایا وہ ہوش میں آتے ہی پھر چیخنے لگی۔ ”میرا بچہ“

”ہاں...... ہاں! یہ ہے تمہارا بچہ“ میں نے بچے کو اُن کی گود میں دیا، اور خود باہر کی طرف بھاگا۔ عامل کا برا حشر تھا سارا جسم زخموں سے بھرا ہوا تھا۔ میں نے پانی گرا کر اسے ہوش دلایا تو وہ میری بات سنے بغیر گرتا پڑتا باہر بھاگا۔ میں نے اسے بہت آوازیں دیں مگر اس نے مڑ کر نہیں دیکھا۔ میں اندر آیا اور حویلی میں جو ایک دو ملازم موجود تھے انہیں حویلی کو ٹھیک کرنے کا کہتا ہوا امی جان کو لے کر ان کے کمرے میں چلا گیا ان کو بہت ہوش میں لانے کی کوشش کی لیکن وہ ہوش میں نہیں آئیں فوراً انہیں لے کر شہر میں اسپتال گیا۔ وہاں ان کے ٹیسٹ وغیرہ ہوئے لیکن کوئی ٹریٹمنٹ دینے سے پہلے ہی وہ اللہ کو پیاری ہوگئیں۔ رپورٹوں سے پتا چلا کہ ان کے دماغ کی کوئی رگ پھٹ گئی تھی نجانے وہ اتنی دیر بھی کیسے زندہ رہ گئیں امی جان کی موت میرے لئے بہت بڑا صدمہ تھا مجھ پر جان چھڑکنے والی ماں اتنی جلدی موت کے منہ میں چلی جائے گی مجھے یقین نہیں آرہا تھا لیکن میں سوائے صبر کرنے کے کچھ بھی نہیں کرسکتا تھا۔

اب یہ ہونے لگا کہ احمد اور شہروز جوں جوں بڑے ہوتے گئے ان کی ہر سالگرہ پر حویلی میں وہی تماشا ہونے لگا احمد 6 سال کا ہو چکا تھا جبکہ شہروز 4 سال کا کہ پھر تم پیدا ہوئے اس رات پھر ہماری حویلی میں ہنگامہ رہا تمہارے کندھے پر یہ سرخ نشان پیدائشی تھا جب تم 2 سال کے ہوئے تو ایک دن احمد نے اپنے بازو میں درد کی شکایت کی حکیم کو بلا کر دکھایا گیا اس نے دوائی دی لیکن کوئی افاقہ نہ ہوا رات ہوتے ہوتے بازو کا درد پورے کندھے میں پھیل گیا حکیم کو پھر بلایا گیا لیکن اس نے جواب دے دیا اور کہنے لگا کہ آپ اسے شہر لے جائیں آدھی رات کا وقت تھا اس لئے میں نے سوچا کہ صبح کی روشنی پھیلتے ہی میں اسے لے جاؤں گا رات جیسے تیسے گزاری جائے لیکن اسے شہر اسپتال لے جانے کی نوبت ہی نہ آئی۔ احمد نے اس رات تڑپ تڑپ کر میرے سامنے جان دیدی لیکن میں کچھ کر نہ سکا میری اتنی دولت کسی کام نہ آسکی۔ مجھے احمد بہت پیارا تھا اس رات میں نے دیواروں سے سر ٹکرا دیا۔ اس رات ہماری حویلی بھیانک قہقہوں سے گونج اٹھی اور یہ پہلی دفعہ ہوا تھا کہ ہماری حویلی میں ہر طرف بھیانک قہقہے گونج رہے تھے۔ ”خدا کے واسطے مجھے معاف کردو ورنہ مجھے اللہ بھی کبھی معاف نہیں کرے گا۔“ میں نے گڑگڑاتے ہوئے کہا۔

”نہیں...... ہرگز نہیں“ سکینہ کی سرگوشی سنائی دی اور قہقہے اچانک سسکیوں میں بدل گئے جو کم ہوتے ہوتے ختم ہوگئے میں اور جہاں آراء صدمے سے نڈھال ہوگئے تھے۔

احمد کو فوت ہوئے 2 ماہ کا عرصہ گزر گیا میں اور جہاں آراء قدرے سنبھل گئے تھے لیکن احمد کی باتیں شرارتیں یاد کرکے ہم ابھی بھی چھپ چھپ کر روتے تھے۔ اس دن کے بعد سے پھر سکون تھا لیکن قدرت کو شاید میرا سکون اچھا نہ لگا ایک دن تم کھیلتے ہوئے گیٹ سے باہر نکل گئے کہ پھر واپس ہی نہ آئے میں نے کوئی جگہ نہ چھوڑی جہاں تمہیں ڈھونڈا نہ ہو گاؤں کا چپہ چپہ چھان مارا لیکن تم نہ ملے یہ دوسرا صدمہ جہاں آراء کے لئے نہایت جان لیوا ثابت ہوا اور وہ مجھ سے بغیر کوئی شکوہ کیے ایک رات نہایت خاموشی سے اس دنیا سے ناتا توڑ کر ہر قسم کے غموں سے آزاد ہوگئی۔ اس رات حویلی پھر قہقہوں سے گونج اٹھی لیکن میں پے در پے صدمات سے اس قدر نڈھال ہو چکا تھا کہ اب سکینہ سے معافی مانگنے کے قابل بھی نہ رہا تھا۔

بعض دفعہ میرا دل خودکشی کرنے کو کرتا تھا لیکن پھر شہروز کا چہرہ میری نگاہوں کے سامنے آجاتا تھا۔ آہستہ آہستہ میں نے خود کو شہروز کے لئے سنبھالا اب میری زندگی کا محور شہروز تھا حویلی جو کبھی بہت پُررونق ہوا کرتی تھی اب بالکل سنسان ہوگئی تھی سارے ملازم اس خوفناک صورتحال سے گھبرا کر حویلی چھوڑ گئے تھے صرف اللہ رکھا میرا وفادار ملازم میرے ساتھ تھا اس نے میرا ساتھ نہیں چھوڑا تھا لیکن وہ بھی مجھے تسلی دینے کے قابل نہیں رہا تھا اسے تو خود تسلی کی ضرورت تھی کیونکہ ایک دن

اچانک تیل کا چولہا پھٹنے سے گھر والے آگ کی لپیٹ میں آگئے تھے لوگوں نے آج بجھانے کی بہت کوشش کی لیکن کوئی فائدہ نہ ہوا اللہ رکھا اس وقت حویلی میں تھا اسے جب اس واقعے کی خبر ملی تو وہ بھی گھر کی طرف بھاگا اپنی بیوی اور بچوں کی کوئلہ بنی لاشوں کو دیکھ کر اسے سکتہ ہوگیا اور جب اس کا سکتہ ٹوٹا تو وہ بولنے کے قابل نہ رہا تھا اس کے کیے کی سزا بھی اسے مل گئی کیونکہ وہ بھی اس جرم میں میرے ساتھ شریک رہا تھا۔

ایک دن شہروز کھیلتے کھیلتے گر پڑا اور بے ہوش ہوگیا اس دفعہ میں نے دیر نہیں کی اور فوراً اسے لے کر شہر اسپتال پہنچا ڈاکٹروں نے اس کا ٹیسٹ اور ایکسرے کیے تو پتہ چلا کہ اسے بلڈ کینسر ہے اور آخری اسٹیج پر ہے اس وقت کینسر کا کوئی علاج نہ تھا میں نے اسے باہر لے جانا چاہا لیکن ڈاکٹروں نے مجھے کوئی امید نہ دلائی کیونکہ کینسر بالکل آخری اسٹیج پر تھا اس لئے ان کے خیال میں اب باہر سے بھی اس کا علاج ممکن نہ تھا میرے شہروز نے ایک ماہ میں میرے سامنے جان دیدی۔ اس وقت میں چیخ چیخ کر رو دیا۔ اللہ سے فریاد کی شکوے کیے مجھے کچھ پتہ نہ تھا کہ میں کیا کررہا ہوں؟ میرا سارا گھر میرے سامنے موت کے منہ میں جا سویا تھا لیکن میں کچھ نہ کرسکا میں بھی مرنا چاہتا تھا لیکن میں حرام موت مرنا نہیں چاہتا تھا۔

وقت بہت بڑا مرہم ہے آہستہ آہستہ مجھے قرار آگیا اس دوران اللہ رکھا بھی فوت ہوگیا پھر میں نے اپنی آمدنی کو رفاہی کاموں میں استعمال کرنا شروع کردیا۔ اسکول بنوایا، گاؤں میں مسجد بنوائی، اسپتال بنوایا، غریبوں اور بیواؤں کی مدد کرنے لگا۔ بعض دفعہ مجھے تمہارا خیال بھی آتا تھا اور میں اللہ سے دعا کرتا تھا کہ اگر تم اس دنیا میں ہو تو کبھی بھی اس حویلی میں داخل نہ ہو جو ایک بددعا کے حصار میں ہے لیکن جب ملازم نے تمہارے آنے کی اطلاع دی اور میں نے تمہیں دیکھا تو میرے دل نے فوراً گواہی دی کہ تم ہی میرے بیٹے ہو۔ میں اپنے آپ پر قابو نہیں پاسکا۔ شہروز کی موت کے بعد سے اس حویلی میں سسکیوں کی آواز صرف اس رات گونجی تھی جس رات سکینہ نے خودکشی کی تھی لیکن جب کل رات یہ آوازیں آئیں تو مجھے مکمل طور پر یقین ہوگیا کہ تم ہی میرے بیٹے ہو۔ تمہارے کندھے کے نشان نے بھی ثبوت فراہم کردیا میرے بیٹے میں نے ساری حقیقت تمہیں بتادی ہے تم سے ایک لفظ بھی نہیں چھپایا۔ گو کہ اس پوری کہانی میں بعض باتیں ایسی تھیں جو کہ ایک باپ بیٹے کے سامنے نہیں کرسکتا لیکن میں تمہیں کسی بات سے بے خبر نہیں رکھنا چاہتا تھا بیٹا! میں چاہتا ہوں کہ تم اس حویلی سے چلے جاؤ۔ کیونکہ تم ہی اب میرے وارث ہو اور میں تمہیں کھونا نہیں چاہتا تم شاید اب تک اس لئے بچے رہے ہو کہ تم نے کہیں اور پرورش پائی ہے اس لئے تم یہاں سے چلے جاؤ۔ چوہدری فیروز بخت نے ساری حقیقت حسن کو بتاتے ہوئے کہا۔ حسن نے ایک طویل سانس لیا واقعی یہ ساری کہانی سن کر اس کے رونگٹے کھڑے ہوگئے تھے وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس کے باپ کا ماضی اتنا بھیانک ہوگا لیکن انہوں نے اپنی ساری عمر اس جرم کی سزا پاتے ہوئے گزار دی تھی۔

یہ دردناک حقیقت جاننے کے بعد اب حسن یہ چاہتا تھا کہ سکینہ کی بے چین روح کو قرار بھی مل جائے اور اس کے باپ کی سزا بھی معاف ہوجائے۔ اسی وقت چوہدری فیروز بخت نے حسن سے اس کے حالات پوچھے تو اس نے ہوش سنبھالنے کے بعد کی ساری کہانی انہیں سنائی اور خاموشی سے اٹھ کر اسٹڈی روم سے باہر آگیا۔ باہر نکل کر وہ حیران رہ گیا کیونکہ باہر رات ہوچکی تھی۔

''اتنا ٹائم گزر گیا اور مجھے پتہ بھی نہیں چلا۔'' حسن نے حیرانگی سے سوچا۔ اسے اب بھوک لگ رہی تھی۔ اس نے ملازم کو آواز دی۔ ''جی صاحب!'' ملازم نے پوچھا۔

''کھانا لگادو۔ سخت بھوک لگ رہی ہے۔'' حسن نے کہا۔

''جی اچھا!'' ملازم نے جواب دیا۔ تھوڑی دیر تک حسن اور چوہدری فیروز کھانے کی ٹیبل پر موجود تھے لیکن ان کے درمیان کوئی بات نہ ہوئی تھی چوہدری فیروز خاموشی سے حسن کا ردعمل دیکھ رہے تھے کھانا کھانے کے بعد حسن نے کہا۔

''ابا جان! اب میں سوؤں گا تھک چکا ہوں'' اور وہ اپنے کمرے میں چلا آیا۔ وہ واقعی تھک چکا تھا اور اب صرف سونا چاہتا تھا اس لئے اس نے ہر قسم کی سوچوں کو اپنے ذہن سے جھٹکا اور سونے کی کوشش کرنے لگا تھوڑی دیر کے بعد وہ گہری نیند میں ڈوب چکا تھا۔

وہ رات آرام سے گزر گئی دوسرے دن حسن نے اٹھ کر ناشتہ کرنے کے بعد سب سے پہلا کام یہ کیا کہ اس کمرے کا تالا کھلوایا جہاں پر سکینہ کی لاش دفن تھی۔ حسن نے تالا کھلوا کر ملازم کو واپس بھیج دیا اور ڈرتے ڈرتے کمرے کا دروازہ کھولا دروازہ کھلتے ہی اس کی ناک سے بدبو کا ایک بھبکا ٹکرایا۔ اس نے ناک بند کرلی اور اندر داخل ہوگیا سارے کمرے میں کاٹھ کباڑ جمع تھا حسن نے اس جگہ کو دیکھنے کی کوشش کی جہاں پر سکینہ کی لاش دفن تھی لیکن اسے کوئی کامیابی نہ ہوئی آخر اس نے کمرہ بند کردیا اور چوہدری فیروز کے پاس آگیا وہ حسن کو دیکھتے ہی اٹھے اور اسے گلے لگا کر اس کا ماتھا چوما۔ کیا بات ہے ابا جان! آج آپ بڑے خوش نظر آرہے ہیں'' حسن نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں! بیٹا آج تمہاری سالگرہ ہے تم 25 سال کے ہوجاؤ گے۔'' انہوں نے جواب دیا۔

''اچھا، آپ کو میری پیدائش کا دن ابھی تک یاد ہے؟'' حسن نے حیرانگی سے پوچھا۔

''ہاں بیٹا! کوئی اپنے جگر گوشے کے دنیا میں آنے کا دن بھی بھولتا ہے۔ تم اس حویلی میں نہیں تھے لیکن میرے دل میں تو موجود تھے۔'' چوہدری صاحب نے آبدیدہ لہجے میں کہا۔

''ٹھیک ہے ابا جان! اب آپ مجھے یہ بتائیں کہ میری سالگرہ پر مجھے کیا تحفہ دیں گے؟'' حسن نے مسکراتے ہوئے پوچھا تو چوہدری صاحب ہنسنے لگے۔

''بیٹا! ابھی تو نہیں ہاں میں تھوڑے دنوں تک تمہیں ایسا تحفہ دوں گا کہ تم ساری زندگی اس تحفے کو یاد رکھو گے۔ ابھی تم ایسا کرو کہ میں منشی کو بلواتا ہوں تم اس کے ساتھ اپنی زمینوں کی سیر کر آؤ۔ جس دن سے آئے ہو اس حویلی میں بند ہو۔'' انہوں نے کہا۔

''ٹھیک ہے ابا جان! جیسے آپ کی مرضی۔'' حسن نے جواب دیا۔

تھوڑی دیر بعد حسن کھیتوں میں موجود تھا وہ زمینوں کی وسعت دیکھ کر حیران رہ گیا۔ ''کافی جائیداد ہے ابا جان کے پاس'' اس نے سوچا شام ہونے تک وہ ادھر ادھر پھرتا رہا۔ اب وہ کافی تھک چکا تھا لہٰذا وہ واپس حویلی آگیا۔ چوہدری صاحب کے بارے میں پتہ چلا کہ وہ آرام کررہے ہیں حسن نے انہیں ڈسٹرب کرنا مناسب نہ سمجھا اور فریش ہونے کے لئے اپنے کمرے کے بستر پر موجود تھا اس کا ذہن اسی معاملے میں الجھا ہوا تھا ''مجھے یہاں آئے ابھی ایک ہفتہ ہوا ہے اور کیسے کیسے انکشافات ہورہے ہیں وہاں مراد اور شانی میرا انتظار کررہے ہوں گے لیکن یہاں کا معاملہ سلجھانا زیادہ ضروری ہے انشاء اللہ میں اب یہ معاملہ ختم کرکے رہوں گا بہت جھیل لی ابا جان نے اپنے جرم کی سزا اب ان کی سزا ختم ہوجانی چاہئے۔ اس زندگی کی خوشیوں پر ان کا بھی حق ہے جواب میں انہیں دلوا کر رہوں گا ہے تو یہ مشکل کام لیکن مجھے اپنے اللہ پر پورا بھروسہ ہے کہ وہ میری مدد ضرور کرے گا'' انہی سوچوں میں کھوئے ہوئے اسے نیند آگئی خواب میں اس نے ایک نہایت خوبصورت عورت کو دیکھا جس کے کپڑے خون سے تر ہورہے تھے اور وہ زار وقطار رو رہی تھی جس جگہ پر وہ کھڑی تھی اس سے کافی دور ایک مرد اور بچہ بھی کھڑے تھے وہ دونوں بھی خون میں نہائے ہوئے تھے بچہ روتا ہوا اس عورت کی طرف آنے کی کوشش کررہا تھا لیکن یوں محسوس ہوتا تھا جیسے کوئی ان دیکھی دیوار ان کے درمیان حائل ہورہی ہو اچانک تینوں نے چیخ چیخ کر کہنا شروع

کر دیا۔ ”ہمیں آزادی دلواؤ...... ہمیں آزادی دلواؤ“ ان کی آوازیں نہایت درد بھری تھیں۔ آہستہ آہستہ ان کی آوازیں اس قدر بلند ہوگئیں کہ حسن کو اپنے کانوں کے پردے پھٹتے ہوئے محسوس ہوئے۔

”خاموش ہوجاؤ، خدا کے لئے خاموش ہوجاؤ“ حسن کانوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے چیخا تو اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس کا سارا بدن پسینے میں شرابور تھا وہ تھوڑی دیر تک اس خواب کے بارے میں سوچتا رہا۔ ”ہو نہ ہو یہ خواب مجھے اس معاملے کی کڑی لگتا ہے میں ابا جان سے پوچھوں گا شاید وہ کچھ بتا سکتے ہوں“ حسن یہ سوچ ہی رہا تھا کہ اچانک رونے پیٹنے کی آوازوں سے حویلی پر چھایا گہرا سکوت ٹوٹ گیا۔

حسن ایک دم ڈر گیا پھر اسے کچھ یاد آیا تو وہ کمرے سے باہر نکل کر چوہدری فیروز کے کمرے کی طرف بھاگا ان کا کمرہ بھی کھلا ہوا تھا اور وہ جاگ رہے تھے۔

”ابا جان! وہ پھر آگئی ہے“ حسن نے کہا۔

”ہاں! بیٹا، وہ ہر سال آتی ہے آج تمہاری سالگرہ ہے“ حسن نے محسوس کیا کہ اس دن کی نسبت آج ان آوازوں میں زیادہ شدت ہے پوری رات حویلی ان آوازوں سے گونجتی رہی۔ صبح صادق کے قریب یہ آوازیں بند ہوئیں تو حسن نے سکون کا سانس لیا۔ حویلی اب دوبارہ گہرے سکوت میں ڈوب چکی تھی۔

”ابا جان!“ حسن نے چوہدری صاحب کو پکارا۔ ”کیا آپ نے کبھی کوئی خواب دیکھا ہے جس میں ایک نہایت خوبصورت عورت، مرد اور بچہ رو رو کر کہہ رہے ہوں ہمیں آزادی دلواؤ“ چوہدری صاحب چونک پڑے۔

”ہاں! یہ خواب مجھے اکثر نظر آتا تھا لیکن اب کافی عرصے سے نہیں آیا وہ عورت سکینہ، مرد دینو اور اس کا بچہ ہیں لیکن تم کیوں پوچھ رہے ہو؟“ انہوں نے پوچھا۔

”ابا جان! مجھے یہ خواب آج رات آیا تھا آپ نے کبھی خواب کو سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی اس لئے آپ کو اب نظر نہیں آتا۔ ابا جان! آپ ایسا کریں کہ صبح ہوتے ہی ان تینوں کی لاشیں نکلوا کر ان کی نماز جنازہ پڑھا کر دفن کروادیں اس خواب کا مطلب یہی ہے“ حسن نے جواب دیا۔

”ہاں! واقعی یہی مطلب ہوگا لیکن مجھے اس کا خیال کیوں نہیں آیا۔ لیکن اس طرح کرنے سے میرا جرم معاف ہوجائے گا“ چوہدری صاحب نے بے چینی سے پوچھا۔

”ہاں! ہوسکتا ہے اور نہیں بھی۔ کچھ کہا نہیں جاسکتا“ حسن نے کہا اور کمرے سے باہر نکل آیا۔

اپنے بستر پر لیٹتے ہی اس کی آنکھ لگ گئی اور وہ اتنی گہری نیند سوگیا کہ جب اس کی آنکھ کھلی تو دن کے 12 بج رہے تھے۔ ”اوہ میں اتنی دیر تک سویا رہا“ حسن نے سوچا اور اٹھ کر باتھ روم میں گھس گیا کمرے سے باہر نکل کر اس نے ڈائننگ ہال کا رخ کیا اور ملازم کو ناشتہ لانے کے لئے کہا۔ ابھی وہ ناشتہ کرکے فارغ ہوا ہی تھا کہ ملازم نے آکر اسے بتایا کہ باہر لان میں چوہدری صاحب اسے بلا رہے ہیں۔ حسن فوراً اٹھ کر باہر آیا تو چوہدری فیروز باہر لان کی کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھے ہوئے تھے ان کے پاس تین آدمی کھڑے تھے جو اپنے حلیے سے مزدور نظر آتے تھے جبکہ ان کے پاس ہی زمین پر کچھ سامان پڑا ہوا تھا؟ حسن خاموشی سے ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ ”جی ابا جان! کیوں بلایا تھا؟“ حسن نے پوچھا۔

”بیٹا! میں نے مزدور بلوادیئے ہیں اب تم اپنی نگرانی میں خود کام کروالو“ چوہدری صاحب نے کہا۔

”بہت شکریہ ابا جان! کہ آپ نے میری بات کو اہمیت دی“ حسن نے تشکرانہ انداز میں کہا۔ ”لیکن ابا جان! اس جگہ کی نشاندہی تو آپ نے ہی کرنی ہے۔“

”ہاں! لیکن میں نشاندہی کے بعد یہاں نہیں ٹھہر سکوں گا“ چوہدری صاحب نے سر جھکاتے ہوئے کہا۔

”ٹھیک ہے ابا جان! جیسے آپ کی مرضی۔ میں

آپ کے احساسات کو سمجھتا ہوں۔“ حسن نے جواب دیا۔ پھر مزدوروں کو اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کرتے ہوئے چوہدری صاحب کی تقلید میں آگے بڑھ گیا جو اس سے آگے چل پڑے تھے۔

”یہ ہے وہ جگہ“ چوہدری صاحب نے لان کے ایک کونے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ اور واپس چل دیئے اس جگہ گھاس ہی گھاس اگی ہوئی تھی حسن نے انہیں خاموشی سے جاتے دیکھا اور مزدوروں کو کام شروع کرنے کے لئے ہدایات دینے لگا۔

تقریباً ایک گھنٹے کی مسلسل کھدائی کے بعد ایک دم سے بدبو کا بھبکا آیا اور سب مزدوروں نے حسن سمیت اپنی ناک بند کرلی۔ ”اور کھودو شاباش تھوڑی ہمت کرو“ حسن نے مزدوروں کی ہمت بڑھاتے ہوئے کہا۔ مزدوروں نے اپنے ساتھ لائے ہوئے کپڑے اپنی ناک منہ پر باندھ کر دوبارہ کھدائی شروع کردی اب تھوڑی سی کھدائی کرنے کے بعد ہی ہڈیوں کے پنجر نظر آنے لگے مزدوروں نے ان بچی کھچی ہڈیوں کو باہر نکال کر انہیں گھاس پر ایک طرف بچھے ہوئے پلاسٹک کے شیٹ پر رکھ دیا اور ان کو اوپر سے ڈھانپ دیا اور کھدی ہوئی جگہ برابر کرنے لگے۔ اس کام سے فارغ ہوکر حسن انہیں لے کر اس کمرے کی طرف بڑھ گیا جہاں پر سکینہ کی لاش دفن تھی۔ اس کمرے کے فرش کو کھودنے پر وہاں سے بھی ہڈیاں برآمد ہوئیں حسن نے مزدوروں کو کافی رقم دینے اور انہیں یہ ہدایت کرنے کے بعد رخصت کردیا کہ وہ اس بارے میں کسی کو کچھ نہ بتائیں ورنہ اچھا نہ ہوگا حسن نے انہیں رخصت کرنے کے بعد چوہدری صاحب کو بتایا کہ اس نے مزدوروں کو رخصت کردیا ہے اب صرف ان ہڈیوں کے پنجروں کو غسل دے کر ان کا جنازہ پڑھ کر دفنانا باقی رہ گیا ہے شام تک یہ کام بھی مکمل ہوگیا۔

چوہدری فیروز کی طبیعت خراب ہونے لگی تھی حسن نے فوراً ڈاکٹر کو بلایا اس نے انہیں انجکشن دیا جس کی وجہ سے وہ اب سو رہے تھے حسن خود بھی کافی تھک چکا تھا لیکن وہ اپنے آپ کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کررہا تھا اب اسے انتظار تھا کہ اس کے اس اقدام کا کیا نتیجہ نکلتا ہے کھانا کھانے کے بعد حسن اسی بارے میں سوچتے ہوئے سوگیا خواب میں حسن نے سکینہ کو دوبارہ دیکھا لیکن اب وہ سفید کپڑے پہنے اپنے بچے اور شوہر کے ساتھ کھڑی تھی اور تینوں ساتھ ساتھ کھڑے بہت خوش نظر آرہے تھے کہ اچانک سکینہ کے اردگرد آگ بھڑک اٹھی اس کا بچہ اور دینو اس سے اس طرح دور ہوگئے جیسے کسی ان دیکھی طاقت نے انہیں کھینچ کر سکینہ سے دور کردیا ہو اسی وقت اس کی آنکھ کھل گئی اس کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا جارہا تھا اس نے اٹھ کر دروازہ کھولا تو اس کے سامنے ملازم کھڑا تھا۔

”صاحب، چوہدری صاحب آپ کو ناشتے کے لئے یاد کررہے ہیں“ ملازم نے اسے پیغام دیا۔

”اچھا میں ابھی آتا ہوں“ حسن نے جواب دیا ملازم واپس چلا گیا حسن نے ٹائم دیکھا تو صبح کے 9 بج رہے تھے وہ تھوڑی دیر تک فریش ہوکر ناشتے کی ٹیبل پر موجود تھا۔ ”ابا جان! اب آپ کی طبیعت کیسی ہے؟“ حسن نے پوچھا۔

”اب میں بالکل ٹھیک ہوں رات کو ویسے ہی ذرا دل گھبرا رہا تھا ورنہ اللہ کا شکر ہے کہ میں اس بڑھاپے میں بھی کسی بیماری کا شکار نہیں ہوا“ انہوں نے جواب دیا ناشتہ کرنے کے بعد حسن چوہدری فیروز کے ساتھ ان کے کمرے میں ہی آگیا اور انہیں اپنے خواب کے بارے میں بتایا۔ ”لیکن ابا جان! سکینہ کے اردگرد بھڑکنے والی آگ کی بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔“ حسن نے الجھن آمیز لہجے میں پوچھا۔

”میرا خیال ہے کہ کسی مولانا سے اس بارے میں پوچھنا چاہئے“ چوہدری صاحب نے جواب دیا تو حسن نے پرخیال انداز میں سر ہلایا۔

ظہر کی نماز کے وقت حسن مسجد چلا گیا جب نماز پڑھ کر سب فارغ ہوگئے اور مسجد نمازیوں سے خالی ہوگئی تو حسن نے مسجد کے امام صاحب کے سامنے سارا واقعہ

مختصراً بیان کیا اور اپنا خواب بیان کرتے ہوئے اس کے بارے میں پوچھا۔ ”بات بالکل صاف ہے بے شک اس عورت نے اپنی عزت بچاتے ہوئے خودکشی کی تھی لیکن بہرحال یہ حرام فعل ہے اور اللہ نے اس کی سختی سے ممانعت کی ہے اس لئے اب اسے اس گناہ کا عذاب ہو رہا ہے تم لوگ اس کی مغفرت کے لئے دعائیں کرو اور بھوکوں کو کھانا کھلاؤ۔ تم لوگ تو اس کے لئے صرف یہی کر سکتے ہو ہوسکتا ہے کہ اللہ اس کی سزا معاف کر دے۔“ امام صاحب نے تفصیل بیان کرتے ہوئے کہا تو حسن گہری سانس لیتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا اس نے امام صاحب کا شکریہ ادا کیا اور مسجد سے نکل کر حویلی کی طرف چل پڑا۔ حویلی آ کر اس نے چوہدری فیروز کو سب کچھ بتا دیا انہوں نے دوسرے دن ہی ڈھیر سارا کھانا پکوا کر قریبی شہر کے یتیم خانے میں بھجوا دیا پورے گاؤں کو کھانا کھلوایا مسجد میں سکینہ کی مغفرت کی دعا کروائی گئی ہفتے میں دو تین بار انہوں نے ایسا کرنا شروع کر دیا اس دن کے بعد سے حویلی میں ایسا کوئی واقعہ پیش نہیں آیا تھا جس سے وہ کوئی اندازہ لگا سکتے ایک ماہ گزر گیا اب حسن نے سوچا کہ یہ معاملہ تو ختم ہوا اب شانی اور مراد سے مل کر انہیں تمام حقیقت بتا دی جائے لیکن اس سے پہلے چوہدری فیروز سے اس بارے میں بات کر لینا مناسب ہوگا۔

یہ سوچ کر اس نے ایک دن چوہدری فیروز سے کہا۔ ”ابا جان! آپ سے ایک بات کرنا چاہتا ہوں۔“

”ہاں! کہو بیٹا، کیا بات ہے؟“ انہوں نے پوچھا۔

”ابا جان! شہر میں میرے دو دوست ہیں مراد اور شانی وہ پڑھے لکھے ہیں لیکن بے روزگار ہیں اگر آپ اجازت دیں تو میں چاہتا ہوں کہ انہیں حویلی لے آؤں۔ پھر آپ کچھ کوشش کر کے انہیں کہیں نوکری پر رکھوا دیجئے گا۔“ حسن نے انہیں بتاتے ہوئے کہا۔

”بیٹا! تمہیں مجھ سے پوچھنے کی کیا ضرورت تھی تم اب اس حویلی کے مالک ہو جو چاہے کرو، ویسے بھی اتنی بڑی حویلی خالی ہے۔“ چوہدری فیروز نے اسے اجازت دیتے ہوئے کہا حسن نے ان کا شکریہ ادا کیا۔ تھوڑی دیر کے بعد اس کی گاڑی شہر کی طرف بڑھی جا رہی تھی۔

وہاں پہنچ کر وہ سیدھا شانی اور مراد کے گھر پر گیا دروازہ کھٹکھٹایا تو مراد نے دروازہ کھولا اسے دیکھتے ہی سیدھا ہو گیا۔ ”ارے حسن تم...... تم کیسے آ گئے۔ پتہ ہے تم نے کتنا انتظار کروایا ہے تم نے کوئی رابطہ کرنے سے بھی منع کیا تھا ورنہ ہم وہی کر لیتے۔“ حسن نے اس کے منہ کے آگے ہاتھ رکھ دیا اور اسی طرح سے دھکیلتا ہوا اندر لے آیا اسی وقت شانی بھی باہر صحن میں آ گیا اور حسن کو دیکھتے ہی کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا تو حسن نے اسے چپ ہونے کا اشارہ کر دیا مراد اپنا منہ چھڑانے کے لئے مچل رہا تھا ”اب تم نے نہیں بولنا۔ میرے پاس ٹائم کم ہے اس لئے صرف میری بات سنو سمجھ گئے نا میری بات۔“ حسن نے مراد سے کہا تو اس نے اپنا سر ہلا دیا اس نے اپنا ہاتھ اس کے منہ سے ہٹا لیا۔ ”میرے ساتھ چلو فوراً خاموشی سے فٹافٹ۔ اپنا ضروری سامان لے لو۔ ساری بات تمہیں میں گاڑی میں بتاؤں گا تمہارے پاس صرف دس منٹ ہیں۔“ حسن نے کہا دس منٹ کے بعد وہ واقعی گاڑی میں بیٹھے تھے۔ ”اب تو بتا دو کہ کیا بات ہے؟“ مراد نے پوچھا۔

”چوہدری فیروز بخت میرے اصل والد ہیں“ حسن نے کہا۔

”کیا؟“ دونوں ایک دم چیخ اٹھے۔

”تمہارا مطلب ہے کہ وہی چوہدری فیروز بخت“ شانی نے پوچھا۔

”ہاں! بالکل وہی۔ وہاں پر میرے ساتھ کچھ ایسے واقعات پیش آئے جن کی بناء پر میں تم سے رابطہ نہ کر سکا لیکن مجھے پہلے دن ہی پتہ چل گیا تھا کہ وہ میرے والد ہیں اور انہوں نے مجھے ثبوت بھی پیش کیا ہے میں چاہتا ہوں کہ تم لوگ میرے ساتھ حویلی میں رہو میں نے ابا جان سے بات کی ہے اگر تم اچھے انسانوں کی طرح وہاں رہو گے تو تمہارے اچھے طور طریقوں کے باعث ہوسکتا ہے کہ وہ تم لوگوں کی نوکری کا بندوبست کر دیں“ حسن نے تفصیلی بات کرتے ہوئے کہا۔

”وہ تمہارے والد ہیں اس کی تو ہمیں بہت زیادہ خوشی ہوئی ہے اچھے انسان تو ہم پہلے بھی تھے لیکن بے روزگاری نے ہمیں اس طرف مائل کر دیا تھا لیکن اگر ہمیں نوکری مل جائے گی تو ہمیں کیا ضرورت ہے حرام رزق کمانے کی“ مراد نے کہا تو شانی نے بھی اس کی تائید کی۔

”وہاں جا کر تم نے کوئی ایسی بات نہیں کرنی جس سے ہمارے ماضی کے بارے میں کسی کو خبر ہو تم اپنے ماضی کو بھول جاؤ اسے دفن کر دو اور نئی زندگی شروع کرو۔“ حسن نے کہا تو دونوں نے سر ہلا دیئے اتنی دیر میں حویلی آ گئی۔ تینوں دوست گاڑی سے اتر کر حویلی میں داخل ہو گئے۔

”ابا جان! کہاں ہیں؟“ حسن نے ایک ملازم سے پوچھا۔

”وہ اندر اپنے کمرے میں ہیں“ ملازم نے جواب دیا مراد اور شانی سحر زدہ سے حویلی کی شان و شوکت کو دیکھ رہے تھے حسن انہیں لے کر چوہدری فیروز کے کمرے میں داخل ہوا۔

”السلام علیکم! ابا جان ہم نے آپ کو ڈسٹرب تو نہیں کیا“ حسن نے سلام کرتے ہوئے پوچھا۔

”وعلیکم السلام! نہیں بیٹا میں نے کہاں ڈسٹرب ہونا تھا یہ ہیں تمہارے دوست۔“ چوہدری صاحب نے کہا۔

”جی ہاں! یہ مراد ہے اور یہ شانی“ حسن نے دونوں کو آگے کیا۔ تو دونوں نے چوہدری فیروز کو سلام کیا۔

”وعلیکم السلام! جیتے رہو اور جب تک دل چاہے یہاں رہو تمہیں یہاں پر تکلیف نہیں ہوگی۔“ چوہدری صاحب نے کہا۔

”بیٹے حسن! انہیں ان کے کمروں میں پہنچا دو۔ سفر سے تھک گئے ہوں گے۔ آرام کر لیں۔“ چوہدری صاحب نے حسن سے کہا۔

”ٹھیک ہے بابا جان! آؤ بھئی تمہیں تمہاری آرام گاہوں میں پہنچا دوں“ حسن نے دونوں سے کہا۔

”بیٹا مراد اور شانی تم مجھے ابا جان بھی کہہ سکتے ہو“ دونوں نے مڑ کر پیچھے دیکھا۔

”کیا آپ سچ کہہ رہے ہیں“ مراد نے پوچھا۔

”ہاں! اب تم جاؤ آرام کرو“ چوہدری صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا تو تینوں باہر نکل آئے۔

”یہ واقعی تمہارے والد ہیں حسن۔“ شانی نے کہا۔

”تم نے شاید غور نہیں کیا تمہاری ان کے ساتھ مشابہت اتنی حیرت انگیز ہے کہ تم ان کی جوانی کی تصویر معلوم ہوتے ہو۔“

”چلو اچھی بات ہے کہ تمہیں بھی یقین آ گیا۔ اب تم مجھے یہ بتاؤ کہ تمہیں یہ رشتہ کیسا لگا؟“ حسن نے پوچھا۔

”بہت اچھا۔ یہ رشتہ تو بہت پرانا ہے لیکن اس کا احساس نیا ہے ہم دونوں نے تو اپنے باپ کی شفقت نہیں دیکھی۔ البتہ آج اسے محسوس ضرور کیا ہے“ شانی نے جواب دیا۔

”ہاں! واقعی حسن۔ اور میرا خیال ہے کہ اب واقعی ہمیں زندگی گزارنے کا مزہ آئے گا۔“ مراد نے بھی گفتگو میں حصہ لیا۔ ”بہت اچھی بات ہے اب تمہارے کمرے آ گئے ہیں لہٰذا اب تم آرام کرو باقی باتیں بعد میں ہوں گی۔“ حسن نے کہا تو دونوں اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے۔

رات کے کھانے سے کچھ دیر پہلے حسن ٹی وی لاؤنج میں بیٹھا ہوا تھا کہ ملازم نے اسے آ کر بتایا کہ چوہدری صاحب اسے بلا رہے ہیں۔ حسن فوراً ان کے پاس پہنچا۔

”جی ابا جان کیا بات ہے؟“ حسن نے پوچھا۔

”بیٹا! میں اب بوڑھا ہو گیا ہوں مجھ سے اب اس جائیداد کی نگرانی نہیں ہوتی۔ اس لئے میں نے بہت

سوچ سمجھ کر یہ فیصلہ کیا ہے کہ اب تم جائیداد کے نگران، بلکہ مالک ہو گے اس لئے میں نے آدھی جائیداد تمہارے نام کردی ہے میری باقی آدھی جائیداد کے مالک بھی تم ہی ہو گے لیکن وہ اس صورت میں تمہیں ملے گی اگر تم اس آدھی جائیداد جو تمہارے نام ہو چکی ہے کو ضائع نہیں کرو گے اسے کسی کام میں لاؤ گے چاہے تم اسے میری خود غرضانہ سوچ کہو لیکن میں جانتا ہوں کہ بہت زیادہ مال و دولت سے بہت سے لوگ بگڑ جاتے ہیں لیکن میں تمہیں بگڑتا دیکھ نہیں سکتا میری کہانی سے بھی تم نے کچھ نہ کچھ سبق تو ضرور حاصل کیا ہو گا۔ یہ رہے تمہارے نام کے کاغذات" چوہدری فیروز نے جائیداد کے کاغذات حسن کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔ حسن خاموشی سے کچھ دیر تک کاغذات کو دیکھتا رہا پھر جب اس نے سر اٹھایا تو اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

"ابا جان! آپ نے مجھے میری شناخت دی مجھ بے نام کو اپنا نام دیا آپ نے مجھ سے کبھی نہیں پوچھا کہ تم نے اپنی زندگی کے 25 سال کہاں گزارے؟ مجھے آپ نے اپنا وارث تسلیم کر لیا لیکن آج آپ نے یہ قدم اٹھا کر ثابت کر دیا ہے کہ آپ دنیا کے عظیم ترین انسان ہیں میں آپ کو کبھی مایوس نہیں کروں گا میں آپ کو مایوس کر ہی نہیں سکتا آپ مجھے جو بنتا دیکھنا چاہتے ہیں میں آپ کو اللہ کے حکم سے وہی بن کر دکھاؤں گا۔ یہ میرا آپ سے وعدہ ہے۔" حسن نے گلوگیر لہجے میں بولتے ہوئے کہا تو چوہدری فیروز نے اسے بازو سے پکڑ کر کھڑا کیا اور اسے کچھ دیر تک دیکھتے رہے اور پھر اسے سینے سے لگا لیا۔

"تم واقعی میرے بیٹے ہو" انہوں نے کہا پھر انہوں نے حسن کو علیحدہ کیا اور کاغذات اٹھا کر اس کے ہاتھ میں دے دیئے۔

"یہ اپنی جائیداد سنبھالو۔ اور تمہارے دوستوں کے بارے میں ایک دو ہفتوں تک میں ان کی نوکری کا بندوبست کرتا ہوں لیکن ایک شرط پر کہ وہ ہمیشہ اسی حویلی میں رہیں گے۔" انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "زندہ باد ابا جان! آپ واقعی عظیم ہیں" حسن نے خوشی سے نعرہ لگایا۔

"بھئی چیخ چیخ کر کیوں بتا رہے ہو ہمیں معلوم ہے تمہیں اتنا چیخنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔" مرلو نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا تو حسن جھینپ گیا۔

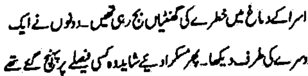
"ابا جان! آپ کے ہاں کھانے کا رواج نہیں ہے شاید مجھے بہت زیادہ بھوک لگ رہی ہے" شانی نے پیٹ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "ہاں بیٹا! چلو کھانا تیار ہو ہی چکا ہو گا۔" چوہدری صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا تو سب لوگ کھانے کی ٹیبل کی طرف چل پڑے۔

کھانا کھانے کے بعد سب آرام کرنے اپنے اپنے کمرے میں چل دیئے۔ حسن سو چکا تھا کہ اس نے آج خواب میں پھر سکینہ کو دیکھا لیکن آج وہ نہایت سفید لباس پہنے اپنے شوہر اور بچے کے پاس کھڑی تھی وہ تینوں بہت زیادہ خوش نظر آ رہے تھے اچانک تینوں پر پھولوں کی بارش ہونے لگی اور وہ کھلکھلانے لگے۔ اسی وقت سکینہ کی آواز حسن کے کانوں میں گونجی۔ "تمہارا بہت شکریہ تم نے ہمیں آزادی دلوائی اور مجھے عذاب سے نجات دلائی یہ تمہارا ہم پر احسان ہے جس کا بدلہ یہ ہے کہ میں چوہدری فیروز علی کو اپنی بددعا سے آزاد کرتی ہوں" اسی وقت حسن کی آنکھ کھل گئی اس نے محسوس کیا کہ کمرے میں نہایت خوشگوار مہک پھیلی ہوئی ہے وہ اُٹھ کر بیٹھ گیا تو اس کی نظر اپنے بیڈ کی سائیڈ پر پڑی وہاں پر گلاب کا بالکل تازہ پھول رکھا ہوا تھا حسن نے اسے اُٹھا کر سونگھا تو اس میں سے نہایت دلفریب خوشبو آ رہی تھی۔

حسن کو وہ خواب یاد تھا۔ "اس کا مطلب ہے کہ سکینہ کا گناہ معاف کر دیا گیا ہے اور اس نے میرے بابا جان کو اپنی بددعا سے آزاد کر دیا ہے۔" حسن نے سوچا اسی وقت قریبی مسجد سے فجر کی اذان بلند ہوئی تو حسن اللہ کے حضور سجدہ شکر ادا کرنے کے لئے اُٹھ گیا ابھی اس نے یہ خوشخبری چوہدری فیروز بخت کو بھی سنانی تھی جن کی سزا معاف ہو گئی تھی۔

ہم سفر

اے آر خاتون



اسرا کے دماغ میں خطرے کی گھنٹیاں بج رہی تھیں۔ دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ پھر مسکرا دیئے شاید وہ کسی فیصلے پر پہنچ گئے تھے

دونوں لڑکے ریل گاڑی کے کمپارٹمنٹ میں داخل ہوئے تو سیٹ پر بیٹھی لڑکی نے انگلی سے چشمہ نیچے کر کے باری باری دونوں کا جائزہ لیا۔ "آپ دونوں کے پاس فرسٹ کلاس کا ٹکٹ ہے" نیلی پینٹ شرٹ والے نے جیب سے ٹکٹ نکال کر لڑکی کی طرف بڑھا دیا۔ لڑکی نے ٹکٹ دیکھا اور پھر چشمہ ناک پر جما کر کتاب پڑھنے لگی۔

"چلو یار چیکنگ تو ہو چکی اب بیٹھو" دونوں ہنس دیئے۔ لڑکی نے پیشانی پر بل ڈال کر دونوں کو دیکھا دونوں سامنے والی سیٹ پر بیٹھ گئے کچھ دیر ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔ شرجیل کو شرارت سوجھی تو اس نے واک مین نکال کر بلند آواز سے چلا دیا۔ انڈین گانے سے کمپارٹمنٹ گونج اٹھا۔

"تجھے دیکھا تو یہ جانا صنم پیار ہوتا ہے دیوانہ صنم۔ اب یہاں سے کہاں جائیں ہم تیری بانہوں میں مر جائیں ہم۔"

"ارے مسٹر یہ بے ہودہ گانا بند کرو۔ میں ڈسٹرب ہو رہی ہوں۔" "ہم بھی تو بور ہو رہے ہیں۔"

"محترمہ ہم بھی اس لئے فرسٹ کلاس میں سفر کر رہے ہیں تا کہ ہمیں کوئی روکے ٹوکے نا۔ اب آپ آرام سے کتاب پڑھیں اور ہمیں ڈسٹرب نہ کریں۔"

اسرا بڑبڑاتے ہوئے پھر کتاب پڑھنے لگی، مگر شور کی وجہ سے اسے کافی مشکل کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا اسے معلوم تھا کہ ڈھائی گھنٹے کے سفر میں اسے ان دونوں کو برداشت کرنا ہو گا۔ آخر جاوید نے واک مین بند کر دیا۔ شاید اسے اسرا کی

حالت پر رحم آ گیا تھا۔ مگر اب ان دونوں کے قہقہے اسے ڈسٹرب کر رہے تھے۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اٹھا کر ان دونوں کو باہر پھینک دے۔ ”یار پچھلے دنوں میں خالہ کے گھر گیا۔ صحن خالی تھا۔ ٹیبل پر خالو کی بتیسی پڑی تھی شاید وہ بھول گئے تھے مجھے ایک شرارت سوجھی۔ میں اسے منہ میں پھنسا کر عالیہ کے کمرے کی طرف بڑھا میں نے دروازے پر دستک دی۔ عالیہ نے جیسے ہی دروازہ کھولا مجھے دیکھ کر پاگلوں کی طرح چلانے لگی۔ سب گھر والے جمع ہو گئے۔ جب میں نے عالیہ کے ڈرنے کی وجہ بتائی تو سب ہنس دیئے اور عالیہ کا خوب مذاق بنایا۔“ دونوں مل کر ہنس دیئے۔

”یار تو کچھ بھی نہیں ایک بار میں نے اپنے کزن بلال سے مذاق کیا، ہمارے کالج میں ایک ڈرامہ ہوا تھا تو اس دوران میرے ہاتھ میں ایک ڈریکولا کا ماسک آیا وہ میں اسے گھر لے گیا۔ میرا کزن سو رہا تھا۔ میں نے اس کے سامنے آئینہ رکھ کر اسے جگانے لگا جب اس کی آنکھ کھلی تو آئینے میں اپنا عکس یعنی ڈریکولا کی شکل دیکھ کر زور سے چیخ پڑا۔ میں اور سب گھر والے اس کا مذاق اڑا رہے تھے۔ مگر وہ اتنا ڈر گیا کہ تین دن تک بخار میں پڑا رہا۔“

”یار اتنی سی بات میں کوئی اتنا بھی ڈر سکتا ہے۔ ویسے ایک بات ماننی پڑے گی تمہارا آئیڈیا تھا زبردست۔“ دونوں مل کر پھر ہنس دیئے۔ ”اے مسٹر تم دونوں خاموش ہو رہے ہو یا میں گارڈ سے ...دوں۔“

”ارے تمہارے پاس گارڈ بھی ہے کون سا سیف گارڈ یا باڈی گارڈ۔ جلدی بتاؤ کہاں ہے۔ پرس کی جیب میں یا بیگ کی“ دونوں ایک دوسرے کے ہاتھ پر ہاتھ مار کر ہنسے۔

”دیکھو میں مذاق نہیں کر رہی آپ دونوں مجھے سخت قدم اٹھانے پر مجبور مت کریں۔“ ”تمہارے دل میں جو آئے کرو۔“ دونوں پھر باتوں میں لگ گئے۔ ”بدتمیز کہیں کے۔“ دونوں پھر ہنس دیئے۔ اسرا نے غصے سے کتاب سیٹ پر پٹخی تو وہ نیچے گر گئی اسرا جلدی سے اسے اٹھانے لگی اور بے خیالی میں نیچے جھک گئی۔ دونوں لڑکے جو اسے دیکھ رہے تھے۔ ان کے دل بے رفتار دھڑک اٹھے۔ اپنی غلطی کا احساس ہوتے ہی اسرا جلدی سے سیدھی ہو گئی۔ وہ جانتی تھی کہ غصے میں اس سے کتنی بڑی حماقت ہو گئی ہے۔ جھکنے کی وجہ سے وہ کیا نظارہ دیکھ چکے تھے۔ ان دونوں کے اڑتے ہوئے رنگ دیکھ کر اسے خطرے کی بو محسوس ہونے لگی تھی۔ وہ دو تھے اور یہ اکیلی ایک کمزور سی لڑکی۔ بند کمرہ، گاڑی جو کہ زیادہ تیز چل رہی تھی وہ چلاتی تو بھی کوئی اس کی مدد کے لئے نہیں آتا۔ اچانک شرجیل اٹھ کھڑا ہوا اور اس کا دل خوف سے سینے سے باہر نکلنے کے لئے بے تاب ہو رہا تھا۔ اس نے جھک کر کتاب اٹھائی اور اسرا کی طرف بڑھا دی۔ ”تمہاری کتاب“ نظریں اسرا کی طرف جمی ہوئی تھیں۔

”تھینکس......“ اس نے کتاب لے کر کہا۔ شرجیل کچھ دیر کھڑا اسے دیکھتا رہا پھر آ کر اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا۔

اسرا کتاب پڑھنے کی ایکٹنگ کرنے لگی جبکہ دھیان تو ان دونوں کی طرف تھا جو ایک دم خاموش ہو گئے تھے۔ اسرا کے دماغ میں خطرے کی گھنٹیاں بج رہی تھیں۔ دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ پھر مسکرا دیئے شاید وہ کسی فیصلے پر پہنچ گئے تھے۔ اسرا نے گہرا سانس لیا اور کتاب چہرے پر رکھ کر لیٹ گئی۔ اسے سکون سے لیٹے دیکھ کر دونوں کو حیرت ہوئی۔ دس پندرہ منٹ وہ بیٹھے رہے پھر اٹھ کر آہستہ آہستہ اس کی طرف بڑھے۔

شرجیل نے جاوید کی طرف دیکھا پھر اسرا کے چہرے سے کتاب ہٹائی تو اس کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ جب اسرا نے آنکھیں کھولیں تو دونوں ہی چلاتے ہوئے ڈبے کے دروازے سے جا لگے کیونکہ اس کی آنکھیں بالکل سفید تھیں۔ دو دانت باہر کو نکل رہے تھے جن سے خون بہہ رہا تھا آنکھوں سے خون بہہ رہا تھا سرخ زبان ہونٹوں سے باہر لٹک رہی تھی۔ ”کیا ہوا تم دونوں کو۔“ اس کی آواز اتنی خوفناک تھی کہ دونوں ہی ایک دوسرے سے لپٹ گئے۔ ”میں نے بہت کوشش کی میرا یہ روپ تم دونوں کے سامنے نہ آئے۔ بہت تنگ کیا تم دونوں نے مجھے، میرے سمجھانے کا بھی اثر نہیں ہوا...... اور اب حد ہی کر دی۔ میری عزت لوٹو گے تم دونوں۔“ دونوں نے نفی میں سر ہلایا۔

”ارے ادھر آؤ۔“ اسرا کھڑی ہو کر سیٹ سے نیچے اتری تو دونوں جلدی سے دروازہ کھولنے لگے۔ ”اب میری باری ہے

بھاگ کر دکھاؤ مجھے۔“

وہ جیسے جیسے ان کے قریب آ رہی تھی دونوں پاگلوں کی طرح دروازہ کھولنے کی کوشش کرنے لگے۔ جیسے ہی اسرا کے ہاتھ ان کے قریب آئے دروازہ کھل گیا...... اور دونوں بھاگ کر باہر نکل گئے۔ دروازے کو باہر سے بند کر دیا۔

اسرا کے قہقہے خالی کمپارٹمنٹ میں گونجنے لگے دونوں کا سامان بھی اندر رہ گیا تھا۔ گاڑی جیسے ہی اسٹیشن پر رکی اسرا نے اپنا سامان اُٹھایا۔ دروازہ کھول کر باہر آئی تو دونوں خوفزدہ ایک طرف کھڑے تھے۔ اسرا ان کے قریب آ گئی۔

”گھبراؤ مت میں کوئی بھوت ووت نہیں ہوں۔ تم دونوں بڑے بدتمیز لڑکوں نے مجھے یہ سب کرنے پر مجبور کیا میں یہ اپنے دیور کے بیٹے کے لئے جا رہی تھی۔ اب تم دونوں میری طرف سے گفٹ رکھ لو“ اور وہ خوفناک ماسک شرجیل کے ہاتھوں میں پکڑا دیا۔ ”تم دونوں کا سامان اندر ہے“ وہ تیزی سے گاڑی سے نیچے اتر گئی اور وہ دونوں حیرت سے اسے جاتے ہوئے دیکھتے رہے کہ ایک معمولی سی لڑکی انہیں بے وقوف بنا کر چلی گئی۔

اسرا کا شوہر صفدر اسٹیشن پر اس کا انتظار کر رہا تھا اسے آتا دیکھ کر آگے بڑھ کر اس کے ہاتھ سے بیگ لے لیا۔ کچھ دیر بعد کار میں دونوں کے قہقہے گونج رہے تھے۔ ”شکر ہے تم ان شیطانوں سے محفوظ رہی۔“ ”گھر والے کیسے ہیں“

”سب ٹھیک ہیں سوائے میرے“

”کیا مطلب“ اسرا نے حیرت سے کہا۔

اتنے میں فون کی گھنٹی بجی۔ اسرا نے موبائل فون کان سے لگا لیا۔ ”ہیلو السلام علیکم آنٹی! جی میں پہنچ گئی ہوں۔ جی“ پھر حیرت سے اپنے شوہر کی طرف دیکھا۔ ”مگر وہ تو اس وقت میرے......“ پھر اس کے ہاتھ سے موبائل گر گیا اس نے پھٹی پھٹی نظروں سے صفدر کی طرف دیکھا۔ ”آپ کی والدہ کا فون تھا وہ کہہ رہی تھیں......“

”ہاں! میں مر گیا ہوں۔ تمہیں لینے آ رہا تھا تو میرا ایکسیڈنٹ ہو گیا۔ دس منٹ پہلے ہی اسپتال میں پہنچ کر میں نے دم توڑ دیا۔ تمہیں پریشانی نہ ہو اس لئے لینے چلا آیا۔“

”آ...... آپ مذاق کر رہے ہیں مجھ سے......“

”پاگل! ماما کا فون سن کر بھی یقین نہیں آیا......“

اسرا خوف سے پیچھے ہو گئی۔ ”ارے ڈر کیوں رہی ہو مجھ سے تمہارا شوہر ہوں، تمہیں پریشان ہوتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا۔ اس لئے لینے چلا آیا۔ اب ہم دونوں ایک ساتھ رہیں گے۔ جہاں ہمیں پریشان کرنے والا کوئی نہ ہوگا۔“

”نہیں صفدر تم میرے ساتھ ایسا نہیں کر سکتے، تم مجھ سے بہت محبت کرتے ہو“ اسرا رونے لگی تھی۔

”میں تو تم سے بہت محبت کرتا ہوں۔ مگر تم ہی مجھ سے محبت نہیں کرتی۔ ورنہ میرے ساتھ جانے سے انکار کیوں کرتی؟ اب تمہیں میں زبردستی اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔“

اس نے کار ٹرین کی لائنوں پر کھڑی کر دی۔ ”پلیز گاڑی چلاؤ۔“ مگر وہ آرام سے بیٹھا رہا۔

دور سے اسے ٹرین آتی ہوئی نظر آئی تو خوف سے اسرا چلانے لگی۔ ”خدا کے واسطے صفدر ایسا مت کرو پلیز گاڑی چلاؤ۔“ ٹرین وسل دیتی ہوئی تیزی سے ان کی طرف بڑھ رہی تھی۔ جیسے ہی ٹرین کار کے قریب پہنچی اسرا چلا کر صفدر سے لپٹ گئی کار کو ایک زوردار جھٹکا لگا اور کار اڑتی ہوئی دور جا گری۔ ٹرین کچھ آگے جا کر رک گئی۔

سب لوگ اتر اتر کر کار کی طرف بھاگے۔ چند لوگوں نے کار کو سیدھا کیا اور اسرا کی لاش نکالی۔

شرجیل اور جاوید حیرت کا بت بنے اسرا کو دیکھ رہے تھے اور اسرا روتے ہوئے اپنے ہم سفروں کے قریب آ کر اپنی لاش کو دیکھنے لگی۔

شرجیل نے جاوید کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ”چلو چلتے ہیں پتہ نہیں کیوں مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ اس لڑکی کی روح ہمارے قریب ہی ہے۔“ دونوں جلدی سے ٹرین کی طرف بڑھ گئے۔

اسرا ان دونوں کو جاتے ہوئے دیکھ کر سوچ رہی تھی۔ ”گاڑی کے ہم سفروں سے تو وہ بچ گئی مگر اس کے زندگی کے ہم سفر نے ہی اس کی زندگی چھین لی۔“

”چلو اسرا اب ہمارے بھی جانے کا وقت ہو گیا یہ لوگ تمہاری لاش کو گھر پہنچا دیں گے۔“ صفدر نے اسرا کی کلائی پکڑی اور دونوں ایک طرف چل دیئے۔

آنسو

شگفتہ ارم درانی

میرا دل دھڑکنا بھول گیا ٹرے میرے ہاتھوں سے چھوٹ گئی اور چائے نے قالین کو تر کر دیا۔ سامنے کا منظر ناقابل بیان حد تک بھیانک تھا

آج کی رات مجھ پر بہت بھاری تھی، سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں اور کیا نہ کروں، باہر زوروں کی بارش ہو رہی تھی۔ بار بار بجلی کی کڑک دل کو دھڑکا دیتی۔ دو بجنے میں ابھی بیس منٹ باقی تھے۔ جوں جوں وقت گزر رہا تھا میری سانسیں تیز تر ہوتی چلی جا رہی تھیں۔ کیونکہ دو بجے وہ کچھ ہونا تھا جسے میں برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ ''یا خدا! اب کیا ہوگا؟'' میں نے دل میں سوچا۔ ''دو بجے سے پہلے ہی کاش میں مر جاؤں اور وہ منظر دیکھنے کے لئے زندہ ہی نہ رہوں۔'' میری آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑی رواں تھی۔ میں بار بار مسہری پر سوئی اپنی بیٹی حمیرا کو غور سے دیکھتی اور بار بار کلام الٰہی پڑھ کر اس پر پھونک دیتی۔

''یا خدا! یہ کیسی آزمائش ہے۔''

ماضی کے بیتے واقعات پل بھر میں میری آنکھوں کے سامنے گھوم گئے۔

''وقار احمد سے میری شادی آج سے 19 سال پہلے ہوئی۔ وہ خاندانی طور پر زمیندار لوگ تھے۔ کافی امیر کبیر...... جبکہ میں ایک معمولی متوسط خاندان کی لڑکی تھی۔ ہماری شادی کی وجہ، ہم دونوں کی ایک دوسرے سے شدید محبت تھی۔ ہم کالج میں ساتھ پڑھتے تھے۔ اپنی کلاس کے قابل ترین طالب علموں میں ہمارا شمار ہوتا تھا۔ کئی مرتبہ ہم میں نوٹس وغیرہ کے تبادلے ہوئے جس کی وجہ سے آہستہ آہستہ ہم ایک دوسرے سے قدرے بے تکلف ہو گئے اور ہم دونوں ایک دوسرے کے قریب تر چلے آئے۔ قصہ مختصر...... ہم دونوں نے بڑی مشکل سے اپنے اپنے گھر والوں کو راضی کیا اور یہ سارا قصہ ہماری شادی پر ختم ہوا۔

شادی کے بعد ہم گاؤں میں آ گئے۔ یہ سرسبز و شاداب گاؤں، وقار احمد کا آبائی گاؤں تھا وقار اپنے ماں باپ کے اکلوتے صاحبزادے تھے۔ میرے سسر بہت سخت اور انتہائی سخت طبیعت کے مالک تھے وہ بہت مشکل سے اس شادی پر راضی ہوئے تھے کیونکہ وہ اپنے بیٹے کی شادی اپنی حیثیت کے لوگوں میں کرنا چاہتے تھے لیکن بیٹے کی محبت اور ضد نے انہیں مجبور کر دیا تھا۔ ہماری شادی کے دو ہفتے بعد ہی ان کی موت واقع ہوئی تھی موت کیا تھی ایک معمہ تھی۔ جسے آج تک ذہن حل نہیں کر سکا۔ ان کی صحت بالکل ٹھیک ٹھاک تھی ذہنی لحاظ سے بھی وہ بالکل پرفیکٹ زندگی گزار رہے تھے لیکن کوئی نہیں جانتا کہ کن وجوہات کی بناء پر وہ خود چل کر جلتے دہکتے آتش دان میں جا بیٹھے اور کسی نے ان کی چیخ سنی نہ آہ و فغاں......

جب میری ساس کمرے میں داخل ہوئیں تو وہ دلدوز منظر دیکھتے ہی چیخ مار کر گر گئیں اور بے ہوش ہو گئیں ظاہر ہے منظر ہی ایسا ہولناک تھا جب ایک عورت کے سامنے اس کا سہاگ دہکتی آگ میں جل رہا ہو تو بھلا وہ کیسے برداشت کر سکتی ہے۔ میری ساس پہلے ہی بلڈ پریشر کی مریضہ تھیں وہ اتنے بڑے صدمے کو برداشت نہ کر سکیں ہم انہیں اٹھا کر اسپتال لے گئے لیکن قسمت کو شاید کچھ اور ہی منظور تھا میری ساس نے اسپتال پہنچنے سے پندرہ منٹ پہلے ہی دم توڑ دیا۔ یعنی شادی کے دو ماہ بعد ہی ہم دونوں اپنے بزرگوں سے محروم ہو گئے۔

وقار کی حالت ماں باپ کی اچانک موت پر حد سے زیادہ خراب تھی ان کے آنسو سوکھ گئے تھے۔ بہر حال وقت کے مرہم نے کچھ حد تک ان کے زخم مندمل کئے اس



کے بعد میں نے اپنے شوہر کو دوبارہ شہر جانے کا مشورہ دیا لیکن وہ راضی نہ ہوئے۔ ان کا کہنا تھا کہ اپنے گاؤں اور اپنی حویلی سے انہیں اپنے والدین کی خوشبو آتی ہے میں بھی تھک ہار کر خاموش ہو بیٹھی۔ آخر مجھے کیا تکلیف تھی سب کچھ تو تھا یہاں...... نوکر، چاکر گاڑیاں اور سب سے بڑھ کر محبت کرنے والا شوہر...... وقار احمد جنہوں نے والدین کے چلے جانے کے بعد بھی مجھے اتنا پیار دیا جس کی کوئی انتہا نہیں۔

زندگی پھر معمول کے مطابق چلنے لگی۔ وقار احمد نے زمینوں کا کام سنبھال لیا اپنے والد کی گدی پر بیٹھ گئے۔ کچھ عرصہ بعد میں نے انہیں ایسی خبر سنائی جسے سن کر وہ بچوں کی طرح خوشی سے ناچنے لگے ہمارے اس خوشیوں بھرے آنگن میں ایک گلاب کھلنے والا تھا جس کے ہم دونوں بے چینی سے منتظر تھے اتنے غموں کے بعد جب اتنی بڑی خوشی ملی تو ہم نے سب غم بھلا دیئے۔ اب زندگی میں رونق ہی رونق اور خوشی ہی خوشی بھر آئی میں تو ہواؤں میں اڑنے لگی لیکن وہ کہتے ہیں ناں! کہ زیادہ خوشیاں بھی انسان کو راس نہیں آتیں۔ میری یہ خوشی چند روز کی تھی۔

ہوا یوں کہ ایک دن سہ پہر کے وقت وقار احمد لاؤنج میں بیٹھے اخبار پڑھ رہے تھے اور میں ساتھ والے صوفے پر بیٹھی آنے والے مہمان کے لئے سویٹر بن رہی تھی۔ ''کیا کر رہی ہو سلمٰی!'' انہوں نے بغیر مجھے دیکھے پوچھا۔

''کچھ نہیں! بس ذرا یہ سویٹر بن رہی ہوں۔'' میں نے بھی انہیں دیکھے بغیر جواب دیا۔ انہوں نے ایک نظر مجھ پر ڈالی اور سویٹر پر...... اور پھر حیران ہوتے ہوئے بولے۔

''ارے اتنا چھوٹا سویٹر کس کے لئے! بھئی مجھ پر یا تم پر تو یہ سویٹر یقیناً نہیں آئے گا۔''

''تو آپ سے کس نے کہا کہ یہ سویٹر میرے یا آپ کے لئے ہے؟''

''تو پھر!'' انہوں نے پوچھا۔

''آپ بھی بس!'' میں نے نظریں جھکائیں اور شرما کر کہا۔ تو وہ سمجھ گئے۔

''اوہ...... اچھا تو یہ بات ہے ابھی سے ان کے ناز اٹھائے جا رہے ہیں۔'' پھر ذرا توقف کے بعد

بولے۔
”ڈارلنگ ذرا چائے تو پلاؤ بہت تھکن محسوس ہورہی ہے۔“ انہوں نے اخبار ایک طرف رکھا اور صوفے سے ٹیک لگاتے ہوئے بولے اور میں نے دھاگہ اور سلائیاں وغیرہ سائیڈ ٹیبل پر رکھیں اور ساڑھی سنبھالتے ہوئے کچن کی طرف چل دی۔ وقار کے لئے چائے میں خود بناتی تھی۔ ویسے تو خادموں کی کوئی کمی نہیں تھی لیکن وقار احمد کے لئے چائے بنا کر مجھے بہت سکون ملتا تھا میں نے چائے بنائی ٹرے میں تمام اشیاء رکھ کر لاؤنج میں داخل ہوئی۔ لیکن یہ کیا...... !میں سامنے دیکھتے ہی ساکت ہوگئی وقت جیسے تھم گیا تھا۔

میرا دل دھڑکنا بھول گیا ٹرے میرے ہاتھوں سے چھوٹ گئی اور چائے نے قالین کو تر کردیا۔ سامنے کا منظر ناقابل بیان حد تک بھیانک تھا۔

وقار احمد آتش دان کی دہکتی آگ میں بیٹھے جھلس رہے تھے وہ نہ چیخ و پکار کررہے تھے اور نہ ان کے چہرے کے خدوخال سے ان کی تکلیف کا اندازہ ہورہا تھا۔ بس وہ حیرت سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ آگ معمول سے کہیں زیادہ بھڑک رہی تھی میرے قدم تو جیسے زمین نے پکڑ لئے تھے یہ سب کچھ ایک خواب لگ رہا تھا پھر میرے ذہن پہ دھند سی چھا گئی۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا آ گیا اور بجائے اس کے کہ میں جا کر وقار احمد کی مدد کرتی یا کسی کو بلاتی خود ہی میں غش کھا کر گر پڑی اور بے ہوش ہوگئی۔

جب آنکھ کھلی تو خود کو اسپتال میں نرم و گداز بستر پر پڑے پایا میرے دائیں طرف انکل سبحانی کھڑے تھے میری آنکھیں کھلتے دیکھ کر ان کے چہرے پر مسرت دوڑ آئی میں نے کچھ کہنے کے لئے لب کھولے تو انہوں نے مجھے اشارے سے چپ رہنے کے لئے کہا اور خود ڈاکٹر کو بلانے چلے گئے انکل سبحانی کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں جیسے بہت زیادہ رونے کے بعد سوج جاتی ہیں۔ لیکن بظاہر وہ مجھے دیکھ کر مسکرانے لگے تھے اچانک مجھے سب کچھ یاد آ گیا۔ میرے ذہن میں آندھیاں سی چلنے لگیں۔

”یا خدایا...... !یہ سب کیا تھا کیا وہ سب سچ تھا۔ نہیں، نہیں...... ایسا نہیں ہوسکتا لیکن اگر وہ جھوٹ تھا...... صرف ایک خواب تھا تو پھر...... وقار کہاں ہیں؟ آخر یہ سب کیا ہے؟“ ابھی میرا ذہن ان گتھیوں کو سلجھانے کی کوشش میں تھا کہ خوب صورت لیڈی ڈاکٹر اندر داخل ہوئی اس نے مسکرا کر میرے چہرے پر ایک نظر ڈالی اور مجھے ایک انجکشن لگا دیا اور میرے پاؤں کی طرف چل پڑی ٹیبل سے ایک رجسٹر اٹھا کر کچھ درج کرنے لگی جبکہ میں ایک مرتبہ پھر دنیا مافیا سے بیگانی ہوگئی۔

دوسری بار مجھے ہوش آیا تو میری امی، ابو، بہن، بھائی سب میرے پاس موجود تھے انکل سبحانی دروازے کے پاس سب سے الگ تھلگ ایک بینچ پر بیٹھے خلاؤں میں گھور رہے تھے میرے والدین نے مجھے پیار کیا اور بظاہر خوشی کا اظہار کیا لیکن مجھے محسوس ہوا جیسے وہ مجھ سے کچھ چھپانے کی کوشش کررہے ہیں۔

”وقار کہاں ہیں امی؟“ میں نے پوچھا انہوں نے مجھ سے آنکھیں چراتے ہوئے جواب دیا۔

”وہ بیٹا...... اپنے ایک دوست سے ملنے گیا ہے بس آتا ہی ہوگا“ امی نے مجھ سے جھوٹ بولا۔ لیکن اتنی بڑی خبر آخر کب تک چھپائی جاسکتی ہے مجھ پر یہ تلخ حقیقت بجلی بن کر گری میری زندگی میں ایک بار پھر خزاں آ گئی وہ پھول...... وہ خوشی کی کلیاں تو کھلنے سے پہلے ہی مرجھا گئیں۔ وقار احمد...... میری محبت میرے ہمسفر...... خوشیوں اور غموں کے ساتھی...... مجھے چھوڑ کر اچانک یوں چلے جائیں گے میں تو سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔

وقار کی ناگہانی موت کے بعد آس پاس کے لوگوں نے جھوٹی خبریں اڑانی شروع کردیں کہ ”یہ حویلی منحوس ہے یہاں آسیب ہیں، بھوت پریت بستے ہیں وغیرہ وغیرہ۔“ لوگوں کی من گھڑت کہانیاں سن کر میرے والدین نے مجھے شہر جانے کا مشورہ دیا لیکن میں شہر نہیں جانا چاہتی تھی مجھے حویلی سے محبت ہوگئی تھی۔ صرف یہی تو تھی...... جہاں رہ کر مجھے اپنے شوہر کی کمی محسوس نہ ہوتی تھی مجھے یہاں کی ہر چیز سے ان کی خوشبو

آتی تھی سو میں نے فیصلہ کیا کہ میں یہیں رہوں گی۔ زندگی ایک بار پھر معمول پر آ گئی وقار کی وفات کے چند مہینے بعد ہی خدا نے مجھے ایک چاند سی بیٹی سے نوازا۔ جس کا نام میں نے خود ”حمیرا“ رکھا میری بے رونق زندگی میں پھر سے بہار آ گئی میرے گھر والے پیدائش سے کچھ عرصہ پہلے سے ہی حویلی میں ٹھہرے ہوئے تھے سب بہت خوش تھے بہت سے لوگ آس پاس سے بھی مبارکباد دینے کے لئے آئے حویلی کو پھولوں سے سجایا گیا غریبوں میں کھانا تقسیم ہوا غرض ہر طرف رونق ہی رونق اور خوشی کا سماں تھا۔

گھر والے چند ہفتے رک کر پھر واپس چلے گئے اور حویلی پھر سے خالی ہوگئی حویلی کے ملازمین بھی مجھ سے اجازت لے کر اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے کیونکہ لوگوں کی من گھڑت افواہوں کی وجہ سے اس حویلی سے خوف محسوس کرنے لگے تھے لیکن میں مطمئن تھی اور ذرا بھی خوفزدہ نہیں تھی کیونکہ میرے ساتھ کبھی کوئی انہونا واقعہ پیش نہیں آیا تھا۔ مگر میرا ذہن اکثر وقار احمد اور سسر کی ناگہانی موت کے بارے میں سوچتا تھا کہ آخر کیا وجہ تھی کہ وہ بغیر کچھ سوچے سمجھے دہکتے آتش دان میں جا بیٹھے...... آخر کیوں......؟ اس ”کیوں“ کا جواب کسی کے پاس نہیں تھا۔

بہرحال اب میرے ذہن میں یہ خیالات کم ہی آتے تھے کیونکہ میں اپنی حمیرا کے ساتھ بہت خوش تھی ہر آسائش اس بھری پری حویلی میں ہمیں مہیا تھی اتنی آمدن ہوجاتی تھی کہ ہم دونوں ماں بیٹی خوب مزے سے زندگی گزارنے لگیں زندگی یونہی گزرتی رہی۔

سچ کہتے ہیں وقت پر لگا کر اڑتا ہے میری حمیرا نے میٹرک کرلیا وہ جوان ہوگئی۔ ماشاءاللہ وہ اتنی خوبصورت تھی کہ ہر روز میں اس کی نظر ضرور اتارتی۔ ذہانت تو اسے ورثے میں ملی تھی وہ اکثر مجھ سے اپنے باپ کے بارے میں پوچھتی تو میری آنکھیں بھیگ جاتیں پھر خود ہی میرے گلے میں بانہیں ڈال کر کہتی ”امی آپ نے مجھے اتنا پیار دیا ہے کہ کبھی باپ کی کمی محسوس نہ ہوئی“ اور میں بے اختیار اسے گلے سے لگا کر پیار کرتی۔ جب وہ ایف اے میں داخل ہوئی تو حویلی میں کچھ عجیب واقعات رونما ہونے لگے اتنا طویل عرصہ میں نے اس حویلی میں گزارا لیکن مجھے کبھی کوئی خوف محسوس نہیں ہوا لیکن آج کل مجھے محسوس ہوا کہ جیسے حویلی میں ہمارے علاوہ کوئی تیسری نادیدہ ہستی بھی موجود ہے جو حمیرا کو نقصان پہنچانا چاہتی ہے اکثر جب حمیرا چائے بناتی تو اس کے دوپٹے کا پلو آگ پکڑ لیتا وہ خوفزدہ ہوکر دوپٹہ دور پھینک دیتی ایک مرتبہ چائے کی ٹرے ہاتھوں میں پکڑے جب لاؤنج میں داخل ہونے لگی تو نجانے کیا ہوا کہ اس کا پاؤں پھسلا اور ٹرے اس پر آ گری اُف خدایا...... اس کے جسم پر گرم گرم چائے گری۔ وہ تو خدا کا شکر ہوا کہ جسم زیادہ نہیں جلا صرف ہاتھ کہنیوں تک جلے۔ لیکن اسے بہت زیادہ تکلیف ہورہی تھی میں اسے اس حالت میں دیکھ کر رو پڑی۔ ماں تھی ناں...... !کلیجہ منہ کو آ جاتا تھا جب میری بچی کو چھوٹی سی خراش بھی آتی بہرحال پھر میں نے حمیرا کے کچن میں گھسنے پر پابندی لگا دی اور خود سارے کام کرنے لگی۔

حمیرا کالج ایک بس میں جاتی تھی۔ ایک مرتبہ اس کی بس کو حادثہ پیش آ گیا اور وہ سڑک کے سائیڈ پر لگے ہوئے ایک تناور درخت سے ٹکرا گئی لیکن حیرت کی بات تو یہ تھی کہ بس میں کسی اور لڑکی کو خراش تک نہ آئی تھی صرف حمیرا زخمی ہوئی اس کی دائیں ہاتھ کی شہادت والی انگلی ٹوٹ گئی اور کہنیوں پر بھی خراشیں آئیں۔ میں ان واقعات کی وجہ سے بہت زیادہ پریشان تھی مجھے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ اپنی بیٹی کی حفاظت کیسے کروں۔

مجھے اکثر لاؤنج کے آتش دان کے پاس رات کی تنہائی میں کسی کی موجودگی کا احساس ہوتا تھا ایک مرتبہ میں رات کو کچن سے پانی لینے کے لئے وہاں سے گزری تو یوں لگا جیسے آتش دان کے قریب میں کوئی دھیمی آواز میں رو رہا ہے حمیرا کا خیال آتے ہی میں اندر داخل ہوگئی۔ اندر گھپ اندھیرا تھا کھڑکی سے چاند کی روشنی کمرے میں ایک لکیر کی صورت میں داخل ہورہی تھی۔

اس روشنی میں میں نے دیکھا کہ ایک سایہ زمین پر آتش دان کے بالکل سامنے بیٹھا تھا۔

”حمیرا......!“ میں نے کچھ فاصلے سے پکارا تو وہ سایہ ایک دم غائب ہوگیا جیسے وہاں کوئی تھا ہی نہیں میں نے خوف سے جھرجھری لی اور حمیرا کے کمرے کی طرف بڑھ گئی دروازہ کھول کر دیکھا تو حمیرا بے خبر بڑے مزے سے نیند کی وادیوں کی سیر کررہی تھی۔ واپسی پر میں نے ڈرائنگ روم کا معائنہ کیا تو سب کچھ معمول کے مطابق تھا سوائے آتش دان کے جس میں دھواں بلند ہورہا تھا جس کا مطلب یہ تھا کہ یہاں تھوڑی دیر پہلے آگ جل رہی تھی لیکن یہ کیسے ممکن تھا رات کے تین بجے آگ کس نے جلائی؟ ذہن میں یہی سوال لئے میں اپنے کمرے میں آ گئی۔ بستر پر لیٹی لیکن نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی ایک ہی سوال مجھے پریشان کئے ہوئے تھا کہ آخر وہ سایہ کیا تھا اور آگ کس نے جلائی انہی سوچوں میں گم نجانے کب نیند کی دیوی نے مجھے اپنے آغوش میں لے لیا۔

صبح میں حسب معمول 6 بجے اٹھی نماز پڑھی اور حمیرا کو جگانے اس کے کمرے کی طرف بڑھ گئی لاؤنج سے گزرتے وقت غیر ارادی طور پر میری نظر آتش دان کی طرف گئی لکڑیوں وغیرہ کے اوپر کاغذ کا ایک پرزہ نظر آیا میں نے قدم آتش دان کی طرف بڑھا دیئے کاغذ پر اردو زبان میں ایک تحریر درج تھی میں اسے محویت سے پڑھنے لگی۔

”سنو سلمیٰ! میری تم سے کوئی دشمنی نہیں۔ میں صرف آفتاب احمد کی نسل مٹانا چاہتی ہوں اسی طرح مجھے سکون نصیب ہوگا تمہاری بچی کا پیچھا میں اس کی جان لے کر ہی چھوڑ سکتی ہوں۔

مجھ پر تو جیسے سکتہ طاری ہوگیا۔ یا خدا یہ کیا ہے“ میں نہیں جانتی کہ کب کاغذ میرے ہاتھوں سے چھوٹا اور کب میں نے حمیرا کے کمرے کی طرف دوڑ لگادی وہاں جاکر میں نے حمیرا کو اپنے بازوؤں میں سمیٹ لیا اور دروازے پر نظریں گاڑ دیں جیسے کسی آنے والے وحشی سے اپنی بچی کو بچانا چاہ رہی ہوں۔ ”کیا ہوا امی؟“ حمیرا نے آنکھیں کھولتے ہوئے کہا۔

”ہاں...... کچھ نہیں۔ وہ میں تمہیں جگانے آئی تھی۔“ میں نے بات بناتے ہوئے کہا اور اٹھ کر ڈرتے قدموں سے باہر نکل گئی۔

ناشتے کی میز پر میں حمیرا کو ناشتہ کرتے دیکھتی رہی۔ ”امی کیا بات ہے آپ ناشتہ نہیں کررہیں......!“ حمیرا نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”ہاں......! نہیں تو! وہ میں بعد میں کرلوں گی تمہیں جلدی ہے ناں...... تم کھاؤ......“ ناشتہ کرکے وہ اٹھی اور باہر گیٹ کی جانب بڑھ گئی۔

اور میں بیٹھی خلاؤں میں گھور رہی تھی اچانک مجھے خیال آیا کہ کیوں نہ حمیرا کو لے کر شہر چلی جاؤں لیکن اس کے فائنل کے امتحان ہونے والے تھے۔ وہاں کس کالج میں داخل کرواں گی حمیرا کا تو سال ضائع ہوجائے گا۔ انکل سبحانی بھی اپنی وائف کے ساتھ انگلینڈ ریسرچ کے لئے چلے گئے تھے۔ ورنہ ان کے ہاں چلی جاتی۔ ”کیوں ناں امی اور بہن کو یہاں بلوالوں“ یہ سوچ کر میں نے ٹیلی فون کے نمبرز ڈائل کرنا شروع کئے ”ہیلو“ دوسری طرف سے آواز سنائی دی۔

”ہیلو امی میں سلمیٰ بول رہی ہوں۔“

”کیا حال ہے سلمیٰ! بڑے دنوں بعد فون کیا۔ حمیرا کیسی ہے؟“

”وہ بالکل ٹھیک ہے امی۔“

”بیٹی تم کچھ دنوں کے لئے آ جاؤ نا! تمہارے ابو بہت یاد کرتے ہیں تم لوگوں کو......!“

”امی وہ حمیرا کے امتحان ہونے والے ہیں نا۔ پھر آؤں گی۔ آپ کیوں نہیں آ جاتیں کچھ روز کے لئے میرے پاس......!“ میں نے کہا تو وہ بولیں۔

”ارے بیٹا کیا بتاؤں میں تو تمہارے بھائی کی طرف سے بڑی فکرمند ہوں وہ آج کل اچھے دوستوں کی صحبت میں نہیں بیٹھتا“

”کیوں امی! کیا ہوا ہے انہیں؟“

”بس بیٹا وہ بھٹک گیا ہے برائی کے راستے پر کل

تمہارے ابو نے خود اسے سلطان کے اڈے پر چرس پیتے دیکھا تھا، تب سے وہ بہت پریشان ہیں۔ ان کی طبیعت بھی ٹھیک نہیں۔“

”اوہ......! اچھا امی وہ عائشہ کہاں ہے؟“

”بیٹا وہ اپنی دوستوں کے ساتھ کالج ٹور پر مری گئی ہے ایک ہفتہ بعد لوٹے گی۔“

”اوہ اچھا امی میں حمیرا کے امتحان کے بعد چکر لگاؤں گی آپ ابو کو سلام دیجئے گا۔“

”اچھا بیٹا حمیرا کو میرا پیار دینا۔“

”جی اچھا امی اللہ حافظ......!“ اور میں نے ریسیور کریڈل پر رکھ دیا۔

سارا دن بس یہ سوچتے گزر گیا کہ کیا کروں۔ رات ہوئی تو ڈر و خوف نے آن گھیرا میں نے آج جاگنے کا فیصلہ کیا میں نے سوچا کہ آج اس ”سائے“ سے یا وہ جو کوئی بھی ہے اس سے دوٹوک بات کرنی چاہئے۔ حمیرا کو اس کے کمرے میں سلا کر میں اپنے کمرے میں آ گئی لیکن میں جاگتی رہی جائے نماز پر دیر تک اپنے رب سے رحم کی بھیک مانگتی رہی رو رو کر میری آنکھیں تھک چکی تھیں آخرکار میری بچی کا کیا قصور ہے اور آخر میں نے کیا بگاڑا ہے اس کا جو وہ مجھ سے میری بچی کو جدا کرنا چاہتی ہے کون ہے وہ کیا ہے وہ؟“ میں یہی سوچ رہی تھی کہ اچانک مجھے لاؤنج میں کسی کے چلنے کی آہٹ محسوس ہوئی میں دبے قدموں میں لاؤنج کی دیوار کے ساتھ آ چپکی اور اندر جھانکنے لگی“ وہ ایک سایہ تھا ایک عورت کا سایہ جو سرتاپاؤں کالی چادر میں لپٹا ہوا تھا“ دھیرے دھیرے چلتا ہوا وہ آتش دان کے پاس گیا اور وہاں دو زانوں براجمان ہوگیا میں بت بنی اسے دیکھتی رہی اور سوچتی رہی کہ یہ ہے کون؟ کہ اچانک اس کے رونے کی آواز آئی وہ بہت ہلکی آواز میں رو رہی تھی بالکل ایسے جیسے وہ چھپنا چاہتی ہو۔ اپنا دکھ بتانا چاہتی ہوں لیکن سوائے آنسو بہانے کے اسے کچھ نہ سوجھ رہا ہو۔ اس کی سسکیوں میں اتنا درد اور سوز تھا کہ میری بھی آنکھیں نم ہونے لگیں میرے دل میں اس کے لئے ہمدردی پیدا ہوئی دل چاہا کہ قریب جاکر اس سے رونے کا سبب پوچھوں کہ اچانک......

میری آنکھوں نے ایک ناقابل یقین منظر دیکھا آتش دان میں خود بخود آگ بھڑک اٹھی اور سلگتے شعلوں کے درمیان ایک دھندلی سی شبیہہ نظر آئی ذرا غور کرنے پر اندازہ ہوا کہ آتش دان میں دو تین سال کا معصوم بچہ یا بچی پڑی چیخ رہی ہے وہ سایہ اس کی طرف ہاتھ بڑھانے کی کوشش کررہا تھا لیکن دونوں کے درمیان بھڑکتی ہوئی آگ کی خلیج حائل تھی دیکھتے ہی دیکھتے آن کی آن میں بچہ یا بچی جل کر خاک ہوگئی۔

اُف خدایا......! کیسا ہولناک منظر تھا میں بھی آخر ماں تھی میری ممتا بیدار ہوگئی میں نے منہ دوسری طرف کرلیا کہ اچانک اس سائے کی سسکیاں ابھرنے لگیں اور اس نے دھیمے لہجے میں رونا شروع کردیا لیکن اب اس کی آواز میں درد کے ساتھ ساتھ غصہ بھی شامل تھا۔ میرا دل بہت زور زور سے دھڑکنے لگا یوں محسوس ہوا جیسے وہ سایہ میری طرف خونخوار انداز میں بڑھ رہا ہے میرا سر چکرانے لگا میں وہیں چوکھٹ میں بے ہوش ہوکر گر پڑی۔

ہوش آیا تو خود کو نرم و گداز بستر پر پڑے ہوئے پایا میرے سامنے میری حمیرا بیٹھی تھی جبکہ سرہانے کی طرف ڈاکٹر اسلم تھے اسلم میرے شوہر کے بہت اچھے دوستوں میں سے تھے۔ ”حمیرا...... بیٹا یہ دوائیں انہیں پلا دینا انشاءاللہ، اللہ شفا دے گا“ اور حمیرا نے ان کے ہاتھ سے ایک پرچہ تھام لیا۔

”جی بہتر“ حمیرا نے جواب دیا اور پھر ڈاکٹر کو باہر چھوڑ آئی واپس آئی تو مجھے ہوش میں دیکھ کر خوشی سے کھل اٹھی ”امی کیا ہوا تھا آپ کو؟ میں محسوس کررہی ہوں کہ کچھ دنوں سے آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں چلیں نانو کے گھر چلتے ہیں“ اس نے اپنی بانہیں میرے گلے میں حمائل کرتے ہوئے کہا۔

”نہیں حمیرا میں ٹھیک ہوں میری جان...... تمہارے امتحان ہوجائیں تو نانی کے گھر چلیں گے۔“ میں نے اسے پیار کرتے ہوئے کہا۔

"اچھا یہ بتائیں رات کو کیا ہوا تھا؟" اس نے مجھے بغور دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں...... نہیں...... وہ...... کچھ نہیں کیا ہوا تھا رات کو؟" میں نے بات بناتے ہوئے کہا۔ میں اسے بلاوجہ پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی۔ ویسے بھی اس کے امتحانات ہونے والے تھے اور وہ یونہی خوفزدہ ہو جاتی۔

"تو پھر آپ بے ہوش کیوں ہو گئیں؟"

"وہ میں رات کو وہاں سے گزر رہی تھی تو یونہی تمہاری ابو کی یاد آ گئی بس پھر مجھے ہوش نہ رہا" میں نے بات بناتے ہوئے کہا۔

"اچھا چھوڑیں ڈاکٹر نے کہا ہے کہ آپ کو آرام کی ضرورت ہے میں کالج چلتی ہوں آپ آرام کریں واپسی پر آپ کی دوائیں لے آؤں گی۔ اوکے ٹیک کیئر...... بائے" اور اس نے میرے گال چوم کے باہر قدم بڑھا دیئے جبکہ مجھے ایک مرتبہ پھر سوچوں نے آن گھیرا۔ میرے ذہن میں واقعات کی کیسٹ چلنے لگی۔

"وہ سب کیا تھا جو میں نے رات کو دیکھا؟ آخر یہ سب کچھ کیا ہے؟ اس دن میں نے پکا تہیہ کر لیا تھا کہ آج ہر صورت میں "اس" سے حقیقت معلوم کر کے رہوں گی۔ اب میرا حوصلہ پہلے کے مقابلے میں کافی بڑھ چکا تھا میں نے دل میں یہ مصمم ارادہ کیا۔

خدا خدا کر کے رات ہوئی اور حمیرا کھانا کھانے کے بعد کافی کا کپ ہاتھ میں تھامے اپنے کمرے میں چلی گئی جبکہ میں لاؤنج میں صوفے پر براجمان ہو گئی وقت گزارنے کے لئے میں نے مشہور و مقبول "ڈر ڈائجسٹ" کی ورق گردانی شروع کر دی۔ وقت گزرنے کا پتہ ہی نہ چلا اور رات کے دو بج گئے۔

اچانک ایک کھٹکے سے میں چونک گئی اور میں نے دروازے کی چوکھٹ پر نظریں گاڑ دیں اسی لمحے وہ سایہ اندر داخل ہوا سر تا پاؤں کالی چادر میں ملبوس کسی عورت کا سایہ بہت خوفناک دکھائی دے رہا تھا اس کا چہرہ چادر میں لپٹا ہوا تھا لیکن اس کے لمبے بالوں کی لٹیں باہر جھول رہی تھیں جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ اس کے بال انتہائی بے ترتیب اور بکھرے ہوئے ہیں رات کے پچھلے پہر ایک سایہ ایک خوفناک سایہ میرے سامنے تھا آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ کتنا دہشت ناک منظر ہو گا۔ بہر حال وہ معمول کے مطابق بغیر ادھر ادھر دیکھے آتش دان کی طرف بڑھنے لگی میں تو جیسے اسے نظر ہی نہ آئی وہ جونہی آتش دان کے سامنے بیٹھی میں نے ہمت کر کے دریافت کیا "کون ہو تم......؟" اس نے بغیر میری طرف دیکھے کہا۔

"مجھے معلوم تھا کہ تم مجھ سے بات ضرور کرو گی لیکن یہ سن لو کہ میں حمیرا کی جان لے کر رہوں گی۔ چاہے کچھ بھی ہو جائے۔" میں نے خوف سے جھرجھری لی اور ایک مرتبہ پھر خاموشی کے سکوت کو توڑا۔

"آخر کیوں؟ اس نے تمہارا کیا بگاڑا ہے......؟"

"تم کہتی ہو اس نے میرا کیا بگاڑا ہے" اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ اُف خدایا...... اس کی آنکھوں میں آگ کے انگارے دیکھ کر میں تو کیا میری روح تک لرز گئی۔ "کیا بگاڑا تھا میری شائلہ نے آفتاب احمد کا...... کس جرم کی سزا ملی تھی میری بچی کو......؟"

اور اس کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے کچھ دیر خاموش رہی اس نے اپنا سر گھٹنوں میں دے رکھا تھا اچانک اس نے سر اٹھایا اور غصے سے بولی "ختم کر دوں گی نہیں چھوڑوں گی میں اس کی نسل کو۔ سب کو ختم کر دوں گی۔ ہاں سب کو۔" اور میری طرف دیکھنے لگی جیسے ابھی مجھ پر جھپٹ پڑے گی۔

میں نے اپنی مٹھی مضبوطی سے بھینچ لی جس میں حسب معمول میری تسبیح موجود تھی نجانے کیوں رات کے اس پہر اس عجیب الخلقت مخلوق سے ہم کلام ہو کر مجھے وہ خوف محسوس نہ ہوا جو عام آدمی کو ہوتا میں یقین سے کہتی ہوں اگر کوئی اور ہوتا تو اس وقت اس کی روح کوہ قاف کی وادیوں کی سیر کر رہی ہوتی۔ شاید یہ اللہ تعالیٰ کے ذکر کی بدولت تھا یا شاید تسبیح کے ساتھ کی کرامت تھی کہ میں اس سے دوبارہ گویا ہوئی۔ "تم جو کوئی بھی ہو مجھے بہت دکھی معلوم ہوتی ہو بولو تمہارے ساتھ کیا ہوا تھا؟ کیا داستان

ہے تمہاری؟ کس آگ میں جل رہی ہو تم؟ بتاؤ آج مجھے سب کچھ بتا ڈالو۔"

نجانے مجھ میں اتنی ہمت کہاں سے آ گئی مجھے اپنے کانوں پر یقین نہ آیا کہ یہ سب میں نے ہی کہا ہے۔

"میرا نام فرحانہ ہے" اس نے اپنی داستان شروع کی جیسے وہ بھی کسی کو اپنی داستان غم سنانے کے لئے ترس رہی ہو۔

☆......☆......☆

"میں اسی گاؤں کے ایک غریب مزدور کے گھر میں پیدا ہوئی میں اپنے والدین کی اکلوتی اور لاڈلی بیٹی تھی میری منگنی بچپن ہی سے میرے ماموں زاد "عرفان" سے طے ہو چکی تھی جب ہم جوان ہوئے تو ہمیں ایک دوسرے سے شدید محبت ہو گئی عرفان میرے خوابوں کا شہزادہ تھا خوبصورتی میں میں بھی کم نہ تھی ہم روز پرانے کنوئیں کے پاس چھپ کر ملتے تھے ایک دن وہ مجھ سے مل کر اور کل دوبارہ آنے کا وعدہ لے کر چلا گیا میں نے گھڑا اٹھایا اور گھر کی طرف قدم بڑھا دیئے کہ گاؤں کے زمیندار کے بیٹے آفتاب نے میرا راستہ روک لیا آفتاب ہمیشہ سے مجھ پر بری نظر رکھتا تھا مجھ پر کیا گاؤں کی ساری لڑکیوں پر......! مجھے تو اس کے نام ہی سے نفرت تھی۔

"کہاں جا رہی ہو رانی......؟" اس نے ایک گھٹیا مسکراہٹ کے ساتھ پوچھا۔

"تم سے مطلب" میں نے غصے سے جواب دیا۔

"مطلب وطلب کیا بس اتنا کہنا تھا کہ کبھی ہم غریبوں کو بھی وقت دے دیا کرو" اور اس کے ساتھ ہی اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا میں غصے سے تلملا اٹھی اور دوسرے ہاتھ سے گھڑا چھوٹ گیا اور میرا ہاتھ اس کے گالوں پر اپنی انگلیوں کے نشان چھوڑ گیا وہ حیرت سے ساکن ہو گیا جیسے اسے یقین نہ آ رہا ہو کہ گاؤں کی ایک معمولی سی لڑکی نے زمیندار کے بیٹے کو تھپڑ مار دیا تھا۔

"اگر آئندہ میرا راستہ روکا تو اس سے بھی بری طرح پیش آؤں گی سمجھے۔" میں نے اس کے پاس سے گزرتے ہوئے کہا اور گھر آ گئی۔ وہ شاید میری زندگی کی سب سے بڑی غلطی تھی آفتاب احمد اس دن کے بعد چپ سا ہو گیا اس نے کسی کو کچھ نہ بتایا میں یہ سوچ کر مطمئن ہو گئی کہ چلو آفتاب سدھر گیا ہے لیکن وہ تو اتنے عرصے سے آتش فشاں کی طرح اپنے اندر لاوا جمع کر رہا تھا۔

بہر حال میری اور عرفان کی شادی بڑی دھوم دھام سے ہو گئی زمیندار نے بھی شرکت کی اور سب سے حیرانگی کی بات یہ کہ آفتاب بھی شریک ہوا وہ کافی سدھرا ہوا دکھائی دے رہا تھا زمیندار نے ہماری شادی کا تحفہ ہمیں اس حویلی کے ایک سرونٹ کوارٹر کی صورت میں دیا ہم غریب لوگ زمیندار کی حویلی کے سرونٹ کوارٹر کے صرف خواب ہی دیکھ سکتے تھے زمیندار نے یہ اعلان کر کے ہم سب کو حیران کر ڈالا ہم بہت خوش ہوئے اور دوسرے دن ہی اپنا سامان کوارٹر میں شفٹ کر کے یہاں آ گئے یہاں ہمارا ہر طرح سے خیال رکھا جانے لگا میں تو پہلے ہی عرفان کی محبت میں خوشی سے پاگل ہو رہی تھی زمیندار کے بندے تقریباً ہر روز آ کر خیر۔ خیریت پوچھ لیا کرتے تھے آہستہ آہستہ میں نے آفتاب احمد والا واقعہ بھی بھلا دیا۔

صبح عرفان زمینوں پر کام کرنے چلے جاتے اور شام دیر سے لوٹتے تھے لیکن میں پھر بھی مطمئن تھی کیونکہ یہاں مجھے ہر طرح کا سکون و آرام میسر تھا۔ وقت اسی طرح گزرتا گیا۔ اچانک مجھے یوں محسوس ہونے لگا جیسے آفتاب مجھے باقاعدگی سے نوٹ کرتا ہے۔ میں اکثر کھڑکی کھول کر صفائی کرتی تو مجھے کئی مرتبہ ایسا محسوس ہوا جیسے وہ مجھے دیکھ رہا ہو لیکن دروازہ کھول کر دیکھتی تو کوئی نہ ہوتا۔ ایک مرتبہ جونہی میں نے کھڑکی کھولی سامنے آفتاب کھڑا تھا میں ذرا پیچھے ہٹی اور مکمل اطمینان سے پوچھا۔ "کیا بات ہے آفتاب؟"

"فرحانہ میں تم سے بدلہ ضرور لوں گا۔ تمہیں شاید وہ تھپڑ یاد نہیں۔ دیکھتی جاؤ میں تمہیں برباد کر دوں گا۔" اس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے

انتہائی غصے سے یہ سب کہا اور وہاں سے چلا گیا میں کانپ کر رہ گئی میرے ذہن میں آندھیاں سی چلنے لگیں۔ میں نے فوراً کھڑکی بند کر لی۔

شام کو عرفان آئے تو میں نے باتوں باتوں میں انہیں یہاں سے چلنے کو کہا۔ لیکن انہوں نے یہ کہہ کر ٹال دیا۔ "یہاں کیا پریشانی ہے۔ اور ویسے بھی میرے گھر میں تو میری بہن پہلے ہی اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ ڈیرا جمائے ہوئے ہے۔ ہم بھلا وہاں کہاں رہیں گے؟"

تو میں چپ ہو گئی کہ انہیں کیا بتاؤں۔ کاش میں اسی دن انہیں سب کچھ بتا دیتی تو شاید وہ سب کچھ نہ ہوتا جو بعد میں ہو چکا۔ فرحانہ نے ایک سرد آہ بھری اور دوبارہ اپنی داستان سنانے لگی۔ "اس دن کے بعد آفتاب دوبارہ نہیں آیا اور نہ ہی مجھے نظر آیا اور میں اس واقعے کو بھول گئی کیونکہ اب ہمارے آنگن میں ایک ننھی سی کلی کھلنے والی تھی۔

اس خوشی نے مجھے سب کچھ بھلا دیا۔ عرفان کو پتہ چلا تو وہ خوشی سے دیوانے ہونے لگے۔ کچھ ہی عرصے بعد خدا نے ہمیں چاند سی بیٹی سے نوازا۔ ہماری خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا۔ ہم دو سے تین ہو گئے بچی کا نام ہم نے "شائلہ" رکھا۔ میری شائلہ میری آنکھوں کا تارا تھی۔ میرے دل کی ٹھنڈک کیا بتاؤں کتنا پیار تھا ہم دونوں کو اس ننھی سی جان سے۔" وہ وقفے بھر کے لئے رکی اور اپنی آنکھوں سے دوبارہ آنسوؤں کی برسات شروع کر دی میں بھی اسے دیکھتی رہی مجھے اس کی کہانی سے خاصی دلچسپی ہو رہی تھی پھر میں نے ہی خاموشی کا سکوت توڑا۔

"پھر کیا ہوا؟" میں نے پوچھا۔

"وقت گزرتا گیا اور میری بیٹی تین سال کی ہو گئی۔ میں اس کی ہر ضرورت کا خیال رکھتی تھی عرفان بھی اس پر جان چھڑکتے تھے ہماری زندگی یونہی خوشی سے گزر رہی تھی کہ نجانے کس کی نظر ہمارے ہنستے بستے گھرانے کو لگ گئی۔

ایک دن میں اپنے کمرے کی صفائی کر رہی تھی کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ "کون.....؟" میں نے دروازے کے قریب جاتے ہوئے پوچھا۔ شائلہ ساتھ والے کمرے میں سو رہی تھی۔ "میں ہوں باجی فرخندہ جلدی دروازہ کھولیں۔" میں نے جلدی سے کنڈی کھول دی اور فرخندہ نے بغیر کچھ کہے سنے مجھے ایسی خبر سنائی کہ میرے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ "باجی آپ کے میاں کو کھیت میں زہریلے سانپ نے ڈس لیا ہے۔"

"کیا؟" اور میرے منہ سے چیخ نکل گئی۔

"وہ حویلی میں پڑے ہیں۔ آپ جلدی چلیں"

اور میں ننگے پاؤں حویلی کی طرف دوڑ پڑی۔ وہاں پہنچی تو دیکھا سامنے چارپائی پر عرفان زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا تڑپ رہے تھے میں دوڑ کر ان کے قریب گئی

"عرفان کیا ہوا؟ یہ سب کیا ہوا؟" میں نے ان کا سر اپنی گود میں رکھتے ہوئے بے تابی سے پوچھا اور جواب میں وہ صرف اتنا کہہ سکے "فر.....فر.....حا.....نہ..... شم.....آ.....ئلہ..... کا خیال رکھنا۔" اور ان کی آنکھیں ہمیشہ کے لئے بند ہو گئیں۔

"نہیں.....!" میں وہیں چیخ مار کر بے ہوش ہو گئی۔

ہوش آیا تو خود کو حویلی کے ایک خوبصورت اور عالیشان کمرے میں نرم و گداز بستر پر پایا میری آنکھیں ابھی کھلی ہی تھیں کہ سامنے کے منظر نے میرے ہوش اڑا دیے۔ اتفاق سے اسی دن اس کے والدین کسی عزیز کے گھر دوسرے گاؤں گئے تھے۔ حویلی خالی تھی نوکروں کو بھی اس نے چھٹی دے دی تھی۔

میرے سامنے آفتاب کھڑا کمینگی سے مسکرا رہا تھا جبکہ میری معصوم بچی شائلہ اس کے مضبوط بازوؤں سے نکلنے کے لئے ناکام جدوجہد کر رہی تھی میں اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"تم..... چھوڑو میری بچی کو۔ کیا چاہتے ہو تم؟"

میرے لہجے میں نفرت و حقارت نمایاں تھی میں بہت جلد اس کے قریب پہنچ گئی تاکہ شائلہ کو اس کی گرفت سے آزاد کروا سکوں۔

"ہاہاہا..... مجھے پہچانا؟ میں آفتاب احمد وہی جسے تم نے تھپڑ مارا تھا۔ یاد آیا؟ جانتی ہو میری زندگی میں میرے ماں باپ نے بھی کبھی مجھے نہیں مارا تم کیا سمجھتی تھی کہ میں اپنی بے عزتی بھول گیا ہوں نہیں میری جان نہیں اور یہاں اتنا عرصہ میں خاموش صرف اس لئے تھا کہ تمہارے لئے مناسب سزا تجویز کروں اور آج وہ وقت آ گیا ہے کہ میں اپنا بدلہ لے سکوں۔ عرفان کو بھی میں نے راستے سے ہٹایا ہے میں تمہیں برباد کر دوں گا اور اسے۔" اس نے بچی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "ہاں..... میں اپنے اور تمہارے بیچ آنے والی ہر چیز کو تباہ کر دوں گا۔"

"ذلیل کمینے! میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گی۔"

اور میرے نازک ہاتھوں کے بے مقصد وار اس کے مضبوط جسم پر چلنے لگے اس نے مجھے ایک طرف دھکا دیا اور بچی کو اٹھائے باہر نکل گیا۔ جاتے وقت اس نے اتنی زور سے دروازہ بند کیا کہ میرے کئی مرتبہ زور لگانے پر بھی نہ کھلا اور میں محض دروازہ پیٹتی رہ گئی۔ "ذلیل کمینے.....! چھوڑ دے میری بچی کو۔ خدا کے لئے چھوڑ دے" میں چیختی رہی تڑپتی رہی لیکن اس بھیڑیے پر بھلا کیوں اثر ہوتا تھا میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں۔ میں نے کمرے میں ادھر ادھر نظریں دوڑائیں۔ سائیڈ ٹیبل پر ایک لمبی سی سلاخ پڑی نظر آ گئی مجھے نہیں معلوم کہ وہاں کس نے رکھی اور نہ یہ سوچنے کا میرے پاس وقت تھا میں نے فوراً سلاخ اٹھائی اور دروازے کے لاک میں گھسا کر اسے کھولنے کی کوشش کرنے لگی۔

تھوڑی ہی دیر میں کامیابی نے میری کوشش کا ماتھا چوما اور دروازہ کھل گیا میں پاگلوں کی طرح حویلی کے کمروں میں اپنی بچی کو تلاش کرتے ہوئے اور آوازیں دیتے ہوئے دوڑ رہی تھی۔ میری حالت بہت بری ہو رہی تھی۔ سر کے بال بکھر گئے تھے چہرہ آنسوؤں کی وجہ سے شدید پژمردہ ہو گیا تھا۔

دوڑتے دوڑتے میں لاؤنج کی طرف بڑھ گئی وہاں کا منظر دیکھ کر گویا میں سچ مچ پاگل ہو گئی میری پھولوں جیسی بچی جو مجھے جان سے بھی زیادہ عزیز تھی۔ آتش دان میں جل رہی تھی۔ تکلیف کی شدت سے وہ تڑپ رہی تھی لیکن جب تک میں اس کے قریب پہنچی اس کی آخری چیخیں تقریباً ختم ہو چکی تھیں اور وہاں صرف اس کا کوئلہ جسم تھا اس کے بعد میں سچ مچ پاگل ہو گئی۔ میں قہقہہ مار کر ہنسی اور پھر خود ہی رو دی اور پھر اچانک غصے سے اٹھ کر میں نے باہر دوڑ لگا دی کیونکہ مجھے آفتاب کو ڈھونڈنا تھا میں ہوش و حواس سے بیگانی ہو کر سڑک تک دوڑتی چلی آئی مجھے خیال ہی نہ رہا کہ کب میں ریلوے لائن پر پہنچی اور کب ریل مجھے کچلتی ہوئی آگے نکل گئی۔"

اتنا کہہ کر وہ خاموش ہو گئی لیکن یقین کیجئے اس کی دردناک کہانی سن کر میری آنکھیں بھیگ گئیں۔ اُف کتنا بڑا صدمہ تھا اسے، اس کی روح کو واقعی چین کیسے آ سکتا تھا میں نے دل میں سوچا کہ اچانک اس کی غصیلی آواز کانپ اٹھی۔

"نہیں چھوڑوں گی اب میں اس کی نسلوں کو بھی نہیں چھوڑوں گی سب کو اسی آتش دان میں جلاؤں گی جس میں میری شائلہ جلی تھی۔" پھر ایک منٹ کے وقفے کے بعد میری طرف خونخوار نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولی "کل رات دو بجے میں تمہاری بچی کو..... آفتاب کی نسل کو مٹا دوں گی۔ پھر مجھے سکون نصیب ہوگا ہاں..... کل میں ضرور آؤں گی میرا انتقام کل ختم ہو جائے گا اور تم بھاگنے کی کوشش بھی مت کرنا کیونکہ تمہارے بھاگنے کے سارے راستے میں بند کر چکی ہوں ہاہاہا....." کہہ کر وہ ہنستے ہوئے باہر نکل گئی۔

جبکہ میں ناقابل فراموش اور ناقابل برداشت مصیبت میں پھنس گئی۔ "یا اللہ یہ سب کیا ہے آخر اس میں میرا کیا قصور ہے میری حمیرا کا کیا قصور ہے" میں سوچتی رہی اور نجانے کب نیند کی بانہوں میں چلی گئی۔

صبح مجھے حمیرا نے جگایا۔ "امی! آپ کیا اب تک سو رہی ہیں؟ آج آپ نے نماز بھی نہیں پڑھی۔"

"اوہ تو کیا..... میں اب تک سوتی رہی" میں نے گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

"تم کالج نہیں گئی؟"

"لو امی کیا ہو گیا ہے آپ کو؟ آج چھٹی ہے بھئی۔"

اس نے مجھے دیکھتے ہوئے جواب دیا اور میں اٹھ کر فریش ہونے چلی گئی۔ باتھ روم میں مجھے رات کا واقعہ یاد آ گیا۔

"اُف کتنی دردناک کہانی تھی فرحانہ کی" میں نے سوچا اور اچانک سوچ کر لرز گئی۔ "کیا اب وہ میری بچی

کو...... میرے خدا میں کیا کروں؟" دن یونہی سوچتے میں گزر گیا حمیرا کی فرینڈز آج چھٹی منانے کے لئے حویلی آ گئی تھیں اس لئے دن کو خوب رونق لگی رہی لیکن میرے دماغ میں تو آندھیاں سی چلتی رہیں جوں جوں رات قریب آ رہی تھی میرے دل میں ہول اٹھ رہے تھے۔

"یا اللہ اب کیا ہوگا بس تو ہی میری بچی کی حفاظت کرنا" میں حویلی کی چھت کو دیکھتے ہوئے دل ہی دل میں بول اٹھی۔

اور اب رات کے 1 بجکر 30 منٹ پر میں اپنی حمیرا کے کمرے میں بیٹھی آنے والی بری گھڑی کے ٹل جانے کی دعائیں مانگ رہی ہوں۔ میری نظر حمیرا پر اور دوسری گھڑی کی سوئیوں پر پڑی۔ میں الفاظ میں بیان نہیں کر سکتی کہ میری کیا کیفیت ہے میں اکیلی کر بھی کیا سکتی ہوں۔ سوائے دعاؤں کے...... پھر اچانک ایک خیال کے ذہن میں آتے ہی میں قدرے مطمئن ہو گئی۔ میں حمیرا سے اب مزید ایک لمحہ بھی دور نہیں رہنا چاہتی تھی اس لئے اس کے سو جانے کے فوراً بعد میں اس کے کمرے میں چلی آئی۔ ابھی میں آنے والی گھڑی کی پیچیدگیوں کے بارے میں سوچ ہی رہی تھی کہ اچانک گھڑی نے دو بجنے کا اعلان کر دیا۔

اچانک ہی کمرے میں دھواں سا اٹھنے لگا۔ تسبیح حسب معمول میرے ہاتھ میں تھی چند سیکنڈ بعد ہی دھواں چھٹا اور وہاں ایک انتہائی خوبصورت عورت کالی چادر میں ملبوس دکھائی دی۔ خوبصورت میں نے اس لئے کہا کہ آج خلاف معمول اس کا چہرہ بے نقاب تھا اس کا معصوم اور نکھرا ہوا چہرہ بہت ہی پرکشش تھا۔

"آج اس دنیا میں میری آخری رات ہے میرا وقت ختم ہوا اور تیری بیٹی کا بھی۔" اس نے حمیرا کو دیکھتے ہوئے کہا۔ اس کی آواز میں ایک گرج تھی جس سے میں گھبرا گئی حیرت انگیز طور پر حمیرا بے خبر پڑی سو رہی تھی۔ جیسے اس نے کوئی آواز ہی نہ سنی ہو پھر فرحانہ حمیرا کی طرف بڑھنے لگی۔

"نہیں......! خدا کے لئے نہیں...... فرحانہ میری بچی کو چھوڑ دو خدا کے لئے۔ میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے آخر مجھے کیوں بے اولاد کرنا چاہتی ہو......؟" میں اٹھتے ہوئے چلائی۔ وہ رک گئی اور میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

"یہ تمہاری بیٹی نہیں آفتاب کی نسل ہے اسے ختم کر کے ہی مجھے سکون ملے گا تم میرے راستے میں مت آؤ ورنہ تمہارا انجام بھی اچھا نہیں ہوگا۔" اس کی آنکھوں میں انتقام کے شعلے بھڑک رہے تھے۔ اس کے لہجے میں درندگی اور سختی تھی وہ دوبارہ حمیرا کی طرف بڑھنے لگی۔

میری کوشش بے کار ہو گئی تھی لیکن اب یوں خاموش بھی تو نہیں رہ سکتی تھی۔ لہٰذا آخری مرتبہ کوشش کرنے کا ارادہ کیا اور اس کے سامنے دوزانوں ہو کر بیٹھ گئی۔

"نہیں فرحانہ...... تمہیں تمہاری ماتا کا واسطہ، تمہیں تمہاری مری ہوئی بچی کا واسطہ" اور میں نے اپنا دوپٹہ اس کے قدموں میں ڈال دیا۔ وہ جیسے ساکت ہو گئی اور حیرت کے ملے جلے آثار چہرے پر سجائے مجھے گھورنے لگی۔

"خدا کے لئے فرحانہ......! میری حمیرا کو میرے دامن میں ڈال دو خدا کے لئے اسے کچھ مت کہو۔ کیا کسی ماں کی گود کو اجاڑ کر تمہاری روح کو سکون مل جائے گا؟ کیا یہی ہے تمہارا انتقام......؟ فرحانہ اسے اپنی شائلہ سمجھ کر چھوڑ دو پلیز رحم کرو۔ تمہیں ایک ماں کی آنکھوں سے بہنے والے آنسوؤں کی قسم۔"

"اتنا کہہ کر جیسے میرے جسم سے مزید بولنے کی طاقت ہی چھن گئی ہو، میں وہیں اس کے قدموں میں سر جھکائے بیٹھ کر آنسو بہانے لگی کیونکہ میں اس کے علاوہ اپنی بچی کو بچانے کے لئے اور کچھ کر بھی نہیں سکتی تھی۔ میری یہ حالت دیکھ کر شاید فرحانہ بھی آبدیدہ ہو گئی۔

"اٹھو جاؤ سلمٰی...... تم جیتی میں ہاری۔ آج ایک ماں نے دوسری ماں کے انتقام کو اپنے آنسوؤں سے زیر کر دیا۔ جاؤ خوش رہو تم دونوں۔ میرے سکون کے لئے دعا کرنا۔"

اس نے ایک پیار بھری نظر سوئی ہوئی حمیرا پر ڈالی اور ہوا میں تحلیل ہو گئی۔

قبرستان کا نمبر

روشن آراء



یہ کمر لشست گاہ تھا اس کے بیٹھنے، دیکھنے اور مسکرانے کا انداز بڑا دل فریب اور قیامت خیز تھا سینے پر اس کے بنفشہ پھولوا... رہا تھا

ہر شخص کی زندگی میں کچھ ایسا واقعہ یا واقعات ضرور پیش آتے ہیں جسے وہ بھلانا چاہے بھی تو ساری زندگی بھلا نہیں سکتا۔ آخری سانس تک اس کے دل و دماغ پر چھائے رہتے ہیں۔ کوئی ضروری نہیں کہ وہ واقعہ خوفناک، سنسنی خیز اور عبرت ناک ہی ہو۔ عموماً وحشت ناک واقعات یاد رہ جاتے ہیں یا پھر عجیب و غریب...... میں جو واقعہ آپ کو سنا رہا ہوں وہ نہ صرف بے حد پر اسرار ہے بلکہ عجیب و غریب بھی مگر بہت سے لوگ اس واقعہ کو سن کر کہتے ہیں کہ یہ ایک گھڑی ہوئی کہانی ہے۔ میں ان سے بحث و تکرار اس لیے نہیں کرتا کہ اس کا گواہ میں ہوں۔ یہ واقعہ میرے ساتھ پیش آیا۔ میں اس واقعے کو شاید آخری سانس تک بھلا نہیں سکوں۔ آپ کے ساتھ پیش آتا تو آپ بھی بھلا نہیں پاتے۔

مجھے اس روز اسپتال میں بہت دیر تک کام کرنا پڑ گیا تھا۔ کیونکہ ایک بوڑھے مریض کی حالت بہت نازک تھی وہ زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا تھا۔ گویا میری ڈیوٹی کا وقت ختم ہو چکا تھا مگر میں اس وقت تک اپنے گھر جانا نہیں چاہتا تھا جب تک مریض کی حالت خطرے سے باہر نہیں ہو جاتی۔ دوسرے ڈاکٹر نے ڈیوٹی سنبھال لی تھی۔ اس بوڑھے مریض سے میرا کوئی رشتہ نہ تھا وہ نہ میرا باپ، بھائی یا رشتہ دار تھا۔ میں یوں ہی مریضوں کو اپنا سمجھتا تھا۔ بلا رنگ و نسل اور مذہب ان کی خدمت کرتا تھا میرے نزدیک سب

انسان برابر تھے۔

جس وقت اس مریضہ کی حالت خطرے سے باہر ہوگئی۔ خدا نے اسے ایک نئی زندگی دی تو مجھے ایسا محسوس ہوا کہ مجھے ایک نئی زندگی ملی ہے۔ پھر جو مسرت میری روح اور میرے دل کو ملی شاید وہ بے پناہ دولت یا کسی قیمتی شے پانے سے بھی نہیں ملتی۔ میں گھر جانے کے لیئے اسپتال سے باہر آیا تو مجھ پر ایک عجیب سی سرشاری طاری تھی۔ میں اس بات سے خوش تھا کہ میری جدوجہد اور توجہ سے ایک مریض کی جان بچ گئی۔ جب میں کسی مریض کا علاج کرتا اور وہ صحت مند ہو جاتا تو وہ یا اس کے لواحقین اپنی جانب اور اپنی خوشی سے مجھے انعام میں رقم دینے کی کوشش کرتے تھے جسے میں قبول کرنے سے انکار کر دیتا تھا۔ کیونکہ میرا اصل انعام تو مریض کی صحت یابی تھی ایک ڈاکٹر کے لیئے یہ بہت بڑا انعام ہوتا ہے۔ میں اسپتال سے باہر آیا تو اس وقت شام ہو چکی تھی۔ اندھیرا پھیل چکا تھا لیکن اس کا سینہ روشنیوں نے چیر دیا تھا۔ لوگ گھروں کو واپس جا رہے تھے، سڑک پر ٹریفک سیلاب کی طرح بہہ رہا تھا۔ ٹرام اور بسیں جو ڈلہوزی کی طرف سے آ رہی تھیں ان میں لوگ جانوروں کی طرح بھرے ہوئے تھے۔ میں چورنگی پارک اسٹریٹ کی طرف بڑھا مجھے سڑک پار کرنا تھا تاکہ وہاں جو بس اسٹاپ تھا وہاں سے بس لے سکوں۔ کلکتہ میں جتنا ٹریفک ہے ہندوستان کے کسی بھی علاقے میں شاید ہو۔ شام کے وقت سڑک پار کرنا بعض اوقات ناممکن ہو جاتا تھا اور آدمی ہار دیتا تھا۔

میں فٹ پاتھ پر سڑک پار کرنے کے ارادے سے کھڑا ہوا تھا میں نے محسوس کیا کہ میرے پاس کوئی سڑک پار کرنے کے ارادے سے کھڑا ہوا ہے۔ میرے دل میں انجانے خوف کی لہر اٹھی کیونکہ کلکتہ شہر میں چھوٹے بڑے جرائم پیشہ افراد کی کوئی کمی نہ تھی۔ جیب کتروں کی بھرمار تھی آج پانچ تاریخ تھی اور مجھے آج ہی تنخواہ ملی تھی۔ تین برس سے میں اس اسپتال میں ملازمت کر رہا تھا گو کہ میں نے تنخواہ کو بہت سنبھال کر اندر کی جیب میں رکھا ہوا تھا پھر بھی ایک ڈر سا غالب ہو گیا تھا۔ وہ چاقو چھرے کی نوک پر مجھ سے رقم طلب کرتا۔ اس سے پہلے کہ میں اس کی طرف دیکھتا میرے نتھنوں میں سوندھی سوندھی خوشبو سی بھر گئی۔

جب میں نے اس طرف دیکھا تو ایک نوجوان لڑکی کو مہکتے ہوئے پایا۔ اس کے حسن و جمال نے مجھے بہت متاثر کیا بلکہ مجھ پر بجلی بن کر گرا تھا۔ میں نے اسے ناقدانہ نظروں سے دیکھا، چہرہ بیضوی سرو قد، جسم بے پناہ گداز اور کشش کا خزانہ معلوم ہوتا تھا نیم دگلابی اور مرطوب ہونٹوں سے گویا تپش ابل رہی تھی اسپتال میں دو ایک نرسیں اور سسٹرز بہت حسین تھی جنہیں دیکھ کر مریض اپنا مرض بھلا دیتے تھے۔ ان کا حسن مردوں کو متاثر کرتا تھا مگر میں ان کے حسن کا اسیر نہیں ہوا تھا کیونکہ میں ایک ڈاکٹر تھا اور اسپتال میں مریضوں کی خدمت اور اپنے فرض کی ادائیگی کے لیئے آتا تھا۔ اور پھر حسین و جمیل لڑکیاں اور عورتیں اکثر نظر آتی رہتی تھیں لیکن میں نے ایسی گہری اور نیلی آنکھیں کبھی نہیں دیکھیں تھیں۔ چہرے کے خدوخال میں نہ صرف تیکھا پن تھا بلکہ اس قدر جاذبیت اور دل کشی تھی کہ میرے دل پر یہ سب قیامت ڈھانے لگے۔ اس کے گداز لبوں پر ایک تبسم رقصاں تھا ایسا طرح دار سراپا بھی میں نے بہت کم دیکھا تھا۔ یہ پہلی لڑکی تھی جس پر میں ریشہ خطمی ہو گیا تھا۔

جب اس سے میری نگاہیں چار ہوئیں تو میرا دل بہت تیزی سے دھڑکنے لگا۔ جامنی رنگ کی ساڑھی میں اس کی اجلی رنگت اور قیامت ہو گئی تھی۔ اس نے بغیر آستینوں والا بلاؤز پہن رکھا تھا جو مختصر اور نیچی تراش اور نئے فیشن کے مطابق تھا۔ ایسا لباس ہر دس عورتوں میں سے سات عورتیں پہنتیں ہیں۔ عورت کی نیم عریانی کوئی معیوب بات نہیں رہی تھی اس نے مجھ پر جیسے جادو کر دیا تھا۔

جب وہ میرے اور قریب ہوئی تو میرے دل میں سب سے پہلا خیال جو آیا وہ یہ تھا کہ یہ لڑکی مجھے شکار کرنا چاہتی ہے۔ اس شہر میں ایسے گھرانوں کی نوجوان پرکشش اور خوبصورت لڑکیاں شام ہوتے ہی شکار کی تلاش میں نکلتی تھیں جو مالی مشکلات، تنگ دستی اور بے روزگاری کا شکار ہوتی تھیں۔ میرے دل کے کسی کونے میں دھوکے کی ایک لہر آئی میں نے اپنے دل میں یہ کہا کہ..... خدا کرے یہ ایسی لڑکی نہ ہو اگر یہ شکاری لڑکی ہوئی تو مجھے ساری زندگی دکھ

رہے گا۔ دوسری طرف میں نے اپنے دل میں فیصلہ کر لیا کہ اگر یہ ایسی لڑکی ہوئی تو میں اس کے ساتھ چلا جاؤں گا جو بھی رقم طلب کرے گی اس کی نذر کر دوں گا۔ اس نے مجھ پر تبسم کی چیاں نچھاور کرتے ہوئے کہا۔ "ڈاکٹر ڈیوڈ!" "آپ مریضوں کی بڑے خلوص سے خدمت کرتے ہیں۔ کیا میں آپ کو ایک زحمت دے سکتی ہوں؟ اس کی آواز بھی اس کی طرح مدھ بھری اور رس بھری تھی۔ میں اپنا نام سن کر بڑے زور سے چونکا۔ "آپ مجھے جانتی ہیں؟" میں نے حیرت سے کہا

"آپ کو کون نہیں جانتا" وہ رس بھری آواز میں بولی "وٹ نورا اسپتال میں آپ کو ہر کوئی فرشتہ کہتا ہے مریض آپ کی پوجا کرتے ہیں۔"

میں اس کی بات سن کر ہنس پڑا۔ اور انکساری سے بولا "میں فرشتہ نہیں ایک انسان ہوں فرمایئے میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں"

"کسی طرح مجھے سڑک پار کرا دیجیئے" وہ میری آنکھوں میں جھانکتی ہوئی بولی "اس قدر ٹریفک ہے کہ میرے لیے سڑک پار کرنا بہت دشوار ہے۔"

"اس میں زحمت کی کیا بات ہے" میں نے جواب دیا۔ "چونکہ مجھے بھی سڑک پار کرنا ہے میں آپ کو بھی پار کرادوں گا تیار ہو جایئے سڑک پار کرنے کے لیئے" سڑک پار کرنے کی غرض سے میں فٹ پاتھ سے اترا تو وہ بھی اتر گئی۔ پھر اس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا مجھے بڑی حیرت ہوئی۔ ایسی حرکت کی توقع نہ تھی میں اس کا ہاتھ پکڑے بغیر اسے سڑک پار کرا بھی نہیں سکتا تھا تاہم اس نے اپنی طرف سے پہل کر دی تھی اس کے ہاتھ کا لمس اس قدر انوکھا اور لطیف سا تھا کہ میرے سارے بدن پر ایک فرحت بخش سنسنی دوڑ گئی اور نس نس میں خون جیسے رقص کرنے لگا۔ خون کے فوارے ابل پڑے تھے۔

سڑک پار کراتے وقت دو ایک مرتبہ ہم ٹکرا بھی گئے تھے ایک مرتبہ وہ لڑکھڑا گئی تو اسے سنبھالنے کے لیئے مجھے اس کی نازک سی کمر میں ہاتھ ڈالنا پڑا۔ سڑک پار کرنے کے بعد اس نے ساڑھی کا پلو سینے اور شانے پر درست کیا تو اس کی مرمریں بانہیں خنجر کی طرح میرے دل میں اتر گئیں۔ میرا دل اس سے جدا ہونے کو نہیں چاہ رہا تھا میں نے دل کڑا کر کے اسے چائے پینے کی دعوت دی تو اس نے بغیر کسی تامل کے قبول کر لی۔ یہ میرے لیے اعزاز تھا ہم دونوں ایک ریسٹورنٹ میں بہت دیر تک بیٹھے باتیں کرتے رہے میں اس کا چاند سا چہرہ اور اس کی جادو بھری آنکھوں میں کھویا رہا اس کی باتیں بڑی دلکش تھیں جب ہم دونوں اٹھے اور باہر آئے اور میں اس سے دوبارہ ملنے کے بارے میں پوچھنا چاہ رہا تھا کہ میری نگاہ معاً اس کے ہاتھ پر پڑی۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ اس سے پہلے میں اس کے ہاتھ کی انگلی میں جو انگوٹھی تھی دیکھ نہ سکا تھا۔ وہ منگنی کی انگوٹھی تھی۔ وہ انگوٹھی نہیں تھی خنجر تھا جو میرے دل میں اتر گیا تھا۔ میں باوجود کوشش کہ اسے نہ بھلا سکا۔ وہ دن جب بھی یاد آتا تھا مجھے ایسا محسوس ہوتا جیسے وہ میری زندگی کے ناقابل فراموش لمحات تھے۔

چار برس بیت گئے میں اپنے اس اسپتال میں اسسٹنٹ سرجن کے عہدے پر فائز ہو گیا۔ میرے دل میں جو خدمت کا جذبہ تھا وہ بدرجہ اتم موجود تھا۔ بعض اوقات ایسے ایمرجنسی کیس آتے تھے کہ مجھے رات دیر تک رکنا پڑتا تھا۔ مجھے اسپتال کی طرف سے جو مکان ملا تھا وہ اسپتال سے دس منٹ کی مسافت پر تھا میں گھر پہنچا میری بیوی گھر پر نہیں تھی وہ میکے گئی ہوئی تھی...... وہ مجھ سے ناراض ہو کر چلی گئی تھی اسے میرا دیر سے گھر آنا اور اسپتال میں زیادہ وقت دینا زہر لگتا تھا۔ حالانکہ وہ نرس رہ چکی تھی اس کی اور میری لو میرج تھی۔ میں نے شادی سے قبل اس سے کہہ دیا تھا کہ میں اپنے کام میں دخل اندازی بالکل بھی پسند نہیں کروں گا اس نے کہہ دیا کہ میں ذرا بھی دخل نہیں دوں گی لیکن اس نے ازدواجی زندگی تلخ بنا دی۔

میں چونکہ بے حد تھکا ہوا تھا اور کافی کی طلب ہو رہی تھی اس لیے میں کچن میں چلا گیا۔ میں نے کافی بنائی۔ میں دو ایک گھونٹ حلق سے اتار رہا تھا کہ اطلاعی گھنٹی بجی۔ بعض مریض مجھے اسپتال میں نہ پا کر میرے گھر کا رخ کرتے تھے۔ نہ جانے کون بدنصیب تھا جسے اس وقت میری خدمات کی ضرورت تھی۔ میں نے دروازہ کھولا ایک جواں سال عورت دروازے میں کھڑی تھی۔ ملگجی روشنی میں تھی وہ بالکل

سفید برق لباس میں ملبوس تھی اس لباس میں وہ ایک دلہن کی طرح لگ رہی تھی میں نے اس سے پوچھا "کیا مریض اسپتال میں ہے؟ آپ نے اسٹاف سے کیوں نہیں کہہ دیا وہ مجھے بلا لیتے......"

اس عورت نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔ وہ مسکراتی ہنستی ہوئی میرے قریب سے ہو کر اندر داخل ہوگئی پھر کرسی پر جا بیٹھی۔ یہ کمرہ نشست گاہ تھا اس کے بیٹھنے، دیکھنے اور مسکرانے کا انداز بڑا دل فریب اور قیامت خیز تھا سینے پر اس کے بنفشہ پھولوں کا ایک گچھا لٹک رہا تھا۔

روشنی میں اسے دیکھا تو میری حیرت اور خوشی کی انتہا نہ رہی یہ وہ تھی۔ میں نے اسے پہچان لیا یہ وہی تھی جسے میں نے چار برس پہلے سڑک پار کرائی تھی۔ جسے میں آج تک بھول نہ سکا تھا آج بھی اس کے حسن میں وہی تابانی تھی۔ مسحور کن حسن...... وہی پیاری نیلی آنکھیں...... خدوخال ... وہی جذبات کو بھڑکانے والا سراپا...... میں نے سوچا کہ اس سے کہوں کہ تمہیں پہچان لیا ہے لیکن میں کسی خیال کے زیر اثر خاموش رہا۔

"ڈاکٹر ڈیوڈ!...... آپ نے مجھے پہچان لیا ہوگا۔ مجھے وہ دن آج بھی اسی طرح یاد ہے جیسے کل کی بات ہو۔"

"جی ہاں، میں نے آپ کو پہچان لیا ہے۔" میں نے بڑی سنجیدگی سے جواب دیا۔ میں اب چوں کہ شادی شدہ تھا اس لیے اس سے فری ہونا اور رسم بڑھانا نہیں چاہتا تھا۔

وہ خود بھی بے حد سنجیدہ ہو کر بولی "ڈاکٹر! میں اتنی رات آکر آپ کا وقت لینے اور پریشان کرنے پر معافی چاہتی ہوں۔ میں جانتی ہوں کہ آپ اس وقت بہت تھکے ہوئے بھی ہیں لیکن میں کیا کروں؟ میں اپنی خود غرضی اور شوہر کی وجہ سے آپ کو تکلیف دینے کے لئے آگئی ہوں۔ میں کس قدر پریشان اور الجھن میں مبتلا ہوں بتا نہیں سکتی۔ اصل بات یہ ہے کہ میرے شوہر سخت بیمار ہیں۔ تھوڑی دیر پہلے انہیں دل کا دورہ پڑا تھا اس وقت وہ بے ہوشی کی حالت میں پڑے ہوئے ہیں۔ میری آپ سے التجا ہے کہ ابھی اور اسی وقت جاکر انہیں دیکھ لیں۔ ان کے گھر کا پتا نوٹ کرلیں۔

پھر اس نے توقف کر کے مجھے کالک اسٹریٹ کے ایک مکان کا نمبر اور پتہ پتا بتایا۔ وہ مکان میرے مکان سے زیادہ دور نہیں تھا۔

"پتا بتانے کی کیا ضرورت ہے۔ آپ میرے ساتھ چلیں میں اسی وقت آپ کے ساتھ چل رہا ہوں۔" میں نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

"میں کسی وجہ سے آپ کے ساتھ چلنے سے قاصر ہوں" اس نے جواب دیا "میں اپنے شوہر سے کچھ عرصے سے الگ رہ رہی ہوں ہم دونوں کے درمیان نفرت کی دیوار کھڑی ہوگئی ہے ان کے نزدیک میرا قصور ناقابل معافی ہے اس کے باوجود میں چاہتی ہوں کہ وہ زندہ رہیں بچ جائیں۔"

میں نے اپنا بریف کیس کھول کر اس کا جائزہ لیتے ہوئے اس سے کہا "آپ کے شوہر کو آپ سے کتنی ہی نفرت کیوں نہ ہو اس وقت آپ کا ان کے پاس رہنا اشد ضروری ہے کیونکہ انہیں دل کا دورہ پڑا ہے ایسی حالت میں آپ انہیں چھوڑ کر چلی آئی ہیں یہ بات غلط ہے۔"

"ڈاکٹر!" وہ مجھے ملتجیانہ نظروں سے دیکھنے لگی "یہ وقت ان باتوں کا نہیں ہے پلیز! جتنا جلد ہو سکے آپ وہاں پہنچنے کی کوشش کریں بڑی نوازش ہوگی۔"

"لیکن ایک بات میری سمجھ میں نہیں آرہی ہے کہ آپ کو اپنے شوہر کی علالت کی خبر اتنی رات گئے کیسے ملی؟ کس نے دی؟ جبکہ آپ الگ رہتی ہیں؟" "دل سے دل کو راحت ہوتی ہے یہ میرے دل کا کہنا ہے میرے دل نے کبھی بھی مجھ سے غلط بیانی نہیں کی یہ میرے دل کی محبت ہے جس نے مجھے آگاہ کیا۔"

"ایسا لگتا ہے کہ آپ کے دل کا مواصلاتی رابطہ شوہر کے دل سے ہے" میں نے کہا۔ پھر میں نے کچھ ضروری ادویات بریف کیس میں رکھ کر بند کیا۔ پھر اس سے کہا "چلیئے...... میں آپ کا حکم بجا لاتا ہوں میں آپ کے دل کے کہنے کے مطابق وہاں جاؤں گا اور پھر میں پہلے آپ کو آپ کے گھر چھوڑ دوں گا۔ اس وقت شہر کی سڑکیں ویران، سنسان اور بے حد خطرناک ہو جاتی ہیں چور، اچکے اور رہزن گھومتے رہتے ہیں آپ ایک جوان عورت ہیں۔"

وہ اس بات کے لئے تیار نہ تھی کہ میں اسے اس کے گھر پر چھوڑ دوں۔ وہ تکرار کے لہجے میں بولی۔ "پلیز! ڈاکٹر! آپ میری فکر نہ کریں کسی بدمعاش کی مجال نہیں کہ وہ مجھ پر ہاتھ ڈالے اور میری ذات پر کوئی آنچ آئے۔ اس وقت آپ کا یہ فرض بنتا ہے کہ جتنا جلد ہو سکے وہاں پہنچیں کیونکہ یہ دل کا معاملہ ہے۔ آپ مجھے میرے گھر چھوڑ کر جائیں گے تو بہت دیر ہو جائے گی کہیں ایسا نہ ہو کہ ان کی طبیعت اور بگڑ جائے۔"

"پھر مجھے خیال آیا کہ کیوں نہ میں اس کا پتا لے لوں تاکہ اسے ٹیلی فون پر یا ذاتی طور پر جا کر اس کے شوہر کی طبیعت سے مطلع کروں۔ اگر وہ میری بیوی کی موجودگی میں خیریت پوچھنے آئی تو میری بیوی اس کے حسن کو دیکھ کر نہ صرف جل جائے گی بلکہ تہمت بھی لگا دے گی۔ میں نے اس سے کہا اچھا آپ مجھے اپنا پتا دے دیں تاکہ میں آپ کو شوہر کی خیریت سے آگاہ کرسکوں آپ کو یہاں تک آنے کی زحمت نہ ہو۔"

"وہ میری بات سن کر معنی خیز انداز سے مسکرا دی پھر بولی چلیے یہ آپ میرا پتا نوٹ کرلیں لیکن میرا پتا معلوم کر کے آپ کو کوئی خوشی نہیں ہوگی۔"

میں نے لیٹر پیڈ اور قلم اٹھا کر اسے دیا اس نے اپنا پتا اور ٹیلی فون نمبر لکھ کر پیڈ واپس کیا تو میں نے اسے دیکھے بغیر میز پر رکھ دیا میں جوتے پہننے لگا اس نے میرا انتظار بھی نہیں کیا باہر نکل گئی۔ میرا خیال تھا کہ وہ باہر میرا انتظار کر رہی ہوگی باہر آیا تو وہ موجود نہ تھی میں نے سڑک پر پہنچ کر اسے متلاشی نظروں سے چاروں طرف دیکھا۔ وہ مجھے کہیں جاتی ہوئی دکھائی نہ دی۔ مجھے یقین نہیں آیا کہ اپنے شوہر کو اس قدر چاہنے والی عورت اس قدر خود غرض بھی ہو سکتی ہے۔ غصہ بھی آیا، میں اس محلے میں کئی بار جا چکا تھا اس لیے پیدل ہی چل پڑا۔

جب میں اس مکان پر پہنچا تو مجھے یہ دیکھ کر نہ صرف حیرت ہوئی بلکہ غصہ بھی آیا پورا مکان اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ کہیں سے بھی روشنی کی جھلک نہیں رہی تھی۔ یہ ناقابل یقین بات تھی کہ ایک شخص پر دل کا دورہ پڑا ہو اور گھر والوں نے اس کا کوئی اثر نہیں لیا اور گھوڑے بیچ کر سو رہے ہیں۔ اس نے شاید میرے ساتھ ایک سنگین قسم کا مذاق کیا تھا جو مجھے اس وقت سخت ناگوار لگا تھا آج یکم اپریل بھی تھا۔

میں نے سوچا کہ کیوں نہ دستک دے کر پوچھ ہی لوں۔ میں نے دروازے پر بڑے زور سے تین مرتبہ وقفے وقفے سے دستک دی۔ تھوڑی دیر کے بعد دروازے کے نیچے سے روشنی جھانکنے لگی پھر آہٹ ہوئی۔ پھر ایک نسوانی آواز نے تحیر زدہ لہجے میں پوچھا۔ کون ہے؟"

میرے جواب دینے سے پیشتر دروازہ کھلا۔ ایک معمر عورت میرے سامنے کھڑی تھی اس کے سر کے سارے بال سفید تھے میں نے کہا "خاتون! میں ڈاکٹر ڈیوڈ ہوں مسٹر ہربرٹ یہاں رہتے ہیں وہ سخت بیمار ہیں۔ ان پر دل کا دورہ پڑا ہے میں ایک خاتون کی اطلاع پر یہاں آیا ہوں۔"

"وہ میرا بیٹا ہے۔ بالکل ٹھیک ہے۔ جس کسی نے بھی آپ کو اطلاع دی اس نے آپ کے ساتھ مذاق کیا ہے" اس عورت نے جواب دیا۔

"اچھا...... ایک منٹ" اتنا کہہ کر وہ اندر چلی گئی مجھے اس کی بیوی پر بہت تکلیف آیا تھوڑی دیر کے بعد وہ عورت آئی تو بدحواس سی تھی اس کا چہرہ متغیر تھا وہ تشویش ناک لہجے میں بولی "واقعی میرا بیٹا......" اس وقت وہ ایک جملہ ہی کہہ نہ سکی۔ اس کی آواز بھرا گئی۔ چند لمحوں کے بعد کمرے میں داخل ہوا تو دیکھا کہ ایک شخص جس کی عمر تیس برس کی ہوگی زمین پر بے ہوشی کی حالت میں پڑا ہوا ہے میں نے اسے اٹھا کر بستر پر لٹایا۔ پھر اس کا معائنہ کیا۔ خطرے والی بات نہ تھی میں نے اسے دو انجکشن دیئے۔ اپنے پاس سے دوا دی۔ پھر اس عورت کو اپنا ٹیلی فون نمبر دیا کہ طبیعت دوبارہ خراب ہونے کی صورت میں مجھے اطلاع دی جائے میں ایمبولنس بھیج دوں گا۔

میں جب اپنے گھر واپس آیا تو میرا پورا گھر بنفشہ پھولوں کی بھینی بھینی خوشبو سے مہک رہا تھا حیرت کی بات تھی پارو جو آئی تھی اس کے سینے میں بنفشہ پھولوں کا گچھا تھا جاتے وقت گر گیا تھا اور اسے خبر بھی نہ ہوسکی تھی۔ میں نے اسے اٹھا کر میز پر رکھ دیا۔

میں دوسرے دن اس کا معائنہ کرنے گیا اس کے کمرے میں دیوار پر ایک بہت بڑے فریم میں ایک تصویر لگی ہوئی تھی یہ پادر کی تصویر تھی وہی مہتاب چہرہ، وہی خوب صورت آنکھیں، وہی تبسم، وہی لباس جسے پہن کر آئی تھی اس تصویر میں بنفشہ کے پھول بھی نظر آ رہے تھے جو تر و تازہ اور مہکتے ہوئے لگ رہے تھے۔ مجھے ایسا لگا یہ اس کی تصویر نہیں ہے بلکہ وہ بذات خود فریم میں موجود ہے۔

مجھے تصویر کو غور سے دیکھتے پا کر ہربرٹ نے کہا ڈاکٹرا یہ میری بیوی پادو کی تصویر ہے جو شادی کے دن کھینچی گئی تھی۔

"جی ہاں...... میں آپ کی پتنی کو پہچانتا ہوں..... ان کے کارن آپ آج زندہ ہیں اور آپ کو ایک نئی زندگی ملی ہے" میں نے کہا۔

"کیا مطلب......؟" ہربرٹ نے اپنی پلکیں جھپکائیں "میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔ آپ میری پتنی کو کب سے اور کیسے جانتے ہیں؟"

میں نے اسے کسی قدر تفصیل سے سارا واقعہ سنایا تو اس کا چہرہ متغیر ہو گیا وہ حیران ہو کر بولا "یہ کیسے ہو سکتا ہے ڈاکٹرا......"

"دنیا میں کیا چیز ممکن نہیں ہے آپ کو اپنی پتنی کی محبت کا احساس کرنا چاہیے اس کے دل نے محسوس کر لیا کہ آپ شدید بیمار ہیں۔"

"لیکن ڈاکٹر ڈیوڈ! میری بیوی کو اس دنیا سے رخصت ہوئے پورا ایک برس ہو رہا ہے۔ یہ بات سب لوگ جانتے ہیں۔"

"وہ سورگ باش ہو چکی ہے؟" میں بھونچکا سا ہو گیا۔ "آپ میری بات کا یقین کریں میرے گھر پر آپ کی پتنی آئی تھی وہ زندہ تھی۔ اس نے یہی لباس پہن رکھا تھا جو اس تصویر میں ملبوس ہے اس کے گلے میں بنفشہ پھولوں کا ہار تھا کل رات جب میں گھر گیا تو میرا پورا گھر ان پھولوں کی خوشبو سے مہک رہا تھا۔ میں نے کوئی خواب نہیں دیکھا ہے میں ایک حقیقت آپ سے بیان کر رہا ہوں۔ اس کے کہنے پر تو میں یہاں آیا ہوں۔"

"مجھے آپ کی کسی بات سے انکار نہیں ہے۔" وہ میری باتوں کو سن کر بولا۔ "اس نے یہ لباس شادی کے روز پہنا تھا اور اس لباس میں اس کی تدفین بھی کی گئی۔ تجہیز و تکفین کے وقت اس کے تابوت میں، میں نے بنفشہ پھولوں کو رکھ دیا تھا اسے یہ پھول اور ان کی خوشبو بہت پسند تھی۔"

وہ اپنی بات ختم کر کے اور اپنی بیوی کو یاد کر کے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ اس نے آنسو تھمنے کے بعد بتایا کہ اس کی بیوی بہت چاہنے والی تھی۔ شوہر پرست تھی، اپنی شدید علالت میں بھی اس کی بڑی خدمت کی تھی۔ ہر طرح سے خیال رکھتا تھا وہ کسی سے جلتی بھی نہیں تھی۔

میں نے گھر آ کر حیرت سے سوچا کہ یہ کیا اسرار ہے۔ میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا پھر مجھے دفعتاً یاد آیا کہ اس نے اپنا پتا اور ٹیلی فون نمبر بھی تو لکھ کر دیا تھا۔ مرے ہوئے لوگوں کے نمبر ٹیلی فون ڈائریکٹری میں نہیں ہوتے ہیں میں نے لیٹر پیڈ اٹھایا۔ اس پر ٹیلی فون نمبر لکھا ہوا تھا میں نے وہ نمبر ملایا۔ تھوڑی دیر تک گھنٹی بجتی رہی۔ جب میں ریسیور رکھنے والا تھا تب کسی نے ریسیور اٹھا لیا اس طرف سے ایک شخص نے سپاٹ لہجے میں کہا یہ عیسائیوں کا قبرستان ہے؟ ہم آپ کی کیا خدمت کر سکتے ہیں؟"

میں نے فوراً ہی ریسیور رکھ دیا اس لیے کہ میں ان سے کیا خدمت لے سکتا تھا۔ اب اس بات میں کسی شک و شبہے کی گنجائش نہیں رہی تھی کہ پادو مر چکی تھی اب اس سے دوبارہ ملاقات نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ ایک روح تھی، مجھے اس قدر صدمہ محسوس ہوا کہ میرا دل پاش پاش ہو گیا۔ پھر مجھے ایسا محسوس ہوا کہ کسی نے مجھے ہمالیہ کی چوٹی سے دھکا دے کر نیچے گرا دیا ہے۔

میں اپنے دل میں کہہ رہا تھا کہ وہ نہیں مری ہے۔ ایسی عورتیں کبھی نہیں مرتیں۔ وہ ان لاکھوں عورتوں کے لئے ہمیشہ زندہ رہے گی جو زندہ رہنے کے باوجود اپنے شریف شوہروں کو چھوڑ دیتی ہیں...... جیسے میری بیوی۔"

عشق بے پرواہ

سیما کاجل



پہلی رات دلہن کے چہرے سے گھونگھٹ ہٹاتے ہوئے بیر بکرم سنگھ پہلا سوال پوچھنا چاہتا تھا کہ وہ لڑکی کون تھی جو لان میں پودوں کو پانی دے رہی تھی

وہ پہاڑی گاؤں زیادہ بلندی پر نہ تھا۔ جس کے قریب سے انڈین بیورو آف مائنز کے انجینئر تانبے کی تلاش میں خیمہ زن تھے۔ یوں بھی وہ پہاڑیاں بالکل خشک تھیں ہریالی نام کی کوئی شے موجود نہ تھی۔

میں تھکا ہارا دوپہر وہاں پہنچا تو خاصی گرمی تھی لیکن شام ہوتے ہی سردی نے اپنا رنگ دکھانا شروع کر دیا۔ ٹین کی چادروں کے بنے ہوئے عارضی کوارٹرز میں ایک کمرہ میں...... اپنے میزبان بیر بکرم کے ٹھاٹ باٹ کا جائزہ لے رہا تھا جس نے جنگل میں منگل بنا رکھا تھا۔ اس عارضی کوارٹر میں بڑھیا قیمتی سامان پینٹنگ، سنگ مرمر کے اسٹیچو، ایرانی قالین اور مٹی کے تیل سے چلنے والا ریفریجریٹر اس کی خاندانی امارت کا اظہار کر رہے تھے ورنہ ایک جیالوجسٹ کی ایسی اوقات نہ تھی۔

خنکی ذرا بڑھنے لگی تو بیر بکرم سنگھ نے ہارٹ ڈرنک کے لئے استفسار کیا میں نے بغیر کسی پس و پیش کے فوراً ہاں کر دی وہ ذرا سی دیر کے لئے اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلا گیا قریب ہی کچن سے لونگ، الائچی، دار چینی وغیرہ کی خوشبو آ رہی تھی مرغ پک رہا تھا اس دور افتادہ مقام پر ایسی دعوت کی امید لے کر میں گھر سے نہیں چلا تھا۔ میری بھوک بڑھ گئی تھی۔

میں سوچ رہا تھا کہ گیسٹ ہاؤس تک جا کر اپنے اٹیچی کیس سے سوئٹر نکال کر لاؤں کہ اتنے میں بیر بکرم سنگھ ایک

شال لیے ہوئے آیا اور کہا کہ میں اسے اوڑھ لوں۔ اس کے پیچھے پیچھے ایک نہایت ہی خوبصورت لڑکی ٹرے میں چاندی کے پیالے اور وہسکی کی بوتل لیے ہوئے آئی جسے دیکھ کر میں بڑے تذبذب میں پڑ گیا کہ اپنی جگہ سے احتراماً اٹھوں کہ نہیں۔ کیونکہ ہیر بکرم سنگھ نے مجھے بتایا تھا کہ اس کی بیگم میکے گئی ہوئی ہے۔

"سوڈا تو یہاں نہیں ملے گا" ہیر بکرم سنگھ نے کہا "گرم پانی پسند کریں گے یا......؟"

"تازہ پانی سے ہی لے لوں گا"

میز پر وہ ٹرے رکھ کر تازہ پانی لینے کے لئے گئی تو ہیر بکرم سنگھ نے مجھ سے کہا "لیلا کھانا بھی بہت اچھا پکاتی ہے اور گھر کو بھی بڑے سلیقے سے رکھتی ہے۔"

میری الجھن کچھ اور بڑھ گئی بکرم اور لیلا کی عمر میں اتنا فرق تھا کہ وہ اس کی بیوی ہو سکتی تھی سالی بھی اور کوئی نزدیکی رشتہ دار بھی...... اپنی ملاقات کی مدت ابھی اتنی مختصر تھی کہ میں ہیر بکرم سے لیلا کے بارے میں کوئی سوال سیدھے طور پر نہیں کر سکتا تھا۔

وہسکی کا دور کافی دیر تک چلتا رہا گلاس ہاتھ میں لیے ہوئے ہونٹوں سے لگائے ہوئے کتنے ہی موضوع زیر بحث آئے مگر لیلا کا ذکر بالکل بھی نہیں ہوا پھر جب چاول پکنے کی بھینی بھینی خوشبو ناک سے ٹکرانے لگی تو ہیر بکرم سنگھ نے کہا۔

"لیلا چاول پکانے میں بھی بہت ماہر ہے اور یہ چاول میں پٹنہ سے اپنے ساتھ لایا تھا...... یہاں تو ناقص چاول ملتے ہیں پکنے کے بعد ایسے ہو جاتے ہیں جیسے خوب بند لے......"

اور جب مزے دار کھانا لگایا گیا تو میں نے دیکھا کہ وہ چاول اتنے لمبے ہو گئے ہیں جتنی لمبی لیلا کی پلکیں تھیں ہیر بکرم کچھ زیادہ ہی پی گیا تھا وہ کھانا کم کھا رہا تھا میز پر ہر چیز گرم ہو کم پہنچ رہی تھی لیلا کو کھانا کھلانے کا بھی عمدہ سلیقہ آتا تھا۔

"اس کیمپ میں مجھ سے بھی بڑے افسر موجود ہیں مگر ہمارے ڈائریکٹر تک جب بھی دورے پر آتے ہیں تو کھانا میرے ہاں ہی کھاتے ہیں" ہیر بکرم سنگھ نے کہا...... اور پھر اس نے اپنی پوری فیملی ہسٹری مزے لے لے کر بیان کرنا شروع کر دی۔

رات گیارہ بجے کے قریب کھانا بھی ختم ہوا اور ہیر بکرم سنگھ کی باتیں بھی...... وہ مجھے گیسٹ ہاؤس تک پہنچانے کے لئے اٹھا تو لیلا جلدی سے اس کا جیسٹر اور ٹارچ لے آئی۔

"کھانا بہت عمدہ پکا ہوا تھا...... بہت لذیذ" میں نے لیلا کی طرف دیکھ کر کہا۔ وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں مسکرائی بہت کم لوگ آنکھوں سے مسکراتے ہیں اور کندھے پر پڑی ہوئی گھنے بالوں کی موٹی سی چوٹی کو اس نے بڑے دلربا انداز سے پشت پر ڈال دیا۔

اگلی صبح ناشتے کے بعد میں اپنی ایک اردو کہانی کا ہندی ترجمہ کر رہا تھا کہ ہیر بکرم سنگھ جیپ لے کر پہنچ گیا میں کاغذات سمیٹنے لگا تو اس نے کہا۔

"انسپکشن سے پہلے ہی رپورٹ تیار کر رہے تھے کیا؟" "نہیں...... اپنی ایک کہانی کا ترجمہ کر رہا تھا"

"تو آپ کہانیاں کیسے لکھ لیتے ہیں......؟" وہ اپنی عمر کے مطابق ہی سوال کر رہا تھا میں نے اسے ٹالنے کی غرض سے کہا۔ "جس کسی سے گھنٹہ آدھ گھنٹہ گفتگو ہو جائے اس پر ایک کہانی لکھ سکتا ہوں۔"

ہیر بکرم سنگھ نے تعجب سے میری طرف دیکھا تو میں نے کہا "اب چاہوں تو آپ کے اوپر بھی ایک کہانی لکھ سکتا ہوں۔"

"میرے اوپر کہانی......؟ میرے اوپر کہانی......" وہ بڑے تحیر سے دہرانے لگا "میرے اوپر کہانی کیسے بن سکتی ہے......؟"

"آج رات رکتا تو کل سویرے وہ کہانی میں پڑھ کر سنا بھی دیتا...... لیکن آج تو مجھے کام بھی ختم کرنا ہے اور پچاس میل کا پہاڑی سفر طے کر کے ریل گاڑی بھی شام تک پکڑنی ہے آیئے اب چلیں......"

جیپ اسٹارٹ کرتے ہوئے ہیر بکرم سنگھ نے ایک بار پھر دبی زبان سے کہا "میرے اوپر کہانی...... آپ نے تو مجھے ڈرا ہی دیا۔"

☆......☆......☆

ہیر بکرم سنگھ بہار کے ایک ایسے زمیندار گھرانے کا چشم و چراغ تھا جس کی زمینداری ختم ہو چکی تھی اب وہ لوگ

گاؤں چھوڑ کر شہر کے اس مکان میں مستقل طور پر آباد ہو گئے تھے جہاں وہ کبھی کبھی چند روز کے لئے آ کر رکتے تھے۔

بکرم کافی زیرک تھا اس نے انجینئرنگ ختم کی اور اپنے خاندانی اثر و رسوخ کے باعث جلد ہی سرکاری ملازمت حاصل کر لی اور پھر ادھر اُدھر سے بہت سے رشتے آنے لگے، بکرم کے والد سب چٹھیاں اس کے پاس بھیج دیتے۔

اسے فیلڈ میں جانے سے پہلے چند ماہ کے لئے پٹنہ میں ٹریننگ حاصل کرنا تھی ایک چٹھی ٹھاکر بلرام کی طرف سے بھی تھی جو پٹنہ میں ہی سکونت پذیر تھے جس دن بکرم کو دفتر میں وہ چٹھی ملی اس شام کو وہ ٹھاکر بلرام سنگھ کی کوٹھی کے سامنے سے گزرا۔ ایک اجنبی کی طرح لیلا ایک دھانی ساڑھی میں ملبوس لان میں پانی دے رہی تھی ذرا سی دیر کے لئے آنکھیں چار ہوئیں مگر دونوں نے آنکھیں جھکا دیں لیلا آنکھیں جھکائے پودوں کو پانی دینے لگی ہیر بکرم سنگھ آنکھیں جھکائے سڑک پر چلتا ہوا اپنے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس نے پلٹ کر دیکھنا مناسب نہیں سمجھا پھر اس نے گھر پہنچ کر اپنے والد کو خط کا جواب تحریر کر دیا اور یہ بھی لکھا کہ وہ جہیز بالکل نہیں لے گا...... کالج کی تعلیم کے دوران اس نے اپنے چند دوستوں کے ساتھ مل کر قسم کھائی تھی کہ وہ اپنی شادی کے موقع پر جہیز نہ لینے کی مثال قائم کر کے اس لعنت کو دور کرنے کی کوشش کرے گا سگائی کی رسم بھی بڑے سادہ طریقے سے سرانجام دی جانی چاہیے۔

لیکن سگائی کے موقع پر اور شادی کے موقع پر بھی ہزاروں روپے فضول فضول باتوں پر خرچ کر دیئے گئے جو بکرم جیسے روشن خیال نوجوان کو بالکل پسند نہیں تھا۔ مگر نقار خانے میں طوطی کی آواز کون سنتا ہے سب لوگ اپنی اپنی خوشی اپنے اپنے طریقے سے منا رہے تھے مگر ایک بات جس پر بکرم اڑا ہوا تھا وہ پوری ہوئی جہیز بالکل نہیں لیا۔

پہلی رات دلہن کے چہرے سے گھونگھٹ ہٹاتے ہوئے ہیر بکرم سنگھ پہلا سوال پوچھنا چاہتا تھا کہ وہ لڑکی کون تھی جو لان میں پودوں کو پانی دے رہی تھی مگر اس سوال کو کسی دوسرے موقع کے لئے اٹھا کر اس نے کہا "پربھا!" پربھا نے شرما کر اپنی آنکھیں اور جھکا لیں۔

ہیر بکرم سنگھ نے اس کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لے کر ملائمت سے دباتے ہوئے پوچھا "پربھا! تم اس شادی سے خوش ہو نا؟"

لب پربھا نے اپنی آنکھیں اٹھا کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے آہستگی سے کہا۔ "بہت خوش......"

اگلے روز بھی وہ اس لڑکی کے بارے میں کچھ پوچھ نہ سکا۔ دن بھر وہ یہی سوچ کر اپنے اوپر جبر کیے رہا کہ دو چار دن کے بعد سسرال جائے گا تو خود بخود پتا چل جائے گا۔

مگر سسرال جاتے ہوئے اس نے راستے میں اس لڑکی کا ذکر چھیڑ ہی دیا پربھا نے اسے کسی قسم کی اہمیت دیئے بغیر ہی بتا دیا کہ اس کے دادا کی شادی نیپال کے ایک راجپوت گھرانے میں ہوئی تھی جہاں سے اس کی دادی دستور کے مطابق جہیز میں باندیاں ساتھ لے کر آئی تھیں۔ یہ لیلا انہی باندیوں کی اولاد میں سے ہے۔ پربھا نے تھوڑا رک کر کہا "لیلا کھانا بہت اچھا پکاتی ہے۔"

سسرال میں قریباً ایک ہفتے کے قیام کے دوران وہ لیلا کے ہاتھ کے بنے ہوئے لذیذ کھانے کھاتا رہا نوکر تو اور بھی تھے لیکن زیادہ تر لیلا ہی بکرم کی خدمت پر مامور تھی۔

روانگی سے پہلے بکرم اور پربھا دادی اماں سے ملنے کے لئے گئے تو دادی نے بکرم کی پیٹھ تھپتھپاتے ہوئے کہا "بیٹے! ہم نے سنا ہے کہ تم نے جہیز بالکل نہیں لیا۔ مگر ہم تمہیں خالی ہاتھ جانے نہیں دیں گے...... بنا جہیز کے شادی ہمیں بالکل بھی اچھی نہیں لگی......"

لیلا، پربھا سے ایک قدم پیچھے کھڑی تھی ہیر بکرم سنگھ نے اس کی طرف دیکھا اور دل کی گہرائیوں میں چھپی ہوئی خواہش سے سر اٹھایا۔ پھر اس نے کہا۔

"دادی صاحبہ! جہاں میری پوسٹنگ ہو رہی ہے وہاں نوکر نہیں ملتے ہیں۔ اگر آپ کچھ دینا ہی چاہتی ہیں تو پھر لیلا کو ساتھ بھیج دیجئے......"

کچھ عرصے بعد یہ بات سامنے آئی کہ لیلا ہیر بکرم سنگھ کی بیوی بن چکی تھی۔

دشت دل

انتخاب: لاریب حسن

دوسری قسط

رائیڈر ہیگرڈ کی بہترین کہانیوں میں سے ایک مشہور و معروف کہانی

اور وہ اپنے مخصوص بھیانک قہقہے لگانے لگا۔

''ہاں میکومیزن اس طرح میں تین دفعہ بچا۔ ایک دفعہ اپنی ان بیویوں کے لئے جنہیں شاکا نے اپنے قبضے میں کرلیا تھا دوسری دفعہ اپنے بچوں کے لئے جنہیں اس نے قتل کروادیا تھا اور تیسری دفعہ اس نام کے لئے جو اس نے ذلیل کرنے کے لئے مجھے دیا تھا اور اس کے بعد میں ڈنگان کا مشیر خاص بن گیا اور ڈنگان سے میں اتنی نفرت کرتا تھا کہ اتنی نفرت میں نے شاکا سے بھی نہ کی تھی کیونکہ وہ شاکا کا ہی روپ تھا حالانکہ اس کی طرح عظیم نہ تھا اور ڈنگان کے انجام سے تو تم واقف ہی ہو میکومیزن کیونکہ تم نے اس جنگ میں حصہ لیا تھا اور میں اس کے بھائی ''ہلا بانگانا'' اور اس کے ساتھیوں کا بھی مشیر تھا میں نے ڈنگان کو اپنے بھائی امرلا بانگانا کو قتل کردینے کا مشورہ دیا اور اسے یہ مشورہ جاما کی بیٹی منکا بالی کے ہونٹوں سے دیا جو ایک بوڑھی شہزادی اور سازاانگولونا کی بہن تھی وہ نمائے روح تھی جس کے سامنے ہر شخص سر جھکاتا تھا میں نے اس کے منہ سے کہلوایا کہ ''زولوؤں'' کی اس زمین پر سرخ بھالے کی حکومت نہیں ہوسکتی کیونکہ میکومیزن یہ ام لا ہانگانا ہی تھا۔ جس نے شاکا کو پہلا بھالا مارا تھا اور اب پانڈا کی حکومت ہے پانڈا سازاانگوکونا کا آخری بیٹا، بیوقوف اور بیوقوف پانڈا لیکن میں نے اپنے انتقام کا ہاتھ روک لیا ہے کیونکہ پانڈا نے میرے اس بچے کو بچانے کی کوشش کی تھی، جسے آخرکار شاکا نے قتل کردیا لیکن پانڈا کے بیٹے ہیں اور وہ ایسے ہی ہیں جیسا کہ شاکا تھا اور ان کے خلاف میں وہی کر رہا ہوں جو میں نے ان سے پہلے والوں کے لئے کیا تھا۔''

''کیوں؟'' میں نے پوچھا۔

''کیوں؟ میکومیزن! اگر میں اپنی پوری داستان تمہیں سنادوں تو تم سمجھ جاؤ گے کہ کیوں اور شاید ایک دن آئے گا جب میں تمہیں سب کچھ بتادوں گا۔''

اور یہاں میں بتادوں کہ اس نے مجھے اپنی پوری داستان سنادی تھی اور بڑی حیرت انگیز داستان تھی وہ لیکن چونکہ اس کا تعلق ہماری موجودہ کہانی سے نہیں ہے اس لئے میں اسے یہاں تحریر کرنا مناسب نہیں سمجھتا۔

''یہ تو میں بھی کہوں گا زکالی'' میں نے کہا کہ شاکا، ڈنگان، ام لا ہانگانا اور دوسرے کچھ اچھے آدمی نہ تھے لیکن ایک سوال اور تم یہ سب باتیں مجھے کیوں سنا رہے ہو حالانکہ جانتے ہو کہ میں خاموش نہ رہ سکوں گا اور یہ کسی ہلکے پیٹ والے کے سامنے دہرادوں گا اور پھر اس سے پہلے کہ نیا چاند ڈوب جائے تمہاری زندگی ختم کردی جائے گی۔''

''اوہو! تمہارا مطلب ہے کہ ایک ہی مہینے میں پانڈا کے ساحر مجھے سونگھ لیں گے اور پھر مجھے قتل کردیا جائے گا۔ لیکن میکومیزن اتنا زمانہ گزر گیا اب تک تو کوئی ایسی بات نہیں ہوئی خیر تو ہے میکومیزن میں یہ باتیں تمہیں اس لئے بتا رہا ہوں کہ تمہارا زولوؤں سے بڑا تعلق رہا ہے اور رہے گا اور اس لئے بھی کہ میں چاہتا

ہوں کہ جب یہ طویل داستان اپنے انجام تک پہنچ جائے تو کوئی اسے لکھ دے اس کے علاوہ میں نے اس لئے بھی تم سے یہ باتیں کہیں ہیں کہ میں ابھی ابھی تمہاری روح سے ملاقات کر چکا ہوں تمہاری روح سفید ہے چنانچہ میں جانتا ہوں کہ تم کسی ہلکے پیٹ والے باتونی شخص کے سامنے یہ باتیں نہ دہراؤ گے۔"

میں نے آگے کی طرف جھک کر اور گھور کر اس کی طرف دیکھا۔

"زکالی کیا انجام ہے اس کہانی کا جس کی طرف تم اشارہ کر رہے ہو! میں نے پوچھا" تم ان لوگوں میں سے نہیں ہو جو ہوا میں ہی چھڑی چلاتے ہیں تمہاری یہ چھڑی آخر میں کس کے سر پر پڑنے والی ہے؟"

"کس کے سر پر؟" زکالی نے بدلی ہوئی آواز میں جواب دیا جو سانپ کی پھنکار سے مشابہ تھی" ان مغرور زلوؤں کے سر پر جو اپنے آپ کو "آسمانوں کی اولاد" کہتے ہیں اور دوسرے قبیلوں کو اس طرح نگل رہے ہیں جس طرح کہ اژدھا بکری کے بچوں اور دوسرے چھوٹے جانوروں کو نگل لیتا ہے اور جب وہ ان سب کو نگل کر موٹا ہوتا ہے تو چیخ کر دنیا سے کہتا ہے کہ دیکھو میں کتنا بڑا ہوں، کتنا عظیم ہوں ہر چیز میرے اندر ہے، میں انڈاونڈے ہوں۔ ان لوگوں میں سے ہوں جنہیں شاکا آماتیغولا کہہ کر خوش ہوتا تھا۔ بچارے طفیلی جو جنگلی سور کھا کر اپنا پیٹ بھرتے ہیں۔

چنانچہ اب میں یہ کر رہا ہوں کہ شکاری کو جنگلی سور کے تیز اور نوکیلے دانتوں کے سامنے ڈال رہا ہوں اور اگر ایسا نہ ہوا تو پھر میں وہ جال بچھاؤں گا کہ کالا شکاری تمہاری قوم کے سفید گینڈے کے کھروں تلے روندا جائے ہاں اگر یہ سفید گینڈا اپنے سر انڈوانڈے سور پر رکھ دے تب بھی میں اسے کالے شکاری کے مقابل لانے سے دریغ نہ کروں گا۔ لو، میں نے تمہیں اپنا راز بھی بتا دیا۔ اور میکومیزن اسی لئے میں اتنی مدت سے جی رہا ہوں اور اس وقت تک نہ مروں گا جب تک کہ یہ واقعات نہیں ہو جاتے اور یہ واقعات ہوں گے میکومیزن ایسا ہوگا ضرور ہوگا۔ میکومیزن! جب وہ بھالا، جس سے اس نے اپنی ماں اور خود میرے عزیزوں کو قتل کیا تھا، شاکا کے جسم میں اتر کر اس کے کلیجے تک پہنچ گیا تھا اس نے، شاکا نے کیا کہا تھا؟ ہاں اس نے امبوپو اور شہزادوں سے کیا کہا تھا؟ یہی کہا تھا اس نے کہ وہ عظیم سفید قاموں کے پیروں کی چاپ سن رہا ہے جو زلوؤں کو کچل کر رکھ دیں گے؟ تو میکومیزن میں یعنی وہ چیز ہے جسے پیدا نہ ہونا چاہئے تھا۔ اس دن تک زندہ رہوں اور جب وہ وقت آئے گا میکومیزن تو ہم دونوں زیادہ دور نہ ہوں گے اور اسی لئے میں نے اپنے دل کی باتیں تم سے کہہ دی ہیں اور تم جانو میں مستقبل میں جہاں تک سکتا ہوں بس...... بس اب میں ان باتوں کے متعلق مزید کچھ نہ کہوں گا جو ہونے والی ہیں کیونکہ اب تک شاید بہت کچھ کہہ چکا ہوں لیکن تم ان باتوں کو نہ بھولنا یا بھول جانا بشرطیکہ بھول سکو کیونکہ میں وقتاً فوقتاً تمہیں یہ باتیں یاد دلاتا رہوں گا اور اس وقت تو خصوصاً یاد دلاؤں گا جب تمہاری قوم کے لوگ زلوؤں سے انڈوانڈے قبیلہ کا انتقام لے چکے ہوں گے۔

اور یہ عجیب آدمی جو میرے سامنے بیٹھا ہوا تھا ایک جوش کے عالم میں اپنا سر ہلانے لگا یہاں تک کہ اس کے بال، جو زلو کاہنوں کی رسم کے مطابق چھوٹی چھوٹی چوٹیوں میں گتھے ہوئے تھے اس کے چہرے پر نقاب کی طرح آ پڑے۔

چند ثانیوں بعد اس نے اپنے بالوں کی اسی نقاب کے پیچھے سے کہنا شروع کیا۔

"تم سوچ رہے ہو میکومیزن کہ سادو کا ان واقعات سے کیا تعلق جو ہونے والے ہیں اس کے متعلق تو یہ ہے کہ سادو کو بھی ان واقعات میں اپنا فرض انجام دینا ہے اور اپنا پارٹ ادا کرنا ہے کوئی بڑا اور اہم پارٹ نہیں بہرحال ہے اور اسی لئے میں نے اسے بانگو کے بھالے سے اسی وقت بچایا تھا جب وہ بچہ تھا میں نے اسے پالا اور بڑا کیا اور سپاہی بنایا۔ لیکن یہ بھی ہے کہ میں جھوٹ نہیں بول سکتا چنانچہ میں نے اسے خبردار کر دیا

ہے کہ اس کی بہتری اسی میں ہے کہ وہ بھالوں کو چھوڑ کر علم کو اپنا لے۔ بہرحال سادو کو بانگو کو قتل کر دے گا جس نے اب پانڈا سے جھگڑا کر لیا ہے اور میکومیزن اس ناٹک میں ایک عورت آئے گی، وہ عورت جس کا نام مامینا ہے اور اسی عورت کی وجہ سے پانڈا کے بیٹوں میں جنگ ہوگی اور اس جنگ سے زلوؤں کو زوال آئے گا کیونکہ وہ جو فاتح ہوگا بڑا ظالم حکمران ثابت ہوگا اور ان پر ایک بڑی اور قوت والی قوم کا غصہ نازل کرے گا اور اس طرح "وہ جسے پیدا نہ ہونا چاہئے تھا" اور انڈوانڈے اور کابیز اور ٹیٹو قبائل کا انتقام زلوؤں سے لیا جائے گا۔ ہاں میکومیزن میری روح مجھ سے باتیں کہہ رہی ہے اور یہ جھوٹ نہیں ہو سکتا۔"

اور میرے دوست اور تمہارے منہ بولے بیٹے سادو کو کا کیا انجام ہوگا؟ میں نے پوچھا۔

تمہارا دوست اور میرا منہ بولا بیٹا سادو کو وہ راستہ لے گا جو اس کے لئے مقرر ہو چکا ہے جیسا کہ تمہارے اور میرے لئے مقرر ہو چکا ہے اس کے علاوہ اور کر بھی کیا سکتا ہے کیونکہ اس نے اسی راستے کی خواہش کی تھی اور اپنے لئے یہی راستہ منتخب کیا ہے۔ چنانچہ وہ اسی راستے پر چلے گا اور اپنا وہ پارٹ ادا کرے گا جو "عظیم...... عظیم" نے اس کی قسمت میں لکھ دیا ہے بس اس سے زیادہ معلوم کرنے کی کوشش نہ کرو میکومیزن اور اس کی ضرورت بھی کیا ہے کیونکہ وقت خود اپنی زبان سے تمہیں کہانی سنا دے گا اچھا اب جا کر سو جاؤ میکومیزن کیونکہ مجھے بھی اب آرام کرنا ہے۔ تم جانو میں بوڑھا اور کمزور ہوں اور جب تمہارا جی چاہے تو میرے پاس آ جانا اور ہم مزید باتیں کریں گے اور تب تک یہ یاد رکھنا کہ میں ایک کافر دھوکے باز کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوں جو بظاہر یہ دعویٰ کر رہا ہے کہ وہ ان باتوں سے واقف ہے جن سے کوئی واقف نہیں اور یہ خصوصاً اس وقت یاد کرنا جب تمہاری ملاقات خشک دریا میں چھپے ہوئے سینگ والے بھینسے سے ہو اور اس وقت بھی یاد کرنا جب مامینا ایک خاص پیش کش کرے گی جسے قبول کرنے کے لئے تم بیتاب ہو جاؤ گے شب بخیر اے پاسبان شب جس کا دل سفید اور مقدر عجیب و غریب ہے۔ شب بخیر میکومیزن! اور دیکھو اس بوڑھے دھوکے باز کے متعلق کوئی بری رائے قائم کرنا جس کا لقب ان دونوں راستے کھولنے والا ہے" میرے خادم باہر منتظر کھڑے ہیں وہ تمہیں اس جھونپڑی میں پہنچا دیں گے جو تمہارے سونے کے لئے تیار کی گئی ہے اور اگر تم کل شام تک اوبیزی کے کرال میں پہنچنا چاہتے ہو تو مناسب ہوگا کہ کل علی الصبح روانہ ہو جاؤ۔ کیونکہ یہاں آتے وقت تم نے معلوم کر ہی لیا ہے کہ سادو کو بڑا تیز چلنے والا ہے حالانکہ وہ بیوقوف ہے۔"

چنانچہ میں اٹھ کر جانے لگا لیکن عین اس وقت زکالی کو کچھ اور یاد آ گیا چنانچہ اس نے مجھے واپس بلا کر ایک بار پھر اپنے سامنے بیٹھنے کو کہا۔

"میکومیزن!" وہ بولا میں ایک اور بات کہنا ضروری سمجھتا ہوں۔ جب تم جوان تھے تو رطیف کے ساتھ تم اس علاقے میں آئے تھے کیوں؟

"ہاں، یہ سچ ہے" میں نے [illegible] اور مردہ آواز میں جواب دیا۔

غالباً یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ رطیف اور اس کے ساتھیوں کے قتل عام کے لرزہ خیز واقعہ کو میں بھولنا چاہتا ہوں اور اس کے متعلق گفتگو کرنے سے کتراتا ہوں اور اس کی بھی ایک خاص وجہ ہے لیکن وہ داستان میں نے تحریر کر لی ہے جو اپنے وقت پر چھپ جائے گی حتیٰ کہ میرے دونوں گہرے دوست سر ہنری کرٹس اور کپتان جان گڈ بھی اس داستان سے پوری طرح واقف نہیں ہیں۔

"لیکن زکالی" میں نے کہا "تم ان واقعات کے متعلق کیا جانتے ہو۔"

"وہ سب کچھ میکومیزن جو جاننا ضروری ہے خصوصاً اس لئے کہ بوئروں کے اس قتل عام میں بھی میرا ہاتھ تھا۔"

"ڈنگان نے میرے ہی مشورے سے ان

بوئروں کو قتل کیا تھا جس طرح کہ اس نے میرے ہی مشورے سے شاکا اور ملاہا منگانا کو قتل کیا تھا"

"تم! پتھر دل بوڑھے خونی......" میں نے کہنا شروع کیا لیکن زکالی نے میری بات کاٹ دی۔

میکومیزن! تم مجھے گالیاں کیوں دے رہے ہو؟ کیوں ہوں میں پتھر دل؟ کیوں ہوں میں خونی؟ کیا اس لئے کہ میں نے ان چند سفید فاموں کو قتل کروادیا جو اتفاقاً تمہارے دوست تھے اور ہم بھولے بھالے اور جاہل سیاہ فاموں کو دھوکا دینے آئے تھے؟"

"تو کیا محض اسی لئے تم نے ڈنگان کے ذریعہ انہیں قتل کروادیا تھا؟ صرف یہی ایک وجہ تھی؟" میں نے پوچھا اور گھور کر اس کی طرف دیکھا کیونکہ میرے خیال میں اس وقت وہ بوڑھا میرے سامنے جھوٹ بول رہا تھا۔

"نہیں میکومیزن! صرف یہی ایک وجہ نہ تھی" زکالی نے جواب دیا اور اپنی نظریں جھکالیں وہ حیرت انگیز آنکھیں جو پلک تک جھپکے بغیر سورج کی طرف دیکھ سکتی تھیں جھکالیں وہ حیرت انگیز آنکھیں جو پلک جھپکے بغیر سورج کی طرف دیکھ نہیں سکتی۔

"تو پھر دوسری وجہ کیا تھی؟"

میں نے کہا کیں کہ مجھے سازاکوکونا کے پورے گھرانے سے نفرت ہے؟ اور جب رطیف اور اس کے ساتھ کل کردیئے گئے تو ان کا بے وجہ خون بہانے سے سفید فاموں اور زولوؤں کے درمیان وہ جنگ شروع نہ ہوگئی جس کا خاتمہ سفید فاموں یا زولوؤں کے کسی ایک کے مکمل ترین خاتمے پر ہوسکتا ہے؟ ان کا قتل ڈنگان اور ہزاروں آدمیوں کی موت کا سبب نہ بنا میکومیزن؟ اور یہ موت کے ایک طویل سلسلے کی پہلی کڑی ہے اب سمجھے میکومیزن؟"

"میں تو صرف یہ سمجھا ہوں زکالی کہ تم بے حد عیار بوڑھے ہو" میں نے غصے اور نفرت سے کہا۔

"کم سے کم تمہیں تو ایسا نہیں کہنا چاہئے میکومیزن" زکالی نے ایک نئے لہجے میں کہا جس میں سچائی کی جھلک تھی۔

"کیوں؟ نہیں کہنا چاہئے؟"

"اس لئے کہ اس دن میں نے تمہاری جان بچائی تھی۔ ان سفید فاموں میں سے تنہا تم اپنی جان بچا کر لے جاسکے تھے یاد ہے نا تمہیں؟ اور تم اب تک سمجھ نہیں سکتے کہ میں نے کیوں تمہاری جان بچائی تھی۔"

"ٹھیک ہے زکالی میں آج تک یہ بات سمجھ نہیں سکا میں نے اسے اپنی قسمت کا ایک کرشمہ سمجھا تھا اور اب بھی سمجھتا ہوں۔"

"بہت اچھا میں بتاتا ہوں تمہاری وہ قسمت یا روح میرا لبادہ پہنے ہوئے تھی" اور وہ ہنسا "میں نے تمہیں بوئروں کے ساتھ دیکھا اور یہ بھی دیکھا کہ تم بوئر نہیں ہو بلکہ دوسری قوم میں شاہی ہو کہ اس وقت میں شاہی گھرانے کا مشیر خاص اور وچ ڈاکٹر تھا۔ یہ اور بات ہے کہ میں تم سے دور رہا اور ہماری ملاقات نہ ہوسکی یا یوں کہو کہ تمہیں کبھی معلوم نہ ہوا کہ ہماری ملاقات ہوئی ہے کیونکہ اس وقت تم سو رہے تھے۔ اس کے علاوہ مجھے تمہاری جوانی پر رحم آ گیا شاید تم یقین نہ کرو گے لیکن ان دنوں میرا دل ذرا نرم تھا اس کے علاوہ میں یہ بھی جانتا تھا کہ آنے والے برسوں میں ہماری ملاقات ہوگی اور ہم ایک دوسرے کے قریب آجائیں گے اور تم دیکھ رہے ہو کہ آج ہماری ملاقات بھی ہوئی ہے اور ہم ایک دوسرے کے قریب آ گئے ہیں اور آئندہ بھی ایسا ہوتا رہے گا اس وقت تک جبکہ سازاکوکونا کے گھرانے کی تباہی مکمل نہیں ہوجاتی۔ جب تک کہ یہ داستان انجام تک نہیں پہنچ جاتی چنانچہ میں نے ڈنگان کے آدمیوں کو (یعنی انگریزوں کو) زولوؤں پر چڑھالاؤ گے اور وہ ڈنگان سے اور زولوؤں سے تمہارے خون کا بدلہ لیں گے اور یہ کہ تمہاری روح اس کے یعنی ڈنگان کے جسم میں حلول کرجائے گی اور اسے پریشان کرتی رہے گی اور اسے بددعا دے گی چنانچہ ڈنگان نے میری بات مان لی اور اس بیوقوف کی سمجھ میں اتنی سی بات نہ آئی کہ اس کے سر پر بہت سی بددعائیں بہت سی آہیں اور بہت سی لعنتیں منڈلا رہی تھیں چنانچہ ان میں ایک کے اضافے

سے کوئی فرق نہ پڑ جائے گا چنانچہ تمہیں بوئروں کے ساتھ قتل نہ کیا گیا میکومیزن اور تم بھوت بنے بغیر ہی ڈنگان پر لعنت برسانے اور تباہی لانے میں معاون ثابت ہوئے اور یہی وجہ ہے کہ میکومیزن کہ آج پانڈا تمہیں پسند کرتا ہے۔ پانڈا جو خود اپنے بھائی ڈنگان کا سخت ترین دشمن تھا اور ہے وہ عورت تمہیں یاد ہے جس نے تمہاری مدد کی تھی، یقین کرو میکومیزن وہ میری فرستادہ تھی تو پھر میکومیزن بعد میں تمہاری اور اس خوبصورت بوئر لڑکی کی کیسی گزری جس کے ساتھ تم ان دنوں محبت کرتے تھے؟"

"جیسی بھی گزری ہو اس سے تمہیں کیا؟" میں نے جواب دیا اور اٹھ کر کھڑا ہوا کیونکہ اس بوڑھے کاہن کی باتوں نے میری غمناک یادیں تازہ کردی تھیں "وہ زمانہ مرگیا زکالی"

"مرگیا میکومیزن؟ لیکن تمہارے بشرے سے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ زمانے اب بھی زندہ ہے۔ بہت زیادہ زندہ ہے اسی طرح جس طرح کہ وہ واقعات اپنے طور پر زندہ ہیں جو تمہاری جوانی میں ہوئے تھے۔ لیکن شاید میرا خیال غلط وہ سب کچھ اسی طرح کہ تمہارے دوسرے ساتھی مرچکے ہیں۔ کم سے کم یہ سوچ ہے کہ میکومیزن کہ اس خونی دن میں نے، ہاں میں نے تمہاری جان بچائی تھی۔ اب چاہے تم یقین کرو یا نہ کرو اور تمہاری جان میں نے ایک خاص غرض سے بچائی تھی۔ اب تمہارا جی چاہے تو مجھے خود غرض کہہ سکتے ہو۔ اچھا اب جا کر سو رہو حالانکہ تمہاری پرانی یادیں تازہ ہوگئی ہیں لیکن میں وعدہ کرتا ہوں کہ تم گہری نیند سوؤ گے"

اور اس نے اپنے چہرے پر سے بالوں کی نقاب ہٹائی، میری طرف دیکھا اور اپنا سفید سر ہلا کر قہقہہ لگایا۔

"جاؤ میکومیزن جاؤ۔"

اور میں زکالی کی جھونپڑی سے باہر آیا تو رو رہا تھا۔

اب اگر آپ نے میری ان دنوں کی داستان (شہید وفا) پڑھی ہے تو آپ سمجھ سکتے ہیں کہ میں کیوں رو رہا تھا۔ لیکن میری اس پہلی محبت کی اور ان سنسنی خیز واقعات کی جو ڈنگان کی زمانے میں ہوئے تھے کہانی بیان کرنے کا نہ یہ وقت ہے اور نہ موقع۔

جیسا کہ زکالی نے کہا تھا اس رات میں سکون کی گہری نیند سویا غالباً اس لئے کہ میں بہت زیادہ تھکا ہوا تھا اور نیند تھی کہ برکھا کے بادلوں کی طرح امڈی چلی آرہی تھی لیکن دوسرے دن اوبیزی کے کرال تک کے پیدل اور طویل سفر میں بہت کچھ سوچتا رہا۔

بے شک وشبہ میں نے بہت سی عجیب باتیں دیکھی اور سنی تھیں۔ وہ باتیں جن کا تعلق ماضی سے تھا اور حال سے تھا اور جنہیں میں ذرا بھی سمجھ نہ سکا تھا اس کے علاوہ زولوؤں کی بلند پالیسی سے متعلق تھیں اور ان واقعات پر ایک نئے رخ سے روشنی ڈال رہی تھیں جو میری جوانی میں نہ صرف میرے ساتھ بلکہ دوسروں کے ساتھ بھی ہوئے تھے۔

اور اب دن کی روشنی میں ان تمام باتوں کے تجزیہ کرنے کا موقع تھا اور یہی میں کر رہا تھا اور ان کا تجزیہ میں حتی الامکان منطقی نقطہ نظر سے کر رہا تھا یہاں میں یہ بتادوں کہ اس سلسلے میں سادو کو ذرا بھی معاون ثابت نہ ہو رہا تھا کیونکہ جب میں اس سے کوئی سوال پوچھتا وہ خاموشی سے اپنے شانے اچکا دیتا۔

ان [illegible] ت سے، اس نے کہا، اسے کوئی دلچسپی نہ تھی، اس نے کہا کہ میں زکالی کا جادو دیکھنا چاہتا تھا اور زکالی نے مجھے میرے سامنے اپنے بہترین جادو کا مظاہرہ کردیا تھا اس کے علاوہ بعد میں اس نے مجھ سے تنہائی میں بھی باتیں کی تھیں۔ اور یقیناً یہ باتیں بڑی اہم تھیں اور بڑے اہم مسائل کے متعلق تھیں چنانچہ اسی لئے اسے یعنی سادو کو، اس گفتگو میں شریک نہ کیا گیا تھا اور یہ وہ شرف تھا یعنی زکالی سے تنہائی میں کرنے کا جو کسی خوش نصیب کو ہی حاصل ہوتا تھا۔ چنانچہ سادو کو کہا میں اپنے طور پر ہی ان باتوں کے متعلق کوئی نتیجہ اخذ کرلوں۔

میں نے چڑ کر جواب دیا کہ بے شک میں آخری اور صحیح نتیجہ اخذ کرسکتا ہوں کیونکہ سادو کو کے لہجے نے

مجھے غصہ دلادیا تھا سچ تو یہ ہے کہ سادوکو کو یہ بات بہت بری معلوم ہوئی تھی کہ اسے بچے کی طرح سونے کے لئے بھیج دیا گیا تھا جبکہ اس کا رضاعی باپ تنہائی میں اور رات گئے تک مجھ سے باتیں کرتا رہا تھا۔ سادوکو کی سب سے بڑی کمزوری یہ تھی کہ وہ ایک حد تک خود پسند تھا اور اپنے آپ کو بہت زیادہ عقلمند سمجھتا تھا اس کے علاوہ وہ فطرتاً خوفناک حد تک حاسد تھا۔ حتیٰ کہ معمولی معمولی معاملات میں بھی اس کی یہ خصوصیت نمایاں ہو جاتی تھی لیکن اس کے متعلق یہاں کچھ کہنا فضول ہے کیونکہ اس کہانی کے مطالعہ کے دوران قاری خود بخود اسی کی اس خصوصیت یا کمزوری سے واقف ہو جائیں گے۔

چنانچہ ہم کئی گھنٹوں تک خاموشی سے چلتے رہے اور اس خاموشی کو آخرکار سادوکو نے توڑا۔

"انکوسی! کیا اب بھی تم اوبیزی کے ساتھ شکار پر جانا چاہتے ہو؟" یا اب تم خوفزدہ ہو گئے ہو؟"

"خوفزدہ؟ میں کس سے خوفزدہ ہونے لگا؟" میں نے خفا ہو کر پوچھا۔

"اس بھینسے سے جس کا سینگ ٹوٹا ہوا ہے اور جس کے متعلق زکالی نے بتایا ہے" سادوکو بولا۔

اور اب میں اس بھینسے کو گالیاں دینے اور اسے برا بھلا کہنے لگا اور میں نے کہا کہ مجھے اس بھینسے کے وجود کا سرے سے یقین ہے ہی نہیں پھر وہ خشک ندی میں اور اس میں پانی کے گڑھے کے قریب ہو یا کہیں اور "اب اگر تمہیں اس بوڑھے کی باتوں نے خوفزدہ کردیا ہو" میں نے کہا تو بے شک تم اوبیزی کے کرال میں ماینا کے پاس جا کر بیٹھ جاؤ"

"میں کیوں خوفزدہ ہونے لگا میکومیزن؟ زکالی نے یہ تو نہیں کہا کہ وہ بدروح والا بھینسا مجھے زخمی کردے گا یا کوئی اور نقصان پہنچائے گا اب اگر مجھے خوف ہے تو تمہاری طرف سے ہے کیونکہ اگر تم زخمی ہو گئے تو پھر تم میرے ساتھ بانگو کے مویشیوں کی تلاش میں نہ چلو گے۔

"آ..... ہاں" میں نے تلخی سے کہا تو معلوم ہوا سادوکو کہ تم خودغرض بھی ہو کیونکہ تم اپنے فائدے کے متعلق سوچ رہے ہو اور تمہیں اس کی پرواہ نہیں کہ میرے ساتھ کیا واقعہ ہوتا ہے اور کیا نہیں ہوتا"

"انکوسی! اگر میں اتنا ہی خودغرض ہوتا" جتنا کہ تم نے مجھے سمجھ رکھا ہے تو کیا میں تمہیں اپنے چھکڑوں کے ساتھ رک جانے کا مشورہ دیتا؟ کیونکہ تم جانو میرے اس مشورے سے خود مجھے بھی نقصان ہے کہ اس طرح مجھے وہ بندوق نہ ملے گی جو تم نے دینے کا وعدہ کیا ہے لیکن یہ بھی سچ ہے کہ میں اوبیزی کے کرال میں ماینا کے ساتھ بیٹھنا پسند کروں گا خصوصاً اس وقت جب وہ لالچی اوبیزی کہیں گیا ہوا ہو اور بہت دنوں تک کرال میں واپس آنے والا نہ ہو"

اب یہ تو آپ بھی جانتے ہوں گے کہ دوسروں کے عشق و عاشقی کے قصے سننے سے زیادہ بیزارکن چیز دنیا میں اور کوئی نہیں ہے اور مجھے احساس تھا کہ اگر میں نے ذرا سے ڈھیل دی تو سادوکو ماینا سے اپنی محبت کی داستان شروع سے پھر سنانے لگ جائے گا چنانچہ میں نے اس بحث کو یہیں ختم کر دینا مناسب سمجھا۔

چنانچہ ہم نے بقیہ راستہ خاموشی سے طے کیا اور سورج غروب ہونے کے کچھ ہی دیر بعد اوبیزی کے کرال میں تھے وہاں پہنچے تو معلوم ہوا کہ ماینا اب تک واپس نہ آئی تھی۔ غالباً یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اس خبر سے ہم دونوں کو سخت مایوسی ہوئی۔

دوسرے دن ہم شکار کے لئے روانہ ہو گئے اور اس پارٹی میں یہ لوگ تھے ایک تو میں خود، دوسرا میرا خادم سکاؤل جس کے متعلق شاید میں بتا چکا ہوں کہ نصف ہاٹنٹوٹ تھا اور جسے میں نے کیپ ٹاؤن سے ساتھ لیا تھا۔ تیسرا سادوکو، چوتھا خوش طبع زولو بوڑھا اوبیزی اور اس کے کرال کے چند آدمی جو بار برداروں اور ہانکا کرنے والوں کی خدمات انجام دینے والے تھے۔

ہمارا یہ سفر بے حد کامیاب اور منافع بخش رہا۔ میرا مطلب ہے اس کے انجام سے کچھ پہلے تک...... کیونکہ اس زمانے میں افریقہ کے اس حصے میں شکار کثرت سے تھا دوسرے ہفتے کے اختتام تک میں چار ہاتھی مار چکا تھا

جن میں سے دو کے دانت خاصے بڑے اور شاندار تھے لدھر سادو کو نے جو بہت جلد ایک اچھا نشانے باز بن گیا تھا اس دو نالی بندوق سے ایک اور ہاتھی مار گرایا جو میں نے اسے دینے کا وعدہ کیا تھا اوبیزی نے بھی ایک مناسب دانتوں والی ہتھنی کا شکار کر لیا تھا اور اس کا یہ کارنامہ کسی صورت معجزے سے کم نہ تھا کیونکہ اس نے اس ہتھنی کا شکار اس بندوق سے کیا تھا جو میں نے اسے دی تھی جو اپنے آپ چلی جاتی تھی اور جو قارئین بھولے نہ ہوں گے اس کی بیوی کے کان کا اوپر کا حصہ اڑا گئی تھی۔

چنانچہ اوبیزی اپنے اس کارنامے سے اتنا خوش ہوا کہ میں نے پہلے کبھی کسی سیاہ فام اور سفید فام کو بھی اتنا خوش نہ دیکھا تھا پورے ایک گھنٹے تک وہ ناچتا، گاتا، نسوار سونگھتا، سلام کرتا اور مجھے بار بار اپنے اس کارنامے کی داستان سناتا رہا اور اس کا ہر بیان اپنے پہلے بیان سے اور ہر تفصیل پہلی تفصیل سے قطعی مختلف ہوتی تھی ساتھ ہی خود اس نے اپنے آپ کو ایک نئے لقب سے نواز دیا جس کے معنی تھے ”ہاتھیوں کو کھا جانے والا“ پھر اس نے اپنے آدمی سے کہا کہ وہ اس کی یعنی اوبیزی کی سان میں ”بونگا“ کہے (یعنی اس کی مدح میں گیت گائے) چنانچہ اس کا وہ آدمی ساری رات ”بونگا“ کہتا رہا اور اوبیزی نے ہم سے کسی کو بھی رات بھر سونے نہ دیا یہاں تک کہ اوبیزی کا بونگا کہنے والا تھک کر ایسا نڈھال ہوا کہ باقاعدہ بے ہوش ہو کر دھڑام سے گر پڑا۔ یہ پورا سلسلہ بے حد دلچسپ تھا لیکن آخر میں اس سے اکتانے لگا کیونکہ آپ جانئے ہر بات اور ہر چیز اپنی حد میں اچھی لگتی ہے۔

ہاتھیوں کے علاوہ ہم نے دوسرے بھی بہت سے جانور شکار کیے جن میں دو شیر بھی شامل ہیں یہ دونوں شیر میرے دائیں بائیں سے تقریباً ایک ساتھ نکل آئے تھے اور میں نے بڑی پھرتی سے دائیں بائیں گھوم کر ان دونوں کو مار گرایا تھا۔ ان کے علاوہ تین سفید گینڈے جو افریقہ سے ناپید ہو چلے ہیں۔

قصہ مختصر ہفتے کے آخر تک ہمارے پاس اتنا ہاتھی دانت، گینڈوں کے سینگ، چوپایوں کا سوکھایا ہوا گوشت وغیرہ جمع ہو چکا تھا کہ ہمارے باربردار اسے آسانی سے اٹھا سکتے تھے چنانچہ ہم نے دوسرے دن اوبیزی کے کرال کی طرف روانہ ہونے کا فیصلہ کیا اور سچ تو یہ ہے کہ ہم اپنی واپسی کے سفر کو اور چند دنوں کے لئے ملتوی نہ کر سکتے تھے کیونکہ ہماری بارود اور گولیوں کا ذخیرہ قریب الختم تھا یہاں میں یہ بتا دوں کہ ان دنوں وہ بندوقیں ایجاد نہ ہوئی تھیں جن میں کارتوس بھرے جاتے ہیں چنانچہ گولیاں اور بارود شکاریوں کو بکسوں میں ساتھ لے کر چلنا پڑتا تھا۔

سچ تو یہ ہے کہ میں اس خیال سے بے حد خوش تھا کہ ہماری یہ مہم بخیر و خوبی ختم ہو گئی تھی حالانکہ میں اپنے آپ سے بھی اقرار کرنے کے لئے تیار نہ تھا لیکن دل ہی دل میں اس خیال سے قدرے خوفزدہ ضرور تھا کہ کہیں اس پھٹے ہوئے سینگ والے بھینسے کی پیشگوئی جو بوڑھے بونے نے کی تھی سچ ہی نہ ہو اور بدقسمتی میرے لئے گھات لگائے بیٹھی ہو۔

لیکن شکر ہے کہ اس پوری مہم میں ہمیں کسی جگہ ایک بھینسا بھی بلکہ اس کی جھلک بھی نظر نہ آئی تھی اور پھر چونکہ ہم جس راستے سے واپس جانے والے تھے وہ بلند اور بنجر علاقے سے گزر رہا تھا اور ایسی جگہ بھینسے ہوتے نہیں چنانچہ واپسی کے سفر میں بھی کسی بھینسے کے ملنے کی کوئی امید نہ تھی چنانچہ میں نے سوچا کہ ان لوگوں کے ایمان کمزور ہوتے ہیں جو اس قسم کی اوٹ پٹانگ پیشگوئیوں میں یقین رکھتے ہیں اور یہ کہ کافر وچ ڈاکٹر کی پیشگوئیاں تو سراسر ایک فریب ہیں۔ یہ لوگ نہ صرف کافروں کو الو بناتے بلکہ خود اپنے آپ کو بھی دھوکہ دیتے ہیں۔ مطلب یہ کہ زکالی بھی اسی طرح کا ایک خود فریب کافر تھا غالباً یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ ہمارے شکار کے آخری دن کی رات کو سونے جانے سے پہلے میں نے اپنے خیالات کا اظہار سادو کو کے سامنے بھی کر دیا اور بڑے طنزیہ انداز میں۔

سادو کو سر جھکائے سنتا رہا اور اس نے کچھ نہ کہا ایک لفظ تک نہ کہا اور اگر کہا تو صرف یہ کہ چونکہ میں یعنی ایلن کوائر میں تھک گیا ہوں اس لئے اب مجھے جا کر سونا چاہئے۔

اب میں یہ نہیں جانتا کہ اس کی وجہ کیا ہے لیکن میرا تجربہ یہ ہے کہ کسی بھی بات کے متعلق ڈینگ ہانکنا حماقت سے کم نہیں کم سے کم شکار کی مہم میں تو قطعی نہیں بلکہ آپ کو اس وقت تک خاموش رہنا چاہئے جب تک کہ آپ بخیر و خوبی اپنے گھر نہیں پہنچ جاتے بہرحال اس قدیم مقولے کا ایک ٹھوس اور بے حد عمدہ ثبوت مجھے اب ملنے والا تھا یہ میرے لئے مقدر ہو چکا تھا۔

جہاں ہمارا پڑاؤ تھا وہ ایک میدان سا تھا جس میں یہاں وہاں جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں اور اس میدان کے سرے پر خشک نرسلوں کا ایک جھنڈ تھا یہ جھنڈ موسم باراں میں یقیناً دلدل بن جاتی ہوگی اور اس دلدل کو اس دلدل کا پانی کمک پہنچاتا ہوگا جو ہمارے کیمپ کے عین سامنے تھا۔

رات کے کسی حصے میں میری آنکھ کھل گئی اور مجھے کچھ شک سا ہوا کہ میں نے نرسلوں میں کچھ بڑے قسم کے جانوروں کے گھومنے کی آواز سنی تھی لیکن دوبارہ چونکہ مجھے کوئی آواز سنائی نہ دی اس لئے میں اسے اپنا وہم سمجھ کر پھر سو گیا۔

پو پھٹنے کے کچھ دیر بعد ایک آواز نے مجھے بیدار کر دیا یہ آواز مجھے پکار رہی تھی آدھے جاگتے اور آدھے سوتے عالم میں میں نے اس آواز کو پہچان لیا یہ اوبیزی کی آواز تھی۔

”میکومیزن! اوبیزی کی آواز نے پھٹی ہوئی سرگوشی میں کہا“ وہ سامنے والے نرسل بھینسوں سے بھرے ہوئے ہیں اٹھو، میکومیزن اٹھو۔

”کیوں؟“ میں نے جواب دیا“ اگر بھینسے نرسلوں میں اپنی مرضی سے آئے ہیں تو اپنی مرضی سے چلے بھی جائیں گے اب ہمیں گوشت کی ضرورت نہیں بہت گوشت ہے ہمارے پاس“

”ہاں میکومیزن ہمیں گوشت کی ضرورت تو نہیں لیکن مجھے ان کی کھالیں درکار ہیں۔“

”کیوں“

”زولوؤں کے بادشاہ پانڈا نے مجھ سے پچاس ڈھالیں طلب کی ہیں اور اپنے بیلوں کو ذبح کیے بغیر میں ڈھالوں کے لئے کھالیں حاصل نہیں کر سکتا اور میکومیزن میرے پاس مویشی پہلے ہی سے کم ہیں اور میکومیزن یہ بھینسے خود ہی نرسلوں میں آ کر پھنس گئے ہیں یہ دلدل میکومیزن ایک منہ والے برتن کی طرح ہے چنانچہ بھینسے دلدل کے اوپر کو اٹھے ہوئے کناروں کی طرف سے تو ظاہر ہے کہ نہیں نکل سکتے اور جس راستے سے وہ نرسلوں میں داخل ہوئے ہیں وہ بے حد تنگ ہے اب اگر ہم دلدل کے اس منہ کے دونوں طرف کھڑے ہو گئے تو جتنے بھینسے چاہیں گے مار لیں گے۔“

اس عرصے میں میں پوری طرح سے بیدار ہو چکا تھا اور اپنے کمبلوں کے بستر میں سے نکل آیا تھا اپنے شانے پر لبادہ ڈال کر میں اس جھونپڑی سے باہر آیا جو عارضی طور پر میرے لئے بنا دی گئی تھی میں میدان عبور کر کے جو سنگلاخ تھا اس کے سرے پر پہنچا میدان سے ذرا نیچے وہی خشک دلدل تھی جس کا ذکر میں اوپر کر چکا ہوں۔

وہاں صبح کی دھند اب بھی منڈلا رہی تھی لیکن اس دھند میں چیخنے و کراہنے اور کھروں کو پٹخنے کی آوازیں آ رہی تھیں میں ایک تجربہ کار شکاری ہوں میری ایک عمر شکار کرتے ہوئے گزری ہے چنانچہ میں نے ان آوازوں کو فوراً پہچان لیا یقیناً بھینسوں کا ایک پورا ریوڑ جس میں ایک سو یا دو سو بھینسے تھے ان نرسلوں میں موجود تھا۔

میں ان نرسلوں کی طرف دیکھ ہی رہا تھا کہ میرا ملازم سکاؤل اور سادو کو بھی وہاں آ گئے دونوں ہی اس وقت بڑے جوش میں تھے دونوں کو شکار کا بخار چڑھا ہوا تھا۔

معلوم ہوا کہ سکاؤل نے جو ہمیشہ بے وقت سوتا اور سونے کے وقت پر جاگا کرتا تھا بھینسوں کو نرسلوں

میں گھستے دیکھا تھا اور ان کی تعداد کا اندازہ دو سو تین سو تک لگایا تھا ادھر سادو کو نے اس شگاف کا معائنہ کیا تھا چنانچہ اس نے بتایا کہ وہ اتنا تنگ تھا کہ ہم اس کے دونوں طرف ہو کر جتنے چاہیں مار سکتے ہیں یعنی اس وقت جب وہ بھاگ کر باہر نکل رہے ہوں۔

”ٹھیک ہے“ میں نے کہا ”چنانچہ مناسب ہوگا کہ ہم انہیں نکل جانے دیں“

”نکل جانے دیں!“

”ہاں...... کیونکہ اوبیزی سمیت ہم صرف چار بندوقوں سے مسلح ہیں اور یہ تو تم جانتے ہی ہو کہ بھالے بھینسے کا شکار کرنے میں زیادہ کارآمد نہیں ہوتے چنانچہ میں کہتا ہوں کہ جانے دو انہیں۔

اوبیزی یہ موقع ہاتھ سے جانے دینا نہ چاہتا تھا پانڈا نے اس سے ڈھالیں طلب کی تھیں اور یہاں ڈھالوں کے لئے کھال نہ صرف مفت مل رہی تھی بلکہ جنگلی بھینسے کی کھال بے حد عمدہ بھی ہوتی ہے چنانچہ یہ ڈھالیں دیکھ کر پانڈا خوش ہو جائے گا چنانچہ سب سے پہلے اوبیزی نے میری رائے سے اختلاف کیا اور اس کے ساتھ سادو کو نے دیا شاید اس لیے کہ وہ اپنے ہونے والے خسر کو خوش کرنا چاہتا تھا یا شاید محض شکار کے شوق میں البتہ صرف سکاؤل نے جس کے خون میں ہاٹنسلوٹ خون تھا اور اس کے خون نے اسے محتاط اور عیار بنا دیا تھا میری رائے سے اتفاق کیا اور کہا کہ ہمارے پاس بارود کا ذخیرہ زیادہ نہیں ہے اور یہ کہ بھینسے بہت زیادہ گولیاں کھا جاتے ہیں۔

آخرکار سادو کو نے کہا۔

”آقا میکومیزن ہمارے سردار اور کپتان ہیں چنانچہ ان کے حکم کی تعمیل ہم پر فرض ہے البتہ اس عمدہ موقع کا ہاتھ سے نکل جانے کا عمر بھر افسوس رہے گا لیکن میں سمجھتا ہوں کہ زکالی کی پیشنگوئی نے انہیں خوفزدہ کر دیا ہے چنانچہ دنیا ادھر سے ادھر ہو جائے آقا میکومیزن بھینسوں کے شکار کے لئے تیار نہ ہوں گے۔“

”زکالی!“ اوبیزی نے چونک کر پوچھا ”اس بوڑھے بونے کا اس معاملے سے کیا تعلق؟“

”اس بوڑھے بونے کا اس معاملے سے کیا تعلق ہے اور کیا نہیں ہے اس سے تمہیں کیا؟“ میں نے جلدی سے کہا۔

میں سمجھتا ہوں کہ سادو کو میں نے جو کچھ کہا تھا لیکن چونکہ اس کی باتیں حقیقت سے قریب تھیں اس لئے مجھے بے تاب کر گئیں خصوصاً اس لئے کہ میرے ضمیر نے مجھے احساس دلایا کہ وہ بے بنیاد نہ تھیں ہم چند بھینسوں کا شکار کرنے کی کوشش کریں گے میں نے اپنی خودداری کو سنبھالتے ہوئے کہا لیکن ہم زیادہ سے زیادہ آٹھ یا دس بھینسے مار سکیں گے اور ظاہر ہے کہ ان کی کھالیں ڈھالوں کے لئے ناکافی ہوں گی ہاں اگر بھینسے دلدل میں پھنس جائیں تو ہم جتنے چاہیں مار سکتے ہیں لیکن یہ ممکن نہیں کیونکہ دلدل خشک ہے اچھا بھئی آؤ اب ان کے شکار کا نقشہ بنایا جائے کیونکہ میں سمجھتا ہوں کہ سورج کے بلند ہوتے ہی یہ ریوڑ اپنی عارضی قیام گاہ سے رخصت ہونے کی تیاری کرے گا۔

آدھے گھنٹے بعد ہم چاروں جن کے پاس بندوقیں تھیں اس ڈھلائی اور تنگ راستے کے جو پانی نے صدیوں سے بہہ کر بنا دیا تھا دونوں طرف پتھروں کے پیچھے دبکے ہوئے تھے یہ راستہ دلدل تک جاتا تھا ہمارے ساتھ اوبیزی کے چند آدمی بھی تھے۔

خود سردار یعنی اوبیزی میرے ساتھ تھا یہ وہ شرف تھا جو خود اس نے اپنے طور پر یعنی میری پیشکش کے بغیر قبول کر لیا تھا سچ تو یہ ہے کہ جب اس نے میرے پہلو میں بیٹھنے پر اصرار کیا تو میں نے بھی انکار نہ کیا کیونکہ مجھے احساس تھا کہ اگر اوبیزی اپنی بندوق سمیت میرے ساتھ نہیں بلکہ میرے سامنے ہوا تو خود میں غیر محفوظ ہوں گا کیونکہ اس کی پرانی بندوق خود بخود چل جانے کی عادی تھی اور یہ فرض محال اگر اس وقت وہ خود بخود نہ بھی چلی تو خود اوبیزی جب جوش میں آ کر گولی چلاتا تھا تو وہ اپنے نشانے سے بھٹک کر کسی اور کے اور کہیں جا لگتی۔

معلوم ایسا ہوتا تھا کہ بھینسے نرسلوں میں اطمینان

سے بیٹھ گئے تھے چنانچہ پہلے تو ہم اپنی اپنی مقررہ جگہ پر دبک گئے کہ احتیاط کا تقاضہ یہی تھا اور پھر ہم نے تین بار برداروں کو راستے یا نالے کے انتہائی سرے پر بھیج دیا کہ وہ شور مچا کر بھینسوں کو اٹھا دیں بقیہ زولو ہمارے ساتھ رہ گئے۔ یہ تعداد میں دس یا بارہ تھے اور سب کے سب لمبے دستوں والے بھالوں سے مسلح تھے۔

ان تین باربرداروں نے جنہیں ہم نے نرسلوں کی طرف بھیجا تھا شور مچا کر بھینسوں کو گھبرا دینے کے بجائے یہ کیا کہ ان بیوقوفوں نے نرسلوں میں ایک ہی وقت میں دو تین جگہ آگ لگا دی انہوں نے ایسا کیوں کیا؟ یہ تو وہ تینوں بے وقوف ہی بتا سکتے ہیں لیکن میں سمجھتا ہوں کہ وہ آگے بڑھنے اور شور مچانے سے ڈرتے تھے مبادا بھینسے انہیں اپنے سینگوں پر لے لیں قصہ مختصر واقعہ یوں ہوا کہ نرسلوں کے جھنڈ کے انتہائی سرے سے شعلے بلند ہوئے نرسل جیسا کہ میں نے کہا کہ خشک تھے چنانچہ وہ ایک دم سے جل اٹھے اور پھر ایک طوفان مچ گیا۔

نرسلوں میں اطمینان سے سوئے ہوئے بھینسے ہڑبڑا کر اٹھ کھڑے ہوئے اور چند ثانیوں تک شش و پنج کے عالم میں کھڑے رہنے کے بعد سیدھے ہماری طرف آئے ڈکراتے اور پھنکارتے ہوئے جنگلی بھینسوں کا پورا ریوڑ غول بیابانی کی طرح ہماری طرف بھاگے آ رہے تھے۔

ان بلاؤں کو اپنی طرف آتے دیکھا تو میں ایک بڑے سے پتھر کے پیچھے دبک گیا سکاؤل بھاگ کر قریب کے میموسا درخت پر بلی کی سی پھرتی سے چڑھ گیا اور اس کے کانٹوں کی پرواہ کیے بغیر اس کی چوٹی پر چڑھتا چلا گیا وہ ایک عقاب کا گھونسلا تھا سکاؤل اس گھونسلے میں بیٹھ گیا بھالوں سے لیس زولو پناہ لینے کے لئے بکھر کر ادھر ادھر بھاگے سادو کو کا کیا بنا اور وہ کہاں گیا یہ میں نہ دیکھ سکا لیکن بوڑھا اوبیزی جوش کے اندھے پن میں اچھل کر اپنی کمین گاہ سے باہر آیا اور راستے کے عین بیچ میں کھڑا ہو کر چیخنے لگا۔

وہ آ رہے ہیں...... وہ آ رہے ہیں...... جنگلی بھینسو! ہمت ہے تو آؤ، ہاتھیوں کو کھا جانے والا تمہارے استقبال کو کھڑا ہے“

”اوبیزی! اے بوڑھے الو......“ میں نے چیخ کر کہا۔

لیکن اس سے آگے کچھ نہ کہہ سکا کیونکہ اس وقت ایک زبردست بھینسے نے جو سب کے آگے تھا اور اس ریوڑ کا شاید سردار تھا اوبیزی کا چیلنج قبول کر لیا اور وہ اپنی گردن لمبی کر کے اور ناک آگے بڑھا کر سیدھا اوبیزی کی طرف آیا۔

اوبیزی کی بندوق کی بندوق چل گئی اور دوسرے ہی لمحے خود اوبیزی زمین سے اوپر اٹھ چکا تھا جلتے ہوئے نرسلوں کے کالے دھوئیں میں میں نے اوبیزی کے موٹے جسم کو فضا میں بلند ہوتے دیکھا اور پھر اسے ”دھپ“ کی آواز کے ساتھ اس چٹان کی چوٹی پر گرتے سنا جس کے پیچھے میں دبکا ہوا تھا۔

”اوبیزی! خدا حافظ“ میں نے کہا۔

اور جب وہ بھینسا جس نے میرے خیال میں اوبیزی کو آنجہانی کر دیا تھا اس چٹان کے قریب سے، جس کے پیچھے میں تھا گزر رہا تھا تو میں نے اوبیزی کی روح پر فاتحہ پڑھ کر اپنی بندوق کی گولی اس بھینسے کی پسلیوں میں پیوست کر دی اس کے بعد میں نے کوئی گولی نہ چلائی کیونکہ مجھے وہاں اپنی موجودگی کا اشتہار نہ دینے میں ہی اپنی خیریت نظر آئی۔

جب سے میں شکاری ایلن کواٹر میں بنا ہوں تب سے لے کر اب تک ایسا منظر نہیں دیکھا جیسا کہ اس وقت دیکھ رہا تھا۔

نرسلوں میں سے نکل کر درجنوں بھینسے راستے پر یا اس تنگ نالے میں بھاگے آ رہے تھے اور ہر بھینسا خود اپنی زبان میں نرسلوں میں آگ لگنے کے واقعہ پر شاید اپنی رائے کا اظہار کر رہا تھا وہ تنگ راستے میں پھنس گئے افراتفری میں وہ ایک پر ایک سوار ہونے لگے وہ پھنکار رہے تھے وہ ڈکار رہے تھے وہ لاتیں چلا رہے تھے وہ ایک دوسرے کو کریدنے کی کوشش کر رہے تھے انہوں

نے میری اس چٹان پر حملہ کردیا جو مجھے اپنی پناہ میں لئے ہوئے تھی وہ اندھا دھند اسے ٹکریں مارنے لگے یہاں تک کہ چٹان لرز لرز گئی وہ اس درخت سے ٹکرائی جس کی چوٹی پر اور اب عقاب کے گھونسلے میں سکاؤل پہلے بھینسوں کے پٹھوں پر اور پھر ان کے کھروں تلے آ رہتا اور ان بھینسوں کے ساتھ دھواں بھی آیا اور یہ دھواں اپنے ساتھ نرسلوں کے جلتے ہوئے تنکے لایا۔

آخر کار یہ طوفان گزر گیا۔

چند بچھڑوں کے علاوہ جو اس مجنونانہ دوڑ میں خود اپنے والدین اور عزیز واقربا کے کھروں تلے کچل گئے تھے جنگلی بھینسوں کا ریوڑ جا چکا تھا اور اب میں روسی شہنشاہ کی طرح غالباً وہ شہنشاہ ہی تھا...... سوچنے لگا کہ میری فوج کیا ہوئی۔

اوبیزی! میں نے چیخ کر بلکہ دھوئیں کی وجہ سے چھینک کر کہا اوبیزی! تم مر گئے میرے دوست؟

"ہاں...... ہاں سیکومیزن! ایک کھانستی ہوئی غمناک آواز نے چٹان کی چوٹی پر سے جواب دیا" میں مر گیا پوری طرح سے مر گیا اس بدروح سلوانا (یعنی درندے نے) نے میری جان لے لی ہائے! میں کیوں اس بھرم میں مبتلا ہو گیا کہ میں شکاری ہوں؟ کاش کہ میں اپنے کرال میں ہی ٹھہرتا اور اپنے مویشیوں کو شمار کرتا رہتا" ہائے! میں کیوں اس شکار پر آیا؟

"یہ تو میں نہیں جانتا بوڑھے مجنوں" میں نے کہا۔

اور اپنے دوست اوبیزی کو آخری سلام کہنے کے لئے چٹان پر چڑھنے لگا۔

چٹان کی چوٹی مکان کی چھت کی طرح ڈھلواں اور استرے کی دھار کی طرح نوکدار تھی اور چوٹی پر ہاتھیوں کو کھا جانے والا لنگنی پر سکھانے کے لئے ڈالے ہوئے زیر جامے کی طرح لٹک رہا تھا۔

"کولہوں میں سیکومیزن، کولہوں میں وہ کراہ کر بولا" کیونکہ میں فرار ہونے کے لئے پلٹ پڑا تھا لیکن افسوس وقت گزر چکا تھا۔

اس کے برخلاف تم نے بڑی عمدہ پرواز کی حالانکہ تم اتنے موٹے ہو میں نے جواب دیا۔

"ذرا دیکھو تو سیکومیزن کہ اس شیطان بھینسے نے کیا ظلم کیا ہے میرے ساتھ زخم دیکھنا آسان ہوگا کیونکہ میرا موچھا (لنگوٹ) غائب ہے۔"

چنانچہ میں نے دیکھا میرا مطلب ہے میں نے اوبیزی کے کالے اور چکی کے پاٹ جیسے اور تھلتھلاتے ہوئے کولہوں کا بغور معائنہ کیا لیکن وہاں کچھ نہ تھا سوائے کیچڑ کے ایک بڑے سے کالے داغ کے جیسے اوبیزی بے خیالی میں کیچڑ میں بیٹھ گیا ہو۔

اور پھر سارا معاملہ میری سمجھ میں آ گیا بھینسے کے سینگوں کا نشانہ تو خطا کر گیا تھا البتہ اس نے اپنی کیچڑ آلود ناک اوبیزی کے کولہوں کے نیچے دے کر اسے اوپر اچھال دیا تھا اور بھینسے کی ناک نے "وصال" کر لیا تھا۔ چنانچہ اوبیزی کو معمولی چوٹ اور خراشیں آئی تھیں۔"

جب یہ انکشاف ہوا کہ اس موٹے کافر کو کوئی خطرناک زخم نہ آیا تھا تو میرا غصہ جو پہلے ہی سے ابل پڑنے کے لئے کسی بہانے کا منتظر تھا ایک دم سے پھٹ پڑا اور میں نے اس کے ننگے کولہوں پر جو بڑی بے شرمی سے میری طرف اٹھے ہوئے تھے ایک چٹاخ دار تھپڑ جڑ دیا میں سمجھتا ہوں کہ اس کے ننگے کولہوں پر ایسا تھپڑ صرف اس وقت ہی پڑا ہوگا جب وہ بچہ تھا۔

"اٹھو اب...... گدھے" میں گرجا اور آؤ ہم اپنے دوسرے ساتھیوں کو تلاش کریں یہ انجام ہے تیری حماقت کا بیوقوف کہ تو نے مجھے بھی بھینسوں کے ریوڑ کا شکار کرنے پر اکسایا تھا اب اٹھے گا بھی یا میں عمر بھر یہاں دھوئیں میں ہی کھڑا رہوں گا تیری وجہ سے؟

تو تمہارا یہ مطلب ہے سیکومیزن کہ مجھے کوئی خطرناک اور جان لیوا قسم کا زخم نہیں آیا ہے؟" اوبیزی نے بشاشت سے پوچھا اور میرے تھپڑ کو اس نے بڑی خندہ جبیں سے قبول کر لیا کیونکہ وہ ان لوگوں میں سے نہ تھا جو دل میں بغض اور کینہ رکھتے ہیں۔ واہ! یہ معلوم کر کے بے حد خوشی حاصل ہوئی اب میں زندہ رہوں گا سیکومیزن اور ان بزدلوں جنہوں نے نرسلوں میں آگ

لگائی تھی انہیں سزا دوں گا کہ انہیں اپنی نانی یاد آ جائے گی اور میں اس نالائق بھینسے کو بھی ٹھکانے لگا دوں گا کیونکہ میں نے اسے زخمی تو کر ہی دیا سیکومیزن۔

یہ تو میں نہیں جانتا کہ تم نے اسے زخمی کر دیا ہے البتہ اتنا ضرور جانتا ہوں کہ خود اس نے تمہیں بڑی یادگار ٹکر ماری ہے میں نے کہا۔

اور پھر ہاتھیوں کو کھا جانے والے کو چٹان پر سے گھسیٹا اور اس درخت کی طرف بھاگا جہاں میں نے آخری دفعہ سکاؤل کو دیکھا۔

اور وہاں مجھے ایک اور حیرت انگیز منظر دیکھنے کو ملا۔ سکاؤل اب بھی عقاب کے گھونسلے میں بیٹھا ہوا تھا اور وہ اکیلا نہ تھا بلکہ اس کے ساتھ عقاب کے دو بچے بھی تھے جن کے پر حال ہی میں نکلے تھے ان میں سے ایک بچہ میری طرح چیخ رہا تھا کیونکہ وہ زخمی ہو گیا تھا اس کی یہ چیخیں بیکار نہ گئیں کیونکہ اس کی چیخیں سن کر اس کے والدین کہیں سے آ گئے تھے یہ عقاب عقابوں کی اس بڑی قسم سے تعلق رکھتے تھے جنہیں بوئروں نے "لاما فانجے" یا بھیڑوں کے بچوں کو اٹھا لے جانے والے کا بے حد مناسب نام دیا ہے اور اب یہ بڑے بڑے عقاب اپنے گھر میں بیٹھے ہوئے بن بلائے مہمان کی اپنے پنجوں اور چونچوں سے ایسی خاطر مدارات کر رہے تھے کہ ایسی خاطر مدارات کبھی کسی میزبان کی نہ کی ہوگی دھوئیں کے پردے میں سے انسان اور پرندوں کی یہ جنگ بڑی مافوق الفطرت معلوم ہو رہی تھی اس کے علاوہ یہ جنگ اتنی پر شور تھی کہ میں نے ایسا شور اور ایسی آوازیں پہلے کبھی نہ سنی تھیں اب یہ میں نہیں جانتا کہ کون زیادہ بلند آواز میں چیخ رہا تھا۔ عقاب یا سکاؤل۔

یہ صورتحال اتنی مضحکہ خیز تھی کہ میرا غصہ غائب ہو گیا اور میں قہقہہ لگا کر ہنس پڑا عین اسی وقت نر عقاب نے اپنے پنجے سکاؤل کے سینے پر جما دیئے اور اپنی مڑی ہوئی چونچ سے سکاؤل کے بالوں کے گچھے کے گچھے اکھاڑنے لگا بے تاب سکاؤل نے عقاب کی دونوں ٹانگیں پکڑ لیں اور درخت کی چوٹی پر سے چھلانگ لگا دی۔

عقاب کے پھیلے ہوئے بازوؤں نے پیراشوٹ کا کام دیا چنانچہ سکاؤل کے گرنے کی رفتار قدرے کم ہو گئی اس کے علاوہ اتفاقاً سیدھا اوبیزی کے سر پر گرا چنانچہ اسے چوٹ نہ آئی چت گرے ہوئے اوبیزی کے سینے پر سے جس کے جسم کے اگلے حصے پر بھی اب خراشیں پڑ گئی تھیں اٹھ کر سکاؤل دوزخ میں سے نکلی ہوئی چمگادڑ کی طرح بھاگا اور وہ بندوق زمین پر سے اٹھانا چھوڑ گیا جسے وہ بھاگتے وقت درخت کی جڑ میں پھینک گیا تھا خوش قسمتی سے بندوق کو کوئی نقصان نہ پہنچا تھا اس واقعہ کے بعد کافروں نے سکاؤل کو ایک نیا لقب دیا جس کے معنی ہیں وہ جو پرندوں سے جنگ کرتا ہے لیکن بری طرح سے پٹتا ہے۔

قصہ مختصر ہم دھوئیں کی مدد سے نکل آئے اور ہم تینوں ایک عجیب مضحکہ خیز منظر پیش کر رہے تھے خصوصاً اوبیزی جس کے جسم پر کپڑے کے نام ایک چیتھڑا نہ تھا البتہ اس کے سر پر موسیائی کا حلقہ اب بھی جما ہوا تھا ہم اپنے ساتھیوں کو آوازیں دینے لگے کہ اگر وہ بھینسوں کے کھروں تلے کچلے جانے سے بچ گئے ہوں تو ہمارے پاس آ جائیں۔

اور سب سے پہلے جو آیا سادو کو تھا جو بے حد پر سکون اور مطمئن معلوم ہوتا تھا اس نے حیرت سے ہماری طرف دیکھا اور پھر بڑی معصومیت سے پوچھا کہ ہم کیا کرتے رہے کہ ہمارے یہ حال ہو گئے۔ میں نے اس سوال کا جواب مناسب لہجے میں موزوں الفاظ میں دینے کے بعد پوچھا کہ خود اس نے کیا کیا کہ اس کا لباس اب تک سلامت ہے۔

اس نے کوئی جواب نہ دیا لیکن میں سمجھتا ہوں کہ وہ چیونٹیوں کے بنائے ہوئے ایک بڑے سے سوراخ میں گھس گیا تھا اور اس کے اس عمل پر اسے بزدلی کا الزام نہ دینا چاہئے اس کے بعد ہماری پارٹی کے دوسرے آدمی مختلف سمتوں سے یکے بعد دیگرے نمودار ہونے لگے کوئی غائب نہ تھا سوائے ان تینوں کے جنہوں نے

زسلوں میں آگ لگائی تھی انہیں اپنی خیریت کئی گھنٹوں تک غائب رہنے میں ہی نظر آئی میں سمجھتا ہوں کہ بعد میں انہیں محسوس ہوا ہوگا کہ وہ اور بھی زیادہ دیر تک بلکہ کئی دنوں تک غائب کیوں نہ ہوگئے۔ بہرحال جب وہ واپس آئے تو میں خود صاحب فراموش تھا چنانچہ یہ معلوم نہ کرسکا کہ ان کے اور ان کے غضبناک سردار اوبیزی کے درمیان کیا واقعہ ہوا۔

جب سب لوگ ایک جگہ جمع ہوگئے تو سوال اٹھا کہ اب کیا کیا جائے میں تو یہ چاہتا تھا کہ ہم واپس اپنے کیمپ میں جائیں اور جتنی جلد ممکن ہو اس منحوس مقام سے روانہ ہوجائیں لیکن یہ فیصلہ میں نے اوبیزی کے وقار کو نظر انداز کرکے کیا تھا۔ وہ اوبیزی دوسرا تھا جو بپھرے ہوئے بھینسے کی ناک کی ٹکر سے ہوا میں اڑکر چٹان کی چوٹی پر تنک دھڑنک لٹک رہا تھا اور اپنے آپ کو خطرناک طور پر زخمی یقین کرچکا تھا اور یہ اوبیزی دوسرا تھا جو اس وقت میرے سامنے اس طرح کھڑا ہوا تھا کہ اس نے اپنے بار بردار کا موچھا لے لیا تھا لیکن موچھا چونکہ چھوٹا تھا اور اس کی ستر پوشی نہ کررہا تھا اس لئے اوبیزی ایک ہاتھ آگے اور ایک ہاتھ پیچھے رکھے اپنے جسم کے مخصوص حصوں کو ڈھانکے ہوئے تھا یہ معلوم کرنے کے بعد کہ اسے کوئی زخم نہیں بلکہ صرف خراشیں آئی تھیں اس کا شکاری جوش عود کرآیا تھا۔

"میں شکاری ہوں" وہ بولا اور میرا نام ہاتھیوں کو کھا جانے والا ہے۔

اور اس نے سینہ پھلا کر ادھر ادھر دیکھا گویا کہہ رہا ہو کہ کوئی ہے جو اسے چیلنج کرے؟ لیکن کسی نے سے چیلنج نہ کیا سامنے ہی وہ دبلا پتلا کافر کھڑا ہوا تھا جورات بھر گلا پھاڑ پھاڑ کر اوبیزی کی مدح سرائی کرتا رہا تھا اور اب اس کی آواز بیٹھ گئی تھی۔ چنانچہ اس بولا کرنے والے نے بیٹھی ہوئی آواز اور تھکے ہوئے لہجے میں کہا۔

"ہاں...... اے عظیم سردار...... ہاتھیوں کو کھا جانے والا تمہارا نام ہے اور وہ جسے بھینسے نے بلندیوں پر پہنچا دیا تمہارا دوسرا نام ہے"

"خاموش، بیوقوف گدھے" اوبیزی گرجا "جیسا کہ میں نے کہا میں شکاری ہوں اور میں نے اس درندے کو زخمی کردیا ہے جو بعد میں اپنے قبیلے کی جو مجھ میں میری ہتک کرنے کی جرأت کربیٹھا"

یہاں میں بتا دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ اس بھینسے کو اوبیزی نے نہیں بلکہ میں نے زخمی کیا تھا۔

"چنانچہ" اوبیزی نے سلسلہ کلام جاری رکھا "اب میں اس بھینسے کو اس کی جرأت کے عوض خاک دھول میں ملا دوں گا آؤ ہم اس کا تعاقب کریں۔"

اور اس نے ایک بار پھر چاروں طرف دیکھا اس پر اس کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے ایک بار بردار نے کہا۔

"بے شک اے ہاتھیوں کو کھا جانے والے آؤ ہم اس گستاخ بھینسے کا تعاقب کریں" اور میکومیزن ہمیں بتائیں گے کہ اس کا پیچھا کس طرح کیا جائے کیونکہ وہ بے حد ہوشیار ہیں اور دنیا میں کوئی ایسا بھینسا نہیں جس سے میکومیزن ڈرتے ہوں۔"

اس کے بعد ظاہر ہے کہ میرے کہنے کو کچھ نہ رہ جاتا تھا چنانچہ میں نے سکاؤل کو طلب کیا جس کے پورے بدن پر عقابوں کی زیادتیوں کے نشانات پڑے ہوئے تھے اور پھر ہم ریوڑ کے کھروں کے نشانات کے سہارے بھینسوں کی تلاش میں چل پڑے۔ غالباً یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ کھروں کے نشانات صاف تھے اور ہم اس آسانی سے آگے بڑھ رہے تھے جیسے چھکڑے کے لیکوں پر چل رہے ہوں۔

تم فکر نہ کرو باس سکاؤل نے کہا اب تک بھینسے بہت دور نکل گئے ہوں گے اور دو گھنٹے تک چلتے رہنے کے بعد بھی ہم انہیں نہیں پا نہ سکیں گے۔

"خدا کرے کہ ایسا ہی ہو" میں نے جواب دیا۔

لیکن اس دن قسمت مجھ سے روٹھ گئی تھی کیونکہ ابھی ہم نے آدھے میل کا فاصلہ بھی طے نہ کیا تھا کہ ایک سرگرم کافر کو زمین پر خون کے داغ نظر آگئے۔

ہم خون کے ان کے داغوں کے ساتھ کوئی بیس

منٹ تک چلتے رہے یہاں تک کہ ہم جھاڑیوں کے ایک قطعہ کے کنارے پر پہنچ گئے یہ جھاڑیاں اس ڈھلان پر اگی ہوئی تھیں جو ایک دریا تک چلی گئی تھی۔

میں خون کے داغوں کے سہارے اتر کر نیچے دریا تک اور پھر ایک بڑے سے تالاب کے کنارے تک پہنچ گیا یہ تالاب بھرا ہوا تھا حالانکہ خون ایک بڑے سے تالاب کے کنارے تک پہنچ کر ٹھہر گیا اور میں سادو کو سے مشورہ کرنے لگا کہ اس زخمی بھینسے کا کیا ہوا آیا وہ تالاب کو تیر کر عبور کرگیا اور دوسری طرف پہنچ گیا تھا یا نہیں کیونکہ تالاب کے کنارے پر کئی نشانات گڑبڑ تھے کہ صحیح اندازہ لگانا تقریباً ناممکن تھا۔

ابھی ہم کوئی فیصلہ نہ کرپائے تھے کہ ان گنجان جھاڑیوں میں سے جن کے قریب سے ہم گزر کر آئے تھے بھینسا نکل آیا اس بھینسے نے وہ عام چالاکی کی تھی جو جنگلی بھینسوں سے مخصوص ہے یعنی وہ تالاب کے کنارے سے لوٹ کر دشمن کو دھوکہ دینے کے لئے خود اپنے کھروں کے نشانات پر چلتا ہوا جھاڑیوں میں چھپ گیا تھا۔

کافی بڑا بھینسا تھا وہ جو تین ٹانگوں کے سہارے کھڑا ہوا تھا اور اس کی چوتھی ٹانگ جھول رہی تھی کیونکہ میری بندوق کی گولی نے اس کی ران کی ہڈی توڑ دی تھی رہا یہ سوال کہ آیا یہ بھینسا وہی تھا جس نے اوبیزی کو ہوا میں اچھال دیا تھا تو اس کا جواب مجھے فوراً مل گیا بھینسے کے دائیں سینگ سے جو نوک کے قریب سے پھٹا ہوا بلکہ دو شاخہ تھا اوبیزی کے موچھا کا "بقایا" لٹک رہا تھا۔

"انکوسی! ہوشیار" سادو کو نے خوفزدہ آواز میں چیخ کر کہا یہ وہی پھٹے ہوئے سینگ والا بھینسا ہے۔

میں نے سادو کو کے یہ الفاظ سنے اور پھر میں نے دیکھا بوڑھے زکالی کی جھونپڑی کا پورا منظر میری نظر کے سامنے گھوم گیا بوڑھا بونا سفید پتھر اور زکالی کے الفاظ غرض ایک ایک تفصیل۔

اور تب بھینسا پھنکار کر لڑھکتی ہوئی چٹان کی طرح ہماری طرف آیا۔

میں نے جلدی سے بندوق اٹھا کر لبلبی دبا دی لیکن گولی اس کی کھوپڑی کو چھوتی ہوئی نکل گئی دوسرے ہی لمحے بھینسا میرے سر پر تھا میں نے بندوق پھینک دی اور اچھل کر ایک طرف ہوجانے اور حملہ آور بھینسے کے راستے سے ہٹ جانے کی کوشش کی۔

میں تقریباً کامیاب ہوگیا تھا لیکن بھینسے کے دو شاخہ سینگ نے جس سے اوبیزی کے موچھا کا چیتھڑا لٹک رہا تھا مجھے اپنی لپیٹ میں لے کر زمین پر سے نہ صرف صاف اٹھا لیا بلکہ مجھے اٹھا کر گہرے تالاب میں پھینک دیا جب میں دریا کے کنارے پر سے تالاب میں منتقل ہورہا تھا تو میں نے سادو کو کو آگے لپکتے دیکھا اور پھر بندوق کا دھماکہ سنا اس کے فوراً بعد ہی بھینسا لڑکھڑا کر بیٹھ گیا لیکن وہ پھر اٹھا اور آہستہ آہستہ چلتا بلکہ یوں کہیے کہ گھسٹتا ہوا تالاب میں اتر آیا۔

اب ہم دونوں تالاب میں اور اسی تالاب میں ہم دونوں کے لئے کافی جگہ نہ تھی چنانچہ چند ثانیوں تک ادھر ادھر بچنے کی کوشش کرنے کے بعد میں ہار گیا۔ یہ نالائق بھینسا میرے ساتھ ہر وہ زیادتی کرنے پر تلا ہوا تھا جو ایسی صورتحال میں ایک بھینسا کرسکتا ہے۔ اس نے مجھے اپنے سینگوں سے ادھیڑ ڈالنے کی کوشش کی اور تقریباً کامیاب بھی ہوگیا حالانکہ ہر دفعہ میں غوطہ مار کر اس کا وار بچانے کی کوشش کرتا تھا پھر اس نے اپنی ناک کی ٹکر سے مجھے گرا دیا اور اپنی تھوتھنی سے مجھے تالاب کے پیندے تک دباتا چلا گیا حالانکہ میں نے اس کے ہونٹ دونوں ہاتھوں سے اور پوری قوت سے مروڑ دیئے تھے پھر اس نے اپنے دونوں گھٹنے میرے سینے پر ٹیک دیئے اور بڑے اطمینان سے اس پر بیٹھ گیا اور اس کے بوجھ سے میں پیندے کے کیچڑ میں دھنستا چلا گیا۔ مجھے یاد ہے کہ اس وقت میں نے اس کے پیٹ پر بے تحاشہ لاتیں چلائی تھیں اس کے بعد مجھے کچھ یاد نہ رہا سوائے ایک وحشت ناک خواب کے جس میں میں ایک بار پھر زکالی کی جھونپڑی کا سارا منظر دیکھ رہا اور اس کی یہ درخواست سن رہا تھا کہ جب اس پانی کے گڑھے میں

اس پھٹے ہوئے سینگ والے بھینسے سے تمہاری مڈبھیڑ ہو تو اس وقت کہنا کہ یہ ایک کافر کا شعبدہ تھا۔

اس کے بعد میں نے اپنی ماں کو دیکھا جو آکسفورڈ شائر کے ایک گھر میں جہاں میں پیدا ہوا تھا ایک بچے پر جھکی ہوئی تھی یہ بچہ میں تھا۔

اور اس کے بعد کچھ نہ تھا سوائے اندھیرے کے۔

مجھے ہوش آیا تو میں نے دیکھا کہ مجھ پر میری تو جھکی ہوئی نہ تھی بلکہ ایک پہلو کی طرف سے سادوکو اور دوسرے پہلو کی طرف سے سکاؤل مجھ پر جھکا ہوا تھا اور یہ کہ سکاؤل رو رہا تھا کیونکہ گرم گرم آنسو میرے چہرے پر گر رہے تھے۔

"مر گیا" میکومیزن مر گیا، سکاؤل نے کہا "اس پھٹے ہوئے سینگ والے بھینسے نے جس میں کوئی بدروح گھس گئی تھی، میکومیزن کی جان لے لی۔ مرنے والا جنوبی افریقہ کا بہترین سفید فام شکاری تھا ہائے ہائے، میں اسے اپنے باپ اور سارے عزیزوں سے زیادہ چاہتا تھا۔

"ضرور چاہتے ہو گے دوغلی نسل کے افریقی" سادوکو نے جواب دیا" کیونکہ تم جانتے ہی نہیں کہ تمہارا باپ کون تھا۔ لیکن میکومیزن مرا نہیں ہے کیونکہ عظیم ساحر زکالی نے کہا تھا میکومیزن کو اپنے گھٹنوں تلے دبا کر اس کی جان نکال لیتا میں نے خود بھینسے کے دل میں اپنا بھالا اتار دیا تھا لیکن مجھے خوف ہے کہ میکومیزن کی پسلیاں ٹوٹ گئی ہیں۔ اور اس نے میرے سینے میں انگلی کھبائی۔

"اے! اپنے منحوس ہاتھوں سے مت چھو مجھے" میں نے تڑپ کر کہا۔

"دیکھا! سادوکو نے کہا میں نہ کہتا تھا کہ میکومیزن زندہ رہے گا؟"

اس کے بعد کی یادیں گڈمڈ ہیں مجھے کچھ زیادہ یاد نہیں کہ میں وحشت ناک خواب دیکھتا رہا اور پھر جب میرے حواس بجا ہوئے تو میں نے اپنے آپ کو ایک بڑی سی جھونپڑی میں پڑے پایا جو معلوم ہوا کہ خود اوبیزی کی جھونپڑی تھی اور وہی تھی جس میں، میں نے "بوڑھی گائے" کے کان کی مرہم پٹی کی تھی۔

جھونپڑی کی چھت میں بنے ہوئے دھواں نکلنے کے سوراخ اور دروازے میں سے روشنی اندر آرہی تھی اور اس روشنی میں، میں جھونپڑی کی چھت اور دیواروں کا معائنہ کرتا اور سوچتا رہا کہ یہ جھونپڑی کس کی ہو سکتی ہے اور یہ کہ میں یہاں کیسے آگیا؟

میں نے اٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کی تو پسلیوں میں درد کی شدید لہر دوڑ گئی اور تب میں نے دیکھا کہ میری پسلیوں پر چوڑی چوڑی چرمی پٹیاں بندھی ہوئی تھیں صاف ظاہر تھا کہ اگر سب کی سب نہیں تو چند پسلیاں ضرور ٹوٹ گئی تھیں۔

پسلیاں کیوں اور کیسے ٹوٹ گئیں؟ میں نے اپنے آپ سے پوچھا اور فوراً ہی سارے واقعات یاد آگئے تو میں بچ گیا تھا جیسا کہ اس بوڑھے بونے نے جس کا نام راستے کھولنے والا تھا کہا تھا ثابت ہوا کہ وہ ایک عمدہ پیشگو تھا اور اگر اس کی پیشگوئی اس معاملے میں صحیح ثابت ہوئی تھی تو پھر دوسرے معاملات میں بھی صحیح ثابت ہو سکتی تھی میں کیا سمجھوں اس سے؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ایک سیاہ فام وحشی پھر وہ کتنا ہی بوڑھا کیوں نہ ہو، مستقبل معلوم کرلے؟

غالباً ماضی کے تجربات اور نتائج سے لیکن ایسے کیسے تجربات ہوں گے جنھوں نے اسے ان واقعات کی جو میرے ساتھ ہونے والے تھے ایک تفصیل دکھادی اور اسے یہ تک معلوم ہو گیا کہ ایک خاص بھینسا جس کا سینگ پھٹا ہوا ہو گا مجھے زخمی کر دے گا؟ میں الجھ گیا اور میں نے اس مسئلے پر غور کرنا ترک کر دیا۔

عین اس وقت میں نے کسی کو جھونپڑی کے نیچے دروازے سے رینگ کر داخل ہوتے سنا اور فوراً ہی اپنی آنکھیں بند کرلیں کیونکہ اس وقت میں کسی سے بھی کسی بھی موضوع پر باتیں کرنا نہ چاہتا تھا جھونپڑی میں داخل ہونے والا میرے قریب آ کر کھڑا ہو گیا اور میں سمجھتا ہوں کہ میری جبلت نے یا یوں کہنا زیادہ مناسب ہو گا

کہ میری چھٹی حس نے مجھے خبردار کیا کہ یہ آنے والا کوئی عورت تھی میں نے آہستہ آہستہ اپنی آنکھیں کھولیں لیکن صرف اتنی ہی کہ میں آنے والی کو دیکھ سکوں۔

اور وہاں میرے بستر کے قریب اور چھت میں بنے ہوئے دھوئیں کے سوراخ میں سے آتی ہوئی روشنی میں ایک بے حد خوبصورت عورت کھڑی ہوئی تھی بشرطیکہ آپ ایک سیاہ فام بلکہ تانبے جیسی رنگت والی عورت کو خوبصورت تسلیم کرنے کے لئے تیار ہوں۔

اس کا قد درمیانہ سے زیادہ بلند تھا اور جسم ایسا خوبصورت تھا جیسا کہ کسی یونان قدیم کے بت کا ہوتا ہے بے حد سڈول اور متناسب الاعضاء، رہا اس کا لباس تو وہ بھی یونان کی کسی دیوی کا سا ہی تھا۔ یعنی وہ اپنی کمر پر دانوں کی جھالر، جو اس کی رانوں تک آتی تھی، اور گلے میں پڑے ہوئے بڑے بڑے اور سبز دانوں کی مالا کے علاوہ اور کچھ پہنے ہوئے نہ تھی رہے اس کے خدوخال تو وہ کسی طرف سے حبشیوں کے سے نہ تھے اس کے برخلاف وہ دلفریب حد تک خوبصورت تھے۔ ناک ستواں اور پتلی تھی اور دانت چھوٹے اور موتیوں کی لڑی جیسے اور دہانہ تنگ، رہی آنکھیں تو ان کے لئے صرف ایک لفظ کافی ہے یعنی "غزالی" ماتھا بلند اور اس کے بال بھی حبشیوں کے سے نہ تھے بلکہ گھنگھریالے اور لابنے تھے یہاں میں یہ بھی بتادوں کہ اس نے اپنے بال بھی افریقی عورتوں کی طرح بنا رکھے تھے اس نے بیچ میں سے مانگ نکال رکھی تھی اور بالوں کا جوڑا اپنی گردن پر باندھ رکھا تھا اور ان بالوں میں سے سیپ کے سے چھوٹے چھوٹے کان جھانک رہے تھے اس کے ہاتھ، اس کے پیروں کی طرح نازک نازک تھے۔ چھاتیاں ابھری ہوئی، مدور اور نرم سخت نظر آتی تھیں۔

بلاشبہ بے حد دلفریب عورت تھی اس کے باوجود اس حسین چہرے میں کوئی خاص بات تھی جو ناگوار معلوم ہو رہی تھی کوئی بات جس کا تعلق جوانی اور معصومیت سے نہیں ہوا کوئی بات جسے اس قسم کے حسین اور تقریباً بچوں کے سے چہرے پر نہ ہونا چاہئے میں نے سوچنے کی کوشش کی یہ کیا بات ہو سکتی ہے؟ میں نے اس کی تحلیل کی اور اس نتیجے پر پہنچا کہ یہ حد سے بڑھی ہوئی ہوشیاری تھی جو اس کے چہرے سے جھانک رہی تھی اور شاید خود حسینہ اپنی اس امتیازی خصوصیت سے بے خبر تھی ساتھ ہی میں نے یہ بھی محسوس کیا کہ اس سانچے میں ڈھلے ہوئے سر میں دماغ تھا وہ بڑا ہی تیز تھا اور یہ کہ یہ خوبصورت مرد کا کھلونا بننے کے لئے نہیں بلکہ حکومت کرنے کے لئے پیدا ہوئی ہے اور یہ کہ وہ اپنا مقصد حاصل کرنے کے لئے اپنے چاہنے والوں کو بھی اپنے آلہ کار کے طور پر بلا جھجک استعمال کر سکتی ہے۔

اس نے آہستہ آہستہ اپنا سر جھکایا اور میری طرف دیکھنے ہی نہیں بلکہ میرا بغور معائنہ کرنے لگی میں نے جلدی سے اپنی آنکھیں بند کرلیں اور منتظر رہا۔ یقیناً وہ مجھے اب تک بے ہوش ہی سمجھے ہوئے تھی کیونکہ اب وہ اپنے آپ سے باتیں کرنے لگی اس کی آواز نرم اور شیریں تھی۔

"پورنا سا آدمی ہے یہ تو" وہ بولی "سادوکو اس کے دو بنا دے گا اور اس دوسرے کے (میں نے سوچا کہ یہ دوسرا کون ہو سکتا ہے؟) تین۔ اس کے بال بھی بڑے واہیات ہیں پھر اس نے اپنے بال چھوٹے کٹوائے ہیں اور یہ یوں کھڑے ہیں جیسے بلی کی پیٹھ پر ہوتے ہیں (یعنی ہشت) پر کی طرح بے حقیقت آدمی۔ لیکن سفید...... سفید...... ان لوگوں میں جو حکومت کرتے ہیں...... بے شک...... وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ سفید فام ان کا آقا ہے اور انہوں نے اسے راتوں کو نہ سونے والا کا نام دے رکھا ہے۔ کہتے ہیں کہ یہ بچوں والی شیرنی کی طرح بے دھڑک اور بہادر ہے وہ جو ڈنگان کے کرال سے اس وقت بھی زندہ نکل آیا تھا جب ڈنگان نے پٹی (یعنی رطیف) اور اس کے 8 ساتھیوں کو قتل کر دیا تھا۔ کہتے ہیں کہ یہ سانپ کی طرح پھرتیلا اور چالاک ہے اور یہ کہ پانڈا اور اس کے اندوآنا (مشیر) اس کی اتنی عزت کرتے ہیں کہ کسی دوسرے سفید فام کی نہیں کرتے اس کے علاوہ یہ شادی شدہ بھی نہیں ہے حالانکہ کہتے ہیں

کہ اس نے دو دفعہ شادی کی اور اس کی دونوں ہی بیویاں مرگئیں اور یہ کہ اب یہ کسی بھی عورت کی طرف نہیں دیکھتا اور یہ واقعی بڑی حیرت انگیز بات ہے بہرحال یہ کسی بھی عوت کی طرف مائل نہیں ہوتا چنانچہ ظاہر ہوا کہ یہ مصیبت سے بچا رہے گا اور کامیاب ہوگا لیکن پھر یہ بات بھی ہے کہ زولولینڈ میں عورتیں ہے ہی کہاں ساری کی ساری بدصورت ہیں۔ گائیں اور بچھیائیں ہیں جو گائیں بن جائیں گی۔ وہشت"۔

وہ چند ثانیوں تک خاموش رہی اور پھر اپنی خوابناک آواز میں کہنے لگی۔

"اب اگر اس کی ملاقات اس عورت سے ہو جو صرف گائے اور بچھیا نہیں ہے بلکہ کچھ اور ہے جو خود اس کی طرح بلکہ اس سے بھی زیادہ ہوشیار ہے حالانکہ وہ سفید فام نہیں ہے تو پھر میں حیران ہوں کہ......"

اور جب وہ اس نقطہ پر پہنچی تو میں نے سوچا کہ اب جاگنا ہی مناسب ہوگا۔ چنانچہ میں نے اپنا سر گھما کر ایک جمائی لی، اپنی آنکھیں کھولیں اور جیسے خالی خالی نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگا دفعۃً اس کے بشرے پر کے جذبات تبدیل ہوگئے اور اب اس کا چہرہ ایک بے حد نسائی چہرہ تھا۔

"تم شاید مامینا ہو۔ ہے نا؟" میں نے کہا۔

"ہاں انکوسی" اس نے جواب دیا "یہی میرا نام ہے لیکن یہ تم نے کہاں سنا اور مجھے کس طرح پہچان لیا؟"

"میں نے تمہارا نام سادوکو سے" یہ نام سن کر اس کی ابرو پر بل پڑ گئے اور دوسروں سے سنا تھا رہی یہ بات کہ میں نے تمہیں کس طرح پہچان لیا تو اس کا تو جواب یہ ہے کہ مامینا کے علاوہ کوئی دوسری عورت اس قدر حسین نہیں ہوسکتی۔

یہ بات میں نے سوچ کر اور بڑے بچے تلے الفاظ میں کہی تھی چنانچہ مسکرانے لگی بڑی مسحور کن مسکراہٹ تھی اس کی اور پھر اس نے سر کو ہلکا سا جھٹکا دیا دل لوٹ لینے والا انداز تھا یہ۔

"واقعی؟" وہ بولی "یہ تو مجھے آج ہی معلوم ہوا کہ میں حسین بھی ہوں ورنہ میں تو ایک عام سی زولولڑکی ہوں جس کا دل رکھنے کے لئے ایک سفید فام آقا خواہ مخواہ کی تعریف کر رہا ہے بہرحال میں سفید فام آقا کی اس مہربانی کا شکریہ ادا کرتی ہوں اور اس نے اپنا ایک گھٹنا جھکا کر اور آداب کا اشارہ کرتے ہوئے مجھے سلام کیا۔

"لیکن اس نے جلدی سے کہنا شروع کیا" میں کچھ بھی ہوں اور کیسی بھی ہوں بہرحال اناڑی ہوں اور آپ کی تیمارداری کرنے کے قابل نہیں چنانچہ تم کہو تو میں جا کر اپنی سب سے بوڑھی ماں کو بھیج دوں۔"

"اپنی بوڑھی ماں سے تمہاری مراد اس عورت سے تو نہیں جس کو تمہارا باپ بوڑھی گائے کہتا ہے اور جس کا ایک کان اس نے بندوق کی گولی سے اڑا دیا تھا۔

تم نے جو حلیہ بیان کیا ہے اس سے میں سمجھتی ہوں کہ وہی ہے" مامینا نے ہنس کر کہا لیکن آج سے پہلے میں نے اپنے باپ کو اسے یہ نام دیتے نہیں سنا"

اور اگر سنا ہے تو تم بھول گئی ہو میں نے کہا لیکن میرے خیال میں میری تیمارداری کے لئے اسے نہ بھیجو تو ہی اچھا ہے شکریہ جب تم خود ہی تیمارداری کرسکتی ہو تو اس غریب آدمی کو تکلیف دینے سے کیا فائدہ؟ اب اگر اس تونبی میں دودھ ہو تو مجھے دو تھوڑا سا۔"

وہ ابابیل کی طرح لپکی اور دوسرے ہی لمحے وہ ایک ہاتھ سے دودھ کا پیالہ میرے ہونٹوں سے لگائے ہوئے تھی اور اس کا دوسرا ہاتھ میرے سر سے پیچھے تھا اور اسے اوپر اٹھائے ہوئے تھا۔

"یہ میری بڑی عزت افزائی ہے۔" وہ بولی۔

"میں تمہارے ہوش میں آنے سے ذرا ہی پہلے جھونپڑی میں آئی اور یہ دیکھ کر رو پڑی کہ تم اب بھی بے ہوش ہی ہو دیکھو میری آنکھیں اب بھی نم ہیں (اور حقیقت میں وہ نم تھیں اب یہ میں نہیں جانتا کہ وہ اپنی آنکھوں میں آنسو کس طرح لے آئی تھی) کیونکہ مجھے خوف ہوگیا تھا کہ تمہاری یہ غشی کہیں موت کا پیش خیمہ نہ ہو۔"

"اچھا بہت بہت شکریہ اس ہمدردی کا میں نے

کہا" اب چونکہ تمہارا یہ خوف بے بنیاد ثابت ہوا ہے اس لئے اب یہاں آکر بیٹھ جاؤ اور یہ بتاؤ کہ میں یہاں کیسے پہنچا۔

اور وہ بیٹھ گئی اور اس وقت یہ بات میں نے خصوصیت سے دیکھی کہ وہ عام افریقی عورتوں کی طرح فرش پر نہ بیٹھی بلکہ تپائی پر بیٹھی۔

انکوسی!" اس نے کہا" تمہیں درختوں کی ٹہنیوں کی بنی ہوئی ڈولی میں ڈال کر کرال میں لایا گیا تھا جب میں نے اس ڈولی کو بار برداروں کے شانوں پر آتے دیکھا تو میرا دل دھڑکنا بھول گیا۔ وہ لوہے کے ٹھنڈے ٹکڑے کی طرح بن گیا کیونکہ مجھے خیال آیا کہ ڈولی میں پڑی ہوئی لاش......"

"سادوکو کی ہے" میں نے لقمہ دیا۔

"نہیں...... بلکہ میں نے سوچا میرے باپ کی ہے۔"

"بہرحال ڈولی میں جو تھا وہ نہ سادوکو تھا اور نہ تمہارا باپ" میں نے کہا چنانچہ تمہیں یک گونہ خوشی حاصل ہوئی ہوگی۔"

"خوشی! مجھے خوشی کیوں حاصل ہونے لگی؟ کیا اپنے اس مہمان کے زخمی ہونے پر جس کے متعلق میں نے اتنی بہت سی باتیں سنی ہیں؟ یہ میری بدقسمتی تھی کہ جب یہ مہمان آیا تو میں کرال میں نہ تھی۔"

"ہاں بھئی...... اس وقت تم کرال میں کیوں نہ تھیں! میں سمجھتا ہوں اپنی سب سے بڑی ماں کے ساتھ کسی سلسلے میں تمہارا اختلاف رائے ہوگیا ہوگا۔

"ہاں...... انکوسی...... میری ماں تو مر چکی ہے اور یہاں میرے ساتھ کچھ اچھا سلوک نہیں کیا جاتا۔ وہ بڑھیا مجھے چڑیل اور ساحرہ کہتی ہے۔"

"اچھا...... بہرحال اس پر مجھے کوئی تعجب نہیں ہے" میں نے کہا" خیر...... آگے کہو۔"

"آگے کیا کہوں انکوسی! وہ لوگ تمہیں یہاں لے آئے اور انہوں نے مجھے بتایا کہ کس طرح ایک بھینسے نے جس میں کوئی بدروح گھسی ہوئی تھی، تمہیں اس تالاب میں مار ڈالنے کی کوشش کی تھی۔"

"یہ تو میں بھی جانتا ہوں لیکن یہ بتاؤ کہ اس تالاب میں سے میں کس طرح نکلا؟"

"سنا ہے کہ تمہارا ملازم سکاؤل تالاب میں کود پڑا اور اس نے بھینسے کو اپنی طرف متوجہ کرلیا۔ ادھر سادوکو چھلانگ لگا کر بھینسے کی پیٹھ پر سوار ہوگیا اور اپنا بھالا اس کے شانوں کے درمیان داخل کرکے دل تک اتار دیا۔ چنانچہ بھینسا مرگیا پھر ان لوگوں نے تمہیں تالاب کے کیچڑ میں سے گھسیٹ کر باہر نکالا اس وقت تم زندگی سے دور اور موت سے قریب تھے پھر تمہیں ہوش آیا لیکن اس کے بعد ایک بار پھر تم بے ہوش ہوگئے اور ابھی کچھ دیر پہلے تک بیہوش رہے اور کچھ الٹی سیدھی باتیں بکتے رہے۔

"یہ سادوکو تو واقعی بڑا بہادر آدمی ہے"

"بہرحال بکا ہی طرح، نہ ان سے کم اور نہ ان سے زیادہ، اس نے اپنے گول اور بھرے بھرے شانے اچکا کر جواب دیا" تو تمہارا خیال تھا کہ وہ تمہیں مرجانے دیتا انکوسی؟ میرے خیال میں تو بہادر آدمی وہ ہے جو بھینسے کے سامنے آکر اس کی ناک مروڑ دے نہ کہ وہ جو اس کی پیٹھ پر سوار ہوکر اس کے بدن میں بھالا اتار دے"

ہماری گفتگو یہاں تک پہنچی تھی کہ ایک بار پھر مجھ پر غشی طاری ہوگئی اور نہ صرف باتوں سے بلکہ اس دلچسپ اور پراسرار عورت مامینا سے بھی میرا رابطہ عارضی طور پر ختم ہوگیا۔

جب مجھے دوبارہ ہوش آیا ہے تو مامینا وہاں نہ تھی۔ اس کی جگہ بوڑھا اوبیزی جھونپڑی میں آگیا تھا ایک بات پھر میں نے خصوصیت سے دیکھی، اوبیزی نے جھونپڑی کے کونے میں پڑی ہوئی پرانی چٹائی اٹھائی تھی اور اسے تہہ کرکے اور اس کی گدی سی بنا کر اس پر بیٹھ گیا تھا۔

جب اس نے دیکھا کہ میں جاگ گیا ہوں تو وہ بولا:۔

''سلام میکومیزن اب حال کیا ہے؟''

''بس زندہ ہوں تمہارا حال کیسا ہے؟''

''بہت برا میکومیزن بہت ہی برا، میرے کولہے ایسے ہو رہے ہیں کہ اب بھی بیٹھنے میں اچھی خاصی تکلیف ہوتی ہے اس مردود بھینسے کی ناک، معلوم ہوتا ہے پتھر کی طرح سخت اور کھردری تھی اس کے علاوہ میرے آگے بھی سخت تکلیف ہے کیونکہ وہ سکاؤل سور درخت پر سے اترتے وقت سیدھا مجھ پر گرا تھا۔ اس کے علاوہ ہمارے نقصانات کی وجہ سے میرے دل کے بھی دو ٹکڑے ہو گئے ہیں۔''

''نقصانات! نقصانات کیسے؟''

''بات یوں ہوئی میکومیزن کہ ان بیوقوفوں نے نرسلوں میں جو آگ لگائی تھی وہ ہمارے پڑاؤ تک نہ صرف پہنچ گئی بلکہ اس نے ہماری ہر چیز کو جلا ڈالا گوشت کھالیں، حتیٰ کہ اس نے ہاتھی دانت کو بھی چٹخا کر بیکار کر دیا۔ بڑی منحوس مہم تھی۔ وہ میکومیزن حالانکہ اس کی ابتدائی بڑی شاندار اور امید افزا تھی۔ بہرحال ہم اس مہم پر سے اس طرح واپس آئے ہیں کہ ننگے تھے، کم سے کم میں تو ننگا ہی تھا۔ ہاں میکومیزن ہم کچھ لے کر نہ آئے سوائے اس پھٹے ہوئے سینگ والے بھینسے کے سر کے اور یہ بھی میں اس لئے ساتھ لے آیا کہ شاید تم اسے یادگار کے طور پر اپنے پاس رکھنا پسند کرو گے۔''

''اماہزی! یہ کیا کم ہے کہ ہم سب کے سب اپنی جانیں سلامت لائے بشرطیکہ میں زندہ رہا۔''

''بے شک تم زندہ رہو گے میکومیزن، ہمارے یہاں کے دو بہترین وچ ڈاکٹروں نے تمہارا معائنہ کرنے کے بعد یہی کہا ہے۔ ان میں سے ایک نے تمہاری پسلیوں پر یہ کھالیں لپیٹ دی ہیں میں نے اس سے وعدہ کیا ہے کہ اگر تم اچھے ہو گئے تو اسے ایک بچھڑا دوں گا اور ایک بکری تو میں اسے دے بھی چکا ہوں پیشگی لیکن اس نے کہا ہے کہ تمہیں ایک آدھ مہینے تک یہیں لیٹے رہنا پڑے گا اس عرصے میں پانڈا نے وہ ڈھالیں منگوا بھیجیں جو اس نے طلب کی تھیں چنانچہ اس کی مانگ پوری کرنے کے لئے مجھے اپنے اور اپنے کرال کے امرا کے پچیس جانور ذبح کر کے ان کی کھالوں سے ڈھالیں بنانی پڑیں۔

''کاش کہ تم نے اور تمہارے امراء نے پہلے ہی سے ایسا کیا ہوتا تو ہمیں بھینسوں کے اس ریوڑ کے شکار کو جانے کی ضرورت نہ پڑتی۔ میں نے کراہ کر جواب دیا کیونکہ میری پسلیاں بری طرح سے درد کر رہی تھیں۔'' سادو کو اور سکاؤل کو بلا بھیجو کہ میں ان کا شکریہ ادا کروں۔ اگر وہ دونوں نہ ہوتے تو اس وقت میں زندہ بھی نہ ہوتا۔

چنانچہ دوسرے دن صبح وہ دونوں میرے پاس آئے اور میں نے بڑی گرم جوشی سے ان کا شکریہ ادا کیا۔

''بس...... بس......'' سکاؤل نے کہا۔

وہ خوشی سے رو رہا تھا اور میں دیکھ رہا تھا کہ اس کے آنسو اس کی کوبڑی ناک کے دائیں بائیں بہہ رہے تھے۔ یہ ایسے آنسو نہ تھے جو میں نے ماینا کی آنکھوں میں دیکھے تھے بلکہ یہ حقیقی آنسو تھے جو میرے وفادار ملازم کی آنکھیں اس لئے بہا رہی تھیں کہ میں نہ صرف موت کی دہلیز سے لوٹ آیا تھا بلکہ مجھے ہوش بھی آ گیا تھا۔

''بس میکومیزن، اب آگے کچھ نہ کہو'' سکاؤل نے کہا اگر تم مر گئے تو پھر میں بھی مر جاؤں گا کیونکہ اگر تم مجھے سہارا نہ دیتے تو آج میرا کوئی سہارا نہ ہوتا اور اس وقت میں اس دنیا میں بھٹک رہا ہوتا جو رحم و کرم کے نام تک سے واقف نہیں ہے یہی وجہ ہے کہ میں تالاب میں کود پڑا میکومیزن اس لئے نہیں کہ میں بہادر ہوں۔

یہ سن کر خود میری آنکھیں پرنم ہو گئیں۔ سیاہ فاموں کو گالیاں دینا ایک فیشن بن گیا ہے لیکن میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ ان کافروں میں جنہیں ہم وحشی اور جاہل کہتے ہیں جو خلوص جو محبت اور جو جان نثاری ملتی ہے اس کا شائبہ تک ہم مہذب لوگوں میں نہیں۔

''رہا میں انکوسی'' سادو کو نے کہا ''تو میں نے تو اپنا

فرض ادا کیا ہے انکوسی اگر تم کو وہ بھینسا ختم کر دیتا اور میں زندہ لوٹ آتا تو لوگ میرے جنم پر تھوکتے اور لڑکیاں میری ہنسی اڑاتیں۔ لیکن سچ کہتا ہوں میکومیزن اس بھینسے کی کھال بڑی سخت تھی میرا تو خیال تھا کہ بھالا اس میں اترے گا ہی نہیں۔

اب یہاں میں اپنا بیان روک کر اپنے قارئین سے درخواست کروں گا کہ وہ نہ صرف میرا نمکخوار ہے بلکہ مجھ سے ایسی محبت بھی کرتا ہے جیسا کہ ایک کتا اپنے آقا سے کرتا ہے حالانکہ کئی دفعہ میں نے نہ صرف اسے سخت کہا بلکہ ذرا سی غلطی پر پیٹا بھی تھا اور دوسرا اس لئے میری جان بچاتا ہے کہ اس کی عزت اور توقیر پر آنچ نہ آئے، اس پر بزدلی کا شبہ نہ لگ جائے اس کے علاوہ اسے شاید یہ خیال بھی آیا ہو کہ اگر میں مر گیا تو ہانگو پر حملہ کرنے اور اس کے مویشی حاصل کرنے اور ان کے عوض ماینا کو اپنی بیوی بنانے کا ارادہ خاک میں مل جائے گا۔ ہو سکتا ہے کہ میرا یہ خیال غلط ہو اور ہو سکتا ہے کہ میری بات آپ کو سخت معلوم ہوئی ہو اس کے باوجود میں کہے بغیر نہیں رہ سکتا تھا کہ سادو کو کے پیش نظر ہمیشہ اپنا ہی مفاد رہتا تھا خصوصاً ماینا کے سلسلے میں جسے وہ دل و جان سے چاہتا تھا اور یہاں مجھے یہ بھی کہنا پڑتا ہے کہ زولوؤں میں سادو کو وہ پہلا اور شاید آخری شخص تھا جس نے کسی بھی لڑکی کو سچے دل سے چاہا تھا۔

تھوڑی دیر بعد سکاؤل میرے لئے سوپ یا شاید دلیہ بنانے چلا گیا اس جھونپڑی میں، میں اور سادو کو اکیلے تھے چنانچہ اس نے فوراً اپنا پسندیدہ موضوع چھیڑ دیا۔

''میکومیزن میں نے سنا ہے کہ ماینا تمہارے پاس آئی تھی'' وہ بولا ''سچ کہنا میکومیزن وہ خوبصورت ہے کہ نہیں۔''

''ہاں بہت خوبصورت'' میں نے جواب دیا ''کم سے کم زولوؤں میں تو میں نے ایسی حسین لڑکی نہیں دیکھی۔''

''اور بہت ذہین بھی کسی بھی سفید فام کی طرح ذہین اور ہوشیار ہے؟''

''ہاں بہت ہوشیار بلکہ کئی سفید فاموں سے بھی زیادہ ہوشیار''

''اور کچھ میکومیزن؟''

''کیا؟''

''بہت زیادہ خطرناک بھی ہے ہوا کی طرح جو سکون بھی بخشتی ہے لیکن تباہی بھی مچا دیتی ہے۔''

سادو کو چند ثانیوں تک ایک سوچ میں پڑ گیا۔ پھر بولا۔

''میکومیزن! دوسروں کے لئے وہ کیسی ہے اور کیا ہے اس سے مجھے کیا مجھے وہ سکون بخشے تو میرے لئے یہی غنیمت ہے۔''

''اور وہ تمہارے لئے باعث سکون ہے سادو کو؟ مائل ہے تمہاری طرف؟''

''پوری طرح سے نہیں میکومیزن، میرے لئے تو فی الحال وہ اس ہوا کی طرح ہے جو طوفان سے پہلے چلتی ہے۔''

''اور یقین کرو سادو کو یہ ہوا بڑی خطرناک اور بے چین کر دینے والی ہوتی ہے کیونکہ وہ طوفان کی نقیب ہوتی ہے؟''

''یہ تو میں یقین سے کہتا ہوں میکومیزن کہ طوفان ضرور آئے گا کیونکہ وہ ایک طوفانی رات میں پیدا ہوئی تھی اور طوفان اس کے جلو میں چلتے ہیں لیکن اگر ہم دونوں ساتھ ہوں تو پھر ان طوفانوں کا مقابلہ کر سکتے ہیں میں اس سے محبت کرتا ہوں اور کسی دوسری عورت کے ساتھ رہنے پر ماینا کے ساتھ مرنے کو ترجیح دیتا ہوں۔''

''سوال یہ نہیں ہے سادو کو بلکہ یہ ہے کہ کیا خود ماینا دوسرے مرد کے ساتھ رہنے پر تمہارے ساتھ مرنے کو ترجیح دیتی ہے؟ اس نے یہ کہا ہے کبھی؟''

''میکومیزن! ماینا کے خیالات اندھیرے میں اپنا کام کرتی ہیں ان چیونٹیوں کی طرح جو زیر زمین سرنگ بناتی چلی جاتی ہیں تم وہ سرنگ تو دیکھ سکتے ہو جو یہ پتہ دیتی ہے کہ وہ سوچ رہی ہے لیکن اس میں رینگتے

ہوئے خیال اور ارادے کو تم نہیں دیکھ سکتے اس کے باوجود بعض اوقات جب وہ سمجھتی ہے کہ کوئی دیکھ اور سن نہیں رہا تو اس کے یہ خیالات سرنگ سے جھانکنے لگتے ہیں اور یہاں مجھے مامینا کی وہ خود کلامی یاد آ گئی جو اس نے مجھے بے ہوش سمجھ کر اور میرے بستر کے قریب کھڑے ہو کر کی تھی۔

''یا جب وہ حیرت زدہ ہو جاتی ہے تو خود بخود اس کے خیالات ظاہر ہو جاتے ہیں'' سادوکو نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا ''ایسا ہی واقعہ گزشتہ کل ہوا تھا۔''

''کیا ہوا تھا؟'' میں نے بظاہر بے پروائی سے پوچھا حالانکہ میرا دل یہ واقعہ معلوم کرنے کے لئے بے چین تھا۔

''جب اسے معلوم ہو گیا کہ میں نے پھیلے ہوئے سینگ والے بھینسے کو اپنے بھالے سے ختم کر دیا ہے تو اس نے موقع غنیمت جان کر اس کے سامنے اظہار محبت کرتے ہوئے پوچھا کہ کیا وہ بھی مجھ سے محبت کرتی ہے۔''

''یقین سے نہیں کہہ سکتی'' اس نے جواب دیا ''اور کیسے کہہ سکتی ہوں؟ یہ ہمارے یہاں کی رسم ہے کہ لڑکی شادی سے پہلے محبت نہیں کر سکتی کیونکہ اگر لڑکیاں ایسا کرنے لگ جائیں تو پھر لڑکیوں کا سودا مویشیوں کے بجائے دل سے ہو۔ نتیجہ یہ ہو کہ زولولینڈ کے سارے نہیں تو آدھے باپ مفلس وقلاش بن جائیں اور لڑکیوں کی پرورش کرنے سے انکار کر دیں کیونکہ ان سے انہیں کوئی فائدے کی امید نہ ہو تو پھر اس کی پرورش کے سلسلے میں کچھ بھی خرچ کیوں کریں؟ سادوکو! تم بہادر ہو اور خاندانی ہو چنانچہ میں کسی دوسرے مرد کی بیوی بننے سے زیادہ تمہاری بیوی بننا پسند کرتی بشرطیکہ تم امیر ہوتے بلکہ اس سے بھی زیادہ یہ کہ صاحب اختیار ہوتے۔ سادوکو! امیر بن جاؤ اور قوت اور صاحب اختیار بن جاؤ اور اس کے بعد شاید میں تم سے محبت کروں گی۔''

''بہت اچھا مامینا، میں امیر بھی بنوں گا اور صاحب اختیار بھی، میں نے جواب دیا'' لیکن تمہیں انتظار کرنا ہوگا شاید طویل انتظار۔ تم جانو زولو قوم صرف ایک دن میں قوم نہیں بن گئی تھی اسے بڑے صبر و سکون سے شاکا کا انتظار کرنا پڑا تھا۔''

''شاکا'' وہ بولی اور میکومیزن اس کی آنکھیں چمکنے لگیں ''شاکا...... ہاں وہ تھا مرد...... سادوکو! تم دوسرے شاکا بن جاؤ اور میں تم سے ایسی محبت کروں گی کہ کبھی کسی عورت نے کسی مرد سے نہ کی ہوگی۔ اس طرح...... اور اس طرح''

اور میکومیزن اس نے میری گردن میں اپنی بانہیں ڈال دیں اور میرے ہونٹ اس طرح چوم لئے کہ پہلے کبھی کسی لڑکی نے میرے اور کسی کے بھی اس طرح نہ چومے ہوں گے اور یہ تو تم جانتے ہی ہو میکومیزن کہ زولولینڈ میں کسی بھی لڑکی کا مردوں کے ہونٹ چومنا معیوب سمجھا جاتا ہے پھر اس نے ہنس کر مجھے اپنے سے دور دھکیل دیا اور بولی۔

''رہی یہ بات کہ مجھے انتظار کرنا پڑے گا تو اس کی درخواست تم میرے باپ سے کرو۔ تم جانو میں تو اپنے باپ کی بکاؤ بچھیا ہوں چنانچہ تم ہی بتاؤ کیا میں ان کے حکم سے سرتابی کر سکتی ہوں؟''

اور وہ چلی گئی اور اپنے ساتھ میری روح اور میرا سب کچھ لے گئی اور میں اپنے آپ کو خالی خالی محسوس کرنے لگا اور اب وہ کبھی مجھ سے ایسی بات کرے گی چیونٹی اپنی سرنگ میں واپس چلی گئی ہے میکومیزن۔''

''اور تم نے اس کے باپ سے بات چیت کی؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں کی...... لیکن بڑے منحوس وقت میں۔''

''منحوس وقت میں!''

''ہاں میکومیزن۔ کیونکہ پانڈا کے لئے ڈھالیں بنانے کے لئے اس نے ابھی ابھی اپنے مویشی ذبح کئے تھے چنانچہ اس کا مزاج برہم تھا اس نے بڑی کھائی سے مجھ سے بات کی۔ اس نے کہا'' یہ مویشی دیکھ رہے ہو جو ہم نے پانڈا کے غضب سے بچنے کے لئے ذبح کئے

ہیں؟ دیکھ رہے ہو نا؟ بہت اچھا ان سے پانچ گنے مویشی لے آؤ اس کے بعد ہی میں اپنی بیٹی کے متعلق تم سے باتیں کروں گا۔''

میں نے جواب دیا کہ میں اس کا غم سمجھتا ہوں اور اس کے اس نقصان کی تلافی کرنے کی ہر ممکن کوشش کروں گا اس پر اومبیزی نرم پڑ گیا کیونکہ وہ فطرتاً نرم دل بوڑھا ہے۔

''میرے بیٹے'' وہ بولا ''میں تمہیں شروع سے ہی پسند کرتا ہوں اور میرے دوست میکومیزن کو اس نالائق بھینسے سے بچانے کے بعد تو میں تمہیں اور بھی زیادہ پسند کرنے لگا ہوں۔ اس کے باوجود تم میری حالت سے واقف ہو میں بوڑھا ہوں ایک قبیلے کا سردار ہوں چنانچہ بہت سے لوگوں کے پیٹ مجھے پالنے پڑتے ہیں۔ لیکن میں غریب ہوں اور میری یہ بیٹی خاص قیمت مجھے دلوا سکتی ہے۔ بہت کم مردوں نے ایسی بیٹی پیدا کی ہوگی چنانچہ مجھے اس سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کی کوشش کرنی چاہئے میرے داماد کو ایسا ہونا چاہئے کہ وہ میرے بڑھاپے کا سہارا بنے تاکہ جب مجھ پر کوئی مصیبت آ جائے تو اور ضرورت کے وقت میں اس کی طرف دوڑ جاؤں اور اس لکڑی کے کندے پر سے چھال اکھاڑ کر اور اسے جلا کر اپنے بوڑھے جسم میں گرمی پہنچاؤں ہاں مجھے ایسا داماد نہیں چاہئے جو مجھے کائی میں دھنسا دے جس طرح کہ اس نالائق بھینسے نے میکومیزن کو دھنسا دیا تھا۔ بس میں کہہ چکا اور اس قسم کی باتیں مجھے پسند نہیں۔ مویشی لے کر واپس آؤ اور پھر میں صبر و سکون سے تمہاری ہر درخواست سنوں گا لیکن یہ سمجھ لو کہ میں تم سے اور کسی سے بھی کوئی وعدہ نہیں کر رہا میری روح جو کچھ میرے لئے بھیج دے گی وہ میں قبول کر لوں گا اور اگر ماضی کو مدنظر رکھ کر مستقبل کے متعلق اندازہ لگایا جا سکتا ہے تو پھر میں کہہ سکتا ہوں کہ میں جو کچھ قبول کروں گا وہ زیادہ نہ ہوگا۔ ایک بات اور زیادہ دنوں تک اس کرال میں نہ رہنا مبادا لوگ یہ سمجھ لیں کہ میں نے تمہیں مامینا کے منگیتر کے طور پر قبول اور پسند کر لیا ہے، یہاں سے جاؤ سادوکو، مرد کا سا کام کرو اور مرد کا سا تحفہ لے کر آؤ، اور اگر یہ تحفہ تم نہیں لا سکتے تو مناسب ہوگا کہ کبھی اس طرف کا رخ نہ کرو۔''

''امبیزی کی باتیں بے بنیاد نہیں ہیں'' میں نے کہا ''اور اب کیا ارادے ہیں سادوکو؟''

''میرا ارادہ تو یہ ہے میکومیزن!'' سادوکو نے اٹھتے ہوئے کہا ''میں فوراً یہاں سے روانہ ہو کر ان لوگوں کو جمع کروں جو میرے دوست اور میرے حمایتی ہیں کیونکہ میں اب بھی اپنے باپ کا بیٹا اور آمادانگے کا سردار ہوں، حالانکہ میرا کوئی کرال نہیں، میرے کسی عزیز کی چھت سلامت نہیں، پھر ایک چاند بعد امید ہے کہ میں یہاں واپس آ جاؤں گا۔ تب تک تم تندرست ہو چکے ہو گے۔ پھر ہم بانگو پر چڑھائی کر دیں گے جیسا کہ میں تم سے کہہ چکا ہوں اور یہ چڑھائی شاہ زولو کی اجازت سے ہوگی جو وعدہ کر چکا ہے کہ میں بانگو کے سارے مویشی اپنے قبضے میں رکھ سکتا ہوں۔''

''یہ تو میں نہیں کہہ سکتا میں تمہارے ساتھ چلوں گا ہی، تم جانو میں نے تم سے یہ وعدہ نہیں کیا ہے کہ میں بانگو کے خلاف جنگ کروں گا خواہ شاہ زولو اس کی اجازت دے یا نہ دے۔''

''بے شک تم نے وعدہ نہیں کیا میکومیزن لیکن زولولینڈ کے عظیم بونے ساحر زکالی نے کہا ہے کہ تم میرا ساتھ دو گے اور تم جانتے ہو زکالی کی پیشنگوئی غلط نہیں ہوئی اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر کہو میکومیزن کہ اس کے پھیلے ہوئے سینگ والے بھینسے خشک دریا اور تالاب کے متعلق پیشنگوئی غلط تھی؟ الوداع میکومیزن! میں پو پھٹتے ہی یہاں سے روانہ ہو جاؤں گا اور میں مامینا کو تمہاری حفاظت میں دے جاتا ہوں۔''

''تمہارا مطلب ہے کہ تم مجھے مامینا کی حفاظت میں دیئے جاتے ہو'' میں نے کہنا شروع کیا۔

لیکن سادوکو نے میری بات ان سنی کر دی کیونکہ وہ چاروں ہاتھوں پیروں کے بل چلتا ہوا جھونپڑی کے دروازے میں سے باہر نکل رہا تھا۔

سادو کو مجھے ماینا کے سپرد کر گیا تھا اور مجھے کہنا پڑتا ہے ماینا ہر طرح سے میرا خیال آرام کا خیال کر رہی تھی حالانکہ وہ ہر دم میرے پاس نہ رہتی تھی۔

''بوڑھی گائے'' سے مجھے کچھ نفرت سی ہو گئی تھی اور ماینا اس سے واقف تھی چنانچہ اس کی گالیوں اور کوسنوں کی پرواہ کئے بغیر وہ اسے میرے پاس نہ آنے دیتی تھی۔ وہ خود میری پسلیوں کی پٹیاں بدلتی اور اپنی زیر نگرانی میرے لئے کھانا پکواتی۔ اس سلسلے میں اس کے اور سکاؤل کے درمیان کئی دفعہ نوک جھونک ہو گئی کیونکہ سکاؤل ماینا کو پسند نہ کرتا تھا خصوصاً اس لئے کہ اس نے سکاؤل پر ڈورے ڈالنے کی کوشش نہ کی تھی۔ اس کے علاوہ جب میری قوت عود کر آئی تو ماینا بہت زیادہ دیر تک میرے پاس بیٹھنے لگی کیونکہ وہ ان سارے کاموں سے بری تھی جو کافر عورتیں اپنی قسمت میں لکھا کر لاتی ہیں یعنی کھیتوں اور گھر کے کاموں سے حتیٰ کہ وہ بقول شخصے، ایک تنکا توڑ کر دو نہ کرتی تھی'' وہ اپنے باپ کے کرال کا زیور اور یہاں یہ میں اپنی طرف سے اضافہ کردوں چلتا پھرتا اشتہار تھی دوسری عورتیں کام کرتی تھیں اور ماینا ان کے کام کی نگراں تھی۔

ہم دونوں تقریباً ہر موضوع پر بحث کرتے مذاہب عالم سے لے کر دنیا کی سیاست تک ماینا کو علم کی پیاس تھی جو کسی صورت بجھتی نظر نہ آتی تھی۔ لیکن اسے سب سے زیادہ دلچسپی زولولینڈ کے حالات سے تھی جن سے میں بہت زیادہ واقف تھا اور میری اس واقفیت سے خدا جانے کس طرح خود ماینا واقف ہو گئی تھی اور یہ حقیقت بھی ہے کہ میں نے زولولینڈ کی تاریخ میں بڑا زبردست کردار ادا کیا تھا شاہان زولو میری عزت کرتے تھے اور میں بوڑوں اور حکومت ناٹال کے ارادوں سے واقف تھا۔

وہ پوچھتی تھی کہ فرض کرو کہ بوڑھا زولو بادشاہ پانڈا مر جائے تو تمہارے خیال میں اس کی جگہ تخت پر کون بیٹھے گا؟

اس کے ان سوالوں کا میں نے یہ جواب دیا کہ میں نہ تو کاہن ہوں اور نہ پیش گو چنانچہ مناسب ہوگا کہ یہ سوال وہ زکالی سے پوچھے۔

''بہت اچھا خیال ہے'' وہ خوش ہو کر بولی ''لیکن مشکل یہ ہے کہ کوئی ایسا ہے نہیں جو مجھے زکالی کے پاس لے جائے اور میرا باپ سادو کو کے ساتھ جانے نہ دے گا۔

وہ چند ثانیوں تک خاموش رہی اور تالی بجا کر بولی۔

''میکومیزن! تم لے جاؤ گے مجھے زکالی کے پاس؟ میرا باپ تم پر اعتبار کرے گا۔''

''یقیناً کرے گا'' میں نے جواب دیا ''لیکن سوال یہ ہے تم میرے ساتھ ہو گی تو کیا اس صورت میں خود اپنے آپ پر اعتبار کر سکوں گا؟''

''کیا مطلب؟'' اس نے پوچھا۔ ''اوہ سمجھی..... تو معلوم ہوا کہ میں تمہارے لئے ایک کالا کھلونا نہیں بلکہ اس سے بڑھ کر کچھ اور ہوں۔''

اور میرے خیال میں میرا...... یہی بدقسمت مذاق تھا جس نے ماینا کو کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا اور اس کے دماغ میں ان خیالات اور اس کے دل میں ان ارادوں نے جنم لیا جو پہلے وہاں نہ تھے اور وہ وہ ہو گئی جسے سادو کو نے ''اپنی سرنگ میں چیونٹی'' کہا تھا۔ بہرحال مجھ سے اس کا سلوک ایک دم سے بدل گیا اب وہ میرا بہت زیادہ ادب کرنے لگی وہ میری ہر بات کو بڑے غور اور خاموشی سے یوں سنتی جیسے میری ہر بات سند ہو۔ وہ میری طرف اپنی خوبصورت آنکھوں سے یوں دیکھتی جیسے میں کوئی خوبصورت اور قابل تعریف چیز ہوں جس پر سے وہ اپنی نگاہیں نہ ہٹا سکتی ہو۔ معاملہ یہاں تک پہنچا کہ وہ میرے سامنے اپنی مشکلات بیان کرنے لگی اور پھر اپنے ارادوں کا اظہار کرنے لگی۔ اس نے سادو کو کے معاملے میں میری رائے پوچھی۔ اس کا جواب میں نے یہ دیا کہ اگر وہ سادو کو سے محبت کرتی ہے اور اگر اس کا باپ امبیزی اجازت دے تو وہ بے شک سادو کو سے شادی کر لے۔

(جاری ہے)

خونی آئینہ

نادیہ مجید



غصے میں آ کر اس نے آئینہ توڑ دیا اور وہیں بیٹھ کر رونے لگی اور بے ہوش ہو گئی رات کو جب ملازمہ شہلا سے کھانے کا کہنے آئی تو اس نے دیکھا کہ شہلا فرش پر بے سدھ گری پڑی ہے

مسٹر آفندی کار ایکسیڈنٹ میں انتقال کر گئے مسٹر آفندی کی اچانک موت سے مسز آفندی کو بہت صدمہ ہوا وہ تین دن تک بے ہوش رہی۔ تین دن کے بعد جب مسز آفندی کو ہوش آیا تو انہیں یوں لگا کہ جیسے ان کے جینے کا اب کوئی فائدہ نہیں ہے وہ خودکشی کرنا چاہتی تھیں مگر جیسے ہی انہیں اپنی سات سالہ بیٹی شہلا کا خیال آیا مسز آفندی کو اپنا فیصلہ بدلنا پڑا۔ مسز آفندی نے خود کو اپنی بیٹی کے لئے زندہ رکھا انہوں نے عدت ختم ہونے کے بعد اپنے مرحوم شوہر کی امپورٹ ایکسپورٹ کی کمپنی سنبھال لی اور اس کمپنی کی ترقی کے لئے دوڑ دھوپ کرنے لگیں۔ مسز آفندی نے نہ اپنے آرام کا خیال کیا نہ اپنی صحت کا ان کو کچھ خبر نہ تھی کہ دن کب ہوا اور رات کب ختم ہوئی۔ مسز آفندی کو تو بس کام کرنے کا جنون تھا وہ اپنے مرحوم شوہر کی کمپنی ملک کی نامور کمپنیوں میں شمار کروانا چاہتی تھیں ایسی جدوجہد میں انہیں اپنی اکلوتی بیٹی کا خیال بھی نہ رہا انہوں نے شہلا کے لئے ایک گورنس مقرر کر دی مگر دنیا کی کوئی عورت ماں کی جگہ نہیں لے سکتی شہلا کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا وہ احساس کمتری کا شکار ہو گئی دن تیزی سے گزرنے لگے شہلا نے میٹرک کا امتحان سیکنڈ ڈویژن سے پاس کیا اور کالج میں ایڈمیشن لے لیا۔ کالج میں اس کی دوستی ثناء سے ہوئی جو ایک خوبصورت ہنس

مکھ اور باتونی لڑکی تھی ثناء کے تین دوست اور تھے جن میں دو لڑکے اور ایک لڑکی تھی ارم، عمران اور سیف، ارم اور عمران کی منگنی ہو چکی تھی سیف بھی ان کا کلاس فیلو تھا شہلا کو جب سیف پہلی نظر میں ہی پسند آ گیا ثناء گروپ سے دوستی کرنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ شہلا سیف کو اپنا دل دے بیٹھی تھی۔

ایک دفعہ تمام دوستوں نے مل کر پکنک منانے کا فیصلہ کیا چیزیں خرید کر وہ لوگ پکنک کی جگہ پر اکٹھے ہوئے وہاں پر بہت سی باتیں کی پھر کرکٹ کھیلی اس کے بعد راکٹ تھمتل سے بیڈمنٹن کا آغاز کیا اور جب وہ تھک گئے تو شام ہونے سے کافی دیر پہلے انہوں نے پارسل گیم کا آغاز کیا سیف کے ساتھ ثنا اور سامنے شہلا بیٹھی تھی جب کہ ارم اور عمران آمنے سامنے بیٹھے تھے یہ تمام لوگ دائرے کی صورت میں بیٹھے تھے اچانک ڈبہ سیف کے ہاتھ میں رکا تو پرچی پر لکھا تھا کہ سامنے والے کو رومانٹک ڈائیلاگ کہو۔ سیف کے سامنے شہلا بیٹھی تھی۔ جب ثناء نے لکھی ہوئی بات کو زور سے پڑھا تو شہلا کو یوں لگا کہ جیسے اس کے دل کے تاروں کو کسی نے چھیڑ دیا ہو مارے رم کے اس کا چہرہ سرخ ہو گیا سیف نے پرچی کو فوراً پھاڑ دیا اور کہا مجھ پر جرمانہ ہو گیا اس لئے میں شام کو آئسکریم کھلاؤں گا۔ شہلا کو سیف کا ڈیو کرنا بہت برا لگا مگر اس نے اظہار نہ کیا گیم پھر شروع ہو گئی اور فضا میں پھر قہقہے گونجنے لگے سیف پر ایک بار پھر باری آئی اور اس بار پرچی پر لکھا تھا کہ اپنی پسندیدہ شخصیت کو پھول دو۔ سیف فوراً بھاگ کر گیا اور ایک گلاب توڑ کر لایا اور ثناء کو دے دیا سب ہنسنے لگے مگر شہلا کے اندر تو گویا کسی نے آگ لگا دی وہ سب کو چھوڑ کر وہاں سے چلی گئی گھر آ کر اس نے خود کو کمرے میں بند کر لیا اور ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے کے سامنے کھڑی ہو گئی اور رونے لگی اسے خود پر غصہ آ گیا کہ وہ بہت زیادہ خوبصورت کیوں نہیں ہے سیف اسے کیوں نہیں چاہتا ہے۔ غصے میں آ کر اس نے آئینہ توڑ دیا اور وہیں بیٹھ کر رونے لگی اور بے ہوش ہو گئی رات کو جب ملازمہ شہلا سے کھانے کا کہنے آئی تو اس نے دیکھا کہ شہلا فرش پر بے سدھ گری پڑی ہے اس نے جلدی سے مسز آفندی کو بلایا مسز آفندی نے ڈاکٹر آصف کو فون کیا۔

شہلا نے آنکھیں کھولیں تو خود کو بستر پر پایا ڈاکٹر آصف اس کی ماما کو ہدایت دے رہے تھے ڈاکٹر آصف کے جانے کے بعد شہلا کی ماما مسز آفندی شہلا کے قریب آئی اور پیار سے شہلا کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگی اور کہا ”بیٹا تم نے ایسا کیوں کیا ڈاکٹر آصف کہہ رہے تھے کہ تم شدید ذہنی دباؤ کا شکار ہو۔ تم مجھے اپنی پریشانی بتاؤ۔ شہلا نے کہا کچھ نہیں ماما کوئی خاص بات نہیں ہے۔

دوسرے دن مسز آفندی اور شہلا طارق فرنیچر شاپ میں موجود تھے یہ فرنیچر شاپ کراچی کی مشہور فرنیچر شاپ تھی مسز آفندی جو کہ مسٹر طارق کو جانتی تھی وہ مسٹر طارق سے باتیں کرنے لگی جب کہ شہلا شاپ میں موجود ڈریسنگ ٹیبل کو دیکھنے لگی ابھی تک اسے کوئی ڈریسنگ ٹیبل پسند نہ آیا تھا اچانک ایک ڈریسنگ ٹیبل پر پڑا پردہ خود بخود نیچے گر گیا شہلا اس ڈریسنگ ٹیبل کی طرف متوجہ ہوئی وہ ایک عام سا ڈریسنگ ٹیبل تھا۔ شہلا نے آگے قدم بڑھانے چاہے مگر اچانک کسی انجانی قوت نے اس کے قدم روک لیے اچانک شہلا کو آئینے میں سے آواز سنائی دی ایک عجیب آواز جسے سن کر شہلا کا دماغ ماؤف ہو گیا آواز ڈراؤنی، بھاری اور غضب ناک تھی یوں محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے بادل گرج رہے ہوں اس بھیانک آواز نے شہلا کو مخاطب کیا۔

”شہلا تم میری غلام ہو۔ میں تمہارا آقا ہوں میں جو حکم دوں گا تم کو تعمیل کرنی ہوگی۔ بدلے میں تم جو چاہے حاصل کر سکوں گی۔ شہلا نے اپنا سر اثبات میں ہلا دیا۔ اس کے چہرے پر منحوس پراسرار مسکراہٹ رینگنے لگی یہ ڈریسنگ ٹیبل پسند ہے۔ شہلا نے اثبات میں سر ہلا دیا اور شاپ سے نکل کر باہر گاڑی میں جا بیٹھی مسز آفندی پہلے تو حیران ہوئی اس کے بعد انہوں

نے ڈریسنگ ٹیبل کی قیمت ادا کی اور کہا کہ یہ ڈریسنگ ٹیبل میرے گھر بھجوا دیں وہ باہر آ کر گاڑی میں شہلا کے ساتھ بیٹھ گئی اور ڈرائیور کو گھر چلنے کے لئے کہا۔ مسز آفندی کو پہلی بار شہلا کے ساتھ بیٹھنے سے اجنبیت کا احساس ہو رہا تھا انہوں نے حیرانگی سے شہلا کی طرف دیکھا تو شہلا کے منہ پر پراسرار مسکراہٹ رینگ رہی تھی اس کی آنکھوں میں بے پناہ چمک تھی۔

کالج میں ثناء اور ارم نے شہلا سے اس کے اس طرح اچانک چلے جانے کی وجہ پوچھی تو شہلا نے سر درد کا بہانہ بنا کر انہیں مطمئن کر دیا۔

ایک شام شہلا نہا کر باتھ روم سے باہر نکلی اس نے اپنا بالوں میں برش کرنے کے لئے برش اٹھایا اور آئینے کے سامنے آ کھڑی ہوئی آئینے کے سامنے کھڑی ہو کر جب اس نے خود کو دیکھا تو وہ دیکھتی رہ گئی اس نے بھرپور نظروں سے اپنے پورے وجود کو دیکھا آج اسے اپنا آپ بہت خوابصورت لگ رہا تھا اچانک آئینے کے سامنے دھواں چھا گیا اور چند لمحوں بعد دو بڑی بڑی خوفناک آنکھیں جو کہ بہت سرخ تھیں اور ان آنکھوں کے نیچے درمیان میں موٹے موٹے بھدے ہونٹ تھے ان ہونٹوں پر بہت مکروہ مسکراہٹ رینگ رہی تھی شہلا اس خوفناک عکس کو دیکھ کر ڈر گئی اتنے میں ایک خوفناک آواز آئی جو کہ وہ فرنیچر شاپ میں سن چکی تھی۔

”شہلا مجھے بھوک لگی ہے میں نے سات سالوں سے کچھ نہیں کھایا جاؤ اپنی ملازمہ کو بلاؤ۔ میں اسے کھانا چاہتا ہوں میں نے اسے تمہارے کمرے کی صفائی کرتے دیکھا ہے وہ توانا جسم کی مالک ہے ایک ہفتے تک میں پرسکون رہوں گا جاؤ اسے بلاؤ۔ جاؤ۔“ شہلا کو ایک جھٹکا لگا اس نے اپنا گاؤن پہنا اور کمرے سے نکل کر کچن میں گئی جہاں اس کی ملازمہ سالن پکا رہی تھی شہلا نے پہلے کچھ سوچا اور پھر وہ ملازمہ کے پاس گئی اور کمرے کی صفائی نہ کرنے کے بہانے سے اسے کمرے میں لے آئی اور آئینہ صاف کرنے کے لئے کہا۔ اس نے آئینہ صاف کرنے کے لئے جیسے ہی آئینے پر ہاتھ رکھا اسے یوں لگا کہ جیسے اس کا ہاتھ کسی دہکتی بھٹی کے اندر چلا گیا ہو درد کی ایک تیز لہر اس کے پورے جسم میں دوڑ گئی اور ملازمہ نے اپنا ہاتھ ایک جھٹکے سے باہر کھینچ لیا مگر جیسے ہی اس نے اپنا ہاتھ باہر کی طرف کھینچا اس کی زوردار چیخ نکل گئی کیونکہ اس کا ہاتھ غائب تھا اور بازو سے خون نکل رہا تھا جیسے کسی نے اس کے ہاتھ کو چبا ڈالا ہو یہ دیکھ کر ملازمہ بری طرح ڈر گئی وہ باہر کی طرف بھاگنے لگی مگر شہلا نے جلدی سے ملازمہ کو گھسیٹ کر آئینے کی طرف دھکیل دیا اور آئینے کے اندر سے کسی نے ملازمہ کو پکڑ لیا۔ جو کہ یقیناً آئینے کا آسیب تھا وہ منحوس آئینہ ملازمہ کو چبا چبا کر مزے لے کر کھانے لگا آئینے نے جب ملازمہ کی ٹانگ کو چبایا تو کمرے کے باہر ایک اور چیخ گونجی جو کہ مسز آفندی کی تھی وہ شاید شہلا کے کمرے میں سے ملازمہ کی چیخ سن کر آئی تھی اور خونی آئینے کو ملازمہ کو کھاتے دیکھ چکی تھی انہوں نے جب دیکھا آئینہ ان کی طرف قہر آلود نظروں سے دیکھ رہا ہے تو وہ بھاگ کر نیچے جانے لگیں اچانک انہیں چکر آیا اور وہ چکرا کر سیڑھیوں سے نیچے گر گئیں اور ان کی گردن کی ہڈی ٹوٹ گئی۔

شہلا کے گھر اس وقت بہت سے لوگ اس کی والدہ کی وفات پر تعزیت کرنے آئے ہوئے تھے اور ان میں ثناء، ارم، سیف اور عمران بھی تھے شہلا کا تو رو رو کر برا حال تھا سب لوگ اسے تسلیاں دے رہے تھے مگر بے سود۔ رات کو جب سب لوگ چلے گئے تو ارم اور عمران نے فیصلہ کیا کہ وہ شہلا کے گھر رہیں گے کیونکہ ابھی شہلا کا زخم تازہ تھا اور شہلا کو اکیلا چھوڑنا ٹھیک نہ تھا جب کہ ثناء اور سیف اپنے گھر چلے گئے رات کو ارم کو پیاس لگی اس نے جگ کی طرف دیکھا جو خالی تھا چنانچہ ارم نے جگ اٹھایا اور وہ کچن سے پانی لینے کے لئے کمرے سے باہر آئی کچن کی طرف جاتے ہوئے ارم شہلا کے کمرے کے سامنے سے گزری تو وہ ٹھٹک کر رک گئی کیونکہ شہلا کے کمرے

سے باتیں کرنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ ارم بہت حیران ہوئی کیونکہ عمران تو نیچے والے کمرے میں سو رہا تھا جو کیدار گیٹ پر تھا ملازمہ کافی دنوں سے لاپتہ تھی پھر شہلا کس سے باتیں کررہی ہے ارم کافی دیر ٹھہری رہی پھر وہ شہلا کے کمرے کے قریب گئی اور دیوار کے ساتھ کان لگائے تو وہ حیران رہ گئی۔

اندر سے شہلا کے رونے کی آواز آرہی تھی اور ایک مردانہ بھاری آواز جو کہ شہلا سے کہہ رہی تھی کہ تمہاری ماما کو ختم کرنا ضروری تھا کیونکہ وہ میری اصلیت جان چکی تھیں اگر میں اس کا بروقت خاتمہ نہ کرتا تو وہ ہمارے لیے خطرہ بن جاتی ارم کے ذہن میں تو آندھیاں چلنے لگیں۔

اس کا مطلب ہے کہ آنٹی کو قتل کیا گیا ہے مگر کیوں ارم بڑبڑائی اس نے تجسس کے مارے کمرے کے دروازے کی چابی کے سوراخ سے اندر جھانکا تو اس کے منہ سے چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی اس نے دیکھا کہ شہلا اپنے ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھی رو رہی ہے اور ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے میں انتہائی خوفناک شکل کا عکس دکھائی دے رہا تھا جس کی صرف ڈراؤنی آنکھیں اور بھدے ہونٹ تھے یہ خوفناک منظر دیکھ کر ارم کا دل بری طرح دھڑکنے لگا وہ فوراً اٹھی اور آرام سے سیڑھیاں اترتی ہوئی عمران کے کمرے میں آئی اس نے عمران کو ساری حقیقت بتائی پہلے تو عمران کو یقین نہ آیا مگر جب ارم نے اسے بتایا کہ اس نے آئینہ کے اندر خوفناک عکس خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے تو عمران سوچنے پر مجبور ہوا کیونکہ مسز آفندی کی گردن صرف سات سیڑھیوں سے گر کر ٹوٹی تھی جو کہ بظاہر ناممکن بات تھی۔

عمران کچھ دیر سوچتا رہا کہ اب وہ کیا کرے پھر اچانک اس نے ٹیلی فون اٹھایا اور سیف کے گھر فون کیا کافی دیر تک بیل جاتی رہی مگر کسی نے فون نہ اٹھایا عمران نے فون بند کیا اور پھر ثناء کے گھر فون کیا تھوڑی دیر بعد ثناء نے فون اٹھایا اس کی نیند میں ڈوبی ہوئی آواز سنائی دی عمران نے جلدی سے اسے ساری بات بتائی پہلے تو ثناء کو بھی یقین نہ آیا پھر اسے یقین کرنا پڑا۔

عمران نے کہا اب بتاؤ ہمیں کیا کرنا ہے چاہیے۔

ثناء نے کہا ”تم شہلا کو بلاؤ اور اس سے بات کرو کہ وہ آئینے کا خاتمہ کردے ورنہ انجام بہت برا ہوگا میں ابھی نہیں آسکتی میری ممی کے سر میں بہت درد ہے صبح کو میں اور سیفی آئیں گے اور آئینے کا خاتمہ کردیں گے تم جلدی سے شہلا کے پاس چلے جاؤ ایسا نہ ہو کہ وہ خونی آئینہ شہلا کو کوئی نقصان پہنچادے۔“ عمران نے اوکے کہا اور فون رکھ دیا۔

شہلا، عمران اور ارم نیچے ڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے شہلا سر جھکائے بیٹھی تھی ارم اٹھ کر شہلا کے پاس گئی اور نرمی سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور کہا۔ ”شہلا بتاؤ تمہارا کیا خیال ہے اگر وہ آئینہ تمہارا ماما کا خون کرسکتا ہے تو وہ کبھی نہ کبھی تمہیں بھی تو نقصان پہنچا سکتا ہے۔“

شہلا نے سر اٹھایا اور باری باری ارم اور پھر عمران کو دیکھا اور پھر بولی ”ارم ہم آئینے کا رات کو کچھ نہیں بگاڑ سکتے ہم صبح کو ہی اس کا خاتمہ کریں گے۔“ شہلا کی بات سن کر دونوں نے سر ہلا دیا۔

”شہلا سر جھکائے اپنے کمرے میں چلی گئی، اس نے کمرے میں جا کر کمرے کو لاک کرلیا اور آئینے کے سامنے جا کر کھڑی ہوئی اس کے چہرے پر پراسرار مسکراہٹ رینگ رہی تھی جو کہ بہت خوفناک تھی۔

عمران اپنے کمرے میں آیا اور بستر پر لیٹ گیا نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی اسے خوشی تھی کہ شہلا خونی آئینے کی پوری طرح غلام نہ ہوئی تھی ورنہ وہ کبھی بھی آئینے کے خاتمے کے لئے تیار نہ ہوتی۔ عمران یہ سب باتیں سوچ رہا تھا کہ اچانک اسے باتھ روم میں سے عجیب طرح کی آوازیں سنائی دینے لگیں ایسی آوازیں کہ جیسے کوئی چیز ابل رہی ہو عمران بہت حیران ہوا وہ اٹھا اور باتھ رم کے دروازے کے ساتھ جا کے کان لگائے تو یوں لگا کہ کوئی چیز ابل رہی ہے اس نے

باتھ روم کا دروازہ ایک جھٹکے سے کھول دیا باتھ روم کے اندر سے بہت گرمائش آرہی تھی وہ دھڑکتے دل کے ساتھ باتھ رم کے اندر داخل ہوا اس کی نظر سامنے نہانے کے ٹب پر پڑی تو وہ اچھل پڑا کیونکہ ٹب میں پانی کھول رہا تھا جس میں سے دھواں بھی نکل رہا تھا عمران کچھ لمحے وہیں ٹھہر کر بغور معائنہ کرتا رہا مگر اس کی کچھ سمجھ میں نہ آیا عمران نے جیسے ہی ایک قدم آگے بڑھایا تو اس کا پاؤں پھسل گیا اور وہ گرم پانی میں جا گرا اور چیخنے لگا۔

شہلا کے جانے کے بعد ارم بھی اپنے کمرے میں آگئی وہ اپنے بیڈ پر لیٹ گئی اور خونی آئینے کے متعلق سوچ رہی تھی کافی دیر کے بعد وہ اٹھی تاکہ لائٹ آف کردے کیونکہ روشنی کی وجہ سے اسے نیند نہ آرہی تھی اس نے ساتھ پڑے بیڈ لیمپ کے بلب کو آف کردیا اور اپنی آنکھیں بند کرلیں اچانک اسے ایسا لگا کہ بلب جل رہا ہو اس نے اپنی آنکھیں کھول دیں اور دیکھا کہ واقعی لیمپ کا بلب جل رہا تھا وہ حیران رہ گئی اسے اچھی طرح یاد تھا کہ اس نے ابھی بلب کو بند تو کیا تھا۔ ابھی وہ یہ سوچ رہی تھی کہ بلب خود بخود آف ہوگیا وہ ڈر گئی ایک دم سے بلب پھر آن ہوگیا اور کچھ لمحوں بعد خود آف ہوگیا بلب کافی دیر تک آن آف ہوتا رہا ارم نے سوچا کہ ضرور بلب خراب ہوگیا ہوگا اس نے اس خیال کے تحت کمرے کی لائٹ آن کی وہ بیڈ لیمپ کے قریب آئی اس نے لیمپ کا سوئچ نکالا اور پھر بلب نکالنے کے لئے ہاتھ بڑھایا اور بلب نکال لیا اچانک سوئچ خود بخود پلگ میں جا کر لگا اور ہولڈر میں کرنٹ آگیا ارم اس بات سے بے خبر تھی اس نے بلب کو غور سے دیکھا بلب بالکل ٹھیک تھا وہ حیران ہوئی کہ پھر بلب خود بخود جل بجھ کیوں رہا ہے ایک خیال کے تحت کہیں ہولڈر میں کوئی نقص نہ ہو اس نے ہولڈر کو دیکھا تو ہولڈر کے اندر اسے گرد کی موٹی تہہ نظر آئی ارم مسکرانے لگی وہ سمجھ گئی کہ گرد کی وجہ سے ہی بلب آن آف ہورہا ہوگا اس نے گرد صاف کرنے کی کوشش کی مگر اس کی زوردار چیخ نکل گئی کیونکہ اسے زبردست کرنٹ لگا تھا۔

شہلا کی بند آنکھیں خود بخود کھل گئیں وہ اٹھی کمرے کا دروازہ کھولا اور باہر آئی اس وقت بھی اس کے چہرے پر پراسرار مسکراہٹ رینگ رہی تھی وہ سیڑھیاں اتر کر عمران کے کمرے میں آئی کمرے کا دروازہ خود بخود کھل گیا شہلا کمرے میں داخل ہوئی باتھ روم کا دروازہ کھلا ہوا تھا شہلا باتھ روم میں داخل ہوئی اس کی نظر سامنے ٹب پر پڑی جہاں عمران کی لاش پڑی تھی اس کی شرٹ کے بٹن کھلے ہوئے تھے اس کے منہ گردن اور سینے پر جلن کی وجہ سے چھالے صاف دکھائی دے رہے تھے شہلا طنزیہ انداز میں مسکرائی اور وہ پھر سیڑھیاں چڑھ کر ارم کے کمرے میں آئی ارم بیڈ سے نیچے گری ہوئی ٹیڑھے میڑھے انداز میں پڑی تھی ارم کے چہرے پر شدید کرب کے تاثرات تھے اور اس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھی شہلا نے یہ سب دیکھ کر زوردار قہقہہ لگایا اور بولی۔

”میرا خاتمہ کرنا چاہتے تھے۔ میرا...... ہاہاہا...... میں سب کو ختم کردوں گا میں سب کو ختم کردوں گا“ شہلا کے منہ سے آئینے کی آواز نکلی۔

ثناء کے ذہن میں اس وقت آندھیاں چل رہی تھیں اس نے صبح سیف کو فون کرکے گھر بلایا رات کی ساری بات بتائی اس کے بعد سیف اور ثناء شہلا کے گھر گئے اور ارم اور عمران کے متعلق دریافت کیا شہلا نے جو بات بتائی وہ سن کر انہیں حیرت کا شدید جھٹکا لگا شہلا نے کہا کہ صبح کو ناشتے سے پہلے ارم اور عمران گاڑی لے کر چلے گئے ہیں اور ابھی تک نہیں آئے ثناء حیران تھی کہ ارم اور عمران کو جانے کی کیا ضرورت تھی ثناء اور سیف نے اپنے اپنے گھروں میں فون کرکے بھی پوچھا مگر وہاں سے یہی اطلاع ملی کہ نہ ارم اور نہ ہی عمران آیا ہے ثناء نے کہا وہ کہاں جاسکتے ہیں انہوں نے تو خود کہا تھا کہ میں سیف کو لے کر شہلا کے گھر آجاؤں۔

شہلا نے چونک کر ثناء سے پوچھا کیوں انہوں

نے تمہیں کیوں بلایا؟ اس سے پہلے کہ شاہ کچھ کہتی سیف بول اٹھا۔

"وہ کہہ رہے تھے کہ ان لوگوں کو کوئی ضروری بات کرنی تھی یہ نہیں بتایا کہ کیا ضروری بات کرنی تھی خیر جب وہ لوگ آجائیں تو ہمیں اطلاع کر دینا میرے موبائل پر میں اور شاہ جا کر پولیس میں خبر کرتے ہیں یہ کہتے ہی اس نے شاہ کا ہاتھ پکڑا اور اسے ساتھ لے کر باہر آ گیا وہ گاڑی میں بیٹھے سیف نے گاڑی چلائی کافی دور جانے کے بعد سیف نے گاڑی ایک طرف کر دی اور شاہ سے کہنے لگا کہ ارم اور عمران کہیں نہیں گئے بلکہ شہلا کے آئینے نے ہی ان کا خاتمہ کیا ہے۔ شاہ کو جھٹکا لگا۔

"کیا؟ کیا کہہ رہے ہو۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔"

"یہ ہو چکا ہے۔" سیف نے کہا۔

"اب جلد ہی اس آئینے کا خاتمہ کرنا ہوگا۔"

"کیا تم کو پتہ ہے شہلا نے یہ آئینہ کہاں سے خریدا ہے" سیفی نے پوچھا۔

"ہاں ارم نے بتایا تھا کہ شہلا نے یہ آئینہ طارق فرنیچر سے خریدا ہے" شاہ نے بتایا۔

سیف نے گاڑی چلا دی اور وہ طارق فرنیچر شاپ کی طرف روانہ تھے شہلا کے گھر پولیس اسٹیشن سے فون آیا اور اس کی گاڑی کا نمبر بتا کر پوچھا کہ کیا یہ آپ کی گاڑی ہے شہلا کے اقرار کرنے پر انہوں نے بتایا کہ آپ کی گاڑی کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے جس کے اندر دو افراد سوار تھے ایک لڑکی اور ایک لڑکا اور وہ دونوں ہلاک ہو گئے ہیں۔ دونوں کی لاشیں شناخت نہیں ہو رہی ہیں آپ آ کے شناخت کر جائیں شہلا نے ریسیور رکھ دیا اس کے بعد اس نے سیفی کے موبائل پر فون کر کے کہہ دیا کہ ارم اور عمران کا ایکسیڈنٹ ہو چکا ہے میں پولیس اسٹیشن جا رہی ہوں یہ کہہ کر فون بند کر کے وہ پولیس اسٹیشن جانے کے لئے اٹھ کھڑی ہوئی اس رات شہلا کے آئینے نے ان دونوں کو اپنی طاقت سے گاڑی میں سوار کروا دیا اور دور کھائیوں والے علاقے کی طرف لے جا کر ایک کھائی میں گرا دیا پیٹرول کی ٹینکی چونکہ کھول دی تھی اس لیے جیسے ہی گاڑی کھائی میں گری تو گاڑی میں آگ لگ گئی اس طرح ان دونوں کی لاشیں بھی جل گئیں اب کوئی شہلا پر شک نہ کر سکتا تھا۔

شاہ اور سیف مسز ڈی کوسلا کے ڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے فرنیچر شاپ والوں سے پتا لگا کہ آئینہ انہوں نے ایک کرسچن عورت مسز ڈی کوسلا سے خریدا تھا چنانچہ وہ مسز ڈی کوسلا سے ملنے اس کے گھر گئے تھوڑی دیر بعد مس ڈی کوسلا تشریف لے آئی سیفی نے پہلے ساری حقیقت بتائی تو مسز ڈی کوسلا نے کہا۔

"واقعی وہ ایک خونی آئینہ ہے اس نے بہت سے لوگوں کا خون کیا ہے میں چونکہ بوڑھی تھی اس لئے میں اس آئینہ کا مقابلہ نہ کر سکی بہت سے لوگوں نے آئینے کو ختم کرنے کے لئے کوشش کی مگر کوئی بھی اسے ختم نہ کر سکا۔"

سیفی نے پوچھا۔"مسز ڈی کوسلا آپ کو یہ آئینہ کہاں سے ملا؟'

مسز ڈی کوسلا نے کہا۔

"یہ آئینہ میرے شوہر کے گھر میں موجود تھا یہ آئینہ ہر ہفتے بعد ایک صحت مند انسانی جسم مانگتا تھا اور بدلے میں وہ ہر خواہش پوری کر دیتا تھا۔ دراصل اس خونی آئینے کا آسیب ایک جیتا جاگتا انسان تھا بچپن میں اس کے ماں باپ مر گئے وہ کروڑوں کی جائیداد کا اکلوتا مالک تھا کوئی اس کی اصلاح کرنے والا نہ تھا وہ برائی کی راہ پر چل نکلا دنیا کی ہر برائی اس کے اندر تھی وہ شیطان کا چیلا تھا خدا نے اسے سزا دی اس کی ساری جائیداد ساری دولت ختم ہو گئی وہ کوڑی کوڑی کو محتاج ہو گیا اس کے پاس کھانے کو بھی کچھ نہ تھا وہ در بدر کی ٹھوکریں کھانے لگا ایک دن شدید بارش آئی وہ ایک غار میں جا بیٹھا اچانک اس کی نظر ایک چھپکلی پر پڑی جو کہ بہت موٹی تازہ تھی وہ چونکہ بہت بھوکا تھا اس نے چھپکلی کو پکڑا اور کھا گیا بھوک میں اسے چھپکلی بھی بہت لذیذ لگ رہی تھی اس نے وہاں پر موجود دو تین چھپکلیوں کو کھایا اور

بھوک مٹائی اور وہیں سو گیا دوسرے دن اسے کوئی چھپکلی نہ ملی تو اس نے ایک کتے کو پکڑ لیا کتے کے گوشت کو کھایا اور اس کے خون سے پیاس بجھائی وہ ایک دو ہفتوں تک اسی طرح کرتا رہا۔ ایک دفعہ ایک گڈریا ریوڑ چرا رہا تھا وہ اس کے ریوڑ کے قریب گیا ایک بھیڑ کو دبوچا وہ ابھی بھیڑ کو کھانے ہی لگا تھا کہ اتنے میں گڈریے نے اسے زوردار دھکا دیا بھیڑ اس کے پنجے سے نکل کر بھاگ گئی اس شخص نے غصے میں آ کر گڈریے پر دانت گاڑ دیئے وہ کافی دیر تک اس کا خون چاٹتا رہا جب پی چکا تو اس نے گڈریے کی لاش ادھیڑ دی اور اس کے گوشت کو کھانے لگا اس کو پہلی بار زندگی کا مزہ آیا اس نے خوب سیر ہو کر کھایا اور پھر وہاں سے بھاگ گیا ایک ہفتے تک اسے خوراک کی طلب نہ ہوئی پھر ایک ہفتے کے بعد اس نے ایک عورت کو قتل کیا اور اپنی خوراک بنایا۔ اس طرح وہ لوگوں کو مارتا رہا پولیس چوکنا ہو گئی کیونکہ آئے روز لوگوں کی ادھڑی ہوئی لاشیں ملنے لگیں لوگ گھروں میں دبکے رہتے تھے ایک دفعہ یہ ایک دس سالہ معصوم لڑکی کا گوشت کھا رہا تھا کہ پولیس نے اسے گرفتار کر لیا اور اسے سزائے موت دیدی گئی پھانسی کے تختے پر اس کی لاش ساڑھے تین گھنٹے تک تڑپتی رہی میرا شوہر جو کہ پولیس انسپکٹر تھا وہ اس بات کا گواہ ہے کیونکہ اس کے سامنے اسے پھانسی دی گئی تھی چونکہ اس شخص کا اعمال نامہ سیاہ تھا اور یہ بدکار انسان تھا چنانچہ اس کی روح آسمان پر نہ جا سکی اور زمین پر بھٹکتی رہی ایک دفعہ میرے شوہر نے خواب میں دیکھا کہ وہی آدمی جو کہ پھانسی پر چڑھایا جا چکا ہے وہ میرے شوہر کے پاس بیٹھا ہے اور میرے شوہر سے کہتا ہے میں بہت بھوکا ہوں میں کچھ کھا بھی نہیں سکتا کیونکہ میں ایک بدروح ہوں اس لئے میں کچھ نہیں کر سکتا لہٰذا اب تم میرے دل پر یہ خنجر پیوست کرو اس طرح میری گندی آتما اس آئینے میں ایک ڈریسنگ ٹیبل میں جو ساتھ پڑی تھی چلی جائے گی اس آئینے میں میری روح جانے کے بعد میں شیطانی طاقتوں کا مالک ہو جاؤں گا اور طاقتور بن جاؤں گا۔ پھر تم میرے پیروکار بن جاؤ گے اور ہر ہفتے بعد ایک صحت مند جسم کی مالک عورت یا مرد کو لے آنا میں اس سے اپنی بھوک مٹاؤں گا۔ یہ کہتے ہی وہ شخص ایک میز پر لیٹ گیا میرے شوہر نے خنجر اٹھا کر اس کے سینے میں گھونپ دیا۔ خنجر گھونپنے سے اس شخص کے سینے میں سے خون کا فوارہ نکلا اور میرے شوہر کے کپڑوں پر آن گرا میرے شوہر ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے ان کے دل کی دھڑکن بہت تیز تھی انہوں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ یہ محض خواب تھا مگر اگلے لمحے وہ چونک اٹھے کیونکہ ان کے کپڑے خون سے بھرے ہوئے تھے اس کے بعد ہر ہفتے میرے شوہر کو خواب میں نظر آتا کہ وہ کسی شخص کو پکڑ کر لاتے اور ڈریسنگ ٹیبل کی طرف دھکیل دیتے ہیں وہ ان خوابوں سے بہت پریشان رہنے لگے کیونکہ وہ جس شخص کا خواب میں خون ہوتا دیکھتے خواب کے بعد وہ شخص لاپتہ ہو جاتا میرے شوہر کی ترقی ہو گئی اور وہ ڈی ایس پی بن گئے میری ان سے شادی ہو گئی ہر ہفتے بعد میں اپنے ماں باپ کے گھر جاتی تھی اس لیے میں اس بات سے آگاہ نہ ہو سکی شادی کے ڈیڑھ سال بعد میں حسب عادت ہفتے کے آخری دن اپنے میکے جا رہی تھی کہ میں راستے سے ہی واپس آ گئی کیونکہ مجھے کوئی ٹیکسی نہ ملی تھی اور میرے پاؤں میں موچ آ گئی تھی لہٰذا مجھے گھر واپس آنا پڑا میں گھر واپس آئی تو میں نے بہت دلخراش منظر دیکھا کہ میرے شوہر ہمارے پڑوس میں رہنے والے مسٹر اصغر کو جو کہ بے ہوش ہیں گھسیٹ کر نیچے تہہ خانے کی طرف لے جا رہے تھے جو ہر وقت بند رہتا تھا میں بہت حیران ہوئی اس کے بعد میرے شوہر مسٹر اصغر کو تہہ خانے میں چھوڑ کر واپس بیڈ روم میں جا کے سو گئے میں نے فوراً اپنے شوہر کو جگایا وہ اٹھ بیٹھے میں نے دریافت کیا کہ آپ نے مسٹر اصغر کو تہہ خانے میں کیوں بند کیا ہے میرے شوہر میرا منہ دیکھنے لگے وہ کہنے لگے تم کو کیسے پتہ چلا میں نے تو خواب میں ایسا کیا ہے میں نے کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا ہی تھا کہ پورے گھر میں اصغر صاحب کی کربناک چیخیں گونجنے لگیں ہم دونوں میاں بیوی سہم گئے میں نے اپنے شوہر

سے کہا کہ ہم پولیس بلاتے ہیں میں نے فون اٹھایا تو فون بند تھا اتنے میں کسی کے چلنے کی آواز آئی اچانک دروازہ کھلا اور ہمارے سامنے ڈریسنگ ٹیبل کھڑا تھا اس کے آئینے میں بہت ہی بھیانک عکس تھا کہ جسے دیکھ کر میری روح کانپ اٹھی وہ آئینہ بہت بھیانک تھا آئینہ ہم سے مخاطب ہوا اور ہمیں اپنے ماضی کے متعلق بتایا اور پھر کہا کہ اگر تم لوگوں نے میرے متعلق کسی کو بتایا تو میں تم کو ختم کردوں گا۔ ہم لوگ ڈر گئے کچھ عرصے کے بعد میرے شوہر ایک ایکسیڈنٹ میں مارے گئے میں نے وہ آئینہ طارق روڈ فرنیچر والوں کو جلانے کے لئے کہا مگر انہوں نے بیچنے کے چکر میں اسے نہ جلایا حالانکہ میں نے انہیں ساری تفصیل بھی بتائی تھی میری شوہر نے مجھے یہ خنجر بھی دیا تھا (مسز ڈی کوسلا نے خنجر دکھایا) اور کہا کہ یہ خنجر اگر اس آئینے میں گھونپ دیا جائے تو آئینہ ختم ہوجائے گا۔" مسز ڈی کوسلا نے پوری تفصیل بتادی جسے سن کر ثناء اور سیف بہت حیران ہوئے سیف نے مسز ڈی کوسلا سے کہا۔

"آپ مجھے یہ خنجر دے دیں میں انشاء اللہ اس خونی آئینے کا خاتمہ کردوں گا۔" سیفی نے پرعزم لہجے میں کہا۔ مسز ڈی کوسلا نے کہا۔

"ہاں ضرور میں فادر جارج سے تمہارے لیے مقدس پانی لاؤں گی تم اس مقدس پانی سے نہالینا اس طرح وہ آئینہ تمہارا کچھ نہ بگاڑ سکے گا۔"

ثناء نے وہ خنجر لے کر اپنے پرس میں رکھ لیا اور کہا "ہم کب تک مقدس پانی لینے آئیں۔"

مسز ڈی کوسلا نے کہا۔ "اب تو فادر جارج عبادت کررہے ہوں گے تم لوگ کل نو بجے پتہ کرلینا۔" اس کے بعد ثناء اور سیف وہاں سے چلے گئے۔

اگلے دن مسز ڈی کوسلا نے ساڑھے آٹھ بجے چرچ میں فون کیا اور فادر جارج کو بلوایا دوسری طرف سے کہا گیا میڈم تھوڑی دیر انتظار کریں فادر ابھی آرہے ہیں۔ مسز ڈی کوسلا نے او کے کہا اور وہ ہولڈ کرنے لگی۔ اچانک مسز ڈی کوسلا کو زوردار کرنٹ لگا اور انہوں نے ریسیور کو چھوڑ دیا وہ حیرانگی سے ریسیور کو دیکھنے لگی کہ ریسیور میں کرنٹ کیسے آسکتا ہے تھوڑی دیر بعد ریسیور خود بخود اٹھا اور ٹیلی فون کی تار مسز ڈی کوسلا کے گلے کے اردگرد لپٹنے لگی مسز ڈی کوسلا کی گردن گھٹ گئی اور وہ مرگئی۔

ثناء اور سیف مسز ڈی کوسلا کے گھر پر آئے تو پولیس موجود تھی جو مسز ڈی کوسلا کے قتل کی تفتیش کررہی تھی کسی نے مسز ڈی کوسلا کا گلا گھونٹ کر خاتمہ کردیا تھا ثناء اور سیف کو فادر کا پتہ نہ تھا کہ کون سے فادر سے مقدس پانی لینا تھا لہٰذا ان دونوں کو ناکام واپس آنا پڑا۔

رات کو بارہ بجے کے قریب ثناء کے کمرے میں فون کی گھنٹی بجی ثناء نے فون اٹھایا تو وہ اچھل پڑی کیونکہ فون شہلا کا تھا اور شہلا اسے اپنے گھر آنے کا کہہ رہی تھی شہلا نے کہا اگر وہ گھر نہ آئی تو اپنی موت کی خود ذمہ دار ہوگی ثناء پریشان ہوگئی۔ اس نے شہلا سے پوچھنا چاہا کہ وہ کیوں بلارہی ہے مگر شہلا نے فون بند کردیا تھا۔ ثناء کچھ لمحے تو سوچتی رہی پھر اس نے سیفی کے گھر فون کیا مگر وہاں سے بھی کوئی فون ریسیو نہ کررہا تھا کافی دیر کے بعد ثناء نے شہلا کے گھر جانے کا فیصلہ کیا وہ جانے کے لئے باہر نکلی تھی کہ اس کو مسز ڈی کوسلا کا دیا ہوا خنجر یاد آگیا اس نے احتیاطاً وہ خنجر لے لیا اور اسے پرس میں ڈال لیا۔

ثناء شہلا کے گھر میں داخل ہوئی گیٹ پر چوکیدار نہ تھا اور گھر کی لائٹ بھی آف تھی۔ ثناء نے دھڑکتے دل کے ساتھ گھر میں قدم رکھا۔ اس کا دل بری طرح سے دھڑک رہا تھا اس نے ڈرتے ڈرتے قدم بڑھایا پورے گھر میں اندھیرا تھا۔ ثناء اس وقت ڈرائنگ روم میں موجود تھی اسے شہلا کی آواز سنائی دی۔ "اوپر میرے کمرے میں آؤ۔" شہلا کی آواز ہر طرح کے جذبات سے عاری تھی۔ ثناء اوپر سیڑھیاں چڑھنے لگی وہ شہلا کے کمرے کے سامنے تھی شہلا کے کمرے میں زیرو دولٹ کا بلب روشن تھا ثناء جیسے ہی کمرے میں داخل ہوئی وہ کسی چیز سے ٹھوکر کھاتے کھاتے بچی اس نے فوراً

نیچے دیکھا تو اس کی چیخ نکل گئی کیونکہ وہ سیفی کی لاش تھی سیفی کے منہ اور ناک سے خون نکل رہا تھا۔ ثناء فوراً سیفی کی لاش سے لپٹ گئی اور کہا۔ "اٹھو سیفی اٹھو آنکھیں کھولو۔"

"یہ اب کبھی نہیں اٹھے گا۔ ماردیا ہے میں نے اسے۔" شہلا نے کہا۔

"کیوں؟ آخر کیوں مارا تم نے اسے۔" ثناء نے چیختے ہوئے کہا۔

"اس لیے کہ وہ تمہیں چاہتا تھا میں نے تمہیں بلانے سے پہلے اسے بلایا میں نے کہا کہ ثناء میرے پاس ہے اگر تم نہ آئے تو میں ثناء کا خاتمہ کردوں گی۔ یہ پاگلوں کی طرح دیوانہ وار میرے پاس بھاگ آیا۔ یہاں آکر میں نے اسے بتایا کہ میں نے جھوٹ بولا تھا یہ واپس جانے لگا میں نے اسے روکا اسے کہا کہ میں تمہیں چاہتی ہوں دل وجان سے میں تمہارے بغیر ایک پل بھی نہیں رہ سکتی ہوں۔ میں تمہاری دیوانی ہوں تو اس نے میرے منہ پر طمانچہ ماردیا اور یہاں سے جانے لگا میں نے اسے ماردیا کیونکہ اگر یہ میرا نہیں ہوسکا تو کسی کا نہیں ہوسکتا۔"

شہلا نے جواب دیا۔ "ذلیل...... کتی...... کمینی میں تیرا خون پی جاؤں گی میں تجھے ماردوں گی۔" ثناء غصے سے چیخنے لگی۔

"پاگل مت بنو ثنا میں نے تم کو تمہاری بکواس سننے کے لئے نہیں بلایا بلکہ اس لیے بلایا ہے کہ تم میرے آئینے کی ماتحت بن جاؤ تاکہ تم اور میں میرے آقا کے غلاموں میں اضافہ کرسکیں شہلا نے ثناء کو ڈانٹ کر کہا۔

ثنا نے کہا۔ "میں تجھے اور تیرے آئینے کو ہی ماردوں گی۔" یہ کہہ کر وہ شہلا کے پاس تقریباً بھاگتے ہوئے گئی اور اس کا گلا دبانے لگی۔ شہلا نے ثناء کو دھکا دیا ثنا صوفے پر جا گری شہلا نے لوہے کا گلدان اٹھا کر ثنا کی طرف دے مارا مگر ثنا فوراً نیچے جھک گئی اس کی نظر اپنے پرس پر پڑی۔ ثنا بجلی کی تیزی سے اپنے پرس کی طرف لپکی اور آناً فاناً اس میں سے خنجر نکالا اور شہلا کو دے مارا خنجر شہلا کے سینے میں لگا اور وہ نیچے گر کر تڑپنے لگی۔ ثنا سیفی کی لاش کو گھسیٹتی ہوئی کار میں لے گئی اور پولیس اسٹیشن فون کردیا اور ساری حقیقت شروع سے لے کر آخر تک صاف صاف بتادی۔

لیشان فرنیچر شاپ میں ایک لڑکا اور لڑکی داخل ہوئے جن کی کچھ دنوں بعد شادی ہونے والی تھی وہ لوگ اپنے لیے اپنی پسند کا فرنیچر خریدنے آئے تھے دونوں ادھر ادھر پڑی چیزوں کو دیکھنے لگے اچانک ایک ڈریسنگ ٹیبل کا پردہ گرا لڑکی نے سرسری طور پر اس ڈریسنگ ٹیبل کو دیکھا وہ آگے بڑھنے لگی مگر کسی انجانی قوت نے اس کے قدم روک لیے تھے لڑکی کو عجیب آواز سنائی دی جسے سن کر لڑکی کا دماغ ماؤف ہوگیا آواز بہت بھیانک تھی کہ جیسے بادل گرج رہے ہوں۔ اس بھیانک آواز نے لڑکی کو مخاطب کیا۔

"سعدیہ تم میری غلام ہو، میں تمہارا آقا ہوں میں جو حکم دوں گا تم کو تعمیل کرنی ہوگی بدلے میں تم جو چاہو گی حاصل ہوگا۔" اس لڑکی نے جس کا نام سعدیہ تھا، اثبات میں سرہلادیا اس کا ہونے والا شوہر اس کے قریب آیا اور کہنے لگا۔

"ڈارلنگ تمہیں یہ ڈریسنگ ٹیبل پسند ہے" لڑکی نے اثبات میں سرہلادیا اور اس کے چہرے پر پراسرار مسکراہٹ رینگنے لگی۔

دراصل خونی آئینہ آسیبی تھا پہلے بھی بہت سے لوگوں نے خونی آئینے کا خاتمہ کرنا چاہا مگر ان سے بھی یہی غلطی ہوئی کہ انہوں نے آئینے کے غلام کو خنجر سے مارا حالانکہ اس مقدس خنجر سے آئینے پر وار کرنا تھا شہلا کی طرح بہت سی لڑکیاں بے گناہ موت کے گھاٹ اتار دی گئیں اور نا جانے اور کتنی بے گناہ ماری جائیں گی۔ شاید اب کوئی حقیقت کو جاننے کے بعد اس آئینے کا خاتمہ کردے اور شہلا کی طرح اور بھی بہت سی بے گناہ روحوں کو سکون آجائے۔

تشنہ کام

مدھو بالا

اس دن شدید بارش تھی کرن کلاس اٹینڈ کر کے یونیورسٹی سے باہر آ رہی تھی کہ اچانک اس کا پاؤں پھسلا اور وہ گر پڑی۔

جب سے فرزانہ بیگم گھر پہنچیں تھیں ان کا رونا کسی صورت رُکنے میں نہیں آ رہا تھا۔ ان کے پاس ہی ان کا اکلوتا بیٹا سر جھکائے خاموش بیٹھا تھا۔ ذرا فاصلے پر ان کی بہو کرن مجرم بنی کھڑی تھی۔ اس کی حالت ایسی تھی کہ کاٹو تو بدن میں خون نہیں۔

جب سے ڈاکٹر نے بتایا کہ کرن بانجھ ہے تب سے ہی فرزانہ بیگم کے آنسو ہر وقت آنکھوں سے بہنے کو بیتاب رہتے مگر اب رونے کی تازہ وجہ یہ بنی کہ ان کی بچپن کی سہیلی فردوس بیگم کے یہاں دوسرے پوتے کی پیدائش ہوئی تھی۔ فرزانہ بیگم بچپن کی دوستی کی وجہ سے مجبور تھیں، جانا ضروری تھا۔ وہاں جا کر جب انہوں نے فردوس بیگم کا پھول سا پوتا دیکھا تو ان سے ضبط کرنا مشکل ہو گیا۔ مبارکباد دینے کے بعد طبیعت کی خرابی کا بہانہ کر کے وہ وہاں سے جلدی واپس آ گئیں۔

"میری عمر کی سب پوتے پوتیاں کھلا رہی ہیں ان کی خوشیاں دیکھ رہی ہیں ایک میں ہی بدنصیب ہوں جس کے گھر کسی بچے کی ہنسی نہیں گونجتی" فرزانہ بیگم نے آنسو بہاتے ہوئے کہا۔

"اللہ پر بھروسہ رکھاماں" بیٹا طاہر منمنایا۔

"پتھر اور درخت اللہ نے بنائے ہیں، کیا کبھی کسی پتھر کے سینے سے پھول اُگا ہے؟ اسی طرح تیری بیوی کے ہاں اولاد نہیں ہو سکتی، کان کھول کر سن لے اگر تو نے بیوی کے عشق میں دوسری شادی نہ کی تو میں زہر کھا کر جان دے دوں گی، تجھے اپنا دودھ نہ بخشوں گی تب اللہ بھی تجھے کبھی معاف نہ کرے گا" فرزانہ بیگم نے طیش میں کہا، جذباتی بلیک میلنگ کے ساتھ۔

کرن کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا اور اس کے آنسو جو کافی دیر سے آنکھوں میں بھرے ہوئے تھے، گالوں پر لکیر بناتے ہوئے بہہ نکلے، طاہر خاموشی سے اُٹھا اور سر جھکائے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ بیٹے کی خاموشی نے فرزانہ بیگم کے غصے کو مزید ہوا دی۔

"یہ دن مجھے تیری وجہ سے دیکھنے پڑ رہے ہیں، ڈائن، بانجھ عورت تو خود تو اولاد پیدا کرنے کے قابل نہیں اور میرے بیٹے کی دوسری شادی کی راہ میں رکاوٹ بنی بیٹھی ہے۔ صرف تیری وجہ سے میرا اکلوتا بیٹا بے اولاد پھر رہا ہے، کم ظرف تجھ جیسی عورت کو تو چلو بھر پانی میں ڈوب مرنا چاہئے۔ تیری موجودگی میرے بیٹے کے لئے سزا بن گئی ہے۔ دیکھنا میری ہائے لگے گی تجھے ضرور۔"

طاہر کی خاموشی کا سارا غصہ کرن پر نکلا تھا فرزانہ بیگم، کرن کو بے بھاؤ کی سنانے کے بعد اب کھانس رہی تھیں، مگر ان کی آنکھوں سے آنسو ویسے ہی رواں تھے۔ اتنی بے عزتی پر کرن اپنے منہ پر ہاتھ رکھ کر باورچی خانے میں بھاگ گئی اور سسک سسک کر رونے لگی۔

☆......☆......☆

حالات حد سے زیادہ خراب ہو چکے تھے۔ فرزانہ بیگم کے مسلسل دباؤ کی وجہ سے طاہر کا دوسری شادی کے سلسلے میں انکار، دم توڑتا جا رہا تھا۔ گو ابھی اس نے واضح طور پر ہاں تو نہ کہی تھی مگر وہ وقت دور نہ تھا جب وہ اپنی ماں کے سامنے ہتھیار ڈال دیتا۔ یہ بات کرن خوب سمجھتی تھی۔

اس وقت طاہر آفس میں تھا جبکہ فرزانہ بیگم پڑوس کے کسی گھر گئی ہوئی تھیں کرن سالن پکا کر فارغ بیٹھی تھی۔ اس کے دماغ میں جھکڑ سے چل رہے تھے۔ ساتھ ہی بار بار دل بھٹک کر گزرے وقت کو بھی یاد کرنے لگتا۔



تقریباً چار سال پہلے وہ یونیورسٹی میں زیر تعلیم تھی۔ اس یونیورسٹی میں طاہر بھی پڑھتا تھا کرن بے حد حسین تھی اس کے تمام کلاس فیلو لڑکے اس کا دل جیتنے کی کوشش کر چکے تھے مگر کرن کا دل دماغ ان میں سے کسی کی طرف راغب ہونے پر تیار نہ ہوا تھا۔ طاہر کرن سے ایک سال سینئر تھا اس لئے ان کی زیادہ ملاقات تو نہ ہوتی تھی مگر آتے جاتے وہ ایک دوسرے کو دیکھ ضرور لیتے تھے دل ہی دل میں جہاں طاہر اس کے بے مثال حسن سے متاثر ہوا وہیں کرن بھی طاہر کی شاندار پرسنالٹی اور سنجیدہ رویے کی وجہ سے اپنے دل میں ایک انوکھا سا جذبہ محسوس کرنے لگی۔

اس دن شدید بارش تھی کرن کلاس اٹینڈ کر کے یونیورسٹی سے باہر آ رہی تھی کہ اچانک اس کا پاؤں پھسلا اور وہ گر پڑی۔ درد کی زیادتی سے کرن رونے لگی۔ یہ سارا منظر سامنے سے آتے طاہر نے دیکھ لیا۔ طاہر نے اسے سہارا دے کر اپنی گاڑی میں بٹھایا اور قریب کے اسپتال لے گیا۔ وہاں سے اس کے پاؤں کی پٹی کروا کر وہ اسے گھر تک چھوڑ گیا۔ اس واقعہ کے بعد وہ ایک دوسرے کے کافی قریب آ گئے۔ ان کی یہ چاہت ان کے گھر والوں سے بھی ڈھکی چھپی نہ تھی اور پھر ایک دن طاہر کی ماں فرزانہ بیگم اپنے اکلوتے بیٹے کا رشتہ لے کر کرن کے گھر پہنچ گئیں۔

کرن کے ماں باپ نے رسمی طور پر سوچنے کے لئے چند دن مانگے اور پھر ہاں کر دی کیونکہ کرن کے ماں باپ اور بہن بھائی بھی طاہر کو پسند کرنے لگے تھے۔ انہیں اپنی بیٹی کی خوشیاں عزیز تھیں اور طاہر کرن کو ہر طرح سے خوش رکھ سکتا تھا۔ دونوں خاندانوں نے بہترین تیاریاں کی تھیں۔ طاہر کے والد، طاہر کے بچپن میں ہی فوت ہو گئے تھے۔ فرزانہ بیگم نے طاہر کو بڑے لاڈ سے پالا تھا۔ اس کے سر پر سہرا دیکھنے کی ان کی دلی آرزو پوری ہو رہی تھی وہ جو بھی کرتیں کم تھا۔

کرن اپنی دو بہنوں اور دو بھائیوں میں سب سے بڑی تھی۔ کرن کے گھر میں بھی یہ پہلی شادی تھی اس کے ماں باپ نے بھی کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی۔ یوں نہایت دھوم دھام سے کرن طاہر کی دلہن بن کر اس کے گھر آ گئی۔ طاہر کی بے پناہ محبتوں سے کرن کو سسرال کی دنیا جنت محسوس ہو رہی تھی۔ فرزانہ بیگم بہو، بیٹے کی نظریں اتارتے نہ تھکتیں اور پھر یہ خوب صورت خواب جیسا وقت گزر گیا۔

شادی کے دو سال بعد تک جب کرن کی گود سونی رہی تو فرزانہ بیگم کو ہول سے اٹھنے لگے ان کے اصرار پر طاہر اور کرن نے اپنا میڈیکل چیک اپ کروایا۔ ڈاکٹر نے یہ روح فرسا خبر سنائی کہ کرن ماں نہیں بن سکتی۔ اس اطلاع نے طاہر اور کرن پر بجلی گرادی طاہر نے کرن کو یقین دلایا کہ وہ کرن پر کبھی سوتن نہ لائے گا۔ مگر فرزانہ بیگم ہر حالت میں طاہر کی دوسری شادی پر بضد تھیں کرن طاہر سے شدید محبت کرتی تھی کسی اور عورت کے ساتھ طاہر کو بانٹنا اس کے لئے موت سے بھی بڑھ کر اذیت ناک تھا۔ کرن کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کا گھر اجڑنے والا ہے۔

سوچ سوچ کر پریشانی سے کرن کا ذہن شل ہو رہا تھا۔ یونہی بیٹھے بیٹھے اسے رانی کا خیال آیا کرکی اپنی بہنیں اس سے خاصی چھوٹی تھیں مگر رانی کرن کی ہم عمر تھی اس لئے دونوں میں گہری دوستی تھی۔ وہ دونوں اپنے ہر کام میں ایک دوسرے سے مشورہ کیا کرتی تھیں۔ اس کے علاوہ ان دونوں کے گھر بھی ساتھ ساتھ تھے۔ شادی کے بعد دونوں میں پہلے جیسا ملنا ملانا تو نہ رہا تھا مگر کسی تقریب یا پھر تہوار پر وہ ایک دوسرے سے ضرور ملتی تھیں۔ رانی کا خیال آتے ہی کرن نے رانی کا نمبر ملایا۔ فون رانی نے ہی اٹھایا تھا سلام دعا کے بعد رانی نے کرن کا حال پوچھا تو کرن نے پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دیا۔

''کرن آخر ہوا کیا ہے؟ تم یوں رو کیوں رہی ہو؟'' کرن کے یوں رونے پر رانی بوکھلا گئی تھی۔ ''رانی تم سے ملنے کو بڑا دل چاہ رہا ہے میں آج شام تمہاری طرف آرہی ہوں'' کرن نے بمشکل تمام ہچکیوں کے درمیان کہا اور فون بند کر دیا۔

☆......☆......☆

اس مسئلے کا ایک ہی حل ہے'' رانی نے ساری کتھا سننے کے بعد پر سوچ انداز میں کہا۔ کرن اس وقت رانی کے سامنے بیٹھی اپنی کہانی سنا کر زار و قطار رو رہی تھی۔

''وہ کیا'' کرن نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے پوچھا۔

''شازا'' رانی نے کرن کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''شازا'' کرن جیسے خود کلامی کی۔ ''یہ شازا کون ہے اور میری مدد کیسے کر سکتا ہے؟'' کرن نے الجھے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔

''شازا میرا کزن ہے اس کا اصل نام شہروز ہے مگر سب لوگ اسے شازا کے عرف سے ہی بلاتے ہیں۔ دراصل شازا کو بچپن سے ہی جادو ٹونہ سیکھنے کا بے حد شوق تھا۔ اسی سلسلے میں کئی فراڈیوں سے بے وقوف بننے کے بعد اسے ایک ایسا جادوگر ملا جو واقعی جادو کا علم جانتا تھا۔ شازا کی بے حد منت سماجت اور جنون کو دیکھتے ہوئے شازا کو اپنی شاگردی میں لینے پر تیار ہوا حالانکہ اس کے گھر والے اس کے اس خطرناک شوق سے سخت بیزار تھے۔ شازا نے کئی بار اپنے والد سے بھی مار کھائی اور بالآخر گھر سے نکال دیا گیا مگر وہ دھن کا پکا تھا لہٰذا پراسرار علوم سیکھ کر ہی رہا اب وہ گھر والوں سے الگ ایک مکان میں رہتا ہے اور ایک ماہر جادوگر ہے۔ اگر ہم اس سے ملیں تو ہو سکتا ہے کہ وہ اس گمبھیر مسئلے کا کوئی حل نکال سکے۔'' رانی نے کرن کو تفصیل بتائی۔

''مگر'' رانی کی بات سن کر کرن نے جانے کیا کہنا چاہا تھا مگر کہہ نہ پائی۔ کرن کچھ دیر سر جھکائے بیٹھی رہی اور وہ دوبارہ بولی تو اس کی آواز لرز رہی تھی۔ ''رانی کیا میرا گھر برباد ہونے سے بچ جائے گا؟'' کرن اس وقت حسرت و یاس کا مجسمہ لگ رہی تھی۔ ''تم فکر نہ کرو حوصلہ رکھو سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' رانی نے کرن کے ہاتھ تھام کر محبت سے کہا۔

☆......☆......☆

شازا چھبیس، ستائیس سال کا جوان مرد تھا۔ لمبا قد، ورزشی جسم، خاص طور پر اس کے بازوؤں اور سینے کے مسلز شاندار تھے۔ چہرے کے خد و خال بھی اچھے تھے۔ بڑی بڑی آنکھیں، کھڑی ناک، متناسب چہرہ، حلیہ سے وہ بہت ہی کھردرا دکھائی دیتا تھا اس کی آنکھوں میں غضب کا ٹھہراؤ تھا۔ اگر کوئی اس کی آنکھوں کی طرف غور سے دیکھے

تو اسے اپنے جسم میں ایک عجیب سی سنسناہٹ محسوس ہونے لگتی تھی۔ کرن کی زبانی تفصیل جاننے کے بعد اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''اولاد تو ہو سکتی ہے مگر طریقہ کار کافی پیچیدہ اور مشکل ہے'' اس کی بات سن کر کرن جھٹ بولی۔

''میں ہر مشکل سے نمٹنے کے لئے تیار ہوں بس میرے ہاں اولاد ہو جائے اور میرا گھر ٹوٹنے سے بچ جائے، میرے میاں دوسری شادی نہ کریں۔'' کرن اتنا کہہ کر ایک بار پھر رونے لگی۔

''خود کو سنبھالئے محترمہ اور بات کو سمجھنے کی کوشش کیجئے، میں کوئی ولی نہیں کہ آپ پر کچھ پھونک دوں اور مسئلہ حل ہو جائے میں ایک جادوگر ہوں اور جادو کے بل پر جو چیزیں حاصل کی جاتی ہیں ان کے لئے سخت محنت کرنی پڑتی ہے۔ بہت سے ایسے کام کرنے پڑتے ہیں جو انسان نہیں کرنا چاہتا۔ ذہنی اور جسمانی دونوں طرح کی کئی تکالیف برداشت کر کے ہی جادو کی دنیا میں کچھ کیا جا سکتا ہے ہاں اگر آپ واقعی ہر طرح کی مشکل برداشت کرنے کا حوصلہ رکھتی ہیں تو پھر میں آپ کی مدد کر سکتا ہوں۔'' شازا نے سپاٹ لہجے میں اپنی بات مکمل کی۔

''میں آپ کو یقین دلاتی ہوں کہ میں ہر مشکل کا سامنا کروں گی۔ ماں بننے کی خاطر اور اپنا گھر بچانے کی خاطر سب کچھ کرنے کو تیار ہوں'' بے شک کرن کی آواز اندرونی عزم کی غماز تھی۔

''تو ٹھیک ہے پھر آپ کل تشریف لایئے گا، میں آج رات کچھ ضروری معلومات حاصل کروں گا۔ عمل کے سلسلے میں اور ان معلومات کے لئے مجھے اپنے استاد کی روح سے رابطہ کرنا ہو گا۔ جو صرف رات کے وقت ہی ممکن ہے۔''

''شازا بھائی کرن کا مسئلہ حل تو ہو جائے گا نا؟'' رانی نے کرن اور شازا کی گفتگو کے دوران پہلی بار زبان کھولی۔ ''بے فکر رہیے'' شازا کے ہونٹوں پر پراسرار مسکراہٹ تھی جبکہ اس کی نظریں کرن کے سراپے پر جمی ہوئی تھیں۔

شازا کی طرف سے ہو کر کرن گھر واپس آئی اور چابی سے آٹو میٹک تالہ کھول کر گھر کے اندر داخل ہو گئی۔ گھر میں سناٹا تھا۔ کرن لان سے ہو کر اندر داخل ہوئی اس کا خیال یہی تھا کہ فرزانہ بیگم آرام کر رہی ہوں گی اور طاہر حسب معمول آفس میں ہو گا۔ کامن روم سے اپنے کمرے کی طرف جاتے ہوئے اسے باتوں کی آواز سنائی دی۔ پہلے تو وہ یہی سمجھی کہ شاید فرزانہ بیگم کسی سے فون پر بات کر رہی ہیں۔ مگر جب اسے کمرے سے مردانہ آواز بھی آتی محسوس ہوئی تو تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر اس کے قدم فرزانہ بیگم کے کمرے کی طرف بڑھ گئے۔ جب اس نے دروازے کی جھری سے جھانکا تو آگے کا منظر دیکھ کر حیران رہ گئی کیونکہ فرزانہ بیگم فل اسپیڈ سے کسی لڑکی کی تعریفیں کر رہی تھیں اور طاہر سر جھکائے ان کے سامنے بیٹھا تھا۔

''نسرین سے شادی کر کے تمہاری قسمت کھل جائے گی۔ شکل و صورت تو پیاری ہے ہی، ساتھ میں بے حد سلیقہ مند بھی ہے اور سب سے بڑھ کر وہ تمہیں باپ بنائے گی، میں دادی بنوں گی، ہمارے گھر بھی خوشیاں آئیں گی، اگر ان کا یہ مطالبہ ہے کہ تمہیں کرن کو طلاق دینی ہو گی تو اس میں برائی کیا ہے؟ ویسے بھی وہ تمہارے لئے بے کار ہے۔ مجھے یقین ہے کہ نسرین سے شادی کر کے تم کرن کو بھول جاؤ گے۔ جب پھول سا بچہ تمہاری گود میں آ کر مسکرائے گا تو تمہیں اس منحوس کی یاد تک نہ آئے گی۔ بیٹے میں چند دنوں کی مہمان ہوں میں چاہتی ہوں کہ آج اگر میری آنکھیں بند ہو گئیں تو، تو ساری زندگی اس منحوس کے عشق کے قید خانے میں بے اولاد بن کر گزار دے گا۔ تجھے خاندان کا نام بچانے کی خاطر دوسری شادی کرنی ہو گی۔ ہاں کہہ دے بیٹا ہاں کہہ دے۔ میں ماں ہوں تیرے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں، تیرے پاؤں پڑتی ہوں۔'' فرزانہ بیگم نے اتنا کہہ کر زار و قطار روتے ہوئے طاہر کے پاؤں پکڑ لئے۔

''اماں یہ کیا کر رہی ہیں، مجھے اتنا سخت گناہ گار نہ کریں کہ میں زندہ ہی نہ رہوں۔'' طاہر تڑپ ہی تو گیا تھا۔

''تو پھر تجھے دوسری شادی کرنی ہوگی۔'' فرزانہ بیگم زور دے کر بولیں۔

''ٹھیک ہے اماں جیسی تمہاری مرضی۔'' طاہر کی حالت ایسی تھی جیسے کوئی جواری اپنا سب کچھ ہار دے۔

''ہاں صدقے، واری واری، میرا بچہ جگ جگ جیئے، دودھوں نہائے، پوتوں پھلے، بیٹے آج تو نے میرے دودھ کی لاج رکھ لی۔ اگر آج تو شادی کے لئے تیار نہ ہوتا تو میں جان دے دیتی۔'' طاہر کے ہاں کہنے سے فرزانہ بیگم خوشی سے پاگل ہوئی جارہی تھیں اور دیوانہ وار طاہر کو پیار کررہی تھیں۔ دروازے سے لگی کرن پتھر کا مجسمہ بن چکی تھی اسے اپنا وجود بے جان لاش کی طرح لگ رہا تھا۔ جیسے سزائے موت پانے والا مجرم کمرہ عدالت میں داخل ہوئی اور بستر پر گر کر گہرے گہرے سانس لینے لگی۔ آنسو اس کی آنکھوں سے بے آواز بہہ رہے تھے۔

☆......☆......☆

دوسرے دن کرن نے رانی کے گھر فون کیا شازا کے پاس جانے کے سلسلے میں، فون رانی کے شوہر نے اٹھایا۔ ''رانی کو کل شام سے شدید بخار ہے وہ دوا کھا کر ابھی سوئی ہے، اسے جگایا نہیں جاسکتا۔'' رانی کے شوہر نے بے زار سے لہجے میں کہا تو کرن کو مایوس ہوکر فون رکھنا پڑا۔ ''شازا کے پاس جانا کتنا ضروری ہے اور رانی کا بخار...... اب میں کیا کروں؟'' بے چینی اور پریشانی سے کرن کی جان نکلنے لگی۔ ''رانی کو بخار ہے تو کیا ہوا تم شازا کے پاس خود ہی چلی جاؤ؟'' ازلی دشمن شیطان نے کرن کے ذہن کو گدگدایا اور کرن نے فوراً اس پر عمل کرتے ہوئے گھر سے باہر کی جانب قدم بڑھا دیئے۔

کرن کو دیکھ کر شازا کے لبوں پر فاتحانہ مسکراہٹ پھیلنے لگی۔ ''میں آپ کے مسئلے کا حل تلاش کرچکا ہوں۔ ماں بننے کے لئے آپ کو اکیس دن میرے زیر سایہ ایک الگ کمرے میں ایک بڑا سا چاقو رکھ کر طلسم پڑھنا ہوگا، 20 دن تک آپ اسی طرح عمل کریں گی مگر اکیسویں دن مقررہ تعداد پڑھنے کے بعد آپ کو وہ چاقو ایک نومولود بچے کے سینے میں اُتارنا ہوگا اور پھر اس کا خون پینا ہوگا۔ اس عمل کی وجہ سے وہ بچہ دوبارہ آپ کے بطن سے جنم لے گا۔'' شازا نے اپنی بات مکمل کی اور کرن کی آنکھوں میں دیکھا۔ کرن کی آنکھیں شازا کی خوفناک گفتگو سے پھٹی کی پھٹی رہ گئی تھیں۔

یہ کیسے ممکن ہے؟ میں ایسا کس طرح کرسکتی ہوں؟ 21 دن تک میں اپنے گھر سے دور کیسے رہوں گی؟ اور پھر ایک بچے کا خون نہیں، نہیں میں ایسا نہیں کرسکتی۔'' کرن نے اپنے دونوں ہاتھ اپنے کانوں پر رکھ لئے۔

''جب تک آپ میرے پاس رہیں گی تب تک میرے تابع ایک بدروح آپ کی شکل میں آپ کے گھر رہے گی۔ جب آپ کا عمل مکمل ہوجائے گا تو آپ آرام سے اپنے گھر واپس جاسکیں گی اور آپ کے میاں یا ساس کو کچھ پتہ نہیں چل سکے گا جہاں تک بچے کے خون کی بات ہے تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے آپ کون سا بچے کو شوقیہ قتل کریں گی، آپ تو صرف مجبوری سے ایسا کریں گی اور پھر ویسے بھی وہ بچہ دوبارہ آپ کی ذات سے جنم لے لے گا۔ صرف تھوڑی سی ہمت کی بات ہے ورنہ یہ کچھ ایسا ناممکن نہیں۔ ہاں اگر آپ یہ سب نہیں کرسکتیں تو آپ کو اپنی طلاق اور شوہر کی دوسری شادی کے لئے تیار رہنا چاہئے۔'' شازا نے کرن کو نفسیاتی طور پر زیر کیا۔

اپنی طلاق اور طاہر کی دوسری شادی کا خیال کرکے کرن کی سانس رُکنے لگی۔ اسے اس بات کا یقین ہوگیا تھا کہ اگر کوئی راستہ اسے تباہی سے بچاسکتا ہے تو وہ یہی راستہ تھا۔ ''لیکن ایسا کیسے ممکن ہے کہ کوئی بدروح میرا روپ دھار کر میرے گھر میری جگہ رہے اور اگر ان اکیس دنوں کے دوران میری ساس نے طاہر کی دوسری شادی کروادی تو؟'' کرن نے بے حد کمزور لہجے میں کہا۔

''اس سلسلے میں آپ بالکل بے فکر رہیں کہ آپ کی غیر موجودگی میں آپ کا شوہر دوسری شادی نہیں کرسکے گا۔'' شازا نے بھاری آواز میں کہا۔ ''اور رہ گیا بدروح کا آپ کی شکل اختیار کرنا، تو بظاہر مشکل سی بات ہے مگر میرے لئے کوئی مشکل نہیں کیونکہ میں ایک ماہر جادوگر ہوں کوئی شعبدہ باز نہیں۔ آپ اپنی آنکھوں سے

اپنی بدروح دیکھ لیجئے'' شازا اتنا کہہ کر اپنی جگہ سے اٹھا اور ساتھ والے کمرے میں چلا گیا تقریباً 5 منٹ بعد وہ لوٹا تو اس کے ہاتھ میں ایک عجیب سی بوتل اور ایک مٹی کا دیا تھا۔ اس نے دیا روشن کیا اور بوتل اپنے سامنے رکھ کر کچھ پڑھنے لگا۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد بوتل میں سے دھواں نکلنا شروع ہوگیا چند لمحوں بعد وہاں ایک انتہائی ڈراؤنی اور بدشکل بدروح موجود تھی اس کی آنکھوں کی جگہ دو گڑھے تھے جن میں جیسے انگارے بھرے تھے۔ حلیہ کے اعتبار سے وہ بدشکل عورت بہت ہی ڈراؤنی اور ہیبت ناک تھی اتنی ہیبت ناک بلا دیکھ کر کرن گنگ ہوکر رہ گئی۔

''چھنوکا یہ خاتون جو سامنے بیٹھی ہیں ان کا روپ دھار لے۔'' شازا نے بارعب آواز میں اس چھنوکا نامی بدروح کو حکم دیا۔ چند لمحوں بعد کرن کی آنکھوں کے سامنے وہ خود کھڑی تھی۔ ذرا برابر بھی تو فرق نہیں رہ گیا تھا اس میں اور اس بدروح میں۔ شازا اپنے پیاسے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے غور سے کرن کے تاثرات نوٹ کررہا تھا۔

☆......☆......☆

رات کے ایک بج رہا تھا طاہر اور فرزانہ بیگم گہری نیند میں تھے کرن کی کھلی ہوئی آنکھوں میں عجیب سی ویرانی تھی۔ اچانک مگر طے شدہ پروگرام کے مطابق کمرے میں چھنوکا آوارد ہوئی اس نے کرن کا روپ دھار رکھا تھا کرن کا دل بری طرح دھک دھک کرنے لگا حالات کی ستم ظریفی سے اس کا کلیجہ پھٹا جارہا تھا بشکل بدروح اس کے سامنے کھڑی تھی اور گھر سے باہر نکل آئی۔ چھنوکا نے اندر سے دروازہ بند کرلیا چند لمحوں تک کرن سکتے کے سے عالم میں اپنے گھر کے دروازے کو دیکھتی رہی اور پھر گلی کے سرے کی طرف بڑھ گئی جہاں اپنی لانسر میں شازا اس کا منتظر تھا۔

راستے میں کرن کا ضبط اپنی آخری حدوں کو چھو رہا تھا وہ بڑی مشکل سے اپنے آنسو روکے بیٹھی تھی پھر بھی کوئی بے قرار آنسو پلکوں کی حدود سے چھلک جاتا تو وہ فوراً بے دردی سے آنکھیں مسل دیتی۔ ڈرائیونگ سیٹ پر شازا کرن کی حالت سے بے خبر نہیں تھا۔ اس قدر جذباتی ہونے سے کام نہیں چلے گا کچھ ہی دنوں کی تو بات ہے، پھر آپ کی گود بھر جائے گی اور گھر بھی اجڑنے سے بچ جائے گا۔ اس دوران ہمت اور صبر سے کام لینا ہوگا۔ شازا نے اتنا کہہ کر کرن کے مرمریں ہاتھ پر اپنا بڑا اور مضبوط سا ہاتھ رکھ دیا۔ ''جی میں ٹھیک ہوں۔'' کرن بمشکل تمام اتنا ہی کہہ پائی تھی اور اس نے اپنا ہاتھ آہستگی سے شازا کے ہاتھ کے نیچے سے نکال لیا۔ شازا زیر لب مسکرایا تھا۔

گھر پہنچ کر شازا نے کرن کو وہ کمرہ دکھایا جہاں اکیس دن تک اسے رہنا اور عمل بھی کرنا تھا۔ وہ ایک بڑا کمرہ تھا مگر اس میں کوئی کھڑکی نہیں تھی اس لئے وہ اندھیرا اندھیرا سا محسوس ہورہا تھا۔ ایک چھوٹا سا روشن دان ضرور تھا جو کہ کمرے کی مناسبت سے ناکافی تھا۔ کمرے میں ایک ڈبل بیڈ تھا ایک کونے میں تو سیٹر صوفہ رکھا تھا۔ زمین پر پھولدار ایرانی قالین بچھا تھا۔ اس قالین پر کمرے کے وسط میں ایک کالے رنگ کی کشن رکھی تھی جس کے آگے طشت میں ایک لمبا سا چاقو رکھا تھا۔ بقول شازا کے کرن کو اسی جگہ بیٹھ کر عمل کرنا تھا اور اکیسویں رات یہی چاقو بچے کے سینے میں اُتارنا تھا شازا کے کمرے سے جانے کے بعد کرن گھائل پرندے کی طرح زمین پر بیٹھ گئی اس کا دماغ سائیں سائیں کررہا تھا اور دل ڈھول کی طرح بج رہا تھا۔ اس کی آنکھیں خشک تھیں شاید تقدیر کی طرح آنسو بھی اس سے روٹھ گئے تھے۔

☆......☆......☆

کرن نے ایک رات کا عمل مکمل کرلیا تھا عمل پڑھنے میں اسے تقریباً چار گھنٹے لگے تھے کرن کی آنکھ کھلی تو دن کے ساڑھے دس بجے تھے بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پر ناشتہ رکھا تھا کرن کو سخت بھوک محسوس ہورہی تھی لہٰذا وہ اٹیچ باتھ سے منہ ہاتھ دھونے کے بعد ناشتہ کرنے لگی۔ ناشتہ بے حد لذیذ تھا مگر اندرونی غموں کی وجہ سے نوالے بار بار اس کے حلق میں پھنسے جارہے تھے تقریباً دو گھنٹے بعد دروازے پر دستک ہوئی کرن اس وقت صوفہ پر بیٹھی آنے والے دنوں پر غور کررہی تھی۔ دستک سے وہ چونک کر حقیقت کی دنیا میں لوٹ آئی اور دوپٹہ سر پر لے کر دروازہ کھول دیا۔

سامنے شازا کھڑا تھا۔ ''کیسی ہیں آپ'' اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔

''جی ٹھیک ہوں'' کرن نظریں جھکا کر بولی۔

''کرن آپ کو معلوم ہے کہ آپ کتنی خوبصورت ہیں؟ جب میں نے آپ کو پہلی بار دیکھا تھا تو تبھی میرا دل دھڑکنے لگا تھا۔ حالانکہ میرے لئے حسین لڑکیوں کی کوئی کمی کہیں مگر نجانے آپ کے حسن میں ایسا کیا ہے کہ ایک پل میں میرا دل کھو گیا۔ آپ میرے ساتھ دوستی کرلیں۔'' شازا اس کے بہت قریب آ گیا تھا۔

''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں'' وقت کی نزاکت اور شازا کے ارادے کا خیال کر کے وہ ہکا بکا رہ گئی۔ اس نے اپنی پھٹی پھٹی آنکھوں سے شازا کی پراسرار سی چمک والی آنکھوں میں سے شازا کی پراسرار سی چمک والی آنکھوں میں دیکھا اور پھر اس کا ذہن بالکل ماؤف ہو گیا۔ اگلے پل وہ شازا کی مضبوط بانہوں میں تھی وہ اس کے نرم اور گلابی ہونٹوں پر اپنا تسلط جما لیا کرن نے مزاحمت کی کوشش کی مگر شازا جیسے مرد سے خود کو بچا لینا اس کیلئے ممکن ہی کب تھا شازا کی شیطانی پیاس اپنے عروج پر پہنچ چکی تھی کرن کا نرم و نازک دودھ جیسا سراپا اس کے سامنے تھے۔ شازا کو یوں لگا جیسے دودھ کی ندی بہہ رہی ہو اور پھر شازا اس ندی میں کود گیا تقریباً گھنٹہ بھر تک وہ کرن کے جسم کی دھجیاں بکھیرتا رہا تھا۔

کچھ دیر بعد جب کرن کے حواس بحال ہوئے تو اس کا انگ انگ ہونے والے ظلم پر سراپا احتجاج تھا وہ اپنے چور چور وجود پر ماتم کرنے لگی۔ ''جانور درندے کیوں کیا تم نے میرے ساتھ ایسا، کیوں کیا؟'' کرن زار و قطار روتے ہوئے شازا کو جھنجوڑنے لگی۔

''اس لئے کہ تم مجھے بہت پیاری لگتی ہو۔'' شازا نے اسے ایک بار پھر اپنے سینے سے بھینچ کر کہا اور اپنے ہونٹوں سے کرن کے ہونٹ مسلنے لگا اور پھر تو یہ روز کا معمول بن گیا۔

کرن رات کو عمل کرتی اور دن کو شازا اس کا جسم ادھیڑ کے رکھ دیتا۔ وقت یوں ہی گزرنے لگا اور اکیسویں رات آ گئی۔

شازا کافی دیر سے غائب تھا جب وہ لوٹا تو اس کی گود میں ایک پھول سا بچہ تھا۔ کرن کا دل غم سے پھٹنے لگا۔ مگر وہ اس منحوس راستے پر اتنا آگے بڑھ چکی تھی کہ واپسی کا کوئی راستہ بچا بھی نہیں تھا۔ جب رات کو وہ عمل مخصوص تعداد میں پڑھ چکی تو اس نے کانپتے ہاتھوں سے تیز دھار چاقو اٹھایا۔ اس کا پورا جسم خزاں رسیدہ پتے کی طرح لرز رہا تھا لیکن اسے اپنی حالت پر قابو پانا تھا۔ کرن نے آنکھیں بند کیں اور پورے کا پورا چاقو معصوم نومولود بچے کے سینے میں اتار دیا۔ بچے کے جسم نے چند جھٹکے لئے اور ساکت ہو گیا۔ کچھ دیر بعد کرن بچے کی لاش سے بہتا ہوا خون پی رہی تھی۔ خون پی کر وہ وہیں بے ہوش ہو گئی۔

صبح جب اس کی آنکھ کھلی تو وہ بیڈ پر لیٹی تھی اس نے اٹھ کر دیکھا تو بچے کی لاش، خون اور چاقو وغیرہ سب غائب تھے یقیناً یہ ساری تبدیلیاں شازا نے کی تھیں، بہرحال اب وہ آزاد تھی عمل مکمل ہو چکا تھا اور اب وہ جلد از جلد گھر جانا چاہتی تھی۔ وہ بیڈ سے اٹھی اور کمرے سے باہر نکل آئی۔

ڈرائنگ روم میں شازا موجود تھا۔ ''کامیابی مبارک ہو جانم۔'' شازا نے اسے گلے لگا لیا۔

''پلیز شازا میں اب فوراً اپنے گھر واپس جانا چاہتی ہوں'' کرن نے خود کو شازا سے الگ کرتے ہوئے کہا۔ جانے اس کے لہجے میں لجاجت زیادہ تھی یا نفرت۔

''میں جانتا ہوں تم جلد از جلد مجھ سے دور ہونا چاہتی ہو اسی لئے تمہارے جاگنے سے پہلے میں جھنوکا سے بات کر چکا ہوں۔ وہ گھر کی کچھ چیزیں لینے کے بہانے تمہارے گھر سے نکل چکی ہے۔ چیزیں لینے کے بعد وہ سیدھا یہاں آئے گی اور تم اس کے کپڑے پہن کر اور چیزیں لے کر اپنے گھر چلی جاؤ گی۔ جب تک تمہیں مجھے برداشت کرنا ہوگا جان من'' شازا کی خبیث مسکراہٹ گہری ہوئی اور وہ کرن کو گود میں اٹھا کر بیڈ روم میں لے گیا۔ یوں تو اس نے پہلے بھی کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی مگر آج اس کی شدت کچھ زیادہ ہی عروج پر

تھی۔ شاید وہ اس آخری موقعہ کو یادگار بنانا چاہتا تھا۔

جب شازا اپنی من مانی کر چکا تو جھنوکا اچانک کمرے میں نمودار ہو گئی۔ ٹوکری اس کے ہاتھ میں تھی اس وقت کرن اور شازا بستر پر بے ترتیب موجود تھے۔ جھنوکا نے ان دونوں کو اس حالت میں دیکھ کر انتہائی بے ہودہ سا قہقہہ لگایا کرن بے بسی اور شرمندگی سے کٹ کر رہ گئی جبکہ شازا بے شرمی سے مسکرا رہا تھا۔

کرن جب اپنے گھر کے سامنے پہنچی تو اس سے ضبط کرنا مشکل ہو گیا اور وہ گھر کے گیٹ سے لگ کر بیٹھ گئی اور بری طرح رونے لگی۔ طاہر دفتر سے گھر واپس آیا تو اسے گیٹ کے قریب کرن روتی ہوئی نظر آئی۔ وہ سخت حیران ہوا۔ ''کیا ہوا کرن تم یوں سڑک پر بیٹھ کر رو کیوں رہی ہو؟'' پریشانی طاہر کی آواز سے عیاں تھی۔ کرن اس سے لپٹ گئی اور مزید شدت سے رونے لگی۔ طاہر نے اس سے رونے کی وجہ پوچھی مگر وہ ہر سوال کے جواب میں صرف آنسو بہاتی رہی۔ کہنے کو اس کے پاس تھا بھی کیا؟

☆......☆......☆

جانے کتنے عرصے بعد اس گھر میں خوشیوں نے قدم رکھا تھا۔ طاہر اور کرن کو جیسے زندگی مل گئی تھی اور فرزانہ بیگم کو ہر پل یوں لگ رہا تھا جیسے خوشی کے مارے ابھی ان کا دم نکل جائے گا۔ ''اللہ یہ تیری مہربانی ہے کہ لق و دق صحرا گل گلزار ہو گیا، اللہ میاں جب تک میں اپنے پوتے کا چاند سا چہرہ نہ دیکھ لوں تب تک مجھے اپنے پاس نہ بلانا پھر بعد میں جیسے تیری مرضی'' وہ گڑگڑا کر دعا مانگتیں اور پھر وہ دن بھی آ گیا جس کے انتظار میں وقت کاٹے نہ کٹ رہا تھا۔

کرن نے ایک خوبصورت لڑکے کو جنم دیا تھا۔ طاہر اور فرزانہ بیگم خوشی سے دیوانے ہوئے جا رہے تھے خوش تو کرن بھی بہت تھی آخر اللہ نے اتنے عرصے میں اس کی گود بھری تھی۔ مگر جب اس نے بچے کو دیکھا تو اس کا دل ڈوب گیا۔ پیدائشی طور پر بچے کی شباہت بالکل شازا جیسی تھی۔ یہ سوچ کر کرن کو چکر سے آنے لگے مگر وہ کچھ بھی تو نہیں کر سکتی تھی جو لوگ بچہ دیکھنے آتے یہی کہتے تھے۔

''بچہ نہ ماں پر ہے نہ باپ پر، اپنی ہی شکل ہے'' اور یہ شکل کس کی تھی یہ صرف کرن جانتی تھی۔

بچے کا نام رکھنے کا مرحلہ آیا تو فرزانہ بیگم نے بچے کا نام شہروز رکھنے کا ارادہ ظاہر کیا تھا۔ طاہر کو بھی یہ نام پسند آیا جبکہ کرن کا دل دھک سے رہ گیا۔ ''شہروز یعنی شازا کا اصلی نام۔ کیا مجھے اپنے بچے کو اس کے نام سے پکارنا پڑے گا جس سے اس قدر تلخ یادیں وابستہ ہیں۔'' سوچ سوچ کر کرن کو ہول اٹھ رہے تھے اور پھر اس نے فرزانہ بیگم سے بات کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

''اماں جی ایک درخواست کرنی تھی۔'' وہ بے حد لجاجت سے گویا ہوئی فرزانہ بیگم اس وقت عصر کی نماز پڑھ کر فارغ ہوئی تھیں۔ ''کہو میری بچی'' فرزانہ بیگم نہایت محبت سے بولیں۔ جب سے کرن نے انہیں خوشخبری سنائی تھی تب سے فرزانہ بیگم کا رویہ دوبارہ ویسا ہو گیا تھا جیسا شادی کے وقت تھا ''اماں جی مجھے یہ نام شہروز بہت برا لگتا ہے۔ پلیز اگر آپ یہ نام بدل دیں تو بہت مہربانی ہوگی'' کرن انہیں ملتجی نگاہوں سے دیکھنے لگی۔

''لو اتنی سی بات۔'' فرزانہ بیگم مسکرا کر بولیں۔

''جو نام ہماری بہو رانی کو پسند نہیں، وہ آج سے اس گھر میں نہیں لیا جائے گا۔'' فرزانہ بیگم نے بہ پرشار ہوتے ہوئے کہا اور پھر باہمی رضامندی سے بچے کا نام طارق فائنل ہو گیا۔

☆......☆......☆

وقت گزرتا رہا اور طارق ناز و نعم میں پلتا رہا۔ وہ ایک نہایت بدتمیز، نالائق اور ضدی بچہ تھا۔ باپ کی مار نے بھی اس پر کبھی اثر نہیں کیا۔ وہ ماں باپ یا دادی وغیرہ سے سیدھے منہ بات بھی نہ کرتا تھا اور پھر اس نے صرف ساتویں جماعت سے اسکول چھوڑ دیا۔ سب نے سمجھایا اور تعلیم کی اہمیت بتائی مگر اس کا جواب تھا۔ ''گولی مارو ان کتابوں کو، مجھ سے نہیں پڑھا جاتا'' اور پھر طارق اپنی ضد پر قائم رہا اور سب نے ہار مان لی۔ چودہ سال کی عمر تک اس میں دنیا بھر کی برائیاں آ چکی تھیں۔ سگریٹ، نشہ، چوری، آوارہ گردی، ایسی کون سی برائی تھی جو اس میں نہ

تھی۔ پوتے کے لچھن دیکھ کر فرزانہ بیگم وقت سے کچھ پہلے ہی قبر میں جا سوئیں۔

طارق جب اکیس برس کا ہوا تو وہ ایک خطرناک کریمنل بن چکا تھا وہ ڈکیتی اور قتل کی کئی وارداتوں میں ملوث تھا۔ کبھی کبھار گھر آتا اور ماں باپ سے لڑائی جھگڑا کرتا اور پیسے لے کر چلا جاتا۔

اس دن اتوار تھا۔ طاہر اپنے کسی دوست کی عیادت کرنے گھر سے باہر گیا ہوا تھا۔ کرن کام والی ماسی حمیدہ سے کام کروا رہی تھی ماسی حمیدہ یہاں بہت عرصے سے کام کر رہی تھی آج اس کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں تھی لہٰذا وہ اپنے ساتھ اپنی جواں سال پوتی جمیلہ کو لے آئی تھی تاکہ کام جلدی ختم ہو سکے۔

اچانک طارق آ گیا۔ اس وقت کرن ماسی حمیدہ سے اپنے کمرے کی جھاڑ پونچھ کروا رہی تھی اور جمیلہ صحن میں جھاڑو لگا رہی تھی طارق نے سازگار موقع دیکھ کر جمیلہ کے منہ پر ہاتھ رکھا اور اسے گھسیٹ کر اسٹور روم میں لے گیا پھر اس نے اسے شدید زیادتی کا نشانہ بنایا اور خون میں لت پت چھوڑ کر فرار ہو گیا اس واقعہ کے بعد طاہر نے طارق پر اپنے گھر کے دروازے ہمیشہ کے لئے بند کرا دیئے اور اس طرح تقریباً ڈیڑھ سال گزر گیا اس دوران طاہر اور کرن کا طارق سے کوئی رابطہ نہ رہا تھا۔

ایک دن دروازے پر دستک ہوئی۔ دروازہ کرن نے کھولا سامنے پولیس والا کھڑا تھا۔ ”طاہر درانی کا گھر یہی ہے“ پولیس والے نے روایتی انداز میں سوال کیا۔

”جی ہاں یہی ہے۔ بات کیا ہے؟“ کرن نے سر پر دوپٹہ لیتے ہوئے سوال کیا۔

”آپ کون ہیں پولیس والے نے کرن کو جواب دینے کے بجائے دوبارہ سوال کیا۔ میں ان کی بیوی ہوں“ کرن نے کہا تو پولیس والے نے خاصے معانی خیز لہجے میں ”اچھا“ کہا۔

”بات یہ ہے بی بی کل پولیس مقابلے میں تین ڈکیت مارے گئے ہیں جبکہ دو پولیس نے گرفتار کر لیے ہیں جو تین ڈکیت مارے گئے ہیں ان میں سے ایک کی جیب سے آپ لوگوں کا ایڈریس برآمد ہوا ہے اور گرفتار ہونے والے دو ڈکیتوں نے اس ڈکیت کا نام طارق بتایا ہے......“

پولیس والا مزید کچھ کہنا چاہتا تھا کرن چکرا کر زمین پر گر گئی۔ اتنے میں اندر سے طاہر بھی آ گیا اور جب اسے حقیقت حال کا پتہ چلا تو اس سے بھی ضبط کرنا مشکل ہو گیا۔

بہر حال طاہر کرن کو تسلی دے کر پولیس والوں کے ساتھ روانہ ہو گیا۔ جب وہ لوٹا تو اس کے ساتھ طارق نہیں بلکہ طارق کی لاش تھی۔ کچھ ہی دیر میں میت گھر کے صحن میں پڑی تھی اور تمام رشتے دار و احباب گھر آ چکے تھے کرن چیخ چیخ کر رو رہی تھی جبکہ طاہر ایک کونے میں ساکت بیٹھا تھا۔ ”ہمت کرو میرے بھائی اللہ کو یہی منظور تھا“ طاہر کے خالہ زاد بھائی نے طاہر کو گلے لگانا چاہا۔

”مگر یہ کیا؟ طاہر کی گردن ایک طرف ڈھلک گئی، جانے وہ کب کا زندگی سے رشتہ توڑ چکا تھا۔ طاہر کی موت سے کرن کو سکتہ ہو گیا۔ ایک گھر سے دو جنازے ایک ساتھ نکلے تو کہرام مچ گیا۔ ہر آنکھ اشکبار تھی اور کرن کے لئے تو آج کا دن روز حشر تھا اور پھر طارق اور طاہر کو دفن کر دیا گیا۔

☆......☆......☆

کمرے میں طارق کا جھولا رکھا تھا جو وہ بچپن میں جھولا کرتا تھا۔ کرن گھٹنے ٹیک کر زمین پر بیٹھ گئی۔ آنسو اس کی آنکھوں سے ایک تواتر سے بہہ رہے تھے۔ ”پروردگار مجھے معاف کر دے، مجھے معاف کر دے میرے گناہ بخش دے“ کرن نے دونوں ہاتھ جوڑ کر منہ آسمان کی طرف کر لیا تھا۔ وہ تڑپ تڑپ کر اس ذات سے معافی مانگ رہی تھی جو سب معاف کرنے والوں سے زیادہ معاف کرنے والا ہے۔ جو رحم کرنے والوں میں بہت عظیم ہے۔

کچھ دیر بعد وہاں ایک بے روح جسم پڑا تھا۔ جس کے ہاتھ مرنے کے بعد بھی معافی کے انداز میں جڑے تھے اور بے نور آنکھیں آسمان کی طرف لگی تھیں۔ سامنے لگا خالی جھولا خود بخود آگے پیچھے ہل رہا تھا۔

راز

امبر حسین



لارا بری طرح ٹھٹک گئی تھی......وہ آدمی اس قدر خوبصورت تھا کہ وہ اپنی پلکیں جھپکانا بھول گئی۔ بس یک ٹک اسے گھورے جا رہی تھی

رابرٹ کی تعریف لفظوں میں بیان کرنا مشکل بات ہوگی۔ مختصراً اتنا کہ وہ مردانہ وجاہت کا ایسا نمونہ تھا جس کی مثال شاید ہی مل جائے۔ صنف نازک تو الگ، اس کے ہم صنف بھی اسے دیکھ کر، اپنے دلوں کی دھڑکنیں ساکت ہوتی محسوس کر سکتے تھے بلاشبہ ایسے حسین و جمیل مرد کم نظر آتے ہیں لارا تو پہلی نظر میں اس پر مرمٹی تھی اس کی اور رابرٹ کی پہلی ملاقات ڈرامائی انداز میں ہوئی تھی وہ اپنی بیمار گرینڈ مدر کو دیکھنے ان کے قصبے آئی تھی اور اب اپنے شہر روانہ ہونا چاہتی تھی۔

”مائی چائلڈ! تمہیں ہوسٹل پہنچتے رات گہری ہو جائے گی درمیان کا راستہ سنسان ہے۔ بے شک تم صبح ہوتے ہی نکل پڑتا۔“ بوڑھے گرینڈ فادر نے اسے ٹوکا۔

”اوہ نو......یہ نہیں ہو سکتا مجھے صبح آٹھ بجے دفتر پہنچنا ہے۔ باس کے ساتھ ایک اہم میٹنگ میں شرکت کرنی ہے۔“ اس نے وال کلاک کی طرف دیکھا جو رات کے سوا دس بجے کی خبر دے رہا تھا وہ اپنے ہینڈ بیگ سے کار کی چابی نکالتی ہوئی بولی۔ ”دیر ہوتی جا رہی ہے مجھے اب نکلنا چاہیے۔“

”مگر......“ بیمار گرینڈ مدر نے کچھ کہنا چاہا۔

”اگر مگر کچھ نہیں“ اس نے نانی کی بات کاٹتے

ہوئے ان کے گلے میں بانہیں ڈال دیں اور اپنا دایاں گال ان کے بائیں رخسار سے چھوتی ہوئی کہنے لگی۔
''میں چھوٹی، نا سمجھ بچی نہیں ہوں، جو آپ دونوں یوں خوفزدہ ہو رہے ہیں۔ مجھے اپنی حفاظت کرنی آتی ہے اور ہاں میں ہوسٹل پہنچتے ہی اپنی خیریت کی اطلاع کردوں گی۔ بس آپ اپنا فون انگیج مت رکھیے گا اچھا اب خدا حافظ۔'' وہ ان دونوں کو ہاتھ ہلاتی ہوئی تیزی سے کمرے سے باہر نکل گئی۔

وہ آبادی سے دور نکل چکی تھی۔ ابھی پون گھنٹے کا سفر مزید باقی تھا کہ کار کے ٹائر بری طرح چرچرائے۔
''اُف خدایا۔'' بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔ باہر نکل کر دیکھا تو کار کا ایک ٹائر پنکچر ہوگیا تھا۔ ''اوہ یہ تو بہت برا ہوگیا۔'' وہ پریشانی سے بڑبڑائی۔ ایسے کڑے وقت وہ سوائے پریشان ہونے کے کیا کرتی۔ جب اس کے پاس ایکسٹرا ٹائر بھی موجود نہیں تھا۔
''بھاڑ میں جائے باس اور میٹنگ۔ مجھے گرینڈ فادر کے گھر سے واقعی نہیں نکلنا چاہئے تھا۔'' اس نے خود کو لعنت و ملامت کرتے ہوئے اپنے اطراف کا جائزہ لیا خوشی سے اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ وہ آبادی سے کچھ فاصلے پر ہی کھڑی تھی آبادی کیا تھی بس دس بارہ مکانات تھے۔ لارا کے خیال میں نیا آباد ہونے والا علاقہ تھا۔
''مجھے ہیلپ ضرور مل جائے گی۔'' اس نے پکے یقین سے سوچا چاند پورا تو نہ تھا مگر قریب کی تاریخوں کا ضرور تھا۔ سو راستے میں چلنے کی کسی قسم کی دشواری و وقت اٹھانے سے وہ بآسانی بچ گئی تھی وہ بہت جلد سنسان آبادی کے علاقے میں داخل ہوگئی تمام مکانات ایک دوسرے سے کافی فاصلے پر بنے ہوئے تھے سبھی مکانات کی بتیاں گل تھیں سوائے ایک دو منزلہ خوبصورت مکان کے۔
''مجھے اسی طرف جانا چاہئے۔'' اس نے روشنی میں نہائے مکان کو دیکھتے ہوئے خیال کیا۔ اس نے مطلوبہ جگہ پہنچ کر کال بیل بجائی چند لمحوں بعد اس کی آنکھوں کے سامنے ستائیس اٹھائیس برس کا ایک آدمی کھڑا تھا۔
لارا بری طرح ٹھٹک گئی تھی...... وہ آدمی اس قدر خوبصورت تھا کہ وہ اپنی پلکیں جھپکانا بھول گئی۔ بس یک ٹک اسے گھورے جارہی تھی اپنی چوبیس سالہ زندگی میں اس نے آج تک اتنا حسین شخص نہیں دیکھا تھا۔
''فرمایئے۔'' وہ جس قدر متاثر کن شخصیت کا مالک تھا اس کی آواز میں اسی قدر اکتاہٹ و بیزاری شامل تھی۔ لارا کے خیال میں وہ نیند سے بیدار ہونے پر چڑ گیا تھا یا ہوسکتا ہے وہ مغرور ہو۔
''اسے مغرور ہونا بھی چاہئے۔'' لارا نے اس کی خوبصورتی کو دل میں سراہتے ہوئے سوچا۔ ''میری کار کا ٹائر پنکچر ہوگیا ہے اور اضافی ٹائر بھی میرے پاس نہیں مجھے آپ کی مدد درکار ہے۔''
''آیئے اندر تشریف لے آئیں۔'' اس نے اس دفعہ شائستہ لہجے میں کہا اور ایک طرف ہوگیا۔ وہ قدرے جھجکتی ہوئی اندر داخل ہوگئی۔
''کیا آپ اکیلے رہتے ہیں۔'' لارا کو اور کوئی دکھائی نہیں دیا تو اس نے استفسار کیا۔
''جی ہاں۔'' اس نے مختصر جواب دیا وہ اسے بڑے سے ہال نما کمرے میں لے آیا...... جو سجاوٹ کے لحاظ سے ڈرائنگ روم معلوم ہوتا تھا۔
''تشریف رکھیں...... میں ابھی آتا ہوں۔'' وہ اسے صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کرتا ہوا بولا۔ اور کمرے سے باہر نکل گیا لارا اسٹ کر صوفے پر بیٹھ گئی اور کمرے کا جائزہ لینے لگی۔ کچھ دیر بعد وہ چلا آیا اس کے دائیں ہاتھ میں ایک عدد ٹائر ہونے کے علاوہ دوسرے ہاتھ میں کچھ ضروری سامان بھی تھا۔ لارا کھڑی ہوگئی اور معذرت خواہ لہجے میں بولی۔ ''تکلیف دینے کی معافی چاہتی ہوں۔''
''کوئی بات نہیں'' وہ بڑی دلکشی سے مسکرایا تو لارا اس کی اس ادا پر فدا ہوگئی۔ ''چلئے میں ٹائر تبدیل کردوں۔'' وہ کہتا ہوا تیزی سے آگے بڑھا تو لارا نے

اس کی پیروی کی۔
کچھ دیر بعد وہ نیا ٹائر لگا چکا تھا۔ ''لیجئے محترمہ، آپ کا کام ہوگیا ہے۔'' وہ دونوں ہاتھ جھاڑتا ہوا کھڑا ہوگیا اور کار کا فرنٹ ڈور کھول دیا۔ جس کا مطلب تھا کہ لارا کو اپنی منزل کی جانب گامزن ہوجانا چاہئے۔
''مجھے آپ سے مل کر بے حد خوشی ہوئی ہے۔'' لارا نے ڈرائیونگ سیٹ پر براجمان ہوتے ہوئے کہا۔
وہ مسکرانے لگا ''اور مجھے بھی۔ کیا آپ سے دوبارہ ملاقات ہوسکتی ہے؟''
''ک ک...... کیوں نہیں۔'' لارا کی سانسیں خوشی سے پھولنے لگیں اس نے برابر والی سیٹ پر پڑا ہینڈ بیگ اٹھایا اس میں سے پین اور پاکٹ سائز ڈائری نکالی اور تیزی سے لکھنے لگی۔ ''یہ میرا موبائل فون نمبر ہے آپ کا جب دل چاہے آپ مجھ سے رابطہ کرسکتے ہیں۔ مجھے اچھا لگے گا'' اس نے ڈائری کا صفحہ پھاڑ کر اس کے حوالے کیا۔
''ٹھیک ہے اب جاؤ۔'' یکدم اس کا لہجہ خشک ہوگیا اور وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا اپنے مکان کے اندر چلا گیا لارا متعجب خیز نظروں سے اسے جاتا دیکھتی رہی۔
''موڈی معلوم ہوتا ہے......'' اس نے کندھے اچکا کر سوچا اور گاڑی اسٹارٹ کرکے آگے بڑھ گئی۔

☆......☆......☆

وہ سوزن کے کان کھانے میں مصروف تھی۔ ''تم سوچ بھی نہیں سکتیں وہ کتنا خوبصورت ہے اگر تم بھی اسے دیکھ لو تو یقیناً میری طرح پاگل ہوجاؤ، اور جب اس نے مجھ سے دوبارہ ملنے کا کہا۔ تب میں خوشی کے مارے بدحواس ہوگئی تھی۔''
''اور یقیناً اب تمہیں اس نامعلوم نام کے ہیرو کی کال کا انتظار ہوگا۔'' سوزن نے تبصرہ کیا۔
''کیا نہیں ہونا چاہئے۔'' لارا نے تلملا کر الٹا سوال داغا۔ ''اور اگر اس نے تم سے رابطہ نہیں کیا تو......؟''
''تو بھی میں اس کا تاحیات انتظار کروں گی۔
''مگر عمر بھر کے انتظار کی نوبت نہیں پڑی رات کے پونے ایک کا وقت تھا وہ بیڈ پر لیٹی سسپنس سے بھرپور ناول پڑھ رہی تھی اور جب وہ انتہائی دلچسپ موڑ پر پہنچی تو موبائل فون کی چنگھاڑتی بیل نے خلل ڈال کر اس کا موڈ خراب کردیا۔ ''اس وقت کون ہوسکتا ہے؟'' اس نے منہ بناتے ہوئے سوچا۔ پھر نا چاہتے ہوئے موبائل فون ہاتھ میں لے لیا۔ سی ایل آئی اسکرین پر دیکھی تو سخت متعجب ہوئی...... کیونکہ اسکرین پر بجائے کسی نمبر کے oooCall درج تھا۔ اس نے بدستور حیرت زدہ ہوتے ہوئے موبائل فون اپنے کان سے لگالیا اور مخصوص انداز میں بولی۔ ''لارا اسپیکنگ۔''
''آئی ایم رابرٹ۔'' دوسری جانب سے ایک جانی پہچانی خوبصورت آواز ابھری۔
''اچھا! تو آپ کا نام رابرٹ ہے۔'' وہ خوش ہوکر بولی۔
''لگتا ہے تم نے مجھے پہچان لیا۔''
''ہاں بھلا! میں اپنے محسن کو کیسے بھول سکتی ہوں۔''
''ہوں......'' اس نے گہرا سانس کھینچا پھر کچھ توقف کے بعد بولا۔ ''میں تم سے ملنا چاہتا ہوں۔''
''کیوں نہیں...... یہ میری خوش قسمتی ہوگی۔'' لارا جھوم گئی۔ ''آپ جگہ اور وقت کا تعین کیجئے۔ میں آجاؤں گی۔''
''ٹھیک ہے پھر وہیں چلی آنا۔ جہاں ہم پہلی بار ملے تھے۔''
''یعنی آپ کے گھر۔'' لارا نے اپنے اندازے کی تائید چاہی۔
''ہاں تم درست سمجھیں کل رات بارہ بجے یا بارہ سے کچھ وقت اوپر بھی تم میرے گھر آسکتی ہو۔ دراصل میری دفتر سے واپسی ساڑھے گیارہ پونے بارہ بجے تک ہوتی ہے پھر پرسوں مجھے بزنس کے سلسلے میں ایک ماہ کے لئے لندن جانا ہے اور میں روانگی سے قبل تم سے ضرور ملنا چاہتا ہوں۔'' اس نے وضاحت کی تو لارا نے مطمئن ہوکر ہامی بھرلی۔

صبح وہ سوزن کو اپنی اور رابرٹ کی طے شدہ ملاقات کے بارے میں بتا رہی تھی۔ ''لارا! تمہیں وہاں ہرگز نہیں جانا چاہئے تم اس کے بارے میں کچھ زیادہ نہیں جانتیں وہ کون ہے؟ اور جانے اس کا مقصد کیا ہو؟ اتنے ویرانے میں وہ بھی اتنی رات گئے جانا دانشمندی نہیں ہے۔'' سوزن نے اسے مخلصانہ مشورہ دیا۔

''اُفوہ، ایسی باتیں بند کرو'' لارا نے جل کر اسے ٹوک دیا۔ ''اٹھو میرے ساتھ بازار چلو میں آج کی ملاقات کے لئے ایک بہترین لباس خریدنا چاہتی ہوں۔''

سوزن کچھ دیر اسے تاسف سے گھورتی رہی پھر کسی خیال کے تحت بولی۔ ''تمہاری مرضی مگر میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گی۔'' لارا نے اس کی بات پر کوئی اعتراض نہیں کیا۔

رات کو وہ دونوں ''ورکنگ وومن ہاسٹل'' سے بہانہ بنا کر رخصت ہو چکی تھیں وہ سوا بارہ بجے کے قریب اپنی مطلوبہ جگہ پر پہنچیں۔ ''تم اندر جاؤ۔ میں یہیں موجود ہوں کسی قسم کا خطرہ محسوس ہو تو مجھے میرے موبائل پر فوراً کال کر لینا'' سوزن باکسنگ چیمپئن مشہور تھی اور اسے اپنی طاقت پر بہت ناز رہتا تھا مگر جانے کیوں وہ اندر جانے سے گھبرا رہی تھی وہ باہر ہی کھڑی رہنا چاہتی تھی۔

''تم حد سے زیادہ شکی مزاج ہو'' لارا نے ہنستے ہوئے کہا اور روشنی سے پرنور رابرٹ کے مکان کی جانب چل دی۔ اس نے کال بیل بجائی تھی کہ رابرٹ نے فوراً دروازہ کھول دیا۔ ''کیا آپ دروازے سے چپکے کھڑے تھے۔'' لارا نے اندر داخل ہوتے ہوئے مذاق کیا۔

''یہی سمجھ لو'' وہ سنجیدگی سے بولا۔ ''میں سخت بے چینی سے تمہارا انتظار کر رہا تھا۔''

''اور میں بھی تم سے ملنے کو بے قرار تھی۔'' لارا نے صاف گوئی سے کام لیا۔

''آؤ چھت پر چلتے ہیں'' رابرٹ بولا۔ ''مجھے کھلی فضا میں گپ شپ کرنا اچھا لگتا ہے یہ میرا پسندیدہ مشغلہ ہے'' وہ دونوں چھت پر چلے آئے اور باتیں کرنے لگے۔

''یہ چودھویں کا چاند کتنا خوبصورت دکھائی دے رہا ہے۔'' رابرٹ کی نظریں روشنی بکھیرتے ماہتاب پر ٹھہر گئیں۔ لارا بھی دلچسپی کے ساتھ پورے چاند کا دیدار کرنے لگی۔

''چودھویں کے چاند کی کرنیں جب مجھ پر پڑتی ہیں تو میں آپے سے باہر ہو جاتا ہوں پھر مجھے کوئی ہوش باقی نہیں رہتا بس پھر میرے دماغ پر ایک ہی بات سوار ہو جاتی ہے۔'' رابرٹ نے نظروں کا زاویہ بدلا۔ لارا کی صراحی دار گردن کی پھولی پھولی رگوں کو دیکھتے ہوئے اس نے اپنے خشک دہانے ہونٹوں پر زبان پھیری۔ اس کی آنکھوں میں سرخی کے ڈورے پھیلنا شروع ہو گئے۔ آگے کے دانت نوکیلے ہو کر باہر نکل آئے۔ اس وقت اس کا خوبصورت چہرہ انتہائی خوفناک دکھائی دے رہا تھا۔

لارا اس کی مدہوش کر دینے والی آواز سننے میں اس قدر مگن تھی کہ اسے رابرٹ میں ہونے والی واضح تبدیلی کا احساس تک نہ ہوا اور جب اس کی نظر بھیانک وحشی رابرٹ پر پڑی تو وہ بری طرح چیختی چلی گئی۔

مکان کے سامنے کھڑی سوزن جانے کسی سوچ میں غرق تھی کہ رات کے سناٹے کو توڑتی ہوئی لارا کی چیخیں اس کے کانوں سے ٹکرائیں سوزن کی تمام تر حسیات بیدار ہو گئیں۔ اس نے ہاتھ میں پکڑے موبائل فون سے فوراً لارا کا نمبر ملایا۔

''ت...... تم'' لارا کی حالت غیر ہو چکی تھی وہ بری طرح کپکپانے میں مصروف تھی رابرٹ کا خوبصورت چہرہ اس وقت کسی خونخوار بھیڑیے کی مشابہت اختیار کیے ہوئے تھا اور اس کے حلق سے ''خرخر'' کی بھیانک آوازیں نکل رہی تھیں جو لارا کو

مزید خوفزدہ کر رہی تھیں۔

وہ اس کی سمت بڑھنے لگا اور اسی وقت لارا کا موبائل فون بج اٹھا اور لارا کے سہمے ہوئے چہرے پر قدرے اطمینان پھیل گیا۔ وہ ہاتھ میں پکڑا موبائل فون رابرٹ کے سامنے لہراتی ہوئی بولی۔ ''م...... میری دوست تمہارے مکان کے سامنے کھڑی ہے تم...... تم میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے ہو۔'' رابرٹ نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ البتہ وہ ایک دہشت ناک مسکراہٹ لبوں پر لا کر رہ گیا جس کا مطلب تھا کہ اسے کسی کی کوئی پرواہ نہیں ہے۔ لارا نے پیچھے بھاگنا چاہا...... مگر صد افسوس کہ وہ اپنا بچاؤ نہ کر سکی۔

☆......☆......☆

سوزن نے بند دروازہ بری طرح پیٹ ڈالا لیکن کوئی مثبت نتیجہ برآمد نہ ہوا اس نے دیوار و دروازے کو دیکھا جو حیرت انگیز طور پر اونچے ہوتے جا رہے تھے تب اس نے حاضر دماغی کا مظاہرہ کرتے ہوئے سوچا کہ آس پاس بنے کسی گھر سے اسے مدد لینی چاہئے وہ دیوانہ وار بھاگتی ہوئی ایک گھر کی طرف دوڑی وہ گیٹ پیٹنے کے ساتھ ساتھ بری طرح چلا رہی تھی چند لمحوں بعد ایک معمر آدمی باہر نکلا اس کی آنکھیں نیند سے بند ہو رہی تھیں مگر دروازے پر اجنبی لڑکی کو دیکھ کر چونک گیا۔ ''کیا بات ہے کون ہو تم لڑکی؟'' اس نے سخت لہجے میں پوچھا۔

''وہ...... وہ ادھر'' سوزن کی زبان لڑکھڑا رہی تھی۔

''تم کچھ پریشان معلوم ہو رہی ہو۔ اندر آ جاؤ۔'' معمر آدمی نے پرخلوص پیش کش کی۔

''ن...... نہیں...... وہ مکان آپ دیکھ رہے ہیں ناں''

سوزن نے رابرٹ کے گھر کی جانب اشارہ کیا۔ ''ادھر میری دوست آئی ہے رابرٹ سے ملنے لیکن اندر کچھ گڑبڑ لگتی ہے آپ براہ کرم میری مدد کیجئے۔'' سوزن ملتجیانہ لہجے میں بولی۔

''رابرٹ کے گھر؟'' وہ آدمی چونکا۔ ''مگر کیوں؟ رابرٹ کا مکان تو ایک عرصے سے قفل زدہ ہے کیا وہ رابرٹ کی کوئی رشتہ دار ہے؟ اور تمہیں کس قسم کا خطرہ محسوس ہوا ہے......؟''

''رابرٹ نے اسے آج اپنے گھر آنے کی دعوت دی تھی'' وہ تیزی سے کہنے لگی۔ ''م...... مگر...... دیکھئے آپ باتوں میں وقت ضائع مت کیجئے بس جلدی سے۔''

''اُفوہ لڑکی جانے تم کیا کہہ رہی ہو۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا ہے۔'' آدمی نے جھنجھلا کر اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''رابرٹ کسی کو بھلا کیسے دعوت دے سکتا ہے اس کا انتقال ہوئے دس ماہ گزر چکے ہیں۔''

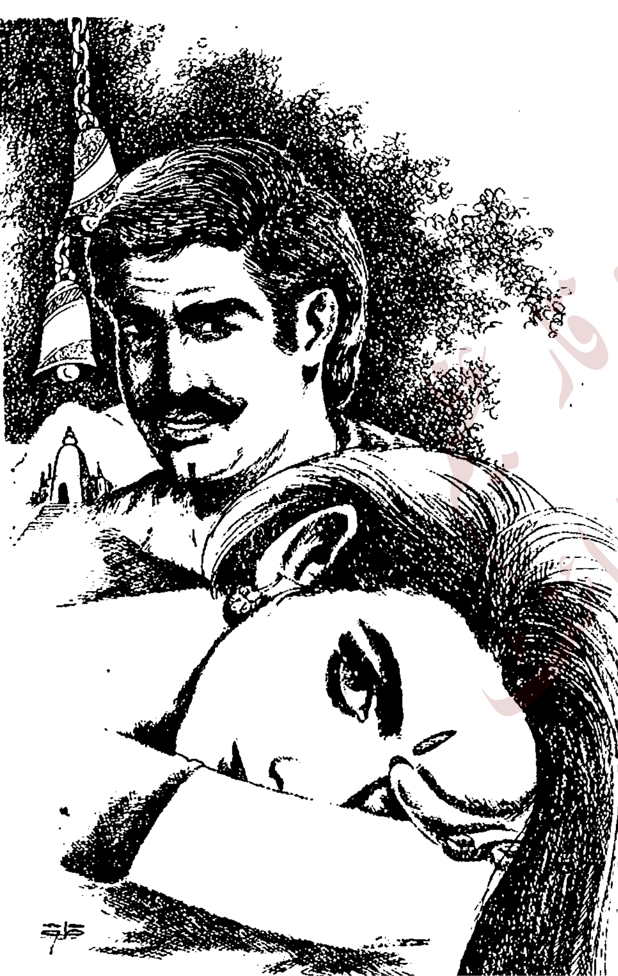
''واٹ'' سوزن پوری قوت کے ساتھ چیخی۔ ''ل...... لیکن...... آپ دیکھئے اس کا مکان کتنا روشن ہے۔''

آدمی نے پہلے تاریکی میں ڈوبے مکان کی طرف دیکھا پھر اسے ناگواری سے گھورتے ہوئے کہا۔ ''مجھے تو تم پاگل معلوم ہوتی ہو۔ ذرا آنکھیں پھاڑ کر دیکھو۔''

سوزن نے رابرٹ کے مکان کی جانب دیکھا وہاں واقعی مکمل اندھیرے کا راج تھا۔ ''چلو بھاگو یہاں سے'' آدمی نے اسے ڈپٹ کر دروازہ بند کر لیا۔

سوزن گرتے پڑتے کار کی طرف بھاگی۔ وہ یہاں سے جلد از جلد روانہ ہونا چاہتی تھی لیکن لارا کی طرح اسی بھی جان بچانے کا موقع نہیں ملا۔ رابرٹ کے مکان سے رابرٹ کے دو ہاتھ لمبے ہو کر اس تک پہنچے اور اس کی گردن کو دبوچ لیا۔ سوزن بری طرح تڑپتی رہی مگر کچھ دیر بعد اس کا جسم ڈھیلا پڑتا چلا گیا۔

رابرٹ جو یہ بھیانک کھیل کئی ماہ سے چپکے چپکے کھیل رہا تھا۔ وہ یہ کیسے برداشت کر لیتا کہ اس کا راز کسی پر فاش ہو جائے۔



سلطان

نگارت نصر

پھر جب وہ دھڑام سے نیچے گرا تو اس کی چیخیں آسمان کو

لرزا گئیں، لوگ اچنبھے میں تھے کہ ایسا کیوں ہوا؟

میری زندگی میں بھی پراسرار واقعات پیش آئیں گے۔ یہ میں نے کبھی نہیں سوچا تھا۔ جب ہم اس نئے گھر میں شفٹ ہوئے تو پہلے دو تین دن تو خیریت سے گزر گئے۔ مگر پھر میرے ساتھ کچھ عجیب و غریب واقعات پیش آنے لگے۔ پہلے تو میں اسے اپنا وہم سمجھ کر ٹالنے کی کوشش کرتی رہی مگر پھر جب معاملہ حد سے بڑھا تو کچھ یقین آ گیا کہ میرے ساتھ واقعی کچھ ہو رہا ہے، ٹھک ٹھہریئے میں شروع سے بتاتی ہوں۔

جب ہم اس گھر میں شفٹ ہوئے تو شروع کے دو تین دن سامان وغیرہ سیٹ کرنے میں ہی گزر گئے اور تھکن اتنی ہوتی تھی کہ اِدھر میں بستر پر گرتی اور میری آنکھیں بند ہو جاتیں۔ اس روز بھی میں اسی طرح تھکن سے چور بدن کے ساتھ بستر پر گری اور گرتے ہی مجھے نیند نے دبوچ لیا۔ نیند میں مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کوئی میرے پاؤں میں گدگدی کر رہا ہو۔ تب ہی میری بہن شرارت سے میرے پاؤں گدگدا رہی ہے۔ میں نے آنکھیں کھولے بغیر اسے زوردار آواز میں ڈانٹا اور کروٹ بدل کر پھر سو گئی۔ چند منٹ کے بعد میرے ساتھ پھر وہی کچھ ہوا۔ میں جھنجلا کر ایک دم اٹھ بیٹھی مگر یہ دیکھ کر میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ کمرے میں کوئی نہیں تھا۔ جس طرح میں اچانک اٹھی تھی اتنی جلدی کوئی بھی میری نظر میں آئے بغیر باہر نہیں جا سکتا تھا پھر اس صورت میں کہ کمرے کا دروازہ بھی عین میرے سامنے تھا۔

میرے ذہن میں خیال آیا کہ ہو سکتا ہے کہ میری بہن کمرے میں ہی چھپ گئی ہو۔ میں نے اٹھ کر سارے کمرے کی تلاشی لے ڈالی مگر کمرے میں کوئی نہ تھا۔ میں نے اپنے دماغ میں ابھرنے والے سوالوں کو اپنا وہم سمجھ کر ٹال دیا اور ہاتھوں سے بال سنوارتی ہوئی کمرے سے باہر نکل آئی۔ باہر نکل کر مجھے دوسرا جھٹکا لگا جب صحن میں بیٹھے ہوئے ابو جان نے مجھے بتایا کہ گڑیا تو امی کے ساتھ بازار گئی ہوئی ہے۔ مجھے پتہ تھا کہ اسے اسکول بیگ خریدنے کے لئے بازار جانا تھا۔ میں نے اپنی مزید تسلی کے لئے ابو سے بھی پوچھ لیا کہ وہ کب گئی ہے۔ ”انہیں گئے ہوئے تو آدھا گھنٹہ ہونے والا ہے۔“ ابو کا جواب سن کر مجھے اس بات پر تو یقین آ گیا کہ میرے ساتھ شرارت کرنے والی کم از کم گڑیا نہیں تھی اور گھر میں کوئی ایسا فرد نہ تھا جس سے اس قسم کی حرکت کی توقع کی جا سکے۔

میرے دونوں بھائی ہم سے بڑے ہیں نواز بھائی تو بسلسلہ ملازمت کینیڈا میں ہوتے ہیں ان سے چھوٹے فراز بھائی ہیں مگر وہ ہر وقت لئے دیئے رہنے والے بندے ہیں جو کبھی کسی سے فری نہیں ہوتے اور اس طرح کی حرکت تو وہ کبھی نہیں کر سکتے۔ خیر میں نے اپنے دماغ میں اس خیال کو جھٹک دیا اور گھر کے کاموں میں مصروف ہو گئی۔ مگر پھر میرے ساتھ اس طرح کے واقعات روزمرہ کا معمول بن گئے۔ اگر کبھی میں کچن میں کام کر رہی ہوتی تو میری پشت کی طرف کچھ کھٹکا ہوتا، میں پلٹ کر دیکھتی تو

وہاں کچھ بھی خلاف معمول نہ ہوتا۔ کبھی میں سارے برتن شیلف پر جمع کر کے کوئی اور چیز لینے جاتی تو میری واپسی پر ان برتنوں میں سے ایک آدھ واپس اپنی جگہ پر ہوتا، حیرت ہوتی مگر پھر میں یہ سوچ کر اپنے دماغ سے اس خیال کو جھٹک دیتی کہ مجھے ہی یاد نہیں رہا ہوگا یہ برتن لانا۔ ورنہ کوئی برتن کیسے ایک جگہ سے خود بہ خود دوسری جگہ جا سکتا ہے۔ حیرت انگیز صورتحال یہ تھی کہ میرے سوا کبھی کسی کے ساتھ اس طرح کا کوئی واقعہ پیش نہیں آتا تھا۔

جب میں نے ایک دو بار اپنی بہن سے سرسری سا ذکر کیا تو اس نے بھی میرا وہم کہہ کر بات ختم کر دی۔ مگر پھر اسے بھی احساس ہو گیا کہ میرے ساتھ واقعی کچھ پراسرار ہو رہا تھا۔

ہوا یوں کہ میں کچن میں ہانڈی پکا رہی تھی کہ گڑیا اسکول سے واپس آ گئی۔ ''آپی قسم سے بڑے زوروں کی بھوک لگ رہی ہے مجھے کچھ بھی کھانے کے لئے فوراً دے دیں۔'' میں نے مسکرا کر اس کے اترے ہوئے چہرے کو دیکھا۔ وہ کچن کے دروازے میں کھڑی تھی۔ اس نے یونیفارم تک نہیں اتارا تھا۔

''تم یونیفارم تو اتارو، میں اتنی دیر میں چائے کے ساتھ کچھ سینڈوچ بنا دیتی ہوں پھر تھوڑی دیر بعد سب کے ساتھ تم بھی کھانا کھا لینا۔'' مجھے پتہ تھا کہ وہ بھوک بالکل بھی برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ اس لئے اسے بھیج کر میں نے جلدی سے دوسرے چولہے پر چائے کا پانی رکھا اور خود اس کے لئے سینڈوچ بنانے لگی۔ جب میں سینڈوچ بنا کر پلٹی تو گڑیا کو کچن میں جھانکتے پایا اس کا منہ حیرت سے کھلا ہوا تھا۔ میں نے حیرت سے پوچھا۔ ''تمہیں کیا ہوا۔''

''آپی...... یہ چولہا......'' اس نے ہاتھ سے چولہے کی طرف اشارہ کیا۔ تو میری بھی نظر ادھر گئی چولہا بند تھا حالانکہ میں خود اسے جلا کر چائے کا پانی رکھ کر گئی تھی۔ مگر میں نے اس کے سامنے خود کو بالکل لاپرواہ ثابت کیا اور ماتھے پر ہاتھ مار کر بولی۔ ''اوہو...... چولہا تو میں نے جلایا ہی نہیں۔''

میں چولہا جلانے کے لئے آگے بڑھی مگر مجھے ابھی تک اس کے حیران ہونے کی وجہ سمجھ نہیں آئی تھی۔

''آپی...... چولہا تو آپ نے جلایا ہوا تھا...... یہ ابھی میرے دیکھتے ہی دیکھتے خود بہ خود ناب کے گھومنے سے بند ہوا ہے اسی لئے تو میں حیران ہوں کہ ناب خود بہ خود کیسے گھوم سکتا ہے؟''

گڑیا اب چلتے ہوئے چولہے کے نزدیک آ گئی تھی۔ میں نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا اور خاموشی سے چائے بنانے لگی۔ وہ چند لمحے خاموش رہی پھر آہستہ سے بولی۔ ''لگتا ہے آپ کے ساتھ واقعی کچھ ہو رہا ہے۔ ورنہ اس طرح چولہا بند نہیں ہو سکتا؟''

میں نے یہ سوچ کر کہ کہیں وہ خوف زدہ نہ ہو جائے بات کو ہنسی میں اڑا دیا۔ مگر گڑیا تب سے اس بات کی قائل ہو گئی کہ میرے ساتھ پہلے بھی جتنے اس طرح کے ناقابل فہم واقعات پیش آئے ہیں وہ بھی سب سچ تھے کسی طرح کا وہم نہیں تھا تاہم وہ خوف زدہ نہیں تھی۔

ہم دونوں بہنوں کا کمرہ مشترک تھا۔ رات کو ہوم ورک کر چکنے کے بعد گڑیا مجھ سے کہانی لازماً سنا کرتی تھی۔ یہ اس کی بچپن کی عادت تھی۔ ایک تو وہ مجھ سے پانچ سال چھوٹی تھی پھر گھر میں سب سے آخری بچہ اور مجھے اس سے کچھ زیادہ ہی محبت تھی۔ وہ ابھی پانچویں میں تھی جبکہ میں میٹرک کر کے فارغ ہو گئی تھی۔ مجھے آگے پڑھنے کی اجازت نہ ملی تو میں گھر کے کام کاج اور سلائی کڑھائی وغیرہ کرنے لگی، رات کو میں اپنے یا اس کے کسی سوٹ پر کڑھائی کرتی اور ساتھ ساتھ اسے کہانی سناتی رہتی۔

اس رات بھی وہ حسب معمول اپنا بیگ بند کرتے ہی چھلانگ لگا کر میرے بستر پر آ گئی۔ ''چلیں آپی کہانی شروع کریں۔'' اس نے میرے گلے میں بانہیں ڈالتے ہوئے کہا وہ بھول گئی کہ میں کڑھائی کر رہی ہوں۔ میرے منہ سے سسکاری نکل گئی کیونکہ سوئی کی نوک میری انگلی میں چبھ گئی تھی۔

''سوری آپی...... میں نے جان بوجھ کر نہیں کیا...... میں تو......'' وہ روہانسی ہو رہی تھی۔ لہٰذا میں نے کہا۔ ''پگلی میں کون سا تمہیں ڈانٹ رہی ہوں۔'' میں نے

درد کو برداشت کرنے کی کوشش کرتے ہوئے گھٹے ہوئے لہجے میں کہا اور فریم ہاتھ سے رکھ کر دوسرے ہاتھ سے انگلی کو دبا لیا۔ سوئی کافی شدت سے چبھی تھی، انگلی میں سے خون کے قطرے ٹپکنے لگے تھے۔ میں نے دوسرے ہاتھ سے انگلی کو دبا لیا۔ گڑیا پریشان شکل لئے مجھے دیکھ رہی تھی۔ مجھ سے انگلی کا درد برداشت نہیں ہو پا رہا تھا۔ میں نے اٹھ کر اس پر دوا لگائی۔ ''گڑیا آج سو جاؤ مجھے درد ہو رہا ہے کل کہانی سناؤں گی۔'' گڑیا نے بے چاری سی شکل بنا کر مجھے دیکھا مگر کچھ بھی کہے بغیر میرے بستر سے اتر کر اپنے بستر پر چلی گئی۔ عام حالات میں وہ اتنی آسانی سے پیچھا نہیں چھوڑتی تھی۔

''اگر میری انگلی کا درد تھوڑی دیر تک رک گیا تو میں تمہیں کہانی سنا دوں گی۔'' مجھے اس پر ترس آ گیا تھا۔ میری بات سن کر وہ کھل اٹھی۔ مگر مجھے حیرت اس بات پر ہوئی کہ یکدم میری انگلی سے درد اس طرح ختم ہو گیا جیسے کبھی ہوا ہی نہ ہو۔ اس طرح درد کیسے رک سکتا ہے بھلا؟ مجھے اس سے پہلے بھی دو تین مرتبہ سوئی چبھنے کا تجربہ ہوا تھا۔ کبھی بھی اس طرح اچانک درد نہیں رکا تھا اور پھر آج تو سوئی کی نوک کافی حد تک اندر گھس گئی تھی۔

بہرحال میں نے اس بات کو بھی پہلے کی طرح اپنا وہم کہہ کر اپنے دماغ سے جھٹک دی اور گڑیا کو کہانی سنانے لگی، جب کہانی مکمل ہو گئی تو میں لائٹ آف کر کے اپنے بستر پر آ گئی ساتھ ہی میری انگلی میں شدید درد شروع ہو گیا حالانکہ پچھلے آدھے گھنٹے سے مجھے بالکل بھی درد نہیں ہو رہا تھا۔ میرا دماغ اس معمے کو حل کرنے سے قاصر تھا۔

☆......☆......☆

اس روز میں نے صبح سے واشنگ مشین لگائی ہوئی تھی۔ سارا دن کپڑے دھو دھو کر میری کمر اکڑ کر تختہ ہو گئی تھی۔ مگر ابھی کچھ دھلے ہوئے کپڑے پھیلانے کے علاوہ نہانے اور فرش کی صفائی کرنے جیسے کام باقی تھے۔ میری امی مزاج کی بہت سخت اور غصے کی تیز ہیں۔ ذرا سا کام ان کی مرضی کے خلاف ہو جائے تو وہ اتنا ڈانٹتی ہیں کہ سب کئے کرائے پر پانی پھر جاتا تھا۔ میں تھکن سے اتنی چور ہو گئی تھی کہ اس بات کو بالکل بھول گئی اور فرش پر بیٹھ کر دیوار سے ٹیک لگا کر ذرا آرام کرنے لگی اور بدقسمتی سے عین اسی وقت میری امی وہاں آ گئیں۔ مجھے اس طرح ٹانگیں زمین پر پسارے آرام سے دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھے دیکھ کر ان کا پارہ ساتویں آسمان پر پہنچ گیا۔ انہوں نے بلا لحاظ مجھے بے نقط سنانا شروع کر دیں وہ کافی دیر تک مجھے ڈانٹتی رہیں۔ میں نے اپنی صفائی میں کچھ کہنے کی کوشش بھی نہیں کی کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ اس کا کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ جب وہ اچھی طرح اپنا غصہ نکال کر چلی گئیں تو میں ایک بار پھر باقی کام نمٹانے کے لئے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اب بدن کے ساتھ ساتھ میرا دل بھی دکھ رہا تھا۔ آخر امی کو صبح سے کیا ہوا میرا اتنا کام نظر کیوں نہیں آیا جو انہوں نے مجھے سستی اور کام چوری کے طعنے دیئے تھے۔ میں نے خاموشی سے سارا کام مکمل کیا اور نہا کر اوپر چھت پر چلی گئی۔ تنہائی ملتے ہی میری آنکھوں سے آنسو لڑھکنے لگے۔ میرا سر درد سے پھٹا جا رہا تھا۔ میری بند آنکھوں میں تھکن کے باعث نیند اترنے لگی۔ میں غنودگی میں تھی تو مجھے یوں لگا جیسے کوئی ہلکے ہاتھ سے میرا سر دبا رہا ہو۔ میرے لئے آنکھیں کھولنا مشکل ہو رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ گڑیا اسکول سے آ گئی ہوگی اور ہمدردی میں میرا سر دبا رہی ہوگی۔ مگر جب میں نے شام میں ہوم ورک کرواتے ہوئے اس سے پوچھا۔ ''اس نے میرا سر کیوں دبایا تھا۔'' تو وہ حیرت سے میرا منہ تکنے لگی۔

''آپی میں تو آتے ہی اوپر گئی تھی مگر آپ گہری نیند سو رہی تھیں، سو میں خاموشی سے واپس آ گئی میں نے تو آپ کا سر نہیں دبایا۔''

مجھے ایک بار پھر خود سے کہنا پڑا کہ مجھے وہم ہوا ہوگا۔ حالانکہ اس وقت میں نے سر دبانے والے ہاتھوں کو دل سے دعائیں دی تھیں کیونکہ اتنے شدید درد میں مجھے بہت سکون ملا تھا اور اس وقت واقعی مجھے کسی سے سر دبوانے کی ضرورت بھی تھی۔

''آپی...... آپی۔ بھاگ کر آئیں دیکھیں کتنی اچھی بارش ہو رہی ہے۔'' میں امی کی قمیص سلائی کر رہی تھی

جب باہر صحن سے گڑیا نے مجھے پکارا۔ ہم دونوں بہنیں بارش کی دیوانی ہیں۔ جب بھی بارش ہو تو ہم کوئی نہ کوئی اچھی سی چیز ضرور بناتے ہیں۔ میں چیزیں سمیٹ کر باہر آ گئی ٹھنڈی ہوا کے ساتھ گرتی ننھی ننھی بوندوں نے مجھے بھی خوش کر دیا۔

"آپی..... آپ پکوڑے بنائیں نا۔" گڑیا نے فوراً میرا ہاتھ تھامتے ہوئے بڑی لجاجت سے کہا تو میں نے مسکرا کر اس کے سر پر ہلکی سی چپت لگائی اور اس کی فرمائش پوری کرنے کے لئے کچن کی طرف بڑھ گئی کیونکہ اس وقت پکوڑے کھانے کو تو میرا بھی دل چاہ رہا تھا۔ ہلکی ہلکی ٹھنڈی ہوا کچن کے ماحول کو بھی خوشگوار بنائے ہوئے تھی۔ اگرچہ شام ابھی اتری ہی تھی مگر گھنے سیاہ بادلوں کی وجہ سے اتنا اندھیرا ہو رہا تھا جیسے بالکل رات سر پر ہو۔

میں پکوڑے تلنے لگی تو ابو جان بھی آ گئے۔ گڑیا بھاگ کر ان کے پاس پہنچ گئی۔ "ابو جان آپی پکوڑے بنا رہی ہیں آپ بھی جلدی سے چینج کر کے آ جائیں۔" ابو جان مسکراتے ہوئے اندر چلے گئے تو وہ سیدھی میرے پاس آئی۔ اتنی دیر میں، میں نے پکوڑے پلیٹ میں نکال لئے تھے۔ وہ سیدھی پلیٹ کی طرف بڑھی مگر جونہی اس نے پلیٹ میں سے پکوڑا اٹھانا چاہا، جانے کیسے پلیٹ فرش پر جا گری اور سارے پکوڑے فرش پر بکھر گئے۔ میں دیکھ رہی تھی کہ گڑیا نے پلیٹ کو ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ پلیٹ خود گری تھی۔ میں نے منہ بسورتے ہوئے کھڑی گڑیا کو پچکارا۔ "ڈونٹ وری..... میں ابھی اور تل لیتی ہوں نا تم وہ لے لینا۔ انہیں اٹھا کر اسی پلیٹ میں ڈال کر شیلف پر رکھ دو۔"

میری بات سن کر گڑیا خاموشی سے پکوڑے اٹھا کر پلیٹ میں ڈالنے لگی مگر اس کا موڈ بحال نہیں ہو سکا۔ میں نے دوسری پلیٹ میں اسے پکوڑے نکال دیئے کہ کچھ ساتھ رکھ کر ابو کو دے آؤ تو پھر ہم دونوں مل کر کھائیں گے۔ اس کے سامنے تو میں نے خود کو بالکل نارمل ظاہر کیا مگر اندر ہی اندر میں اب کافی حد تک پریشان ہو گئی تھی۔ کچھ تو عجیب تھا۔ پراسرار جو پہلے صرف میرے ساتھ ہی ہو رہا تھا مگر اب اس میں کسی کسی وقت گڑیا بھی شامل ہو جاتی تھی۔ میں بے خیالی میں پکوڑوں والی اس پلیٹ کی طرف دیکھ رہی تھی جانے کیسے میرے منہ سے نکلا کہ "تم نے ٹھیک نہیں کیا۔"

گڑیا کے کچن میں داخل ہونے سے میری محویت ٹوٹ گئی مگر مجھے خود بھی حیرت ہو رہی تھی کہ میں نے یہ الفاظ کس سے اور کیوں کہے ہیں۔

بہر حال اس وقت تو میں گڑیا کے ساتھ مصروفیت کی وجہ سے اس بات کو بھول گئی مگر رات کو جب میں سونے کے لئے بستر پر لیٹی تو ایک بار پھر میرے ذہن میں وہی واقعہ گھومنے لگا۔ سوچتے سوچتے میرے سر میں درد ہونے لگا۔ تو بے ساختہ مجھے اس دن کا واقعہ یاد آ گیا جب کسی نادیدہ ہاتھ نے میرا سر دبایا تھا۔ میرے دل میں شدید خواہش جاگی کہ آج پھر وہی ہاتھ میرا سر دبائے۔

کمرے میں زیرو پاور کا بلب روشن تھا۔ میں نے گڑیا کے بیڈ کی طرف دیکھا وہ بے خبر سو رہی تھی۔ میں نے خود ہی کچھ دیر اپنے ہاتھ سے اپنے دکھتے ہوئے سر کو دبایا اور پھر سیدھی لیٹ گئی۔ اگرچہ میں نے آنکھیں بند کر رکھی تھیں مگر میں مکمل طور پر جاگ رہی تھی۔ چند لمحوں بعد مجھے اپنے ماتھے پر بالکل وہی لمس محسوس ہوا جیسا اس دن ہوا تھا۔ پھر کوئی ہلکے ہاتھ سے میرا سر دبانے لگا۔ بجائے خوفزدہ ہونے کے میں متجسس تھی۔ اب مجھے مکمل یقین ہو گیا کہ اس گھر میں کوئی روح یا جن وغیرہ موجود ہے۔

میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں آنکھیں کھول کر سر دبانے والی ہستی کو دیکھوں مگر میں نے خود کو ایسا کرنے کی اجازت نہیں دی نہ جانے کیوں مجھے یقین سا تھا کہ میری آنکھیں کھولتے ہی وہ روح یا جن غائب ہو جائے گا جبکہ میں ابھی اور کچھ دیر تک سر دبوانا چاہتی تھی آرام ملتے ہی کچھ دیر بعد مجھے گہری نیند نے آن لیا اور میں ایک بار پھر اس پراسرار وجود کو دیکھنے سے محروم ہو گئی۔

☆......☆......☆

میرے بال کافی گھنے اور لمبے تھے اس روز بھی بالوں میں کنگھی کر کے انہیں باندھنے کے لئے صحن میں آ بیٹھی مگر گھر میں کوئی بھی نہیں تھا۔ سو میں نے تسلی سے

کنگھی کی مگر جب میں نے چٹیا بنانا شروع کی تو کسی نے بڑے زور سے میرے بال کھینچے۔ تکلیف کی وجہ سے میری چیخ نکل گئی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تو وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ مجھے شدید غصہ آیا۔ میں نے زور سے کہا۔ "شرم تو نہیں آتی میرے بال کھینچتے ہوئے یہ کیا طریقہ ہے جو تم نے اختیار کر رکھا ہے۔ تم جو کوئی بھی ہو سیدھی طرح میرے سامنے آ کر بات کرو۔ اس طرح چھپ چھپ کر بزدلوں کی طرح حرکتیں کرنے کا کیا فائدہ۔"

اگلے ہی لمحے مجھے حیرت کا شدید جھٹکا لگا کیونکہ میرے بالکل سامنے ایک گیارہ بارہ سال کا خوب صورت بچہ کھڑا تھا۔ اگرچہ اس کے چہرے پر معصومیت تھی مگر اس کی آنکھوں میں عجیب سی پراسراری چمک تھی۔ ایک لمحے کے لئے تو مجھے اس سے سخت خوف محسوس ہوا۔ میں بھاگنے کے بارے میں سوچ ہی رہی تھی کہ وہ بولا۔ "آپ مجھے بہت اچھی لگتی ہیں آپی، میں آپ سے دوستی کرنا چاہتا ہوں۔"

میں نہ جانے کیسے چیخ مارنے کے لئے کھلا ہوا اپنا منہ بند کیا۔ مجھے بہت شرم محسوس ہوئی کہ میں اس بچے کے سامنے خود کو بزدل ظاہر کروں جسے ابھی تھوڑی دیر پہلے میں بزدلی کا طعنہ دے چکی تھی۔ میں نے گہرا سانس لے کر خود کو نارمل کرنے کی کوشش کی۔ بچہ بڑی محویت سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ ٹانگوں کی لرزش چھپانے کے لئے میں چارپائی پر بیٹھ گئی، میرا حلق خشک ہو رہا تھا۔ بڑی مشکل سے خود پر قابو پا کر میں نے لرزتے لہجے میں اس سے کہا۔ "تم نے میرے بال کیوں کھینچے۔"

وہ مسکرا دیا۔ "آپی آپ کے بال بہت خوب صورت ہیں، مجھے اچھے لگے، میں پکڑ کر دیکھ رہا تھا۔" ایسا کہتے ہوئے اس کی آنکھوں میں شرارت تھی۔

میں نے بالکل بڑی بہن کی طرح ڈانٹ کر کہا۔ "پکڑ کر دیکھنے سے بال اس طرح کھینچے تو نہیں جاتے۔"

"آپی...... مجھ سے غلطی ہو گئی آئندہ میں آپ کو تنگ نہیں کروں گا۔ آپ مجھ سے ناراض نہ ہونا۔" اس نے فوراً بچوں کی طرح دونوں ہاتھوں سے اپنے کان پکڑتے ہوئے کہا۔ مجھے اس پر بہت پیار آیا۔ حالانکہ میں جانتی تھی کہ وہ انسان نہیں کوئی اور مخلوق ہے مگر اس وقت وہ مجھے بالکل اپنا سگا چھوٹا بھائی ہی لگا۔ "تمہارا نام کیا ہے؟" میں نے مسکرا کر پوچھا۔

"سلطان۔"

"اچھا ادھر آؤ میرے پاس بیٹھ جاؤ۔" میں نے چارپائی پر اس کے بیٹھنے کے لئے جگہ بنائی۔ وہ بلا جھجک میرے پاس آ بیٹھا۔ "میں تمہیں اسی صورت اپنا بھائی بناؤں گی جب تم وعدہ کرو گے کہ آج کے بعد بھی مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچاؤ گے کیونکہ اس سے پہلے تم نے کئی بار شرارت ہی شرارت میں مجھے پریشان کیا ہے۔"

بظاہر تو میں خوفزدہ نہیں تھی مگر میرے لاشعور میں موجود خوف نے میرے منہ سے یہ بات کہلوا دی تھی۔

اس نے فوراً کہا۔ "میں حضرت سلیمانؑ کی قسم کھا کر وعدہ کرتا ہوں کہ آئندہ کبھی آپ کو نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔" اس کی بات سن کر میرے منہ سے سکون بھرا سانس خارج ہوا کیونکہ میں نے کہیں پڑھ رکھا تھا کہ اگر جن، حضرت سلیمانؑ کی قسم کھا کر کوئی وعدہ کریں تو ہر حال میں نبھاتے ہیں کیونکہ وعدہ توڑنے کی صورت میں وہ فوراً جل جاتے ہیں۔ "اچھا اب یہ بتاؤ کہ تم جن ہو یا کوئی اور مخلوق۔" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"میں جن زادہ ہوں۔ میرے نو بھائی اور چار بہنیں ہیں۔" اس نے فوراً جواب دیا۔ ابھی میں اس سے مزید کچھ پوچھنا ہی چاہ رہی تھی کہ کسی نے زور سے دروازہ بجایا۔ میں جلدی سے اٹھ کر دروازہ کھولنے چلی گئی۔ دروازے پر فراز بھائی تھے۔ آج خلاف معمول وہ جلد لوٹ آئے تھے۔ مجھے خوف محسوس ہوا کہ وہ مجھ سے پوچھیں گے کہ یہ بچہ کون ہے؟ مگر یہ دیکھ کر مجھے بہت حیرت ہوئی کہ فراز بھائی اس کے پاس سے یوں گزر گئے جیسے خالی چارپائی ہو جبکہ سلطان ان کی طرف دیکھ بھی رہا تھا۔ میں بھائی کے پیچھے کمرے تک آ گئی۔ "بھائی آپ کو کسی چیز کی ضرورت تو نہیں۔" میں نے حسب عادت

پوچھا۔ ’’نہیں بس میری طبیعت خراب ہے۔ میں آج ہاف ٹائم میں اٹھ آیا ہوں۔ تم تھوڑی دیر کے بعد مجھے چائے کا ایک کپ دے جانا۔‘‘ انہوں نے مدھم آواز میں کہا۔ اس لئے میں کچن میں چلی گئی۔ سلطان بھی وہیں آ گیا۔ میں چائے بنانے لگی تو اس کے لئے بھی ایک کپ بنالیا۔ بھائی کو چائے دے کر میں واپس آئی تو سلطان اپنے کپ سمیت چارپائی پر بیٹھا ہوا تھا۔ ’’آپی آپ بھی پی لیں۔‘‘ اس نے اپنا کپ میری طرف بڑھا دیا۔

میں نے کہا۔ ’’نہیں تم پیو میں اتنی چائے نہیں پیتی۔‘‘

’’نورین کیا تم پاگل ہوگئی ہو جو اکیلی باتیں کررہی ہو۔‘‘ فراز بھائی نے ڈانٹ کر کہا۔ وہ شاید کمرے سے باہر آگئے تھے۔ میں نے خاموشی سے گردن جھکالی وہ امی کے بارے میں پوچھنے آئے تھے۔ میں نے بتادیا کہ وہ ہمسائے کے گھر گئی ہوئی ہیں۔ جب وہ واپس لوٹ گئے تو میں نے شرارت سے مسکراتے ہوئے سلطان کی طرف دیکھا۔ ’’تم میرے بھائی کو نظر کیوں نہیں آئے۔‘‘

’’آپی یہ میری مرضی ہے کہ میں جسے چاہوں نظر آؤں جسے چاہوں نہ نظر آؤں۔‘‘

’’اچھا مجھے یہ بتاؤ کہ تم رہتے کہاں ہو؟‘‘ میرا خیال تھا کہ وہ اسی گھر میں رہتا ہوگا اور اس کے بہن بھائی بھی میرے ساتھ شرارتیں کرتے رہے ہوں گے مگر اس کے جواب نے مجھے حیران کردیا کہ وہ ہمارے گھر سے کافی فاصلے پر واقع ایک ویران حویلی میں اپنے خاندان کے ساتھ رہتا ہے۔ اسے اِدھر اُدھر پھرنے کی عادت تھی۔

ایک دن اسی طرح پھرتے پھرتے وہ ہمارے گھر میں آن پہنچا۔ وہ رات کا وقت تھا اور میں گڑیا کی فرمائش پر کہانی سنا رہی تھی۔ سلطان کو وہ کہانی بہت پسند آئی۔ پھر وہ ہر روز کہانی سننے کے لئے آنے لگا۔ رفتہ رفتہ وہ مجھے اچھا لگنے لگا، ہر روز مجھے اس کا انتظار رہتا۔ اس نے مجھے یہ بھی بتایا کہ اس کے گھر والوں کو یہ معلوم نہیں ہے کہ وہ ہمارے گھر میں آتا رہتا ہے۔ ’’اب مجھے گھر جانا چاہئے ورنہ ماں بہت مارے گی۔‘‘ اس کے ساتھ ہی وہ مجھے نظر آنا بند ہوگیا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ میں یہ بات گھر میں کسی کو نہیں بتاؤں گی۔

☆......☆......☆

شور سن کر میری آنکھ کھل گئی۔ فراز بھائی خلاف معمول تیز لہجے میں بات کررہے تھے۔ مجھے سمجھ نہیں آرہی تھی کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں۔ میں تیزی سے چپل پہن کر اپنے کمرے سے باہر نکلی۔ باتوں کی آواز امی کے کمرے سے آرہی تھی۔ میں بھی وہیں چلی گئی۔ وہ اتوار کا دن تھا اس لئے سب کی چھٹی تھی۔ کمرے میں پہنچ کر مجھے معلوم ہوا کہ فراز بھائی کسی بات پر امی کو قائل کرنے کی کوشش کررہے ہیں جبکہ امی مان نہیں رہی تھیں میں خاموشی سے ایک طرف بیٹھ گئی۔ ’’امی پلیز اگر رسک لیں گے تو ہی ہمارے دن پھریں گے۔‘‘ بھائی نے لجاجت سے کہا۔

میں نے سوچا کہ بھائی بھی باہر جانا چاہتے ہیں کیونکہ نواز بھائی بھی اسی طرح کہہ کر گئے تھے۔ مگر پچھلے دو سالوں سے ہمیں سوائے چند ایک خط کے انہوں نے کوئی روپیہ نہیں بھیجا تھا۔ اگرچہ ابو کی تنخواہ سے گھر اچھی طرح چل رہا تھا۔ ہم بہت خوشحال لوگ نہیں تھے۔ دونوں بھائی شروع سے ہی امیر ہوجانے کے خواب دیکھا کرتے تھے۔ بھائی اٹھ کر امی کے پاس جا بیٹھے مگر امی نے منہ پھیر لیا۔ ’’نہیں جب کہہ دیا تو کہہ دیا میں اس طرح کے کاروبار کے حق میں نہیں جبکہ ہمارا تجربہ بھی نہیں، قرض اور وہ بھی اتنا بڑا لے کر ہم اپنی جان کیوں عذاب میں ڈالیں۔‘‘

تب پتہ چلا کہ بھائی باہر جانا نہیں چاہتے بلکہ کوئی کاروبار کرنا چاہتے ہیں حالانکہ ان کی اچھی خاصی نوکری تھی مگر جانے کس کے بہکانے میں آکر وہ اپنا ذاتی کاروبار اور وہ بھی قرض لے کر شروع کرنے پر مصر تھے۔ جب بھائی کا اصرار حد سے بڑھا تو امی نے مجبوراً اسلام کا سہارا لیا۔ ’’تم یہ لون یقیناً کسی بینک سے لوگے اور اس پر سود لگتا ہے جو حرام ہے اس طرح کے مال میں کوئی برکت نہیں ہوتی۔‘‘

بھائی جھٹ بولے۔ ’’نہیں امی جان یہ بات

بالکل نہیں ہے۔ میرا دوست بہت اچھا آدمی ہے۔ وہ اپنے ایک امیر دوست سے قرض لے کر دے گا۔ جسے ہم دس سالوں میں چکائیں گے۔ اس کاروبار میں اتنا نفع ہے اور مجھے یقین ہے کہ ہم یہ قرض دس کے بجائے تین چار سال میں ہی اتار دیں گے اور اس دوران آدھا نفع واپس کاروبار میں لگانے سے کاروبار بھی پھیل جائے گا۔ پھر رفتہ رفتہ ہم دونوں دوست بھی اپنا اپنا کاروبار الگ کرلیں گے۔‘‘ بھائی کسی بھی طرح امی جان کو منالینا چاہتے تھے اور یہ ان کے لئے مشکل بھی نہ تھا کیونکہ سب بچوں میں امی ان سے زیادہ محبت کرتی تھیں۔

بلآخر وہی ہوا امی جان نے بھائی کو بیدلی سے ہی سہی اجازت دے دی۔ ابو جان سے وہ پہلے ہی بات چیت کرچکے تھے۔ اس طرح ان کے ذاتی کاروبار کا آغاز ہوگیا۔

بہرحال چند دنوں بعد میری خالہ کے بیٹے کی شادی تھی۔ انہوں نے ہمیں بھی مدعو کیا ہوا تھا۔ امی نے مجھے اپنے اور گڑیا کے کپڑے وغیرہ بیگ میں رکھنے کا حکم دیا اور خود اپنے کپڑے نکالنے چلی گئیں۔ میں نے جلدی جلدی کام نمٹایا اور امی کی مدد کرنے کے خیال سے ان کے کمرے میں چلی گئی۔ امی نے کپڑے تو رکھ لئے تھے مگر زیورات میں سے انتخاب نہیں کرپارہی تھیں کہ کیا ساتھ لے کر جائیں خیر کافی غوروخوض کے بعد انہوں نے ایک ہلکا سیٹ نکال کر مجھے دیا کہ میں اسے ان کے ہینڈ بیگ میں رکھ دوں۔ وہ وہاں جاکر پہن لیں گی۔ میں نے جلدی سے ہینڈ بیگ میں زیورات کا ڈبہ ٹھونسا اور الماری بند کردی اور افراتفری میں تیاری کرکے ہم روانہ ہوگئے۔

ٹرین میں بیٹھ کر جب ذرا سکون ملا تو میری نظر امی کے ہینڈ بیگ پر پڑی میری سانسیں رکنے لگیں کیونکہ یہ وہ ہینڈ بیگ نہیں تھا جس میں، میں نے ان کے زیورات رکھے تھے۔ دونوں کا رنگ ایک ہی تھا۔ مگر ڈیزائن مختلف تھا۔ تھا تو یہ بھی سفید ہی مگر میں نے زیورات دوسرے بیگ میں رکھے تھے۔ اب میرا خون خشک ہورہا تھا کہ جب وہاں شادی میں امی کو اپنے زیورات نہیں ملیں گے تو وہ میرا کیا حشر کریں گی۔ اس کے علاوہ سب کزنز اور خالاؤں کے سامنے بھی میری انسلٹ ہوگی۔ سب مجھے پھوہڑ اور نالائق خیال کریں گی۔ میری اڑی ہوئی رنگت دیکھ کر امی نے ایک دوبار پوچھا بھی مگر میں نے سیدھی بات نہ بتائی اور یوں ہی کہہ کر ٹال دیا۔

گڑیا ٹرین سے پہلی بار سفر کررہی تھی اس لئے کافی پرجوش تھی۔ وہ بار بار میری توجہ اِدھر اُدھر کی چیزوں کی طرف دلاتی مگر میں خود کو اس کی خوشی میں شریک نہ کرسکی مجھے رہ رہ کر متوقع بے عزتی کا خیال ستا رہا تھا۔ اب دنیا کی کوئی طاقت مجھے اس مشکل وقت سے نجات نہیں دلاسکتی تھی۔ مجھے پتہ تھا کہ امی کو ابھی یہ سب کچھ بتادینے کا مطلب تھا کہ اپنی شامت کو متعین وقت سے پہلے بلالیا جائے۔ سو میں خاموشی سے اندر ہی اندر گھلتی اور پریشان ہوتی رہی۔ میں اتنی خوفزدہ تھی کہ میری بھوک پیاس ختم ہوچکی تھی۔ امی سے میری حالت چھپی ہوئی نہیں تھی۔ جب انہوں نے پھر پوچھا تو میں نے بہانا کردیا کہ شاید ایک لمبے عرصے کے بعد ٹرین میں بیٹھی ہوں اس لئے مجھے کچھ ہورہا ہے۔

ایک مرتبہ تو خوفزدہ ہوکر میں نے یہ دعا تک مانگ ڈالی کہ یا اللہ اگر اور کچھ نہیں ہوسکتا تو اس ٹرین کا ایکسیڈنٹ ہوجائے اور میں زندہ نہ بچوں۔ اسی طرح خوفزدہ ہوتے ہوئے میرا سفر تمام ہوا اور ہم بخیروعافیت خالہ کے گھر پہنچ گئے۔ مہندی اگلے روز تھی مگر گھر مہمانوں سے بھرا ہوا تھا۔ ہمارے پہنچتے ہی رات کا کھانا لگادیا گیا۔ مجھ سے یہاں بھی ٹھیک طرح کھانا نہ کھایا گیا۔

میں نے خالہ مجیدہ سے کہا کہ ’’میرے لئے بستر کا انتظام کردیں کیونکہ میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔‘‘ انہوں نے جھٹ میری بلائیں لیتے ہوئے بستر کا انتظام کردیا۔ کمرہ چھت پر تھا۔ اس لئے قدرے شور وغیرہ بھی کم تھا۔ ابھی میں بستر پر لیٹی ہی تھی کہ مارے بے بسی کے میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اسی وقت مجھے اپنے نزدیک کسی کی موجودگی کا احساس ہوا، میں نے جلدی سے آنکھیں کھول کر دیکھا تو وہ سلطان تھا جو مجھ پر جھکا ہوا تھا۔ ’’آپی

آپ کیوں رو رہی ہیں۔" اس کی آنکھوں میں تشویش تھی۔ میں نے اسے یکدم کھینچ کر گلے لگا لیا۔

"میرے بھائی تم یہاں کیسے پہنچے، کیا ٹرین میں بھی ہمارے ساتھ تھے؟" وہ مسکرا کر بولا۔ "نہیں آپی مجھے یہاں وہاں جانے کے لئے ٹرین کی ضرورت نہیں پڑتی۔ میں نے تو کہانی سننا تھی اس لئے میں آپ کے پیچھے یہاں تک آ گیا۔ مجھے پتہ تھا کہ آپ شادی پر یہاں آ رہی ہیں۔"

میں جلدی سے سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ "سلطان اگر میں ابھی تمہیں اپنے گھر بھیجوں تو کیا تم جا سکتے ہو۔"

"ہاں میں نہ صرف ابھی جا سکتا ہوں بلکہ واپس بھی آ سکتا ہوں۔ یہ میرے لئے کچھ مشکل نہیں ہے۔ مگر آپ مجھے بھیجنا کیوں چاہتی ہیں؟"

میں نے اس کی بات نظر انداز کر دی۔ "تم ایسا کرنا سیدھے ہمارے گھر جانا۔ میری امی کے کمرے میں جو بڑی سی الماری ہے، اس میں ایک سفید ہینڈ بیگ ہوگا اس میں سونے کے زیورات کا ایک ڈبہ ہے تم وہ حفاظت سے نکال لاؤ، الماری کو تالا لگا ہوا نہیں ہے کمرہ بھی کھلا ہوگا کیونکہ ابو گھر پر ہیں اور تم کسی کو نظر نہیں آتے اس لئے میرے اچھے بھائی میرا یہ کام کر دو۔"

سلطان آرام سے میرے قریب بیٹھ گیا۔ "آپی میرے لئے تالے کوئی معنی نہیں رکھتے میں تالے کے اندر سے بھی ہر چیز نکال کر لا سکتا ہوں۔ مگر میری ماں نے مجھے سختی سے منع کیا تھا کہ کبھی چوری نہ کروں یہ ان کی آخری نصیحت تھی میں چوری نہیں کر سکتا۔"

اس کی بات سن کر میں بھونچکی رہ گئی۔ "ارے بھولے بھائی میں تمہیں چوری کرنے کو نہیں کہہ رہی بلکہ وہ سیٹ ساتھ لانا تھا جو کہ مجھے یاد نہیں رہا اب اس کے نہ ہونے کی وجہ سے مجھے ڈانٹ پڑے گی اسی لئے تو میں رو رہی تھی۔" میں نے ساتھ ہی اپنے رونے کی وجہ بھی بتا دی۔

"اچھا یہ بات ہے...... یہ تو کوئی مسئلہ ہی نہیں میں ابھی لا دیتا ہوں۔" وہ اٹھ کر کمرے سے باہر نکل گیا اور میں یوں سکون سے بستر پر لیٹ گئی جیسے میرے سر سے کسی نے پہاڑ اتار دیا ہو۔

تقریباً آدھے گھنٹے بعد سلطان کھلے دروازے میں سے اندر داخل ہوا اس کے ہاتھ میں وہی زیورات کا ڈبہ تھا۔ میری خوشی کی انتہا نہ تھی۔ میں نے جلدی سے ڈبہ کھول کر دیکھا۔ اس میں وہی سیٹ تھا۔ میں نے خوشی سے لرزتی آواز میں سلطان کا شکریہ ادا کیا۔

"آپی آپ تو یوں میرا شکریہ ادا کر رہی ہیں جیسے کسی غیر کا کیا جاتا ہے۔"

میں نے جلدی سے کہا۔ "نہیں ایسی بات نہیں بلکہ میں تمہیں شاباشی دے رہی تھی۔ آخر تم نے اتنا بڑا کام کیا ہے۔"

"آپ جب بھی مشکل میں ہوں گی میرا نام لے کر آواز دیں گی تو میں حاضر ہو جاؤں گا۔"

اس کی آواز سن کر میری ہنسی نکل گئی۔ "تم بہت شرارتی ہو۔"

اتنے میں میری کچھ کزنز مٹھائی کی پلیٹیں اور چائے کے ساتھ اوپر آ گئیں انہوں نے مجھے بھی چائے پینے کی پیش کش کی چونکہ میں اب خوش تھی اس لئے خوش دلی سے ان کی پیش کش قبول کر لی۔ انہوں نے مجھے ایک کپ تھما دیا اور پلیٹ بھی میرے سامنے کر دی۔ میں نے برفی اٹھائی ایک پیس خود کھا لیا اور ایک سب کی نظر بچا کر پاس بیٹھے سلطان کی طرف بڑھا دیا۔ وہ خوش ہو گیا کہ میں اسے بھولی نہیں۔ میں نے آدھی چائے پی کر کپ بھی اسے تھما دیا۔ باتوں میں مگن میری کزنز کو اس کا احساس تک نہیں ہو سکا وہ سب بھی اس بات پر یقین کر چکی تھیں کہ میں سر درد کی وجہ سے بھی کسی سے فری نہیں ہو سکی تھی۔

چائے پی کر سلطان نے مجھ سے اجازت چاہی۔ مجھے معلوم تھا کہ سلطان کی آواز کسی کو سنائی نہیں دے گی مگر میں اسے جواب نہیں دے سکتی تھی۔ میں نے اس کے ہاتھ پر تھپکی دے کر اسے جانے کی اجازت دے دی۔

☆......☆......☆

صبح سے ہی میرا دل اداس تھا۔ حالانکہ ابھی کچھ دن پہلے ہی ہم شادی سے فارغ ہو کر آئے تھے۔ ہم نے صحیح معنوں میں شادی کو انجوائے کیا تھا۔ مگر اس روز جانے کیوں صبح سے ہی مجھے لگ رہا تھا کہ آج کوئی بری خبر مجھ تک پہنچنے والی ہے۔ میں گھر کے کاموں کو نمٹانے میں لگی ہوئی تھی۔ سلطان نے بھی صبح سے شکل نہیں دکھائی تھی۔ میں صفائی کر کے فارغ ہو گئی تو دوپہر کے کھانے کی تیاری کرنے کو میرا دل نہ چاہا۔ میں اپنے کمرے میں آ گئی۔ اسی وقت سلطان آ گیا۔ "آپی آج آپ کس بات پر اداس ہیں۔" وہ میرا مزاج شناس ہو گیا تھا۔ میری شکل دیکھتے ہی اسے میرے موڈ کا پتہ چل جاتا تھا۔

"سلطان آج مجھے اپنے بڑے بھائی نواز بہت یاد آ رہے ہیں۔ انہیں گھر سے گئے ڈھائی سال ہو گئے ہیں۔ پہلے کوئی فون ہی آ جاتا تھا مگر اب چھ ماہ ہو گئے ہیں ان کا کوئی فون یا خط نہیں آیا۔ آج میرا دل ان سے بات کرنے کو چاہ رہا ہے۔" میں نے ایک لمحے میں دل کھول کر اس کے سامنے رکھ دیا۔ وہ چند لمحوں تک میری شکل دیکھتا رہا۔ پھر بولا۔

"یہ تو کوئی مسئلہ نہیں میں ان کی خبر آپ کو ابھی لا کر دے سکتا ہوں مگر انہیں آپ کو فون کرنے پر مجبور نہیں کر سکتا۔ بس آپ مجھے ان کی تصویر دکھا دیں اور ملک کا نام بتا دیں۔"

میں نے حیرت سے اس کا منہ دیکھا۔ "تم کینیڈا چلے جاؤ گے مگر کیسے؟"

"آپی اس بات کو چھوڑ دیں یہ ہمارے لئے کوئی مسئلہ نہیں...... مجھے ایک خطرہ ہے کہ میرے ابو یا بڑے بھائیوں کو پتہ نہ چل جائے کہ میں ملک سے باہر گیا تھا۔ ورنہ مجھے بہت مار پڑے گی کیونکہ میں ابھی چھوٹا ہوں، اس لئے زیادہ دور جانے کی اجازت نہیں ہے۔"

میں منہ کھولے اس کی باتیں سن رہی تھی۔ "اگر ایسی ہی بات ہے تو پھر تم نہ جاؤ۔" وہ سکون سے چارپائی پر بیٹھ گیا۔

"آپ مجھے اپنے بھائی کی تصویر دکھائیں۔ میں دو تین گھنٹوں میں واپس آ جاؤں گا۔ بس آپ دعا کریں کہ میرے گھر والے اتنی دیر میں میری تلاش نہ کریں۔"

میرا دل سلطان کے بارے میں بھی فکر مند تھا اور بھائی کی خبر پانے کے لئے بھی بے چین پھر فکر مندی پر بھائی کی محبت غالب آ گئی۔ میں نے نواز بھائی کی تصویر لا کر اسے تھما دی۔ سلطان چند لمحے نظر جما کر تصویر کو دیکھتا رہا پھر اس نے مجھے وہ تصویر واپس کر دی اور وہ فوراً غائب ہو گیا۔ اب میں اس کے لئے دعا گو تھی۔ وقت کاٹے نہیں کٹ رہا تھا۔

میں نفل پڑھ کر خدا سے رو رو کر سلطان کی بحفاظت واپسی کی دعائیں مانگنے لگی۔ اس وقت میری تڑپ بالکل ایک ایسی بہن کی تھی جس کا بھائی کسی یقینی خطرے میں ہو۔ بالآخر خدا خدا کر کے ساڑھے چار گھنٹے گزر جانے کے بعد مجھے سلطان کی تھکی ہوئی آواز سنائی دی۔ "السلام علیکم آپی۔"

میں نے تیزی سے دعا کے لئے اٹھے ہوئے ہاتھ منہ پر پھیرے اور پلٹ کر دیکھا۔ سلطان کے کپڑے گرد آلود تھے اور وہ بہت تھکا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ میں لپک کر اس کے نزدیک گئی۔ "سلطان تم ٹھیک تو ہو...... تم نے اتنی دیر کیوں کر دی؟"

وہ تھکی ہوئی سی ہنسی ہنس کر پاس پڑی ہوئی ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ میں نے جلدی سے پانی کا گلاس لا کر اسے دیا۔ سلطان نے یوں پانی پیا جیسے اسے بہت پیاس لگی ہو۔ میں نے اسے کچن میں ہی آ جانے کو کہا کیونکہ کمرے میں گڑیا بھی سو رہی تھی وہ کسی وقت بھی جاگ سکتی تھی۔ کچن میں جا کر میں نے ایک پلیٹ میں سالن اور ایک روٹی نکال کر اس کے سامنے رکھ دی اس نے تشکر بھری نظروں سے مجھے دیکھا اور ہاتھ دھوئے بغیر کھانے لگا میں نے اسے ٹوکا۔ "سلطان...... ہاتھ دھو لو...... بہت گندے ہو رہے ہیں۔" وہ فوراً فرمانبرداری سے اٹھا اور ہاتھ دھو آیا، کھانا کھاتے ہوئے اس نے مجھے بتایا کہ کینیڈا بہت بڑا ملک ہے اور وہ اس کے شہر اور آبادیاں دیکھ کر بہت حیران ہوا تھا۔"

میں نے جلدی سے پوچھا۔ "تم مجھے یہ بتاؤ کہ

نواز بھائی خیریت سے ہیں۔ انہوں نے اتنے عرصے سے ہمیں فون کیوں نہیں کیا؟"

سلطان نے یوں پہلو بدلا جیسے وہ فیصلہ نہ کر پا رہا ہو کہ میری بات کا جواب دے یا نہ دے۔ "چلیں میں شروع سے بتاتا ہوں کہ میں کیسے وہاں پہنچا۔ ارے یہ تو میں نے آپ کو بتایا ہی نہیں کہ وہاں کے جن قبیلے کا سردار بہت اچھا آدمی ہے۔ اس نے میری بہت مدد کی میں اس کے بیٹے کا دوست بھی بن گیا ہوں۔ اب بھی کبھی وہ مجھ سے ملنے یہاں آیا کرے گا۔"

وہ بات کو ٹال رہا تھا۔ میرا دل انجانے خدشوں سے تیز تیز دھڑکنے لگا۔ "سلطان مجھ سے صبر نہیں اور با تم مجھے اصل بات بتا دو۔ میرا بھائی ٹھیک تو ہے۔" میں نے سلطان کی بات کاٹ کر تیز لہجے میں کہا۔ وہ چند لمحے نظریں جھکائے زمین کو دیکھتا رہا پھر آہستہ سے بولا۔

"آپی آپ کے بھائی نے وہاں ایک عورت سے شادی کرلی ہے ان کی ایک بیٹی بھی ہے۔ مگر اب کچھ عرصے سے دونوں لڑ رہے ہیں۔ آپ کے بھائی نے وہ گھر چھوڑ کر ایک دوسری عورت کے ساتھ رہنا شروع کر دیا ہے۔ وہ ذہنی طور پر ٹھیک نہیں ہے۔ میرے وہاں کے دوست نے مجھے بتایا ہے کہ اگر یہ اسی طرح کرتا رہا تو اسے یہاں کی پولیس پکڑ کر لے جائے گی اس لئے وہ آپ سے کوئی رابطہ نہیں کر رہا۔" سلطان اتنا کہہ کر خاموش ہو گیا۔ میں نے اپنا دل تھام لیا۔ کیوں کہ مجھے پتہ تھا کہ سلطان جھوٹ نہیں بولتا اور جو بات اس نے بتائی تھی وہ میرا دل دہلانے کو کافی تھی۔

میری حالت دیکھتے ہوئے وہ مجھے تسلیاں دینے لگا۔ مگر بات ہی اتنی بڑی تھی کہ میری آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔ نواز بھائی پردیس میں ایک غلط راستے پر چل رہے تھے۔ جہاں کوئی اپنا انہیں سنبھالنے والا نہیں تھا۔

"آپی میں ایک چکر گھر کا لگا آؤں پھر آتا ہوں۔" سلطان کو اپنے گھر کی بھی فکر تھی، سو وہ چلا گیا۔ میں نے بھی کوئی اعتراض نہیں کیا کیونکہ ایک تو وہ پہلے ہی بہت دیر سے گھر سے باہر تھا پھر دوسرے اس کی سوتیلی ماں کا سلوک بھی اس سے کوئی خاص اچھا نہیں تھا۔

سلطان کے جانے کے بعد میں اپنے کمرے میں آ گئی اور چپکے چپکے رونے لگی۔ میں اتنی بڑی خبر کو گھر کے کسی فرد سے شیئر بھی نہیں کرسکتی تھی کہ میرا غم ہی کچھ ہلکا ہو جاتا۔

"کیا ہوا ہے نورین...... تم رو کیوں رہی ہو" امی نے اچانک میرے پاس آ کر پوچھا تو میں ڈر کے مارے اچھل ہی پڑی۔ امی جان سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھیں اور میرے پاس رونے کی وجہ بتانے کا کوئی معقول بہانہ نہیں تھا اور سچی بات پر کسی نے یقین نہیں کرنا تھا۔ مگر مجھے کوئی نہ کوئی جواب تو دینا ہی تھا، سو میں نے سلطان سے ملنے والی ساری خبروں کو ابھی ابھی کا دیکھا ہوا خواب کہہ کر امی کو سنا دیا۔ امی بھی میرا "خواب" سن کر پریشان ہو گئیں مگر خود کو پرسکون ظاہر کرتے ہوئے مجھے دلاسا دینے لگیں۔ "تم فکر مت کرو۔ بعض اوقات یونہی الٹ پلٹ سے خواب نظر آ جاتے ہیں جن کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ کیا ایسا ہوسکتا ہے کہ نواز ہمیں بتائے بغیر کسی انگریز عورت سے شادی کرلے؟" اگرچہ وہ خود کو لاپروا ثابت کر رہی تھیں مگر ان کی آواز میں پھنکارتے وسوسوں کی سرسراہٹ مجھے صاف سنائی دے رہی تھی۔ وہ مجھے چپ کرا کے خود جا کر فون کے پاس بیٹھ گئیں اور کافی دیر تک کسی سے باتیں کرتی رہیں۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ وہ کس سے اور کیا بات کر رہی تھیں۔

میں شام تک کمرے سے باہر نکلی نہیں۔ شام کو ابو کے آنے کے بعد گڑیا مجھے بلانے آئی تو بھی میں بادل نخواستہ باہر آئی۔ اسی وقت فراز بھائی بھی گھر میں داخل ہوئے، میں اپنی جگہ رک کر انہیں دیکھنے لگی کیونکہ ان کے تاثرات غیر معمولی تھے۔ وہ سیدھے امی کے پاس آئے جو صحن میں بنی ہوئی کیاریوں کی دیکھ بھال میں مصروف تھیں۔ امی جان بھی ان کے تاثرات دیکھ کر پریشان ہو گئیں۔ "امی جان نواز بھائی نے کینیڈا میں ایک انگریز لڑکی جینیفر سے دو سال قبل شادی کرلی تھی۔ ان کی ایک بیٹی بھی ہے۔ مگر چھ ماہ قبل ان میں کسی بات پر جھگڑے شروع ہو گئے۔ میرے دوست کو اصل وجہ معلوم نہیں ہو سکی مگر اس نے مجھے بتایا ہے کہ آج تھوڑی دیر قبل جب وہ نواز بھائی سے ملنے گیا تو انہیں پولیس گرفتار کر کے لے جا رہی تھی۔ انہوں نے شراب پی کر کسی کا ایکسیڈنٹ کر دیا تھا۔ وہ اپنی بیوی کو چھوڑ کر ایک ادھیڑ عمر عورت نینسی کے گھر میں رہ رہے تھے۔"

امی نے ایک بے یقین نگاہ مجھ پر ڈالی اور لہرا کر زمین پر آ گریں۔ فراز بھائی نے جلدی سے آگے بڑھ کر انہیں اٹھا کر چارپائی پر ڈالا اور ہم انہیں ہوش میں لانے کی تدبیر کرنے لگے۔ اس دوران ابو بھی آ گئے تھے۔ اصل بات جان کر وہ بھی بے حد پریشان اور دکھی تھے۔ ان کے پوچھنے پر بھائی نے بتایا کہ "دوپہر کو امی کا فون آ گیا تھا کہ میں کینیڈا میں اپنے اس دوست سے رابطہ کر کے نواز بھائی کی خیریت معلوم کروں جو روزانہ مجھ سے کمپیوٹر پر چیٹنگ کرتا ہے۔ میں نے امی کی تاکید کی وجہ سے اسی وقت رابطہ کیا تو خوش قسمتی سے وہ آن لائن تھا۔ اس کی رہائش بھی بھائی کے قریب ہی تھی۔ اس نے مجھے یہ ساری باتیں بتائی ہیں۔"

خود نواز بھائی کمپیوٹر چلاتے نہیں تھے اور فون کے لئے انہوں نے کہہ رکھا تھا کہ میں خود ہی کرلوں گا۔ ان کا کوئی نمبر فکس نہیں تھا۔ کبھی کسی نمبر سے بات کرتے کبھی کسی نمبر سے اس لئے براہ راست ان سے رابطہ نہیں ہو سکتا تھا۔ اب ابو اور بھائی دونوں نواز بھائی کو بچانے کے ممکنہ طریقوں پر بات کر رہے تھے جبکہ میں بھائی کی گرفتاری پر نئے سرے سے پریشان ہو کر رو رہی تھی۔

☆......☆......☆

"امی...... امی جلدی آیئے۔" فراز بھائی نے گھر میں داخل ہوتے ہی امی کو پکارا ان کے ہاتھ میں مٹھائی کا بڑا سا ڈبہ تھا۔ امی کے ساتھ ہی میں بھی تجسس سے ان کے قریب چلی گئی۔ بھائی بہت خوش تھے۔ انہوں نے امی کے ہاتھ میں وہ ڈبہ تھماتے ہوئے بتایا "آج ہمیں ایک بڑا پروجیکٹ ملا ہے اگر ہم نے اسے کامیابی سے مکمل کرلیا تو ہم سالوں کی ترقی دنوں میں کر جائیں گے۔"

تین ماہ قبل ہی بھائی نے اپنے دوست کے ساتھ مل کر کنسٹرکشن کمپنی بنائی تھی امی نے خوش ہو کر ان کے سر پر ہاتھ پھیرا اور ڈبا کھول کر اس میں سے مٹھائی اٹھا کر پہلے بھائی کے منہ میں ڈالی اور پھر باقی بھی سب کا منہ میٹھا کروایا۔ سب مٹھائی کھانے اور خوش گپیاں کرنے لگے تو امی نے چپکے سے اپنی آنکھیں پونچھ لیں۔ مجھے پتہ تھا یہ نواز بھائی کی یاد تھی جو اس خوشی کے موقع پر انہیں دکھی کر گئی تھی کیونکہ بھائی نواز کو کافی لمبی قید ہو گئی تھی۔ فراز بھائی نے اپنے دوستوں اور ان کے واقفوں کے ذریعے کافی کوشش کی تھی مگر وہاں کا قانون بہت سخت ہے۔ اس لئے انہیں متعین سزا سے بچایا نہیں جاسکا کیونکہ ایکسیڈنٹ میں زخمی ہونے والے شخص کی دونوں ٹانگیں کاٹ دی گئی تھیں اس لئے انہیں بھاری جرمانہ بھی ادا کرنا تھا۔ حالات کافی دگرگوں تھے۔ ان کی جوانی تو جیل کی سلاخوں کے پیچھے ہی گزر جانے والی تھی اور امی کو دوسرے بیٹے کی خوشی میں ایک بیٹے کی اذیت ناک زندگی یاد آ رہی تھی۔ بھائی کو بھی اندازہ ہو گیا تھا کہ امی اداس ہو رہی ہیں۔ اس لئے وہ بھی "میں تھک گیا ہوں کچھ دیر آرام کرلوں" کہتے ہوئے اپنے کمرے کی طرف چلے گئے جبکہ میں اور گڑیا بھی امی کی دلجوئی کے لئے ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگیں۔

اگلے دن میں انتظار کرتی رہی مگر سلطان کو نہ آنا تھا نہ آیا۔ وہ سارا دن بھی میرا سلطان کا انتظار کرتے ہوئے گزر گیا۔ گڑیا نے کئی بار مجھ سے پوچھا "آپی آپ پریشان کیوں ہیں جیسے آپ کو کسی کا انتظار ہے" مگر میں اسے کچھ نہ بتا سکی۔ حیرت کی بات تو یہ تھی کہ سلطان پچھلی دو راتوں سے کہانی سننے کے لئے بھی نہیں آیا تھا۔ میں خود سے کچھ نہیں کہہ سکتی تھی۔ سوائے سلطان کی واپسی کے انتظار کے سو وہ میں پوری شد و مد سے کر رہی تھی۔ وہ لوٹتا تو ہی مجھے معلوم ہوتا کہ وہ پچھلے دو دنوں سے کیوں نہیں آ رہا تھا حالانکہ پچھلے سال بھر سے اس نے ایک دن بھی آنے میں ناغہ نہیں کیا تھا۔

اس سے اگلے دن رات کو سلطان آیا تو سہی مگر وہ بہت نڈھال سا تھا۔ میں نے فوراً کہانی شروع کر دی تاکہ گڑیا کہانی سن کر سو جائے اور میں سلطان سے بات

چیت کرسکوں۔ کہانی سے فارغ ہوکر میں سلطان کی طرف متوجہ ہوئی کیونکہ گڑیا نے خود پر چادر تان لی تھی۔ میں نے اسے رکنے کا اشارہ کیا۔ وہ میرا اشارہ سمجھ کر اپنی جگہ بیٹھا رہا۔ کچھ دیر بعد ہی گڑیا سوگئی۔ مجھ سے صبر نہیں ہورہا تھا۔ میں نے فوراً اس سے تین دن کی غیر حاضری کی وجہ دریافت کی۔ مجھے لگا اس کے چہرے پر سایہ سا لہرایا تھا۔

"بس آپی ماں نے مجھے اپنے ساتھ کام سے لگائے رکھا اس لئے میں آ نہیں سکا۔" اس نے گھٹے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ جیسے وہ اپنے آنسوؤں پر قابو پانے کی کوشش کررہا ہو۔ اس کی رنگت بھی زرد زرد سی ہورہی تھی۔ میں نے اپنی سوچوں کو پیچھے دھکیل کر اس سے اس کی زرد ہوتی رنگت کی وجہ پوچھی تو اس نے فوراً نظر چرالی۔ "آپی مجھے دیر ہوگئی ہے مجھے جانے دیں ورنہ ماں مارے گی۔"

وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑا ہوا میں نے اگلے دن آنے کا وعدہ لے کر اسے رخصت کردیا۔ مجھے احساس ہوگیا تھا کہ سلطان کے ساتھ کچھ گڑبڑ ہے۔ جس کی وجہ سے سلطان پریشان ہے۔ میں نے دل میں پختہ ارادہ کرلیا تھا کہ کل جب سلطان آئے گا تو اس سے ضرور اس کی پریشانی کے بارے میں پوچھوں گی۔ مجھے خود پر بھی شرم آرہی تھی کہ میں اشرف المخلوقات ہوکر بھی اپنی پریشانیاں اس سے شیئر کرتی رہی جبکہ وہ جن ہوکر بھی اتنا غیور تھا کہ اپنی پریشانی مجھ سے چھپا رہا تھا بہرحال اس سے حقیقت معلوم کرنے کا پختہ ارادہ کرکے میں سوگئی۔

دوسرے دن جب وہ آیا تو میں نے کہا۔ "دیکھو سلطان اگر تم مجھے اپنی پریشانی نہیں بتاؤ گے تو آئندہ میں بھی تم سے اپنی ہر بات چھپایا کروں گی۔" میں نے سلطان کو اصل بات چھپاتے دیکھ کر دھمکی دے ڈالی۔ جب سے وہ آیا تھا میں اس سے اس کی پریشانی کے بارے میں پوچھ رہی تھی مگر وہ مسلسل مجھے ٹال رہا تھا کہ میرا وہم ہے۔ مگر میری اس دھمکی کے بعد اس نے دھیمے لہجے میں بتایا۔ "میرے بڑے بھائی ہم سے الگ ہوگئے۔ وہ ایک دوسرے سے بہت لڑتے تھے تنگ آکر ابا نے انہیں الگ کردیا ہے۔"

میں نے حیرت سے سلطان کی طرف دیکھا۔ "تو کیا وہ گھر چھوڑ کر چلے گئے ہیں؟" حالانکہ ان کی تو ابھی شادی بھی نہیں ہوئی تھی۔"

سلطان نے افسردگی سے نفی میں سر ہلایا اور بولا۔

"ماں اس بات پر بہت ناراض ہے۔ گھر میں کوئی بھی ایک دوسرے سے بات نہیں کرتا۔ ابا نے کہا ہے کہ میں سب بیٹوں کو الگ الگ کردوں گا۔ ماں کا خیال ہے کہ ابا انہیں کھلانے کی ذمہ داری سے آزاد ہونا چاہتا ہے۔ اس لئے وہ ابا کا غصہ بھی مجھ پر نکالتی ہے کیونکہ ابا کو پہلے میری ماں سے اور اس کے بعد مجھ سے بہت محبت ہے۔ اس لئے ماں کو مجھ پر زیادہ غصہ ہے وہ ابا کو تنگ کرنے کے لئے بھی مجھے انتقام کا نشانہ بناتی ہے۔" سلطان اپنی بپتا سناتے ہوئے ہچکیاں لے لے کر رو رہا تھا۔

میں دم بخود اس گیارہ بارہ سالہ بچے کی طرف دیکھ رہی تھی کہ وہ کتنے بڑے صدمے کو تنہا جھیل رہا تھا۔ میں نے اسے گلے سے لگالیا۔ "میں ہوں نا تمہاری بہن، تم دنیا میں تنہا نہیں ہو۔ تم اپنا ہر دکھ مجھ سے کہا کرو۔ اگرچہ میں براہ راست تمہاری مدد نہیں کرسکتی مگر تمہارے لئے دعا تو کرسکتی ہوں۔ اللہ بھی یقیناً تمہارے ساتھ ہے۔ وہ تمہیں تمہارے اس صبر کا صلہ ضرور دے گا۔ بس تم حوصلہ مت ہارنا۔ برے دن ہمیشہ نہیں رہتے۔ دیکھنا ایک دن تمہاری سوتیلی ماں کو بھی اپنے برے رویے کا احساس ہوجائے گا تو وہ بھی تم سے پیار کرنے لگے گی۔" میں نے اسے بہت تسلی دی۔ وہ کافی حد تک پرسکون بھی ہوگیا تھا۔ مگر اس وقت مجھے معلوم نہیں تھا کہ اس کا یہ سکون عارضی ہے۔ سلطان کچھ دیر میرے پاس بیٹھ کر واپس چلا گیا اور میں سارا دن اس کے لئے دکھی ہوتی رہی۔ میں نے خدا سے اس کے حالات کی بہتری کے لئے بہت دعائیں مانگیں۔

اگلے دن میں اس کا انتظار کرتی رہی مگر وہ نہ آیا۔ پھر دن پر دن گزرنے لگے۔ میں سلطان کی طرف سے بہت فکر مند تھی۔ ہر نماز کے بعد اس کے لئے دعا ضرور کرتی۔ مگر اس کی طرف سے کوئی جواب نہ تھا۔ مجھے علم نہیں تھا کہ اب وہ کس حال میں ہے اور اس کی ماں اور گھر والے

اس سے کیسا سلوک کررہے ہیں۔ یہ سب جاننے کے لئے میرے پاس سلطان کے سوا کوئی ذریعہ نہ تھا مگر سلطان نہیں آرہا تھا۔ پندرھویں دن بھی جب سلطان نہ آیا تو میں نے پختہ ارادہ کرلیا کہ کل میں اس کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق پکاروں گی تاکہ وہ میرے پاس آئے اور میں کم ازکم اس کی خیریت سے آگاہ تو ہوسکوں، ساتھ ہی میں اس پر یہ بھی پابندی لگادوں گی کہ وہ ہر روز مجھ سے ملنے آیا کرے، چاہے ایک منٹ کے لئے ہی سہی۔

☆......☆......☆

گھر میں سوگ کی سی کیفیت تھی۔ ہر کوئی ایک دوسرے سے چھپتا پھر رہا تھا۔ آگے پیچھے دو منحوس خبروں نے سب کو ہی توڑ ڈالا تھا۔ کینیڈا سے خبر آئی تھی کہ نواز بھائی نے خودکشی کی کوشش کی تھی اور ذہنی توازن کھو بیٹھے ہیں۔ ابھی امی جان اور ہم بہنیں اس صدمے سے ہی سنبھلے نہیں تھے کہ فراز بھائی کے کاروبار میں بہت بڑے گھاٹے کی خبر نے ہمارے رہے سہے حوصلے بھی توڑ دیئے۔ ہمیں یوں لگ رہا تھا کہ مصیبتیں ہر طرف سے ہم پر حملہ کرنے کے لئے منہ پھاڑے کھڑی ہیں۔ امی کی طبیعت سخت خراب تھی۔ انہیں بیٹھے بیٹھے بے ہوشی کا دورہ پڑجاتا تھا۔ ہم دونوں بھی ایک دوسرے سے چھپ کر رو رہی تھیں اور ایک دوسرے کے سامنے خود کو بہادر ثابت کررہی تھیں۔ ابو بالکل گم صم ہوگئے تھے۔ فراز بھائی سارا سارا دن گھر سے باہر رہتے وہ ڈوبتے ہوئے کاروبار کو سنبھالنے کی کوشش کررہے تھے مگر ان کی کوششیں بارآور ہوتی نظر نہیں آرہی تھیں۔ اب وہ ہر وقت پریشان ہی رہتے تھے۔ اسی پریشانی کی وجہ سے ان کا موڈ بھی ہر وقت آف ہی رہتا کوئی بات کرتا تو وہ کاٹ کھانے کو دوڑتے۔ امی جان کے خدشے درست ثابت ہورہے تھے۔ ابو بھی اندر ہی اندر گھل رہے تھے۔ مجھے ہر ایک کی حالت پر الگ الگ دکھ کا احساس ہورہا تھا مگر میں کسی کے لئے بھی کچھ کر نہیں سکتی تھی۔ سوائے دعا کے اور اس میں، میں نے کوئی کمی نہیں کی تھی مگر حالات سدھرتے نظر نہیں آرہے تھے۔

رات کو بہت دیر کے بعد فراز بھائی گھر آئے تو امی نے انہیں ڈانٹ دیا کہ آخر اتنی دیر تک گھر سے باہر رہنے کی کیا ضرورت تھی۔ وہ تو پہلے اپنی پریشانیوں میں تھے فوراً حوصلہ کھو بیٹھے۔ "آپ بھی مجھے ہی مورد الزام ٹھہرا رہی ہیں جیسے میں جان بوجھ کر نقصان کررہا ہوں اور اس کے بعد اس کو پورا کرنے کے لئے بھاگ دوڑ کررہا ہوں۔ دنیا میں کوئی نہیں جو میری پریشانی سمجھ سکے۔ ایک وہ جسے میں نے اپنا دوست سمجھا تھا وہ میرا سب سے بڑا دشمن نکلا ہے۔ کاروبار میں گھاٹا اس کے فراڈ کی وجہ سے پڑا ہے۔ وہ تو بن گیا ہے، مگر میرا بال بال قرضے میں جکڑا گیا ہے، گھر والے بھی اب مجھ سے جان چھڑانا چاہتے ہیں۔ جب بھی گھر آؤ بجائے دلاسا دینے کے طعنے ہی دیتے ہیں۔"

امی جان صدمے سے گنگ کھڑی انہیں دیکھتی رہیں اور وہ پاؤں پٹختے ہوئے اپنے کمرے میں چلے گئے۔ میری بھی جان پر بن آئی تھی۔ بھائی کی حالت الگ دیکھی نہ جارہی تھی۔ دوسری طرف یہ خبر بھی روح فرسا تھی کہ بھائی کے پارٹنر نے دھوکے سے سب مال خود سمیٹ لیا تھا اور قرضے بھائی کے لئے چھوڑ دیئے تھے مجھے آنے والے وقت سے ابھی سے خوف آرہا تھا مجھے پتہ تھا کہ اگر اتنا بڑا قرضہ بروقت ادا نہ ہوسکا تو ہم سب سڑک پر آجائیں اور اس قرض کی ادائیگی کی کوئی صورت نظر نہیں آرہی تھی۔ جو اتنی بڑی رقم کا بندوبست نہیں کرسکتے تھے اور نواز بھائی تو خود مدد کے مستحق ومنتظر تھے۔ کوئی سہارا نظر نہیں آرہا تھا۔ میں ایک بار پھر خدا کے آگے رونے اور گڑگڑانے لگی۔ اس کے سوا کوئی ہمارا مددگار نہ تھا۔ دعا مانگتے ہوئے مجھے سلطان کا ایک بار بھی خیال نہ آیا جو اتنے دنوں سے مجھ سے ملنے نہیں آیا تھا۔ میں انسان تھی شاید اسی لئے اپنا وقت نکل جانے کے بعد اپنے محسن کو بھول گئی تھی۔

میری آنکھوں سے آنسو لڑیوں کی طرح گررہے تھے۔ میں اس کی حالت دیکھ کر اتنی دکھی تھی کہ اپنی چیخوں پر قابو نہ پاسکی۔ میں اپنی پریشانیوں میں سلطان کو بالکل ہی بھول گئی تھی مگر اس روز جب وہ زخموں سے چور انتہائی خراب حالت میں میرے سامنے آیا تو میرا رواں رواں چیخ اٹھا۔ "سلطان یہ ظلم تمہارے ساتھ کس نے کیا ہے۔ مجھے

بتاؤ۔ کس نے تمہیں اس بری طرح سے مارا ہے۔ کون ہے وہ ظالم؟" میں ہذیانی انداز سے چیختے ہوئے اسے جھنجوڑ رہی تھی۔

وہ نقاہت کی وجہ سے زمین پر بیٹھ گیا تھا۔ اس کے چہرے پر جا بجا خراشیں تھیں۔ اس کے کپڑے میلے اور خون آلود تھے۔ کمزوری کی وجہ سے اس کی رنگت بھی زرد پڑی ہوئی تھی۔ وہ آنکھیں بھی نہیں کھول پا رہا تھا کیونکہ ان پر بہت سوجن ہو رہی تھی۔ وہ اس قدر زخمی تھا کہ میرے اتنے سوالوں کے جواب میں اس کے زخمی ہونٹ محض پھڑپھڑا کر رہ گئے۔

میری ہذیانی چیخیں سن کر امی جان کی آنکھ کھل گئی۔ وہ ابھی کچھ دیر قبل ہی دوا کھا کر لیٹی تھیں صبح سے انہیں بخار تھا۔ "کیا ہوا نورین...... تم چیخ کیوں رہی ہو؟" وہ انتہائی پریشانی سے بولتی ہوئی کمرے سے نکلیں تو مجھے اپنی حماقت کا احساس ہوا، میں نے جلدی سے سلطان کے زخمی بازو چھوڑے اور کھڑی ہو گئی آنسو ابھی تک میری آنکھوں سے گر رہے تھے۔ "تمہیں کیا ہوا ہے؟" امی جان نے ہول کر پوچھا۔

شدید خوف کے باعث ان کی آواز بھی بیٹھی ہوئی تھی میں نے جلدی سے انکار میں سر ہلا دیا۔ "کچھ نہیں، میں ڈراؤنا خواب دیکھ کر ڈر گئی ہوں۔" میرے قریب ہی چارپائی موجود تھی۔ اس لئے امی جان نے میری بات پر یقین کر لیا مگر اب ان کی پریشانی پہلے سے بھی بڑھ گئی تھی۔ وہ پہلے بھی ایک مرتبہ میرے "خواب" کو من و عن سچا ہوتا دیکھ چکی تھیں۔

"نورین...... تم خواب سنانا مت۔ بس کچھ صدقہ خیرات کر دو۔" انہوں نے انتہائی خوفزدہ لہجے میں کہا اور وہیں سے پلٹ گئیں۔ شاید وہ کوئی اور بری خبر سننا نہیں چاہتی تھیں۔ میں پھر جلدی سے سلطان کے قریب آ بیٹھی اب وہ نیم بے ہوشی کی کیفیت میں تھا اور چارپائی کے پائے کے ساتھ ٹیک لگائے ہوئے تھا۔ میں نے اسے سہارا دے کر چارپائی پر لٹا دیا اور خود جلدی سے دودھ گرم کر کے اوولٹین ملا کر لے آئی۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ اس طرح کے زخمی کو کس طرح سنبھالا جاتا ہے۔ میں نے چمچ سے دودھ اس کے حلق میں ٹپکایا تو اس کی حالت پہلے سے قدرے بہتر نظر آنے لگی۔ میں نے روتے ہوئے گیلے کپڑے سے اس کے سارے زخم صاف کئے۔ وہ اس حد تک زخمی تھا کہ اگر مرا نہیں تھا تو یہ کوئی معجزہ ہی تھا۔ اس کی قمیص بھی میں نے کاٹ کر اس کے جسم سے الگ کر دی کیونکہ وہ جگہ جگہ سے پھٹی ہوئی اور خون آلود تھی۔ اس کے سینے اور کمر پر بھی بڑے بڑے نیل اور زخموں کے نشان تھے۔ کچھ زخم پرانے تھے جن کے کنارے بھی سیاہ پڑ گئے تھے اور کچھ زخموں سے ابھی تازہ خون رس رہا تھا۔ میں نیم گرم پانی میں کپڑا بھگو بھگو کر اس کے جسم سے خون اور گرد صاف کرتی رہی۔ وہ بار بار کراہ رہا تھا۔ میں نے سب چھوٹے بڑے زخموں پر مرہم لگا دیا۔ اس سارے کام کے دوران میرے منہ سے بددعائیں اور سلطان کے لبوں سے کراہیں نکلتی رہیں۔

میں کسی سگی بہن کی طرح ہی اس سب کے ذمے داروں کو بددعائیں دے رہی تھی۔ وہ اتنا سا بچہ جو کبھی کسی سے برے طریقے سے پیش نہیں آتا تھا کس ظالم کے ہاتھوں اتنی اذیت ناک حالت کو پہنچا تھا۔ میرا دل یہ چاہ رہا تھا کہ اگر مجھے معلوم ہو جائے تو میں شاید اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے چیل کووں کو کھلا دوں جس نے سلطان کو اس بری طرح مارا تھا۔ سارے زخم صاف کر کے میں نے ایک بار پھر اسے نیم گرم دودھ پلایا۔

"سلطان اب تکلیف کچھ کم ہوئی۔" میں نے اس کے کان کے پاس منہ کر کے پوچھا، اس نے اشارے سے ہاں میں جواب دیا۔

پھر میں نے سہارا دے کر اسے اپنے بستر پر لٹا دیا اور سارا دن وقفے وقفے سے کام کے دوران اس کی دیکھ بھال کرتی رہی۔ اگلے دن وہ خود سے کروٹ بدلنے لگا میں اس کی سخت جانی پر حیران تھی۔ اب اس کی آنکھیں بھی کھل رہی تھیں۔ مگر پھٹے ہونٹوں کی شدید تکلیف کی وجہ سے وہ کوئی بات نہیں کر رہا تھا۔ میں اپنے سوالوں کو اپنے اندر ہی روکے ہوئے تھی تاکہ اسے جواب دینے سے

تکلیف کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ اگلے دن وہ بالکل مدھم آواز میں بات کرنے کے قابل ہو گیا۔

اس نے مجھے بتایا کہ "اس کے باپ کو ایک عامل نے اپنا غلام بنا لیا ہے اور اس کے گھر کا شیرازہ بکھر گیا ہے۔ اس کی ماں نے اپنا سارا غصہ اس پر نکالنا شروع کر دیا کیونکہ پہلے وہ باپ کی وجہ سے اس کے ساتھ اتنا برا سلوک نہیں کر سکتی تھی۔ وہ نہ صرف اس سے کام کرواتی بلکہ بہت مارتی تھی اور ساتھ اسے اور اس کی مرحومہ ماں کو گالیاں بھی دیتی۔ پھر ایک دن سلطان کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ اس نے بھی کام سے جواب دے دیا اور وہ بیڑیاں پہننے سے بھی انکار کر دیا جو وہ روز انہ رات کو اس خیال سے پہنا دیتی تھی کہ ایک تو یہ بھاگ نہ جائے دوسرے آرام سے سو نہ سکے۔ ماں نے اس پر فوراً اپنے بیٹوں کو بلا لیا۔ انہوں نے بھی باپ کے سارے اعمال کا بدلہ معصوم سلطان سے لیا اور اس قدر مارا کہ وہ مرنے کے قریب ہو گیا۔ وہ تو شاید اسے قتل ہی کر دیتے مگر عین اسی وقت وہاں خاندان کی ایک بوڑھی جنی آ گئی۔ اس نے شور مچایا تو وہ اسے انتہائی زخمی حالت میں چھوڑ کر بھاگ گئے۔ بوڑھی جنی نے سلطان کو نیم بے ہوشی میں ہی چھوڑ کر خاندان کے سربراہ کو بلانے چلی گئی تاکہ اسے سلطان کی بری حالت دکھا سکے۔ مگر اس دوران سلطان کو ذرا ہوش آ گیا۔ اسے یقین ہو گیا تھا کہ اب وہ زندہ بچ نہیں سکتا سو وہ آخری بار مجھ سے ملنے چلا آیا کیونکہ وہ پچھلے بہت سے دنوں سے اپنی بیڑیوں کی وجہ سے مجھ سے مل نہیں سکا تھا۔ مگر وہ خدا کو اس کی زندگی منظور تھی سو اب وہ زندگی کی طرف پلٹ رہا تھا۔"

اب اس کے بدن کے زخم بھرنے لگے تھے۔ مگر روح کے زخم ہرے تھے۔ وہ اکثر لیٹے لیٹے خلاؤں میں گھورتا رہتا یا پھر کبھی چپکے چپکے روتا رہتا۔ میں اس کی اندرونی حالت سے واقف تھی اس لئے اسے رونے دیتی تھی تاکہ اس کے اندر بھرا ہوا غبار کچھ کم ہو سکے۔ خود میں بہت دکھی تھی کہ جنوں میں بھی انسانوں کی طرح دشمنیاں ہوتی ہیں۔ وہاں بھی بھائی اپنے بھائی کے خون سے ہاتھ رنگ لیتے ہیں۔ کبھی مجھے اس عامل پر شدید غصہ آتا جس کی ایک گھٹیا حرکت نے سلطان کے خاندان کا شیرازہ بکھیر کر رکھ دیا تھا۔

اس نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ کبھی پلٹ کر اپنے گھر نہیں جائے گا بس وہ کبھی کبھار اپنے باپ سے ملنے جاتا تھا۔ باقی کا سارا وقت ہم دو مختلف مخلوقوں کے بہن بھائی ساتھ ہی گزارتے تھے۔ اب میں اکثر دن میں بھی اسے کہانی سنا دیتی تھی۔ میرے گھر والوں کو یقین ہو گیا تھا کہ میں پے در پے ملنے والے صدموں سے پاگل پن کی طرف بڑھ رہی ہوں جو اکثر اکیلے میں باتیں کرتی ہوں۔ مگر کسی کے پاس اتنے پیسے نہ تھے کہ مجھے لے کر ڈاکٹروں کے چکر کاٹتا۔ اسی طرح وقت اپنی مخصوص رفتار سے چل رہا تھا۔

ایک دن سلطان نے بہت جوش اور خوشی سے بتایا کہ اس کے دوست کی شادی ہے۔ میں نے حیران ہو کر پوچھا۔ "تمہارا کون سا ایسا دوست ہے جو اتنی سی عمر میں شادی کر رہا ہے۔"

"آپی وہ عمر میں مجھ سے بڑا ہے، وہی میرا کینیڈا والا دوست ہے اس نے مجھے ایک ہفتے کے لئے اپنے پاس بلایا ہے۔ اگر آپ اجازت دے دیں تو میں اپنے دوست کی شادی میں چلا جاؤں۔"

وہ لجاجت سے مجھ سے اجازت مانگ رہا تھا۔ میں نے اسے اجازت دے دی وہ بہت خوش ہوا۔ جب وہ رخصت ہونے لگا تو میرا دل اداس ہو گیا۔ میں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "جلد لوٹ آنا سلطان تم مجھے بہت یاد آؤ گے۔"

سلطان کے جانے کے ٹھیک تیسرے دن مجھے سلطان بہت بری طرح یاد آ رہا تھا۔ مگر وہ اتنی دور تھا کہ شاید میری پکار بھی اس تک نہ پہنچ پاتی۔

☆......☆......☆

ہمارا گھر اجڑ گیا تھا۔ فراز بھائی کو پولیس پکڑ کر لے گئی تھی، ابو کو ہارٹ اٹیک ہو گیا تھا جبکہ ہمیں دھمکیاں مل رہی تھیں۔ بھائی قرض ادا نہیں کر سکتے تھے۔ اس لئے اس وڈیرے نے جس سے انہوں نے قرضہ لیا تھا انہیں جیل میں ڈلوا دیا تھا۔ اب اس کے کارندے ہمیں دھمکیاں

دے رہے تھے کہ دو دن کے اندر اندر رقم کا بندوبست کرلیں ورنہ سنگین نتائج بھگتنے کے لئے تیار رہیں۔ خدا نے ان کے دل میں رحم نہیں ڈالا تھا۔

وہ لوگ ہماری کسمپرسی کا احساس کئے بغیر مجھے اغوا کرنے کے لئے آگئے۔ کیونکہ گڑیا تو پہلے ہی خالہ کے گھر گئی ہوئی تھی۔ اسے تو ہمارے اجڑنے کی خبر بھی نہیں تھی۔ اس لئے وہ بچ گئی۔ ایک دن میرے کمرے کے دروازے کو زوردار دھکے پڑنے لگے۔ محلے کے مردوں نے بدمعاشوں کو للکارا تو انہوں نے ہوائی فائر کردیئے کون کسی کی خاطر اپنی جان دیتا ہے۔ سب لوگ اپنے اپنے گھروں میں دبک گئے۔ تیسرے چوتھے دھکے سے دروازے کی کمزور کنڈی ٹوٹ گئی اور وہ دونوں بدمعاش کمرے میں آگھسے انہوں نے اپنی گنوں کا رخ میری طرف کردیا۔

”چل لڑکی آرام سے ہمارے ساتھ گاڑی میں بیٹھ جا۔ نہیں تو بھیجے میں سوراخ بنادیں گے۔“

امی جان روتی ہوئی بھاگ کر میرے سامنے آگئیں۔ ”تم میری بیٹی کو مت لے جاؤ خدا کے لئے۔“ انہوں نے ان درندہ صفت لوگوں کے سامنے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔ مگر انہوں نے بجائے رحم کھانے کے امی کو زور سے دھکا دیا تو وہ کمرے کے وسط میں جاگریں اس کے بعد وہ دونوں مجھے دھکیلتے ہوئے باہر لے آئے۔ میرے حواس میرا ساتھ چھوڑ رہے تھے۔ مجھے اپنے دوپٹے تک کی خبر نہیں تھی جو میرے پاؤں میں گھسٹ رہا تھا میں ان کی بندوقوں کی نال کے آگے آگے ایک گاڑی میں جا بیٹھی اگلے ہی لمحے دونوں گاڑیاں مجھے لئے ہوئے نامعلوم منزل کی جانب روانہ ہوگئیں۔ میرے اعصاب شدید جھٹکا لگنے سے اتنے کشیدہ ہوگئے تھے کہ مجھے خوف تک محسوس نہیں ہورہا تھا۔ میں بغیر چیخے چلائے بالکل ساکت وصامت گاڑی میں بیٹھی ہوئی تھی۔

شہر سے باہر نکل کر انہوں نے ایک جگہ گاڑی روک لی۔ پہلے مجھے پانی پلایا پھر میری آنکھوں پر سیاہ پٹی باندھ دی۔ اس پانی میں شاید کچھ ملا ہوا تھا کیونکہ میں کچھ دیر بعد ہی ہوش وحواس سے بیگانہ ہوگئی۔

جب مجھے ہوش آیا تو میں ایک تاریک کمرے میں بستر پر پڑی تھی۔ پہلے کچھ دیر تو مجھے ٹھیک طرح سے حالات کا اندازہ نہیں ہوسکا مگر جونہی مجھے گزشتہ واقعات یاد آئے تو میں اچھل کر بستر سے اتر آئی۔ میں نے پہلے اپنا اور پھر کمرے کا اچھی طرح جائزہ لیا۔ کمرے میں ایک بیڈ اور دوسری دیوار کے ساتھ دو کرسیاں اور ایک میز پڑا تھا۔ کمرے میں کوئی کھڑکی نہیں تھی ایک دروازہ تھا۔ کم از کم میں اسے کسی طرح بھی توڑ نہیں سکتی تھی۔ دروازہ مضبوط لکڑی کا بنا ہوا تھا۔ میں نے اسے ہلا جلا کر دیکھا مگر وہ باہر سے بند تھا۔

اچھی طرح سارے حالات کا تجزیہ کرچکنے کے بعد میرے حوصلے کی طنابیں ٹوٹ گئیں۔ میں فرش پر بیٹھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ کافی رو چکنے کے بعد میری حالت کچھ سنبھل گئی۔ مجھے رہ رہ کر سلطان یاد آرہا تھا۔ میں نے اس کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق اسے پکارنے کا فیصلہ کرلیا۔ میں بلند آواز سے سلطان کو آوازیں دینے لگی اس وقت میرا رواں رواں دعا کررہا تھا کہ کسی طرح میری آواز سلطان تک پہنچ جائے مگر کافی دیر تک آوازیں دینے سے بھی کوئی فرق نہیں پڑا۔

میری امید ناامیدی میں ڈھلنے لگی۔ برے وقت میں سب ساتھ چھوڑ جاتے ہیں۔ سلطان کو کیا پڑی ہے کہ وہ میری خبر لینے یہاں آئے۔ جب اپنے بھائی برے وقت میں سہارا نہ بن سکے تو اس سے کیا گلہ وہ تو یوں بھی جن زادہ ہے۔ ”سلطان تم سے یہ امید نہ تھی کہ پہلی بار تمہیں پکارا اور تم پہلی بار نہ آئے۔“ میں نے دھیمے لہجے میں کہا اور اپنا چکراتا سر تھام کر بیٹھ گئی۔ اگر سلطان نہیں آیا تھا تو یہاں مجھے قید کرنے والوں میں سے کوئی بھی نہیں آیا تھا۔ میں ایک بار پھر رونے لگی۔

کمرے کے اندھیرے سے مجھے اندازہ ہورہا تھا کہ باہر رات ہوچکی ہے۔ وقت کیا ہورہا تھا اس کا مجھے اندازہ نہیں ہورہا تھا کیونکہ کمرے میں کوئی بلب نہ تھا۔

اگر کمرے میں کوئی کلاک تھا بھی تو میں اس سے بے خبر تھی۔ جب یہ لوگ مجھے اٹھا کر وہاں سے چلے تھے تو صبح کے دس بج رہے تھے مگر اب رات ڈھل چکی تھی۔ مجھے اپنی امی اور اسپتال میں پڑے ہوئے ابو کا خیال آیا یقیناً وہ لوگ میرے لئے بہت پریشان ہوں گے۔ ان لوگوں کے ارادے ڈھکے چھپے نہیں تھے۔ وہ مجھے بیچ کر اپنی ڈوبی ہوئی رقم حاصل کرنا چاہتے تھے۔ اس صورت میں میرا مستقبل اور بھی زیادہ خطرناک اور مخدوش تھا۔

میں فرش پر خدا کے سامنے سجدہ ریز ہوگئی جب انسان کی امید ہر طرف سے ٹوٹ جائے تو اسے خدا یاد آتا ہے۔ میں نے سچے دل سے دل ہی دل میں خدا کو پکارا۔ وہ مہربان خدا جو پکارنے والوں کو مایوس نہیں کرتا۔ چند لمحوں کے بعد ہی میرے دل کو سکون نصیب ہوگیا۔ میں نے اپنے آنسو پونچھ ڈالے اور قرآنی آیات کا ورد کرتے ہوئے بستر پر بیٹھ گئی۔ جانے کتنی دیر اسی طرح گزر گئی۔

اچانک سلطان کی آواز میرے کانوں میں پڑی تو مجھے لگا جیسے میرے مردہ بدن میں بجلیاں سی دوڑ گئی ہوں۔ میں اسے پکارنا چاہتی تھی مگر میرے ہونٹ ٹیپ کی وجہ سے منجمد تھے۔ ”آپی یہ سب کیا ہوگیا...... میری اتنی سی غیر حاضری میں ہماری دنیا ہی لٹ گئی۔“ وہ بہت دکھی تھا۔

مگر میں انتہائی خوش تھی۔ میری موہوم سی امید بر آئی تھی۔ سلطان نے مجھے مایوس نہیں کیا تھا۔ وہ اپنے دوست کی شادی چھوڑ کر آگیا تھا۔ میرے لئے...... جب کوئی بھائی اپنی بہن کے مان پر پورا اترے تو اس وقت کیا حالت ہوتی ہے یہ لفظوں میں کہنے کی بات نہیں ہے۔ بس وہی بہنیں جان سکتی ہیں جن کو اس صورتحال کا تجربہ ہوا ہو۔ میں ایکدم بے فکر اور پرسکون ہوگئی تھی کہ اب سلطان مجھے بچالے گا۔ میرے خدا نے سلطان کو مجھ تک پہنچا کر میری حفاظت کا بندوبست کردیا تھا۔ میں اپنے رب کی شکر گزار تھی۔

مجھے اس حالت میں دیکھ کر سلطان کی کیفیت دیدنی تھی۔ غصے سے اس کا چہرہ سرخ ہوچکا تھا۔

بہرحال اس نے میرے ہاتھ کھولے اور پھر میرے منہ پر چسپاں ٹیپ کو ہٹایا اور آنکھ پر بندھی پٹی کھول دی اور بولا۔ ”آپی چلیں۔“

اس نے نہ جانے کیا اشارہ کیا کہ مقفل دروازہ خود بخود کھل گیا۔ ہم چند قدم آگے بڑھے ہی تھے کہ ہمارے سامنے وہ ظالم آدھمکے۔ مجھے اس حالت میں دیکھ کر وہ حیران اور ششدر ہوگئے۔ سلطان انہیں نظر نہیں آرہا تھا۔ ان میں سے ایک آناً فاناً میری جانب بڑھا اور چاہا کہ مجھے پکڑ لے کہ اچانک وہ کئی فٹ ہوا میں اوپر کو اچھلا اور اس کے بعد دھم سے زمین پر گرگیا۔ اس کی چیخیں آسمان کو ہلا گئیں۔

وہ تین تھے، پھر تو ان تینوں کی چیخیں ناقابل فراموش حد تک پوری فضا کو دہلانے لگیں۔ وہ ہوا میں اچھلتے اور زوردار طریقے سے زمین پر گرتے۔ ان کے منہ اور کان سے خون کے فوارے چھوٹنے لگے تھے۔ ان کی ہڈیاں سلامت نہیں تھیں۔ یہ سلسلہ کئی منٹ تک جاری رہا پھر اس کے بعد ان کے جسمانی اعضاء چیتھڑوں میں بٹتے چلے گئے۔ اس منظر کو دیکھ کر میری حالت ایسی تھی کہ کاٹو تو جسم میں لہو نہیں، میں سکتے کے عالم میں تھی، میری آنکھیں جیسے پتھرا گئی تھیں۔ میں سہمی ہوئی ٹکر ٹکر دیکھ رہی تھی۔

”آپی چلیں۔“ سلطان نے میرا ہاتھ پکڑا تو میں چونک پڑی۔ آپی اپنی آنکھیں بند کرلیں اور جب تک میں نہ بولوں اپنی آنکھیں کھولئے گا نہیں، یہ بتائیں میں آپ کو کس جگہ چھوڑوں۔“

”سلطان مجھے میرے گھر پہنچادو۔“ میں لرزتے ہوئے لہجے میں بولی۔

یہ سن کر سلطان نے میرا ہاتھ پکڑا تو میں نے اپنی آنکھیں بند کرلیں، اس کے بعد میں نے محسوس کیا کہ جیسے میں ہواؤں میں اڑتی جارہی ہوں، میری زبان اور آنکھیں بند تھیں۔ تھوڑی دیر بعد میرے قدم زمین پر لگے، اس کے بعد سلطان کی آواز سنائی دی۔ ”آپی آنکھیں کھولیں۔“

جب میں نے آنکھیں کھول کر دیکھا تو میں اپنے گھر کے سامنے کھڑی تھی۔ میں نے دروازہ کھٹکھٹایا تو چند

منٹ بعد ایک صاحب نکلے اور بولے۔ "جی فرمایئے، آپ نے کس سے ملنا ہے؟"

ان کی باتیں سن کر میں گھبراہٹ میں بول پڑی۔

"آپ کون ہیں؟ میرا مطلب یہ میرا گھر ہے، میرا نام بشریٰ ہے، میری والدہ......"

"اچھا...... میں سمجھا...... بیٹی یہ گھر میں نے آپ کی والدہ سے خرید لیا تھا۔ آپ کی والدہ غالباً اپنی بہن کے پاس چلی گئی تھیں، آپ لوگوں کے ساتھ بہت برا ہوا تھا، مجھے بہت افسوس ہے۔ بشریٰ بیٹی آپ اندر آ جائیں، رات ہو رہی ہے، کہاں جائیں گی اور آپ تھیں کہاں؟ اور اس وقت اکیلی کہاں سے آ رہی ہیں؟"

سلطان ان کی نظروں سے پوشیدہ تھا۔ اتنے میں سلطان کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ "آپی چلیں! میں آپ کو آپ کی خالہ کے گھر چھوڑ دیتا ہوں، جلدی کریں۔"

یہ سن کر میں نے بزرگ سے کہا۔ "جناب میں چلتی ہوں، آپ کا شکریہ کہ آپ نے میری والدہ کے متعلق بتایا۔" اب میں چلتی ہوں۔

"بیٹی اس وقت رات میں، آپ کا اکیلے جانا ٹھیک نہیں، میری بات پر غور کریں، رات یہیں گزار کر صبح چلی جانا۔" بزرگ نے کہا۔

"انکل آپ فکر نہ کریں، ایسی کوئی بات نہیں، ویسے فلاں گلی میں میرے ایک رشتہ دار کا گھر ہے، میں وہاں چلی جاؤں گی۔" میں نے ٹالنے کے لئے بزرگ سے کہا اور ایک طرف کو قدم بڑھانے لگی تاکہ کچھ دور جا کر سلطان کی باتوں پر عمل کر سکوں یعنی سلطان کے ساتھ اپنی خالہ کے گھر پہنچ جاؤں۔ تھوڑی دور جانے کے بعد ایک گلی میں اندھیرا تھا، اس جگہ سلطان نے کہا۔

"آپی میرا ہاتھ پکڑ لیں اور پہلے کی طرح اپنی آنکھیں بند کر لیجئے گا، میں آپ کو آپ کی خالہ کے گھر چھوڑ دوں۔"

سلطان نے میرا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیا اور میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں تو مجھے لگا کہ میں ہوا میں اڑنے لگی ہوں۔ خیر تھوڑی دیر بعد میرے قدم زمین پر رکے، سلطان کی آواز سنائی دی۔ "آپی آنکھیں کھول لیں، آپ کی خالہ کا گھر آ گیا۔" میں نے آنکھیں کھولیں اور خالہ کے گھر کا دروازہ جیسے پیٹ ڈالا۔ عجلت میں دروازہ کھلا، دروازہ کھولنے والی ہستی میری خالہ مجیدہ تھیں۔ خالہ پر نظر پڑتے ہی میں لپک کر خالہ کے گلے لگ گئی اور زار و قطار رونے لگی۔ میرے آنسو تھے کہ تھمنے کو نہیں آ رہے تھے اور آواز میرے گلے میں اٹک کر رہ گئی تھی۔ اتنے میں میری امی بھی دروازے پر آ گئی تھیں اور مجھے دیکھ کر فوراً میرے گلے لگ کر رونے لگیں۔

خیر مجھے لئے ہوئے دونوں کمرے میں داخل ہوئیں۔ کافی دیر بعد ہمارے آنسو تھمے، حال احوال سامنے آئے، اس دوران سلطان میرے ساتھ ہی رہا اور وہ کسی کو نظر نہیں آتا تھا۔ خالہ نے مجھے پانی پلایا، اس کے بعد میں نے کہا کہ "کمرے میں میرا بستر کر دیں میں تھکن سے چور چور ہو رہی ہوں۔" خالہ جھٹ پٹ کمرے میں مجھے لے گئیں اور مجھے بستر پر لٹا کر دروازہ بند کر کے چلی گئیں۔

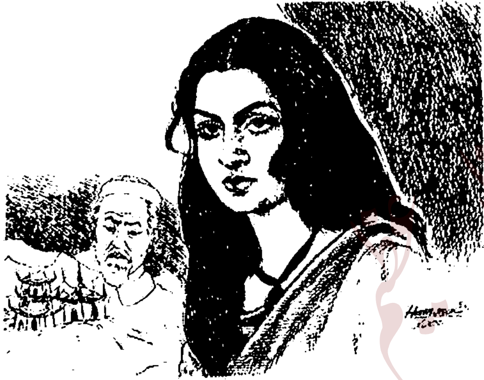
سلطان کو میں نے گلے لگا کر کہا۔ "میرے بھائی میں تا زندگی تمہاری شکر گزار رہوں گی، تم نے میرے لئے جو تکلیف اٹھائی اور مجھے عزت و آبرو سے گھر تک پہنچایا۔" اس وقت بھی میری آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔

سلطان بولا۔ "آپی یہ میرا فرض تھا اور بہن کے لئے یہ کوئی پریشانی یا تکلیف نہیں، آئندہ جب بھی میری ضرورت پڑے مجھے آواز دینا بھولئے گا نہیں۔ اب میں چلتا ہوں، میرے لئے دعا کیجئے گا کہ میری پریشانیاں ختم ہو جائیں۔" اور سلطان میری نظروں سے غائب ہو گیا۔

سلطان چلا گیا اور پھر کبھی پلٹ کر نہیں آیا، میں اسے آواز دیتے دیتے تھک گئی۔ لیکن سلطان نہیں آیا۔ مجھے لگتا ہے یقیناً وہ کسی مصیبت میں گرفتار ہو گیا ہوگا۔ میں آج بھی اسے آواز دیتی ہوں مگر سلطان نہیں آتا۔ یا پھر اس کا وجود ہی ختم نہ ہو گیا ہو۔

جنون خواہش

ملکہ گلونہ



مینا نے اپنا سامان لاؤنج کے کونے والے کمرے میں سیٹ کر لیا۔ اس کے سامان میں عجیب عجیب سی چیزیں تھیں

یہ واقعات میری بہترین دوست مینا کی زندگی سے متعلق ہیں مگر اس سے پہلے میں اپنا تعارف کرا دوں۔

میرا نام کشمالہ عرف کمی ہے۔ ایک کھاتی پیتی معزز فیملی سے میرا تعلق ہے، چند برس پہلے...... ممی کی ڈیتھ کے بعد میرا خاندان ٹوٹ پھوٹ گیا۔ پاپا نے دوسری شادی کر لی تھی اور وہ نئی بیوی کے ہو رہے، پاپا کی اس سرد مہری سے میرا چھوٹا بھائی علی دلبرداشتہ ہو گیا اس نے لندن کی یونیورسٹی میں ایڈمیشن لیا اور چلا گیا۔ میری سوتیلی والدہ کا تعلق کسی اور شہر سے تھا۔ وہیں ان کا بھرا پرا میکہ تھا۔ وہ پاپا سے اپنے آبائی شہر میں مستقل بنیادوں پر شفٹ ہونے کے لئے اصرار کرنے لگیں اور انہوں نے ایڑی چوٹی کا زور لگا کر اپنی تو منوالی لیکن پاپا مجھے دوسرے شہر شفٹ ہونے پر رضامند نہ کر پائے۔ جہاں میں موجود تھی اس شہر میں میری والدہ دفن تھیں۔ یہاں کی ہواؤں سے مجھے ان کی خوشبو آتی تھی۔ اس گھر میں ان کی یادیں بکھری پڑی تھیں میں بھلا یہ سب کیسے چھوڑ سکتی تھی۔ میں اس لگژری اپارٹمنٹ میں تنہا رہنے لگی۔

یہ ان دنوں کی بات ہے جب میں مسز جبار کے بوتیک میں بطور ڈیزائنر ملازم تھی۔ یہ بوتیک میرے اپارٹمنٹ سے قریب تھا، اسی بناء پر میں نے بوتیک میں ملازمت اختیار کر لی تھی۔ ورنہ پاپا کی جانب سے ہر ماہ

اتنی رقم میرے اکاؤنٹ میں آجاتی تھی جس سے میں اطمینان سے گزارہ کرسکتی تھی۔

چونکہ فیشن ڈیزائننگ میں چار سالہ ڈپلومہ لے رکھا تھا اور ذہن میں یہ بات تھی کہ کام کرنے سے کام میں نکھار آئے گا اور پھر گھر میں اکیلے رہ کر بوریت سے بچ جاؤں گی۔

بوتیک میں ایک اور ڈیزائنر لڑکی بھی تھی، بینا، خوشحال گھرانے سے تعلق رکھنے والی چار بڑے بھائیوں کی اکلوتی، لاڈلی بہن بینا شہزاد، شوخ و چنچل، لاابالی مگر ذہین ہرفن مولا میری کولیگ کم دوست زیادہ...... بینا۔

ہم دونوں نے ایک ہی جگہ سے ڈپلومہ لیا تھا ڈپلومہ حاصل کرنے کے بعد وہ فیصل آباد منتقل ہوگئی تھی جہاں اس کے چچا کی ٹیکسٹائل مل تھی وہاں وہ تھری پیس سوٹ کی ٹیکسٹائل ڈیزائننگ کرتی تھی مربہ لیمبرک، مربہ لان اس کا ڈیزائن کرنے کا انداز بڑا دلکش اور جدید تھا اس کے ڈیزائن کردہ ہر پرنٹ کا میں جوڑا بناتی تھی وہ اپنی متنوع مزاجی کی بدولت چچا کی فیکٹری سے بھاگ آئی اور مجھے جاب کرتے دیکھ کر اس نے بھی جھٹ سے اپنی خدمات مسز جبار کو پیش کردیں ایک تجربہ کار ٹیکسٹائل ڈیزائنر کی تو اشد ضرورت تھی لہٰذا فوراً جاب مل گئی۔

بینا کے گھر کا فاصلہ بوتیک سے بہت ہی زیادہ تھا شام میں اکثر و بیشتر وہ میرے اپارٹمنٹ میں آجایا کرتی تھی اور پھر وہ ایک دن میرے یہاں قیام کرکے اپنے گھر جاتی تھی کیونکہ اس جیسی غیر مستقل مزاج لڑکی کے لئے قطعی مشکل بات تھی کہ وہ روزانہ گھر سے بوتیک تک گھنٹہ، ڈیڑھ گھنٹہ کی ڈرائیو کرکے آئے اور پھر بینا کے گھر والے بھی میرے پس منظر سے بخوبی واقف تھے اس لئے اس پر کوئی روک ٹوک نہیں تھی۔

بہت ہی اچھے دن گزر رہے تھے۔ جب بینا نے گڑبڑ شروع کی اور جس کے نتیجے میں اسے اپنی جان سے گزرنا پڑا۔ اتوار والے دن، میں اپنی نگرانی میں ملازمہ سے صفائی کروایا کرتی تھی اس اتوار کی صبح بھی میں اپنی ملازمہ کے ساتھ مصروف تھی کال بیل بجی، جا کر دیکھا تو بینا ٹوتھ پیسٹ کا اشتہار بنی کھڑی تھی اور مسکرا رہی تھی جب وہ اندر آئی تو میں نے دیکھا وہ ایک بڑا سا بیگ کھینچتی ہوئی اندر لا رہی تھی۔

''یہ کیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''میرا سامان ہے۔ میں تمہارے یہاں شفٹ ہو رہی ہوں۔ میرے گھر والے ایک شادی میں شرکت کرنے اسلام آباد جا رہے ہیں۔ میرا جانے کا موڈ نہیں تھا اس لئے تمہارے پاس آگئی۔''

''یہ تو بہت مزے کی بات ہوئی۔'' میں نے خوشی کا اظہار کیا۔ لیکن شام کو جب ہم ٹیرس پر بیٹھے چائے پی رہے تھے، وہ ہچکچاتے ہوئے کہنے لگی۔

''سنو! کشمی میری یہاں شفٹ ہونے کی وجہ ایک اور بھی ہے تم تو جانتی ہو کہ مجھے پراسرار علوم یا جادو کہہ لو۔ سیکھنے کا کتنا شوق ہے سمجھو کہ وہ شوق اب پورا ہونے لگا ہے مجھے میرا مطلوبہ بندہ مل گیا ہے جو کہ مجھے جادو سکھائے گا۔ اپنے گھر تو میں یہ نہیں کرسکتی تھی مما، پاپا بڑے سخت مزاج رکھتے ہیں نا...... اس لئے میں نے سوچا کیوں ناں تمہارے پاس منتقل ہو جاؤں۔''

''بینا! تم تنگ کر کوئی اچھا سا کام کرو، یہ کن چکروں میں پڑنے لگی ہو اور مجھے تو ان چیزوں پر یقین بھی نہیں What the hell''

میں نے ناک چڑھا کر کہا تو وہ مسکرا اٹھی اور بولی۔ ''تم کو یقین نہیں مجھے ہے، بس تم مجھے اب نصیحتیں کرنے کی کوشش مت کرنا، تم جانتی ہو کہ جو میں کرنا چاہتی ہوں کر گزرتی ہوں کوئی مجھے میرے ارادے سے روک نہیں سکتا۔''

بینا نے اپنا سامان لاؤنج کے کونے والے کمرے میں سیٹ کرلیا۔ اس کے سامان میں عجیب عجیب سی چیزیں تھیں مثلاً لالٹین، پتھر کی مورتی، دھونی دینے کے لئے برتن جانوروں کے مجسمے، سیاہ لباس اور موٹے موٹے موتیوں کی مالا۔ شام کے بعد اس نے اپنی تیاری مکمل کی یعنی کاندھے سے ٹخنوں تک سیاہ لبادے میں وہ ملبوس ہوگئی گلے میں مالا ڈالی اور کہیں چلی گئی وہ روزانہ

رات آٹھ بجے گھر سے نکلتی اور پھر گیارہ بجے لوٹتی اس کا کہنا تھا کہ وہ اپنے استاد کے پاس جاتی ہے ایک دن میں نے بھی اس کے ساتھ جانے پر اصرار کیا تو وہ مجھے اپنے ہمراہ لے گئی...... جگمگاتی سڑکوں کو چھوڑ کر وہ گاڑی کو ایک کم آبادی والے علاقے میں لے آئی یہ علاقہ غریب طبقے کی نمائندگی کر رہا تھا بینا نے ایک شکستہ سے دو منزلہ مکان کے سامنے گاڑی پارک کی اور مجھے لیئے اس مکان میں داخل ہوگئی۔ کمرہ کافی کشادہ تھا غالباً یہ نشست گاہ تھا کیونکہ بڑی ترتیب سے تین چار صوفے رکھے ہوئے تھے کمرے کی ایک جانب ایک بت رکھا ہوا تھا اور اس کے سامنے اگر بتیاں جل رہی تھیں۔

''یہ تو کسی ہندو کا گھر معلوم ہوتا ہے۔'' میں نے بینا سے کہا۔

''تمہارا اندازہ ٹھیک ہے، میرے استاد سنیل اویناش ہندو ہیں۔''

''کیا...... تم ہندو کے پاس آتی ہو۔ یعنی کہ......''

''ہاں تو کیا ہوا......'' بینا کا اطمینان قابل دید تھا۔

''بینا! میں نے سنا ہے ہندوؤں کا جادو کالا ہوتا ہے کیونکہ وہ شیطانوں کی پوجا سے سیکھا جاتا ہے یعنی تم شیطان کی پوجا کرنے لگی ہو۔''

''کیا بکواس کر رہی ہو کشمی'' بینا برہم ہوگئی اور غصے سے بولی ''دنیا میں ہر قسم کا علم ہے جادو سیکھنا بھی ایک علم ہے یہ الگ بات ہے کہ ہمارے قدامت پرست معاشرے میں اسے تنگ نظری سے دیکھا جاتا ہے اور برا سمجھا جاتا ہے جبکہ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔''

''بینا یہ حرام ہے اور ہمارا مذہب ایسا کرنے سے منع کرتا ہے۔'' میں نے سمجھانے کی کوشش کی۔

''حرام تب ہوگا جب میں اس علم کے ذریعے کسی کو بلاوجہ نقصان پہنچاؤں یا تکلیف دوں اچھا اب خاموشی سے یہیں بیٹھی رہنا میں اویناش جی کے پاس جا رہی ہوں۔''

میں چپ چاپ بیٹھی رہی بینا کے واپس آنے تک، خلاف توقع بینا بہت جلد لوٹ آئی اس نے اپنے ہاتھ میں ایک موٹی اور سالخوردہ سی کتاب پکڑ رکھی تھی۔

''چلو کشمی! آج اویناش جی نہیں ملے۔ واپس چلتے ہیں اب شاید دوبارہ آنا بھی نہ ہو۔''

میں سمجھی کہ شاید اس کے دماغ میں میری بات آگئی ہے، میں خوش ہوگئی مگر یہ خوشی اس وقت کافور ہوگئی جب وہ مزید شدت سے اپنے معمولات میں مصروف عمل ہوگئی اور اس نے ہندو عالم اویناش کے یہاں جانا چھوڑ دیا۔

ایک دن اس نے عجیب سے انداز میں مجھ سے کالے بکرے کا ایک پیالہ خون طلب کیا مارے دہشت کے میں بوکھلا اٹھی گھبرا کر بینا کا چہرہ دیکھا کہ کہیں اس کا دماغی توازن تو نہیں بگڑ گیا مگر اس کے چہرے پر گہری سنجیدگی طاری تھی جدید تعلیم یافتہ ماڈرن زمانے کی لڑکی اور یہ مطالبہ، مجھے غصہ آگیا میرا دماغ سنسنا رہا تھا میں سکتے کے عالم میں کھڑی تھی کہ اچانک میں اس پر برس پڑی۔

''بینا یہ کیا واہیات ہے تم کیا کرنا چاہتی ہو۔''

''ریلیکس کشمی! میں نے کوئی ایسی بھیانک اور ناقابل حصول چیز کا تو نہیں کہہ دیا کہ تم حیران ہو جاؤ۔..... دیکھو بندوبست تو میں خود بھی کرسکتی ہوں لیکن میں ایک عمل میں مصروف ہوں باہر نہیں نکل سکتی۔''

میں نے بینا کو انکار کر دیا جواباً اس نے دھمکی دی۔ وہ بصورت دیگر مجھ سے دوستی کا ناطہ ہمیشہ کے لئے توڑ دے گی اور میں بے بس ہوگئی۔ بینا کی بلیک میلنگ کے آگے ایک اسی کا تو آسرا اور ساتھ ہے جس کی بدولت میں اب تک ہنستی مسکراتی رہتی ہوں اگر وہی مجھ سے روٹھ گئی تو میں کیا کروں گی نا چاہتے ہوئے بھی مجھے اس کا کہنا ماننا پڑا۔

محلے کے ایک قصائی سے میں نے بات کی اس سے ایک کالا بکرا خرید کر ذبح کروایا اور مطلوبہ مقدار میں خون حاصل کیا قصائی کی مشکوک نگاہیں مجھے گھورتی رہیں وہ بہت کچھ کہنا چاہتا تھا مگر میری سرد مہری اور زیادہ مطلوبہ رقم اور پھر گوشت کی بھی طلب نہیں تھی سارے کا

سارا بکرا قصائی نے لیا بہرحال بینا اپنا مطالبہ پورا کروا کر خوش ہوا ٹھی۔

اس بات کو کئی دن گزر گئے کہ ایک دن میں نے یونہی بینا کے کمرے میں جھانک کر دیکھا تو مجھے کمرے کی دیواروں پر سیاہی مائل سرخ لکیروں سے جابجا انسانی کھوپڑیاں بنی نظر آئیں۔ گئی تو وہ ڈیزائنر اس لئے اس نے اسکیچز نہایت شاندار بنائے تھے لیکن وہ خون سے بنے ہوئے تھے میں مزید ٹھہر نہ سکی اور پلٹ آئی..... دل چاہ رہا تھا بینا کو ان سارے کاموں سے روک دوں لیکن میں جانتی تھی وہ نہیں مانے گی ضد کی بہت پکی ہے بلکہ الٹا مجھ سے ناراض ہو جائے گی اس لئے میں نے اپنے ہونٹ سی لئے اور اس کے معمولات دیکھتی رہی ایک دن وہ کہنے لگی۔

''مجھے انسانی کھوپڑی کی ضرورت ہے۔'' میں سہم گئی پھر سوچنے لگی کہ اسے تو سمجھانا فضول ہے اس لئے چپ رہنا چاہئے۔

''چلو چل کر لے آتے ہیں.....'' اس نے گاڑی کی چابیاں اٹھاتے ہوئے اطمینان سے کہا۔ گویا وہ کسی سافٹ ویئر پروگرام کو خریدنے کی بات کر رہی ہو۔ میں مجبوراً اس کے ساتھ چل پڑی۔

گاڑی مختلف سڑکوں پر دوڑ رہی تھی پھر اس نے آبادی سے دور ایک سنسان ویران سڑک پر گاڑی ڈال دی ذرا دیر بعد اس نے گاڑی روک دی میرے بائیں جانب ایک قبرستان تھا بینا نے بہت اطمینان سے داخلی دروازہ تلاش کیا اور مجھے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کرتی ہوئی اندر داخل ہو گئی۔

''کیا بات ہے بی بی؟'' گیٹ کے قریب بنے کوارٹر کے سامنے بچھی چارپائی پر بیٹھا ایک سیاہ رو شخص اٹھ کر ہماری سمت آ گیا میں ٹھہر گئی مگر بینا آگے بڑھتی چلی گئی۔

''کیا کام ہے آپ کو......'' اس نے دوبارہ پوچھا۔ غالباً وہ قبرستان کے انتظامی امور کا نگراں تھا۔

''وہ ہم فاتحہ پڑھنے آئے ہیں'' بوکھلاہٹ میں مجھے کچھ نہ سوجھا یہی کہہ دیا اتنے میں بینا لوٹ آئی اور اس سیاہ رو شخص پر برہم ہونے لگی۔

''بے وقوف آدمی کیا بکواس کرنے لگے ہو میں تم سے بات کر کے تو گئی تھی'' سیاہ رو آدمی سٹپٹا گیا بینا کی ہدایت پر وہ آگے بڑھا کچھ دیر بعد وہ ایک غیر پختہ شکستہ قبر کھود رہا تھا ہم دونوں اس کے سامنے کھڑی تھیں قبرستان کا سناٹا ہولناک تھا دل ہول رہا تھا خوف کی وجہ سے میں جیسے جم سی گئی تھی۔ قبرستان کے پیڑ پودے اور جھاڑیاں مہیب شکل اختیار کر چکے تھے اندھیرا اب پھیلنے لگا تھا قبرستان کی ہولناکی ہر طرف گھپ اندھیرا جھینگروں کی اکھتی بیٹھتی آوازیں ایک چھوٹی لالٹین کی ناکافی روشنی جو کہ اندھیرے پر مسلط ہونے کے بجائے اندھیرے نے اسے اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا میرا دل بے قابو ہو کر سینے سے نکلنے کو بے قرار تھا کاٹو تو جسم میں خون نہیں گورکن کی تجربہ کاری کام آ رہی تھی اور وہ نڈر ہو کر اپنے کام میں مصروف تھا قبر کھلنے پر اندر ایک انسانی ڈھانچہ لیٹا نظر آیا مجھ سے دیکھا نہ گیا میں پیٹھ موڑ کر کھڑی رہی۔

بینا اپنی مطلوبہ چیز لے کر لوٹ آئی۔ وہ بے حد خوش تھی کہنے لگی ''جانتی ہو میں ایسا منتر سیکھ رہی ہوں جس کی بدولت مجھے لوگوں کے دماغ و جذبات پر چھا جانے کی صلاحیت آ جائے گی اور میں اس کا استعمال کروں گی'' میں نے دل میں سوچا کہ بینا تو اتنی حسین اور دلربا ہے کہ تیرا حسن ہی کافی ہے کسی کو اپنا اسیر بنا لینے کو...... پھر ایسا کیوں کر رہی ہے؟

لیکن وہ اپنے حال میں مست تھی اور اس کے گھر والے بے خبر...... ایک دن میں نے اس کے کمرے میں جھانکا تو کپکپا کر رہ گئی عجیب بدہیئت ڈراؤنی تصویریں اس نے دیواروں پر آویزاں کر رکھی تھیں۔ تپائی پر کھوپڑی رکھی ہوئی تھی شیشے کی بوتل میں بکرے کا خشک خون دکھائی دے رہا تھا اور بینا خود کسی شے کا دھواں کیئے کچھ پڑھے جا رہی تھی سچ تو یہ تھا کہ میں خوفزدہ ہو کر سخت دلبرداشتہ ہو رہی تھی۔ جی چاہتا تھا کہ اسے اپنے گھر سے

نکال باہر کر دوں لیکن دوستی کا خیال آڑے آ رہا تھا اور میں صبر کرنے پر مجبور تھی۔

دو دن بعد کا ذکر ہے۔ رات تین بجے علی کی کال لندن سے آنے والی تھی۔ میں پونے تین بجے اپنے بیڈ روم سے نکل کر لاؤنج میں فون کے قریب صوفے پر بیٹھ کر انتظار کرنے لگی۔ میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ خوف نے مجھ پر اپنا تسلط جما رکھا تھا بیٹھنے کے فوراً بعد مجھے بے چینی سی محسوس ہونے لگی عجیب سی سڑاند بدبو کا احساس ہو رہا تھا فضا بھی دھواں سی لگی۔ میں بے چین ہو کر اٹھ کھڑی ہوئی سوچا کہ بینا سے معلوم کروں۔ اس سے پہلے کہ میں قدم بڑھاتی...... خوف و دہشت سے اپنی جگہ منجمد ہو کر رہ گئی...... ایک بغیر سر کا ڈھانچہ فضا میں تیرتا ہوا بینا کے کمرے میں داخل ہو گیا۔ اس کے داخل ہوتے ہی ایک تیز چنگاڑ سنائی دی۔

''ملعون لڑکی تو نہیں جانتی کہ میں کون تھا، میری کیا طاقت تھی۔ اپنے وقت کا بہت بڑا جادوگر تھا۔ میں کئی سو سال زندگی کا سفر طے کیا اور جب تھکا تو آرام کرنے کے لئے خود کو قبر میں سلا لیا۔ لیکن بدبخت لڑکی تو نے اس کمزور لمحے کا فائدہ اٹھا لیا جس وقت قبر کھودی گئی اس وقت میری روح قبر میں موجود نہیں تھی ورنہ تیرا اور قبر کھودنے والے کا حال لوگوں کے لئے عبرت بن جاتا اس لمحہ میں تو نے میری کھوپڑی دھڑ سے علیحدہ کر لی۔ تجھے یہ بہت مہنگا پڑے گا تو اپنی جان سے جائے گی تو میرا دماغ اپنے قابو میں کر کے زیادہ دن جی نہ پائے گی۔''

''بہت دھمکیاں سن لیں میں نے......'' یہ بینا کی گرجدار آواز تھی وہ کہہ رہی تھی۔ ''میں صرف اتنا جانتی ہوں کہ تیری کمزوریاں میرے پاس ہیں اور تو بڑا بے بس ہے لہٰذا اب اپنے تمام ساحرانہ علوم میرے ذہن میں منتقل کر دے کہ اس کے علاوہ تیرے پاس کوئی راستہ نہیں ہے۔ میری بات نہ مان کر تجھے اذیت بھگتنا پڑے گی اس کے بعد اچانک گہری ہولناک خاموشی چھا گئی...... میں تیورا کر گری اور بے ہوش ہو گئی۔

ہوش آیا بینا کی آواز سن کر آیا۔ وہ میرے سرہانے بیٹھی کہہ رہی تھی۔ ''دلشی! میں جس مقام پر کھڑی ہوں اس سے پیچھے نہیں ہٹ سکتی۔ میں نے ایک بڑے جادوگر کی مردہ روح کو اپنے قابو میں کر لیا ہے اب مجھے اپنی منزل تک پہنچنے کے لئے تھوڑا وقت لگے گا۔ پلیز! تم ذرا سا تعاون مزید کر لو...... اور مجھے یقین ہے کہ میری محنت رنگ لے آئے گی۔''

وہ مطمئن تھی، اٹھ کر چلی گئی، علی الصباح جب کہ وہ سو رہی تھی میں نے اس کے نام پر ایک پرچہ لکھا اور جلدی جلدی میں اپنا بیگ تیار کیا اور دوسرے شہر پاپا کے پاس جانے کے لئے تیار ہو گئی...... مجھے اپنا گھر شیطان کا گھر لگنے لگا تھا۔ اس گھر کو نہ چھوڑ کر میں اکیلی رہ گئی تھی اور آج یہی گھر میری عزیز ترین دوست نے شیطانیت کی بھینٹ چڑھا دیا تھا۔ میرا دم گھٹ رہا تھا پاپا کے پاس پہنچ کر میں اپنے سوتیلے بھائی بہنوں کی معصوم شرارتوں میں گم ہو گئی تو تھوڑا جی بہلا۔ وحشت انگیز خیالات سے چھٹکارا ملا تو بینا سے نفرت بھی محسوس ہونے لگی تھی۔

تقریباً دو ہفتے بعد اچانک بینا کی والدہ کا فون آیا کہ بینا دنیا سے چل بسی ہے۔ کشمالا بیٹا اس کا آخری دیدار کرنا ہے تو آ جاؤ۔ میں فوراً چلی آئی بینا کی والدہ سے ملی ان کے مطابق تیرہ دن پہلے بینا گھر واپس آ گئی تھی اور خلاف معمول بے حد مسرور دکھائی دیتی تھی عادت کے مطابق وہ کمرے میں ہی محدود رہی۔ ایک رات وہ کافی بنانے کچن میں گئی اسے خبر نہ تھی کہ گیس میں لائن لیک ہو رہی تھی جیسے ہی لائٹر جلایا۔ آگ نے اسے فوراً اپنی لپیٹ میں لے لیا اور وہ جانبر نہ ہو سکی۔

میں نے بینا کا مردہ چہرہ دیکھا تو وہ چاند پری چہرہ جل کر سیاہ ہو گیا تھا۔ میرا دل گواہی دینے لگا کہ یہ کوئی اور معاملہ ہے گیس کی تو محض بہانہ ہے۔ لیکن مجھے بینا کی

موت کا کوئی دکھ نہیں تھا میرے خیال میں اس کا مر جانا ہی بہتر تھا۔ وہ پوری طرح خود کو شیطانی چکروں میں پھنسا چکی تھی وہ ایک خطرہ ثابت ہو سکتی تھی تاہم میں یہ جاننے کے لئے بے چین تھی کہ بینا کی موت کا اصل سبب کیا تھا۔ بالآخر اس راز سے پردہ اٹھ گیا بینا کے موبائل فون میں اس کے ہندو استاد اویناش کا نمبر محفوظ تھا میں نے فون پر رابطہ قائم کر کے اسے بینا کی موت سے آگاہ کیا تو جواباً وہ بولا۔

''میں اس کے انجام سے واقف تھا جبکہ میں نے اسے روکنے کی کوشش بھی کی تھی یہ ٹھیک ہے کہ میں کالا علم جانتا ہوں لیکن میں نے جوڑ توڑ کی آگاہی بھی حاصل کی ہے وہ اپنے بچاؤ کی تدبیر سے ناآشنا تھی لیکن اس لڑکی کے عزائم کچھ اور تھے۔''

میں تفصیلات جاننے کے لئے بے چین تھی لہذا وقت لے کر اس کے پاس پہنچ گئی۔ اویناش حلئے سے کافی معقول شخص دکھائی دیتا تھا اس نے مجھے جو تفصیل بتائی وہ یہ تھی۔

''میں اپنا علم کسی کو سکھاتا نہیں لیکن آپ کی دوست بینا نے بہت اصرار کر کے مجھے اس بات پر مجبور کیا کہ اپنے علم کا تھوڑا حصہ ہی سہی لیکن سکھا ضرور دیں۔ میں نے آمادگی ظاہر کی تو وہ روز میرے پاس آنے لگی اس نے کالا جادو سیکھنے کے تمام اصول اپنائے کالی دیوی کی پجارن بن گئی۔ ایک ماہ گزر گیا ایک دن اس کے آنے کے وقت مجھے کسی ضروری کام سے باہر جانا پڑا اور اس نے میری عدم موجودگی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے میرے گھر میں بنے مندر سے وہ کتاب چرالی جو ہمارے آباؤ اجداد سنبھالتے چلے آرہے تھے۔ یہ کتاب مختلف کالے علوم سے متعلق تھی مجھے کتاب کی چوری کا علم نہ ہو سکا پھر اس نے میرے پاس آنا ترک کر دیا وہ کتاب کے منتروں کا جاپ کرنے لگی جس سے اس کے اندر چند شکتیاں آگئی تھیں جو کہ بڑے جادوگروں کو حاصل ہوتی ہیں لیکن اس نے بس نہ کیا اور بڑے بڑے جادوگروں کی روحیں قید کر کے ان سے علوم کا ذخیرہ جمع کرتی گئی جانے کیوں وہ ایسا کر رہی تھی۔ جب وہ اس قدر شکتیاں حاصل کر چکی تھی تو اسے محتاط بھی رہنا تھا۔ بے شمار روحیں اس کی تابعدار تھیں ان روحوں کی تابعداری اس طرح قائم رہتی ہے کہ ہر ماہ چودھویں کے چاند کی روشنی میں ایک مخصوص جاپ کرنا ہوتا ہے وہ پابندی سے یہ جاپ کرتی تھی مگر اس دن بھول گئی کیونکہ اس کا بھتیجا کچھ بیمار تھا اور وہ اسے اپنے منتروں کے چمکار سے ٹھیک کرنا چاہتی تھی اس مصروفیت کے دوران وہ بھول گئی اور اس طرح چودھویں چاند کی رات گزر گئی اور جب دن بھی گزر گیا تو اس کی غلام روحیں آزاد ہو گئیں اور اس پر یلغار کر دی اور شعلوں سے اسے جلا ڈالا موت کی وجہ بظاہر گیس کی لیکیج بنی۔''

ساری کہانی سن کر میں دکھی اور غمزدہ ہو گئی ایک اچھی سہیلی سے ہاتھ دھونے کا دکھ مجھے بہت تھا اور لاکھ ضبط کے باوجود میری آنکھوں سے آنسو نکل کر گالوں پر ڈھلک پڑے۔ کچھ دیر بعد اویناش کی آواز سنائی دی۔ ''کتاب کی چوری معلوم ہو جانے کے بعد میں نے اسے سمجھانے کی بہت کوشش کی مگر وہ ضد کی پکی تھی، نہ مانی۔''

اویناش کے آخری جملے سے اتفاق کرتے ہوئے میں وہاں سے چلی آئی۔ اتنی پیاری دوست کی عبرت ناک موت پر مجھے افسوس تھا۔ کاش وہ غلط چکروں میں نہ پڑتی اور ہمیشہ کی طرح خوش و خرم زندگی گزارتی...... بھلا کس چیز کی کمی تھی اسے...... دنیا کی ہر نعمت تو حاصل تھی لیکن واقعی جب انسان کے دماغ میں کسی چیز کا بھوت سوار ہو جائے تو وہ اپنا کام پایۂ تکمیل تک پہنچا کر ہی رہتا ہے۔ چاہے اس کا جانی نقصان ہی کیوں نہ ہو...... کاش کہ ہر انسان اگر اپنے ذہن میں اچھے کام کرنے کا بھوت سوار کر لے تو تب کتنا اچھا ہو۔



خونی پیاس

صبا ملک



میں نے بہت ساری طاقت، ذہانت حاصل کرنے کے لئے ایک کام کیا۔ وہ کام کیا ہے؟ میں نے خون پیا انسانی خون میٹھا، پرلطف، نشہ طاری کرنے والا، سرخ گاڑھا اور لذیذ خون......

سحر آج کل انتہائی پریشان تھی۔ وجہ بھی بہت معقول تھی کیونکہ اس کی کلاس فیلو ماہم جس کا شمار درمیانے درجے کے اسٹوڈنٹ میں ہوتا تھا۔ کوئی خاص ذہین نہ تھی جبکہ سحر پوزیشن ہولڈر تھی شروع سے لے کر اب تک اس نے ہر کلاس میں پوزیشن حاصل کی۔ اب وہ FA کے سال اول میں تھی اور امتحانوں میں اس نے خوب محنت کی۔ سحر کو یقین تھا کہ وہ ہمیشہ کی طرح اس سال بھی فرسٹ آئے گی مگر......؟ جب نتیجہ نکلا تو ماہم فرسٹ اور سحر نے سیکنڈ پوزیشن حاصل کی۔ یہی بات سحر کے لئے باعث پشیمانی تھی اور حقیقت جاننا چاہتی تھی کہ اصل Reason کیا ہے؟

سحر کے ذہن میں آیا کہ کیوں نہ میں ماہم کے قریب ہو جاؤں اور پھر اس خیال کے تحت ماہم سے سحر نے دوستی کرنے کا سوچا! ماہم خود بھی سحر جیسی خوبصورت، ذہین اور امیر لڑکی سے دوستی کی خواہاں تھی لہذا چند ہی دنوں میں سحر سے ماہم کی بے تکلف ہو گئی بلکہ اس سے ہر بات شیئر کرنے لگی۔

آج ان کی دوستی کو شروع ہوئے تیسرا مہینہ تھا اور گرمیوں کی چھٹیاں ہونے والی تھیں۔ لہذا اشہر نے دل کی بات عیاں کرنے کا سوچا۔ اس وقت دونوں کالج کینٹین میں بیٹھی چائے اور سموسے کھا رہی تھیں۔

''ماہم ایک بات تو بتاؤ؟'' سحر بولی۔

''ہاں...... ہاں پوچھو؟'' ماہم نے جواب دیا۔

''ماہم دراصل بات یہ ہے کہ...... وہ...... میں......!'' سحر کو سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ کس طرح بات کو شروع کرے؟

ماہم نے حیرت سے سحر کو دیکھا جو نجانے کیا کہنے کی کوشش میں ہچکچا رہی تھی، اس نے اپنے ہاتھ آگے بڑھائے اور سحر کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں کی گرفت میں لے کر پوچھا۔ ''کیا بات ہے؟ جو بھی کہنا ہے بالکل بے تکلف ہو کر کہو، میں تمہاری دوست ہوں کوئی غیر نہیں؟''

''دراصل میں یہ پوچھنا چاہتی ہوں کہ...... تم پہلے کوئی خاص ذہین، پڑھاکو قسم کی نہ تھی اور نہ ہی تم نے کبھی کوئی پوزیشن حاصل کی! پھر اچانک یہ انقلاب کیسے؟ کہ تم نے فرسٹ پوزیشن حاصل کر لی؟'' سحر نے اپنی بات ختم کرتے ہوئے ماہم کے چہرے پر سوالیہ نگاہیں مرکوز کر دیں۔

ماہم جو سحر کی بات اطمینان سے سن رہی تھی۔ اس نے سحر کے دونوں ہاتھ چھوڑ دیئے اور کچھ سوچنے لگی۔

ماہم ایک شرارتی اور شوخ سی لڑکی تھی مگر اس وقت وہ بہت سنجیدگی سے کچھ سوچ رہی تھی، وہ کچھ الجھن میں بھی مبتلا تھی جیسے کچھ کہنے اور نہ کہنے کی کشمکش میں مبتلا ہو پھر اچانک وہ ایک فیصلے پر پہنچی اور سحر کی طرف دیکھ کر بولی۔

''سحر میں جانتی ہوں تھی کہ تم یہ بات ضرور پوچھو گی۔ مگر ہماری تین ماہ کی دوستی کے درمیان تم نے کوئی سوال نہ کیا تو میں مطمئن ہو گئی مگر اب تم نے پوچھ لیا۔ تم میری دوست ہو میں تم سے جھوٹ نہیں بولوں گی۔ لہٰذا آج تمہیں سچی حقیقت بتا دیتی ہوں...... مگر کسی سے اس بات کا ذکر مت کرنا۔'' یہ کہہ کر ماہم نے سر کو ایک دفعہ پھر نیچے جھکا لیا جبکہ سحر بے چینی سے کچھ سننے کے لئے منتظر بیٹھی رہی۔

جونہی ماہم نے سر اٹھایا تو سحر کچھ حیران ہوئی کیونکہ ماہم کی آنکھیں انتہائی سرخ ہو رہی تھیں اور اس کا چہرہ بھی لال بھبھوکا ہونے کا منظر پیش کر رہا تھا۔ پھر ماہم بولی تو اس کی آواز ہلکی سی بھاری تھی۔

''سحر تم جاننا چاہتی ہو میری کامیابی کی کیا وجہ ہے؟ تو سنو! میں نے بہت ساری طاقت، ذہانت حاصل کرنے کے لئے ایک کام کیا۔ ایسا کام جس سے مجھے بہت ساری ذہانت ملی اور پتہ ہے وہ کام کیا ہے؟ میں نے خون پیا انسانی خون میٹھا، پرلطف، نشہ طاری کرنے والا، سرخ گاڑھا اور لذیذ خون، یہ کہہ کر ماہم بڑی گہری معنی خیز مسکراہٹ مسکرانے لگی۔

پھر بولی۔

''اور ہاں! آگے کی بھی سنو! میں پوزیشن حاصل نہ کرنے کی صورت میں بہت پریشان تھی کہ اچانک ایک دن میری ملاقات ایک پنڈت سے ہوئی، میں پریشان تو تھی ہی اور میرے چہرے سے پریشانی عیاں تھی۔ پنڈت بولا۔ ''بالکے تو بہت پریشان لگتی ہے، کارن کیا ہے؟ بول ڈر نہیں، ہو سکا تو میں تیری مدد ضرور کروں گا، ایشور کا کہنا ہے کہ پریشان آدمی کی پریشانی دور کرو، اگر تمہارے میں طاقت ہے تو۔''

پنڈت کی بات سن کر میں کچھ دیر سوچتی رہی کہ یہ پنڈت رحم دل لگتا ہے، ہو سکتا ہے کہ میری پریشانی کا کوئی حل بتا دے لہٰذا میں بولی۔ ''دراصل میں پڑھائی میں کمزور ہوں، جب رزلٹ نکلتا ہے تو میری بڑی شرمندگی ہوتی ہے، میں کوئی پوزیشن نہیں لے پاتی، میری خواہش ہے کہ اوروں کی طرح میں بھی فرسٹ پوزیشن حاصل کروں اور اس وجہ سے روز بہ روز میری پریشانی میں اضافہ ہو رہا ہے۔''

میری باتیں سن کر پنڈت کچھ دیر خاموش رہا۔ پھر بولا۔ ''بالکے پریشان نہ ہو تیرا کام ہو جائے گا۔ کل تو فلاں جگہ میرے پاس آ نا، اب تو خوش ہو جا تیری اچھا پوری ہو گی۔ تو اپنے مقصد میں بالکل کامیاب ہو گی۔''

میں دوسرے دن بتائے ہوئے پتہ پر پنڈت کے پاس پہنچ گئی۔ پہلے تو پنڈت مجھے سمجھاتا رہا۔ پھر بولا۔ ''بالکے تجھے انسانی خون پینا پڑے گا، تب تیرا دماغ کھلے گا، تیری ذہانت بڑھ جائے گی اور اس طرح تو اپنے

مقصد میں کامیاب ہو جائے گی۔''

پنڈت کی باتیں سن کر میں چونک پڑی میرے چہرے پر پسینہ آ گیا۔ میں گھبراہٹ میں بولی۔ ''پنڈت جی، میں انسانی خون کہاں سے لاؤں گی یہ میرے بس کی بات نہیں۔ میں یہ کبھی بھی نہیں کر پاؤں گی آپ کے مشورے کا بہت بہت شکریہ۔''

پنڈت مسکرانے لگا اور بولا۔ ''بالکے چند دن کی بات ہے، تو پریشان نہ ہو، انسانی خون کا انتظام میں کر دوں گا۔ بس تو میرے پاس آتی رہنا۔''

میں پنڈت کے پاس جانے لگی۔ روزانہ پنڈت مجھے انسانی خون پلاتا۔ شروع میں تو مجھے بہت کراہیت اور ابکائی سی لگی۔ مگر مرتا کیا نہ کرتا کے تحت میں یہ کڑوا گھونٹ پیتی رہی اور اس طرح میرا دماغ کھلتا گیا یعنی میں نے پڑھائی کے معاملے میں اپنا مقصد پا لیا اور اب وہ پنڈت اچانک نہ جانے کہاں چلا گیا۔ جانے سے چند روز پہلے بولا۔ ''بالکے تیرا کام ہو گیا۔''

ماہم کی بات سن کر سحر پتھر کی ہو گئی۔ خوف، حیرت اور ڈر کی تیز لہر اس کے سارے بدن میں پھیل گئی۔ پھر جیسے ہی اسے ہوش آیا وہ کرسی سے اٹھی اور ماہم سے کوئی بات کیے بغیر کینٹین سے باہر نکل گئی اور دم بخود ماہم سحر کو دیکھتی رہ گئی۔

''خون...... خون...... خون......'' بس یہی لفظ اس کے ذہن میں گونج رہے تھے، وہ گھر پہنچی اور گھر کے اندر داخل ہوتے ہی وہ اچانک گر پڑی اور ہوش سے بیگانہ ہوتی چلی گئی۔

سحر کی آنکھ کھلی تو وہ اپنے بیڈ میں لیٹی تھی اور اس کے اردگرد اس کی والدہ والد، چھوٹی بہن شیری اور اس کا کزن حسن بھی موجود تھے۔ سبھی کے چہرے پر پریشانی کا اظہار کر رہے تھے لیکن جونہی سحر کی آنکھ کھلی تو سب مطمئن ہو گئے لیکن حسن کے چہرے پر الجھن جوں کی توں موجود تھی۔ جھٹ سے اس نے سحر سے پوچھا۔

''کیا ہوا تھا سحر؟ تم کیسے بے ہوش ہو گئی؟ بتاؤ کیا ہوا تھا؟'' حسن بہت بیقراری سے پوچھ رہا تھا جبکہ سحر کی والدہ نزہت اور والد علی عثمان زیر لب مسکرا اٹھے۔

حسن چچازاد کزن ہونے کے علاوہ سحر کا منگیتر بھی تھا۔ دونوں آپس میں بہت پیار کرتے تھے۔ حسن تعلیم کے سلسلے میں یہیں رہتا تھا وہ BSC کر رہا تھا۔

سحر نے حسن کی الجھن بھانپتے ہوئے خود کو نارمل پوز کیا اور بتایا۔ ''کچھ نہیں ہوا بس یونہی چلتے چلتے چکر آیا تو گر پڑی لگتا ہے بھوک زیادہ لگ گئی تھی'' جبکہ حسن کہنے لگا۔ ''ہاں تم بہت لاپرواہ ہو اپنا خیال رکھا کرو۔''

حسن کی بات پر سحر نے وعدہ کیا۔ ''آئندہ وہ اپنا خیال رکھے گی'' اس کے بعد شیری نے جلدی سے اس کے لئے سیب کا جوس منگوایا اور تاکید کی کہ سارا پینا ہے شیری سحر سے پانچ سال چھوٹی تھی۔

رات کے تقریباً 9 بج چکے تھے سحر کے کمرے سے ابھی ابھی سب لوگ اٹھ کر گئے تھے سحر کے والد ایک ٹیکسٹائل مل کے اونر تھے جبکہ اس کی والدہ نے شہر کے ایک مشہور بوتیک کو سنبھالا ہوا تھا جسے انہوں نے اپنی ذاتی محنت سے بہت اچھا بنا لیا تھا۔

حسن BSC کے سلسلے میں اپنے چچا علی عثمان کے گھر ٹھہرا ہوا تھا ویسے بھی علی عثمان حسن کو اپنے کاروبار میں شریک کرنا چاہتے تھے کیونکہ حسن کے والد کا بہت پہلے انتقال ہو گیا تھا تو حسن کے دادا کی دولت جس میں حسن کے والد اور علی عثمان کی وراثت تھی یہ بس دو بھائی تھے حسن کی والدہ علی عثمان کی بہت عزت کرتی تھیں۔ دونوں گھروں کی رضامندی سے حسن کے والد کی دولت کو حسن کے نام کرا دیا گیا جسے بعد میں حسن نے چچا کے کاروبار میں لگا دیا علی عثمان نے اس پیسے کو پوری ایمانداری سے استعمال کیا اور 50 فیصد کا حسن کو مالک بنایا۔ حسن اور سحر کی منگنی بڑوں کی مرضی سے طے ہوئی تھی مگر بعد میں دونوں کی پسند شامل ہو گئی۔ علی عثمان کی دو بیٹیاں تھیں سحر اور شاہینہ جسے پیار سے شیری کہتے تھے۔

ہوش میں آنے کے بعد سے ماہم کی باتوں پر سحر

محسوس کر رہی تھی۔ ''کیا واقعی ماہم نے خون پی کر سب کچھ حاصل کرلیا؟ ماہم ایسی لگتی تو نہیں؟ مگر؟ کیا پتہ اس نے ایسا کیا ہو؟'' سحر یہ سوچ کر دوبارہ سے خوفزدہ ہوگئی کہ ماہم نے انسانی خون پیا ہے۔ اپنا دھیان ہٹانے کے لئے اس نے ٹی وی آن کردیا جہاں پر اس کا پسندیدہ پروگرام چل رہا تھا۔ سو جلد ہی اس کا ذہن بٹ گیا پھر TV دیکھتے دیکھتے وہ نیند کی وادیوں میں گم ہوگئی اور گہری نیند سوگئی......!

سحر ایک ہفتہ تک کالج نہ گئی پھر ہفتہ کے بعد گرمیوں کی چھٹیاں ہوگئیں، 3 ماہ کی۔ سحر مکمل طور پر ماہم کے واقعے کو بھول گئی اور مزید اچھی پوزیشن حاصل کرنے کے لئے محنت کرنے لگی۔

یہ ایک خوبصورت شام تھی لان میں حسن اور سحر کے ساتھ شیری بھی بیٹھی تھی تینوں مل کر لوڈو کھیل رہے تھے۔ پھر تھوڑی دیر بعد شیری اٹھ کر اندر چلی گئی اتنے میں سحر کی والدہ اور والد بھی آ گئے۔ لگتا تھا کہیں جانے کی تیاری تھی؟

سحر سے اس کی والدہ نے کہا۔ ''تم اور حسن بھی چلو، آج عمران کے ہاں پارٹی ہے۔'' مگر سحر نے انکار کردیا کہ اسے ایسی پارٹیاں بور کرتی ہیں تو وہ دونوں ہنستے ہوئے چلے گئے جبکہ حسن مسکرا کر سحر کی طرف دیکھنے لگا۔

سحر نے اس سے پوچھا۔ ''کیوں جی آپ کے چہرے پر مسکراہٹ کیوں؟'' تو حسن نے جواب دیا۔ ''تم میری وجہ سے نہیں گئیں؟'' سحر پہلے تو ہنس پڑی پھر بولی۔

''جناب کو یہ خوش فہمی کب سے لاحق ہوگئی؟ مجھے اپنے کمپیوٹر کے کچھ ضروری نوٹس تیار کرنے ہیں اس لئے نہیں گئی؟'' یہ کہہ کر سحر جانے کے لئے اٹھ کھڑی ہوئی۔ حسن نے جلدی سے کہا۔ ''جھوٹی۔'' تو سحر ہنس کر اندر چلی گئی۔

اچانک شیری کی چیخ سنائی دی تو سحر بدحواس ہوکر شیری کے کمرے میں گئی۔ دیکھا تو شیری کی کلائی سے خون بہہ رہا تھا۔ سحر نے جلدی سے پوچھا۔ ''کیسے چوٹ لگی؟'' تو شیری نے کانچ کے شوپیس کی طرف اشارہ کیا۔ یہ ایک نازک خوب صورت سا شوپیس تھا جو کہ میز سے گر کر ٹوٹ گیا۔ شیری نے بتایا۔ ''اسے ٹھوکر لگی تو وہ میز سے ٹکرائی اور شوپیس سمیت وہ گر پڑی اور شوپیس ٹوٹ گیا اور شیشہ اس کی کلائی میں چبھ گیا۔'' شیری بری طرح رو رہی تھی۔

سحر نے جلدی سے فرسٹ ایڈ باکس لاکر اس کی بینڈ ایج کردی اور اسے نیند کی ٹیبلٹ دیدی جلد ہی شیری سوگئی بینڈ ایج کے بعد سحر نے اپنے ہاتھوں کی طرف دیکھا تو کچھ ڈر سی گئی کیونکہ شیری کی بینڈ ایج کرتے وقت خون اس کے ہاتھ پر لگ گیا تھا۔

''خون...... انسانی خون...... لذیذ خون'' رہ رہ کر یہی چند لفظ۔ پھر ایک جھماکہ ہوا، ماہم کی انگارہ آنکھیں اور بھاری آواز سحر کے ذہن میں گونجی۔ پھر متواتر یہ لفظ سحر کے ذہن میں گونجنے لگے۔ سحر جلدی سے اٹیچ باتھ روم میں ہاتھ دھونے کے لئے بھاگی۔ باتھ روم میں جاکر وہ رک گئی۔ سامنے آئینے میں سحر کا عکس نظر آرہا تھا۔ سحر بظاہر اپنے عکس کو دیکھ رہی تھی مگر اس کا دھیان ماہم کے جملوں پر تھا۔

''خون...... خون...... لذیذ خون...... جس سے میرا دماغ کھلتا چلا گیا مجھے بہت سی طاقتیں حاصل ہوئیں اور میں نے سب کچھ پالیا......!''

بے خیالی میں سحر نے اپنی ایک انگلی کو منہ میں ڈالا جہاں شیری کا خون لگا تھا۔

''اف! ایک تیز مہکی بو اور عجیب سا ذائقہ تھا، سحر کو ابکائی آنے لگی۔

''خون...... لذیذ خون...... جس نے مجھے بہت سی طاقت دی، ہاں خون انسانی خون۔''

سحر نے ایک دفعہ پھر ماہم کی باتوں کو یاد کیا اور بے اختیار اپنی انگلیوں کو منہ میں ڈالا پہلی دفعہ تو اسے کچھ برا لگا مگر جوں جوں اس نے ساری انگلیوں کو ایک ایک کرکے چوسا تو اسے بہت اچھا محسوس ہوا پھر جانے کیا ہوا سحر پر دیوانگی سی کیفیت طاری ہوگئی۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھوں کو بری طرح چاٹ ڈالا پھر وہ ایک جھٹکے سے باتھ روم کا دروازہ کھول کر باہر آگئی۔

شیری اپنے بیڈ پر نیند کی گولیوں کی وجہ سے بے سدھ سو رہی تھی۔ سحر آہستگی سے اس کی طرف بڑھی۔ کچھ دیر وہ شیری کو دیکھتی رہی پھر ہلکے سے اس کی بینڈ ایج کھولی۔ بینڈ ایج کھلنے کی دیر تھی کہ زخم کو بہنے کا راستہ مل گیا۔ آہستہ آہستہ خون پھر جاری ہوگیا۔ سحر نے دیوانوں کی طرح شیری کے زخم پر منہ رکھ دیا۔ شیری اب تک بے سدھ تھی اس بات سے بے خبر کہ کتنا ہولناک واقعہ اس کے ساتھ ہو رہا تھا! کچھ دیر بعد سحر نے اپنا چہرہ پیچھے کرلیا اس کے ہونٹ سرخ تھے خون سے سحر مسکرا رہی تھی انتہائی پراسرار طریقے سے جیسے اس نے بہت بڑا کام کردیا ہو پھر اس نے شیری کی بینڈ ایج کردی اور باتھ روم میں جاکر ہاتھ منہ دھوئے ایک اطمینان سا اس پر طاری تھا۔

حسن اس سارے واقعے سے بے خبر تھا اور وہیں لان میں بیٹھا اخبار پڑھ رہا تھا سحر اس کے پاس آکر بیٹھ گئی نجانے اس کے ذہن میں کیا سمائی کہ اس نے حسن کو کہا۔ ''میرے ساتھ مارکیٹ تک چلو۔'' حسن نے پوچھا۔ ''کچھ لینا ہے کیا؟''

سحر دراصل علم مسمریزم اور ٹیلی پیتھی کی شوقین تھی لہٰذا اس نے حسن سے کہا۔ ''کچھ ضروری کتابیں لینی ہیں۔'' حسن تو بیچارہ سحر کی ہر بات مانتا تھا سو اس وقت وہ اس کے ساتھ چل پڑا۔

رات کے 12 بج چکے تھے۔ سحر کی والدہ اور والد پارٹی سے واپس آچکے تھے جب انہیں شیری کا پتہ چلا تو وہ بہت پریشان ہوگئے جبکہ حسن پر حیرت کا دورہ پڑا کیونکہ اسے تو پتہ ہی نہیں چلا کہ یہ کیسے ہوا۔ اس نے سحر سے پوچھا تو سحر نے معذرت کے ساتھ سب کچھ بتادیا۔ حسن سحر سے کافی بددل ہوا کہ وہ اسے کچھ نہیں سمجھتی جبکہ سحر کو اس کی ناراضگی کا پتہ چل گیا۔ تو سحر نے بتایا کہ میں تمہاری پریشانی کی وجہ سے نہیں بتا سکی۔

والدہ بہت پریشان تھیں کیونکہ شیری چوٹ لگنے سے بہت کمزور سی لگ رہی تھی اس کا چہرہ زرد ہوگیا تھا جبکہ سحر پاس کھڑی تھی اصل حقیقت کا تو صرف اسے علم تھا۔

پھر وہ اپنے کمرے میں آگئی اور کتابیں دیکھنے لگ گئی یہ ٹیلی پیتھی اور علم مسمریزم کی بہت شاندار کتابیں تھیں سحر نے پڑھنا شروع کیا یوں آہستہ آہستہ وہ سب سے چھپ کر اپنی پریکٹس کرتی رہی۔

ماہم کی باتیں یاد آتیں تو سحر چونک پڑتی۔ اس کے ذہن میں تھا کہ کاش مجھے بھی کوئی پنڈت مل جائے جو کہ انسانی خون مہیا کرے اور پھر اس تگ و دو میں وہ ایک دن چھپ چھپا کر ایک مندر میں جا پہنچی یہ مندر شہر سے باہر تھا جہاں کہ ہندوؤں کی آبادی تھی۔ سحر نے من و عن ماہم کی کہی ہوئی ساری باتیں جو ان پنڈت کو بتادیں اور اپنی خواہش کا اظہار کیا۔

پنڈت تیز طرار گھاگ قسم کا چلتر آدمی تھا ساری باتیں سننے کے بعد اس نے فوراً سے پیشتر سارے اندازے لگا لئے اس کی آنکھوں میں تیز قسم کی چمک عود کر آئی اور اب زیر لب مسکرانے لگا۔ کچھ توقف کے بعد بولا۔ ''تمہاری سہیلی تم سے کچھ باتیں چھپا گئی اس نے آدھی بات تمہیں بتائی، دراصل انسانی خون پینا شروع کرنے سے پہلے کالی شکتیوں کا ایک جاپ کرنا پڑتا ہے اور یہ جاپ رات میں دو گھنٹے کا ہوتا ہے یہ جاپ تین رات کرنا لازمی ہے اس کے بغیر اثر نہیں ہوتا کیونکہ جاپ کی کالی شکتیاں ہی ذہن کی گتھی کو کھولتی ہیں اور آدمی ذہین ہوجاتا ہے۔ تمہیں فکر کرنے کی ضرورت نہیں جاپ مکمل ہونے کے چند دن تک انسانی خون کا انتظام میں کردیا کروں گا اور تم اپنے مقصد میں کامیاب ہوجاؤ گی۔ اگر تم بہتر سمجھو اور ضروری ہو تو کل رات دس بجے آجانا، میں تمہارا انتظار کروں گا کیونکہ یہ جاپ میری نگرانی میں میرے پاس کرنا ہوگا۔''

سحر خاموشی سے اٹھی اور گھر واپس آگئی۔ دن بھر اور پھر رات کے طویل پہر تک اس معاملے کے بارے

میں سوچتی رہی چونکہ اس کے دل و دماغ میں ذہین بننے اور دماغ کے تیز ہونے کا بھوت سوار ہو چکا تھا کہ اس نے اٹل فیصلہ کرلیا دوسرے دن کی رات دس بجے پنڈت کے پاس جانے کا، اس کا دل و دماغ مطمئن ہو چکا تھا وہ بستر پر لیٹ گئی اور پرسکون نیند سوگئی۔

دوسرے دن کے بعد رات دس بجے وہ اپنے گھر والوں سے کسی سہیلی کا بہانہ بنا کر پنڈت کے پاس پہنچ گئی۔ اسے دیکھ کر جوان پنڈت مسکرانے لگا پنڈت نے اسے ایک کڑوا سا مشروب پلایا پھر ایک جگہ بٹھا کر چند جنتر منتر کے عجیب الفاظ بتائے اور سحر بخوشی ایک طرف بیٹھ کر وہ الفاظ پڑھنے لگی۔

تھوڑی دیر ہی گزری تھی کہ سحر پر غنودگی طاری ہونے لگی اور پھر وہ ایک فرش پر ڈھلک کر دنیا و مافیہا سے بے خبر ہوگئی اور جب اسے ہوش آیا تو اس نے اپنے اندر ایک عجیب سی بے چینی محسوس کی اور پھر غور کرنے پر اسے پتہ چلا کہ وہ اپنی عزت گنواں چکی تھی۔ وہ سسک پڑی اور آنسو اس کی آنکھوں سے رواں ہوگئے۔ اس نے وہاں بیٹھ کر دیر تک پنڈت کا انتظار کیا مگر پنڈت نہ آیا۔

آنسو بہاتی ہوئی وہ اپنے گھر واپس آ گئی اس فیصلے کے ساتھ کہ وہ دوبارہ پنڈت کے پاس نہیں جائے گی۔

حسن دوسرے شہر اپنی والدہ سے ملنے چلا گیا۔ سحر حسب معمول اپنی ٹیلی پیتھی کی مشقیں کر رہی تھی مسمریزم کا علم اس نے بہت پہلے تھوڑا سیکھنا شروع کیا تھا مگر پھر چھوڑ دیا لہذا اس دفعہ سحر نے علم مسمریزم بہت جلدی سیکھ لیا اب وہ ٹیلی پیتھی پر دھیان دے رہی تھی۔

اچانک اسے شدید بے چینی محسوس ہوئی۔ پھر اس کو پیاس کی شدت محسوس ہوئی اس نے جلدی سے پانی پیا مگر کچھ افاقہ نہ ہوا تو جلدی سے کمرے سے باہر نکلی اس وقت گھر میں صرف وہی تھی شیری اپنے اسکول گئی ہوئی تھی اور والدین اپنے اپنے کاموں پر۔ وہ یونہی بے دھیانی میں چھت پر چلی گئی سامنے کھلے پارک میں بچے کرکٹ کھیل رہے تھے ایک بچے نے چھکا لگایا اور گیند اڑتی ہوئی سحر کے پاس آ گری۔ گیند لینے باقی بچوں نے ایک چھوٹے سے بچے کو بھیجا۔ کچھ دیر بعد وہ بچہ سحر کے پاس پہنچ چکا تھا۔

''آپی یہ گیند دے دیں'' بچہ نے سحر کے ہاتھ میں پکڑی گیند کی طرف اشارہ کررہا تھا۔

سحر کے ذہن میں یکدم پیاس کی طلب بڑھ گئی۔ اس نے صحت مند ننھے سے بچے کو دیکھا سحر نے گیند چھت پر سے بچوں کے پاس پھینک دی نیچے پارک کی طرف اور بچے کو نہایت ہی پیار سے دیکھنے لگی پھر سحر نے کہا۔ ''آؤ میرے ساتھ بہت ساری چاکلیٹ ہیں تم بہت پیارے ہو میں تمہیں چاکلیٹ دیتی ہوں۔''

وہ بچہ جھٹ لالچ میں آ گیا سحر اسے اپنے کمرے میں لے کر آئی اس نے بچے کو ایک کرسی پر بٹھا دیا اور اپنی الماری کھولی الماری سے نکال کر بچے کو چاکلیٹ دی۔

جونہی بچہ جانے لگا وہ بول پڑی۔ ''تم یہیں بیٹھ کر کھالو ورنہ دوسرے بچے تم سے لے لیں گے۔'' بچہ بھی خوشی راضی ہوگیا اور اطمینان سے بیٹھ کر چاکلیٹ کھانے لگا۔

سحر نے بچہ پر اپنا مسمریزم کا علم آزمانے کا سوچا۔ وہ دل ہی دل میں بچے کو دیکھ کر اسے مخاطب کرنے لگی اور بچے کے دماغ میں پہنچ کر اسے جانچنے لگی۔ (ٹیلی پیتھی کے علم سے ٹیلی پیتھی کرنے والا کسی بھی شخص کے دماغ میں جا کر اس سے اپنی مرضی کا کام کرواسکتا ہے)

اچانک سحر کو خوشی کا جھٹکا لگا کیونکہ وہ بچے کے ذہن میں پہنچ چکی تھی اس نے بچے کو ہدایت دی۔ ''تم چاکلیٹ کھا کر سو جاؤ گے تم سو جاؤ گے اور آدھا گھنٹہ سوتے رہو گے یہ میرا حکم ہے بولو کیا تم میرا حکم مانو گے؟''

بچے کے ذہن سے آواز آئی۔ ''ہاں میں تمہارا حکم مانوں گا۔'' کچھ دیر بعد وہ بچہ بیڈ پر لیٹا خراٹے لے رہا

تھا جبکہ سحر اپنی کامیابی پر بہت خوش تھی۔ اس نے جلدی سے اپنی خونی طلب بجھانے کا فیصلہ کیا۔

سحر نے بچے کے کہنی کے اوپری حصہ کے موٹی رگ میں باریک سوراخ کرکے بازوؤں کی طرف سے دبانے لگی تو وہاں سے خون بھل بھل بہنے لگا سحر نے بے تابی سے اس پر اپنا منہ رکھ دیا تقریباً پانچ منٹ تک وہ یونہی بیٹھی خون چوستی رہی پھر وہ سیدھی ہو کر بیٹھ گئی اس وقت وہ مطمئن لگ رہی تھی پھر اس نے جہاں سوراخ تھا وہاں کوئی مرہم سا لگائی جس کی وجہ سے خون فوری رک گیا۔

سحر نے سوتے ہوئے بچے کے ذہن میں چھلانگ لگائی اور اسے حکم دیا۔ ''یہاں سے جا کر وہ کسی سے میرا یا کسی چیز کا ذکر نہیں کرے گا۔''

آدھا گھنٹہ پورا ہونے میں 5 منٹ رہتے تھے لہذا سحر آرام سے بیٹھی رہی۔ کچھ دیر بعد بچہ اٹھا اور کمرے سے باہر نکل گیا سحر نے کھڑکی سے دیکھا تو بچہ باہر جا کر باقی بچوں کے ساتھ کھیل رہا تھا وہ مطمئن ہوگئی......!

سحر کئی دوسرے بچوں پر ایسا عمل کرکے ان کے خون سے اپنی پیاس بجھاتی رہی ان میں سے کئی تو موت کے منہ میں جا چکے تھے۔ ان بچوں کے والدین رو دھو کر چپ کر گئے، کچھ نے پیر فقیر بلوائے مگر سب جعلی تھے۔

ایک ایسا ہی دن تھا سحر نے ایک بچے پر عمل کرکے اس کا خون پیا جونہی وہ اس شیطانی عمل سے فارغ ہوئی تو ایک جھماکہ سا ہوا سحر کچھ حیرانگی سے سامنے دیکھ رہی تھی سامنے عجیب و غریب سیاہ شکل اور سرخ آنکھوں والا شخص کھڑا تھا سحر بہت خوفزدہ ہوئی وہ مسکرانے لگا۔ پھر وہ بولا تو اس کی آواز بہت بھدی اور پھٹی ہوئی تھی۔

''تو نے میرے گرو پنڈت کو خوش کیا، گرو تجھے ہر روز یاد کرتا ہے، گرو نے تجھے جو جاپ کرایا اس جاپ کا میں بیر ہوں، تو وقت سے پہلے بھاگ آئی ورنہ تو بہت زیادہ شکتی شالی ہوجاتی، گرو نے ہی مجھے تیری مدد کے لئے بھیجا ہے تو نے گرو کو خوش کیا تو مجھے خوش کیا آج میں تجھے ایسی شکتی دوں گا کہ تو حیران رہ جائے گی ادھر آ میرے سامنے۔''

سحر میکانکی انداز میں اٹھ کر اس مکروہ صورت آدمی کے سامنے کھڑی ہوگئی۔ وہ بولا۔

''میری آنکھوں میں دیکھ۔'' سحر نے اس کی آنکھوں میں دیکھا تو اس کی آنکھوں سے زرد قسم کی تیز روشنی نکلی جو سحر کی آنکھوں میں جذب ہوگئی۔ پھر وہ شخص بولا۔

''اب تو غائب بھی ہوسکتی ہے ہر کسی کو اپنا مطیع بنا سکتی ہے اور ہاں اس کے علاوہ جو چاہے پا سکتی ہے مگر ایک بات! بھگوان کے نیک اور سچے لوگوں سے بچی رہنا۔'' اس کے بعد وہ غائب ہوگیا۔

سحر نے اس کے جانے کے بعد اپنی طاقت آزمانے کا سوچا اور دل میں خیال کیا کہ چھت پر پہنچ جائے۔ ایک جھماکہ ہوا اور کچھ دیر بعد وہ چھت پر کھڑی تھی۔ سحر پاگلوں کی طرح خوشی سے ناچ رہی تھی۔

اب سحر کی سرگرمیاں بہت تیز ہوگئیں جبکہ سحر کے گھر والے اس کی تنہائی اور کم گوئی سے پریشان تھے۔ سحر کی والدہ نے کئی مرتبہ سحر سے پوچھنے کی کوشش کی مگر ان کی نجانے کیوں سحر کو دیکھ کر کچھ پوچھنے کی ہمت نہ رہتی۔ حسن بھی بہت پریشان تھا کہ آخر پرابلم کیا ہے؟ سحر کے ساتھ کیونکہ سحر نہ تو اس کے ساتھ پہلے کی طرح ہنستی بولتی اور نہ ہی اس سے کسی قسم کی لگاوٹ اور پیار ومحبت کی بات کرتی تھی۔

کچھ دنوں بعد سب نے قدرتی علاقوں کا حسن دیکھنے کے لئے گھومنے پھرنے کا پروگرام بنایا۔ سحر کو ناچار راضی ہونا پڑا۔ جس جگہ سب سے پہلے وہ گئے وہ پہاڑی علاقہ تھا۔ یہاں ایک اچھا سا ہوٹل ان کا مسکن ٹھہرا۔

رات کا وقت تھا چاند کی چودہ تاریخ کی درمیانی رات تھی۔ سحر کو شدت سے خون کی طلب ہو رہی تھی کچھ دیر بعد وہ اکیلی باہر نکلی اور ہوٹل کے پیچھے گیٹ سے باہر چل پڑی۔ آس پاس کچھ نظر نہیں آ رہا تھا کہ اچانک

اسے ایک سایہ نظر آیا وہ کسی نوعمر لڑکے کا تھا جو اپنی دھن میں مگن چلا جا رہا تھا۔ شکل سے وہ مقامی علاقے کا رہنے والا لگتا تھا۔ سحر کی آنکھوں میں چمک بڑھنے لگی وہ چیتے کی سی پھرتی سے لڑکے کی طرف دوڑی اور اس پر پل پڑی۔ چند لمحوں میں وہ اس معصوم لڑکے کا خون پی چکی تھی اور اس کی لاش کو بری طرح ادھیڑ چکی تھی۔

صبح پورے علاقے میں دہشت پھیل چکی تھی۔ کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ آخر کیا معاملہ ہے؟ اس کے بعد یکے بعد دیگرے اس طرح کے اور بھی کئی کیس ہوئے۔ سحر کی والدہ سحر کی پراسرار حالات کا بڑی خاموشی سے جائزہ لے رہی تھیں وہ بہت زیادہ خوفزدہ ہو گئیں اور واپسی کی ضد کرنے لگیں......!

گھر واپس آ کر سحر نے اطمینان کی سانس لی رات کے وقت سحر کے کمرے کے دروازہ پر دستک ہوئی تو سحر نے کہا۔ ''کم ان''

حسن اندر آیا اور بولا۔ ''ہیلو''

''ہائے'' سحر نے مختصر جواب دیا۔

''کیا ہو رہا ہے؟''

''Nothing'' سحر بولی۔

''سحر ایک بات پوچھوں؟'' حسن نے کہا۔

بولو۔''

''تم مجھ سے کچھ کھچی کھچی رہنے لگی ہو؟ بندہ ناچیز سے کوئی خطا سرزد ہو گئی ہے؟''

''نہیں'' سحر بولی اور اٹھ کر باہر چلی گئی۔

دراصل حسن کے پاس سحر اس لئے زیادہ دیر نہیں بیٹھی تھی کہ اس کی خونی پیاس حسن کے صحت مند جسم کو دیکھ کر مچل اٹھتی تھی اور سحر اپنے گھر والوں پر وار نہیں کر سکتی تھی جبکہ حسن اس کے رویہ پر بہت حیران تھا۔

اگلی رات کو سحر نے ایک مختلف پلان بنایا۔ وہ کچھ دیر سوچتی رہی اور پھر غائب ہو گئی۔ اب وہ شہر کے مشہور پارک میں کھڑی تھی یہاں کچھ دیر وہ لوگوں کو دیکھتی رہی پھر اس کی نظر ایک تاریک گوشے میں بیٹھی ایک نوجوان لڑکی پر پڑی۔ لڑکی بہت اداس پریشان نظر آ رہی تھی سحر نے اس پر غور کیا اور ٹیلی پیتھی کا علم استعمال کیا۔ اب وہ اس لڑکی کے دماغ کو پڑھ رہی تھی۔ وہ لڑکی ایک غریب گھرانے سے تعلق رکھتی تھی، اپنی غربت سے نکلنے کے لئے اس نے ایک امیر لڑکے سے محبت کی۔ مگر صلہ میں وہی ازلی بیوفائی ملی۔ سحر اس کا ذہن پڑھ رہی تھی سحر نے اس لڑکی کو دیکھ کر سوچا۔

''چندا کیوں پریشان ہوتی ہو ابھی تمہیں زندگی سے مکتی دلا دوں گی'' پھر وہ اس لڑکی کی طرف بڑھی اور مسکرا کر اسے دیکھنے لگی اور بڑے دوستانہ انداز میں اس سے ہمدردی کی باتیں کرنے لگی۔ ساتھ ساتھ وہ آنکھوں سے اس لڑکی کو اپنا مطیع بنا رہی تھی۔ کچھ دیر بعد وہ لڑکی مکمل طور پر سحر کے ٹرانس میں تھی سحر نے اسے وہاں سے اٹھ کر اپنے پیچھے آنے کو کہا۔ کچھ دیر بعد وہ ایک ویران جگہ پر موجود تھیں۔ یہاں پہنچتے ہی سحر ایک درندے کی سی آواز نکالتی ہوئی لڑکی پر پل پڑی سب سے پہلے تو سحر نے اس کی گردن میں دانت گھسیڑے اور اس کا خون پیا پھر وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور وہاں سے غائب ہو گئی۔

اب وہ اپنے کمرے میں موجود تھی۔ خون اس کے ہاتھوں اور چہرے پر لگا ہوا تھا۔ اچانک کسی نے اس کے کمرے کے دروازے پر دستک دی۔ سحر کو پتہ چل چکا تھا کہ اس کی والدہ ہیں لہٰذا وہ باتھ روم میں گھس گئی اس کی والدہ کمرے میں آ گئیں اور بولیں۔ ''سحر بیٹا کب سے آواز دے رہی ہوں باہر آؤ، تمہارے پاپا بلا رہے ہیں۔'' مجبوراً اسے بولنا پڑا۔ ''آ رہی ہوں''

اس کی والدہ جیسے چونک پڑیں کیونکہ سحر کی آواز سے عجیب وحشت اور بھاری پن کا مظاہرہ ہو رہا تھا وہ فوراً بولیں ''تم تو آؤ مجھے کچھ کہنا ہے۔''

سحر جلدی سے ہاتھ منہ دھو کر باہر نکلی مگر چند لمحے پہلے والی درندگی کے کچھ اثرات اس کے چہرے پر باقی تھے وہ باہر آ کر یونہی کھڑی رہی والدہ نے سحر کا جائزہ لیا تو وہ چونک پڑیں کیونکہ سحر کی قمیض پر اور بازو پر ہلکے ہلکے خون کے دھبے تھے۔ ''کیا ہوا سحر بیٹا؟ کیا کوئی چوٹ

لگ گئی ہے؟'' انہوں نے دھبوں کی طرف اشارہ کیا جبکہ سحر نے کوئی جواب نہ دیا بس ایک سرد سی نظر اپنی والدہ پر ڈالی۔

اس کی والدہ تو جیسے اندر تک لرز گئیں کیونکہ سحر کی آنکھیں سرخ تھیں، لہٰذا وہ سحر سے نظریں چراتی ہوئی باہر نکل گئیں۔

سحر کی والدہ آج کل عجیب سی کیفیت میں مبتلا تھیں۔ سحر کی وجہ سے وہ کچھ شک میں بھی مبتلا تھیں کیونکہ سحر نے کسی سے بات کرنا تو در کنار ملنا بھی چھوڑ دیا تھا اور یہ بات بھی انہوں نے مسلسل نوٹ کی تھی کہ وہ کھانے کو دیکھ کر بہت برا منہ بناتی ہے اور ذرا سا چکھ کر وہ اٹھ جاتی ہے اس حساب سے اس نے مسلسل دو ہفتوں سے کچھ نہیں کھایا تھا۔ یہ باتیں انہوں نے اپنے شوہر سے ڈسکس کیں۔ ''کہیں سحر پر کوئی سایہ؟''

یہ سن کر سحر کے والد ہنس پڑے اور بولے۔ ''بیگم آج کے ماڈرن دور میں یہ قدیم باتیں اچھی نہیں لگتیں۔'' مگر بیگم نے کہا ''کل وہ گھر پر قرآن خوانی کرائیں گی......''

آج گھر میں قرآن مجید کا ختم تھا سحر نے طبیعت کی خرابی کا عذر پیش کیا سحر کی والدہ اور والد گھر پر ہی تھے بہت سارے لوگ مدعو تھے سحر اپنے کمرے میں بند ہو گئی اسے آج عجیب گھبراہٹ اور بے چینی محسوس ہو رہی تھی سحر کی ٹانگیں لرزش محسوس کر رہی تھیں وہ بستر پر لیٹ گئی۔

تقریب کے لئے لان کا انتخاب کیا گیا تھا اور لان سحر کے کمرے کے بالکل نزدیک تھا پھر مائیک سیٹ ہوا۔ شہر کے مشہور قاری صاحب آئے اور تلاوت قرآن شروع کی۔ ادھر سحر کی حالت بگڑنا شروع ہو گئی اس تمام عرصے میں نماز، قرآن، روزہ حتیٰ کہ ہر نیکی کا کام وہ بھول گئی تھی تلاوت ختم ہوئی تو سب نے مل کر قرآن مجید پڑھنا شروع کیا ادھر سحر کی خونی پیاس بڑھنا شروع ہو گئی پورے چار دن سے اس نے کسی کو اپنا شکار نہیں بنایا تھا۔ آج تک وہ بہت کامیابی سے اپنا کام کرتی رہی تھی کسی کو اس پر ذرا برابر بھی شک نہ ہوا تھا۔

مگر ''بکرے کی ماں کب تک خیر منائے گی، آخر ایک نہ ایک دن تو چھری تلے آئے گی۔'' ہر عروج کو زوال ہوتا ہے اور لگتا ہے کہ شیطان کی ہرکارہ گئی معصوموں کا خون پینے والی۔ کئی بے گناہ زندگیاں تباہ کرنے والی سحر کا زوال شروع ہو چکا تھا وہ بیڈ سے گر کر تڑپنے لگی یوں لگتا تھا کہ وحشت، گھبراہٹ اور بے چینی کا اس پر دورہ پڑ گیا ہے۔

اچانک اس کے کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی اندر آنے والی اس کی چھوٹی بہن شیری تھی جو سپارہ تھامے سلیقے سے دوپٹہ اوڑھے اس کے پاس پوچھنے آئی تھی کہ وہ باہر کیوں نہیں آ رہی؟

سحر نے شیری کو دیکھا اس وقت صرف اس پر اپنی خونی پیاس بجھانے کی دھن سوار تھی جبکہ شیری سحر کی حالت دیکھ کر لرز گئی سحر بھیڑیے کی طرح جھپٹی جبکہ شیری کے منہ سے مارے خوف کے ایک چیخ نکلی سحر کی آنکھیں سرخ انگارہ ہو گئی تھیں چہرے پر مکمل درندگی کے آثار تھے۔ ''شکار آ گیا'' وہ بولی تو یوں لگا جیسے کوئی درندہ، بھوکا درندہ غرایا ہو۔ جونہی وہ شیری پر جھپٹنے لگی تو شیری پیچھے کی طرف بھاگی شکار کو ہاتھ سے نکلتا دیکھ کر وہ پاگل ہو گئی۔ اس نے بھاگتی ہوئی شیری پر ہاتھ کا وار کیا مگر شیری اس وقت تک دروازے سے باہر نکل چکی تھی دروازہ بند ہو گیا۔

قرآن مجید پڑھنے کی آواز واضح ہو رہی تھی سحر کے کانوں میں جونہی آواز آئی تو وہ جنونی کیفیت میں ہو کر گر پڑی اور ہانپنے لگی۔ اس نے غائب ہونے کا سوچا مگر وہ غائب نہ ہو سکی یعنی وہ اپنے ہی کمرے میں قید ہو چکی تھی۔ وہ کانوں پر اپنے ہاتھ رکھ کر زور سے چیخی......!

دوسری طرف شیری نے اپنی والدہ اور والد کو ساری صورتحال بتائی۔ دونوں بھاگتے ہوئے سحر کے کمرے کی طرف آئے لیکن ایک عجیب غراہٹ بھری چنگھاڑ سن کر ٹھٹھک کر رکتے میں آ گئے۔ سحر کے والد نے بیوی کو

رکنے کا اشارہ کیا اور دروازے کے لاک کی جھری میں سے اندر کا منظر دیکھا۔

اندر کا منظر بہت ہی خوفناک اور بھیانک تھا سحر اپنی سرخ انگارہ آنکھیں لئے کسی بھوکے درندے کی طرح کمرے کے فرش پر پڑی دروازے ہی کی طرف دیکھ رہی تھی اس وقت وہ کسی زخمی شیرنی کی طرح لگ رہی تھی۔

والد کو شدید خوف محسوس ہوا کہ انہوں نے فوراً کمرے کو لاک کیا اور منع کیا کہ کوئی کمرے کی طرف نہ جائے پھر وہ فون کی طرف دوڑے حسن کو ساری صورتحال کا علم ہو چکا تھا وہ بضد تھا کہ وہ اندر سحر کے کمرے میں جائے گا اسے بڑی مشکل سے روکا گیا تھا۔

ادھر سحر کمرے میں چیخ رہی تھی دروازے پر زور لگا رہی تھی تھوڑی دیر بعد بنگلے کے گیٹ کے سامنے ایک ٹیکسی رکی علی عثمان بھاگ کر گیٹ پر گئے ٹیکسی سے اترنے والے شخص سفید لباس میں ایک نورانی شخصیت کے حامل تھے چہرے پر ہلکی داڑھی، ماتھے پر نمازی ہونے کا ثبوت، یہ شیرازی شاہ تھے جو علی عثمان کے پیر و مرشد بھی تھے۔ شاہ صاحب نے علی عثمان کو گلے لگا کر تسلی دی اور سحر کے کمرے کی طرف چل پڑے۔ دروازے کے پاس کچھ دیر وہ یونہی کھڑے رہے ان کے چہرے پر پر سوچ لکیریں تھیں۔ لمحہ بہ لمحہ ان کا چہرہ رنگ بدلتا رہا پھر وہ کچھ دیر بعد بولے۔

”علی عثمان بہت دیر کر دی۔ آؤ میں تمہیں ساری بات بتاؤں مگر ٹھہرو میں پہلے اندر جاؤں گا اور کوئی میرے پیچھے نہ آئے۔“

کمرہ کھلوا کر شاہ صاحب اندر چلے گئے۔ جونہی وہ اندر داخل ہوئے سحر پہلے تو ان پر جھپٹنے لگی مگر بے اختیار اچھل کر پیچھے جا گری جیسے کسی نادیدہ وجود سے جا ٹکرائی ہو۔

سحر درندوں جیسی غراہٹ کی آوازیں نکالنے لگی شاہ صاحب کچھ پڑھنے لگے۔ سحر چیخنے لگی۔ ”آ...... آ...... مجھے چھوڑ دو۔“

پڑھتے پڑھتے شاہ صاحب نے ہاتھ ہوا میں بلند کیا تو لوہے کی موٹی موٹی زنجیریں ان کے ہاتھ میں آ گئیں۔ ان زنجیروں پر شاہ صاحب نے دم کر دیا کچھ دیر مزید وہ یونہی کوئی ورد کرتے رہے پھر زنجیروں پر پھونک کر وہ آگے بڑھے پھر رک گئے اور زنجیریں سحر پر اچھال دیں ہوا ہی میں زنجیریں سیدھی ہوئیں جیسے کسی نادیدہ وجود نے ان کو پکڑ لیا ہو پھر ان زنجیروں نے سحر کے گلے، دونوں بازوؤں اور ٹانگوں کو جکڑ لیا۔

سحر کے چیخنے چلانے میں شدت آ گئی مگر وہ ذرا بھی ہل نہ سکتی تھی وہ بہت خونخوار نظروں سے شاہ صاحب کو دیکھ رہی تھی شاہ صاحب کچھ دیر سحر کی طرف دیکھتے رہے پھر وہ کمرے سے باہر نکلے۔

شاہ صاحب سحر کے والد سے مخاطب ہوئے۔

”آؤ بیٹھو۔“ سحر کی والدہ اور خصوصاً حسن بہت بیقرار تھے۔ لہٰذا انہوں نے جلدی سے پوچھا۔ ”شاہ صاحب بتائیں کہ کیا ہوا ہے؟“

شاہ صاحب بڑے تحمل سے بولے۔ ”بہت افسوس کی بات ہے آپ کی بیٹی دراصل انسانی خون پینے کی عادی ہو چکی ہے اس پر آسیب کا سایہ کا اثر ہو چکا ہے کئی معصوم لوگوں کی زندگیاں تباہ کر چکی ہے۔“

”کیا......؟ آ...... آپ گگ...... کیا کہہ رہے ہیں۔ سس...... شاہ...... صاحب“ حسن بمشکل بولا۔

”ہاں میں سچ کہہ رہا ہوں اس کے علاوہ انسانی گوشت کی رسیا بھی ہو چکی ہے شیطان نے اسے غائب ہونے کی صلاحیت لوگوں کو مسخر کرنے کی صلاحیت دی ہے مگر شیطان بھول جاتا ہے کہ کائنات کو خلق کرنے والی ہستی زبردست قوت کی مالک ہے آپ کی بیٹی اب انسانیت کے لئے سب سے بڑا خطرہ بن چکی ہے۔“

”تو شاہ صاحب ہم کیا کریں؟“ سحر کی والدہ جو اپنی بیٹی کی بربادی کا سن کر سکتے میں آ گئی تھیں بڑی دیر بعد بولیں۔

نزہت بیٹی اس کا حل تو کوئی نہیں ہے سوائے سحر کی......؟“

”بولیں ناں، شاہ صاحب“ حسن بولا۔

”موت“......؟

”نہیں......“ بیک وقت وہ تینوں چلائے۔

”ہاں! میرے بچوں اگر تم لوگ اسے نہیں مارو گے تو لوگ سحر کی حقیقت جان کر، اسے مار دیں گے میں نے اسے جکڑ دیا ہے وہ آپ سب کے لئے بھی خطرہ بن چکی ہے لہٰذا کوئی اس کے کمرے میں نہ جائے خوب غور کرنا علی عثمان؟ اور کیا تم سحر کی چند روزہ زندگی چاہتی ہو؟ یا انسانیت کی بقا؟“

یہ کہہ کر شاہ صاحب نے رخصت کی اجازت چاہی......!

سحر کے کمرے میں سے بہت ہی خوفناک آوازیں آ رہی تھیں۔ حسن بہت پریشان تھا سحر اس کی زندگی تھی اور سحر کی موت اس کی موت۔

سحر کی والدہ اور والد بہت پریشان تھے وہ کسی فیصلے پر نہ پہنچ پا رہے تھے آخر دونوں اٹھے اور وضو کر کے اپنے معبود سے مدد مانگنے لگے جبکہ حسن سحر کے کمرے کے باہر کھڑا مسلسل کچھ سوچ رہا تھا......!

نماز کے بعد دونوں نے گڑگڑا کر رب باری تعالیٰ سے التجا کی۔ وہ روتے رہے پھر جیسے انہیں بشارت مل گئی اور قرار آ گیا۔

اس کی والدہ بولیں۔ ”مجھے سحر جان سے بھی بڑھ کر عزیز ہے۔ میں نے اسے جنم دیا وہ میری جان ہے۔ میری بلکہ ہم سب کی زندگی ہے مگر اللہ کی مخلوق کے لئے اس وقت وہ بہت بڑا خطرہ بن چکی ہے میں جانتی ہوں کہ اگر میں نے اپنی بیٹی کی بقاء چاہی چند دن کے لئے تو لوگوں کی زندگیاں خطرے میں پڑ جائیں گی اور میں اپنی خوشیوں کے لئے اور لوگوں کے گھر تباہ نہیں کر سکتی۔“ یہ کہہ کر وہ رونے لگیں۔

فیصلہ ہو گیا دونوں میاں بیوی آمنے سامنے بیٹھے تھے ایک دوسرے کو تسلی اور دلاسے جیسے کمزور الفاظ سے مطمئن کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

ادھر حسن نے سحر کے کمرے کا دروازہ کھول دیا تھا۔ کمرے میں سحر انتہائی نحیف حالت میں پڑی تھی۔

”اوہ مائی گاڈ!“ حسن تڑپ اٹھا کیونکہ سحر نے اپنی خونی پیاس بجھانے کے لئے اپنی ہی کلائی کو ادھیڑ ڈالا تھا۔ اس کی کلائی کی موٹی رگ کٹ گئی تھی اس وقت وہ آخری سانسیں لے رہی تھی۔

”سحر...... سحر...... تم...... تم مجھے چھوڑ کے نہیں جا سکتی۔“ حسن بھاگ کر سحر کے پاس بیٹھ گیا اور اس کا سر اپنی گود میں رکھ کر روتے ہوئے بولا۔ ”تمہیں خون چاہئے ناں، میں دوں گا تمہیں خون، تمہیں مرنے نہیں دوں گا تم میری زندگی ہو سحر۔“

یہ کہہ کر اس نے میز پر پڑا تیز چاقو اٹھایا جس سے پھل کاٹنے کا کام لیا جاتا تھا سحر کی چاہت میں حسن اپنا حواس کھو چکا تھا دماغ سے سوچنے کی صلاحیت ختم ہو چکی تھی اس وقت اسے صرف اور صرف سحر کی تکلیف نظر آ رہی تھی۔ اس کے ذہن میں صرف سحر کی زندگی عزیز تھی اور اس نے اپنی شہ رگ کاٹ دی اور اس وفا کے دیوتا حسن نے اپنی گردن سحر کے منہ پر رکھ دی۔ خون کے چند قطرے سحر کے حلق میں ضرور پہنچے ساتھ ہی دو اشک سحر کی آنکھوں سے گرے۔ اس لمحے اس کا ذہن حسن کی قربانی کو محسوس کر رہا تھا پھر بھی اسے حسن کی قربانی نہ بچا سکی اور وہ ہمیشہ کے لئے ساکت ہو گئی۔

نزہت اور علی عثمان دونوں سحر کے کمرے میں داخل ہوئے۔ علی عثمان کے ہاتھ میں ایک جدید سائلنسر لگا پسٹل تھا مگر اندر کا بھیانک منظر انہیں دہلا گیا۔ سارا فرش سرخ خون سے رنگا ہوا تھا سحر کی کلائی ادھڑی ہوئی تھی اور اس کے منہ پر حسن کی گردن تھی جہاں سے خون بہہ بہہ کر فرش پر اور سحر کے چہرے کو سرخ کر رہا تھا۔

نزہت علی تو اسی وقت بے ہوش ہو گئیں مگر عثمان ہمت کر کے آگے بڑھے اور حسن کو جونہی انہوں نے سیدھا کیا تو ایک دلخراش چیخ ان کے لبوں سے آزاد ہوئی۔ چاقو حسن کے ہاتھ سے گر چکا تھا وہ

ساری صورتحال سمجھ گئے تھے اور جونہی انہوں نے سحر کو ہلایا جلایا تو جیسے غموں کا پہاڑ ان پر ٹوٹ پڑا کیونکہ سحر اور حسن دونوں دنیا چھوڑ کر جا چکے تھے کبھی نہ آنے کے لئے!

دونوں میتوں کی تدفین ہو چکی تھی۔ سوئم کے بعد دسواں اور دسواں کے بعد چالیسواں آن پہنچا۔ مگر غم علی عثمان اور بیگم نزہت کو دیمک کی طرح چاٹ رہا تھا اب ان کی زندگی میں دلچسپی نہ ہونے کے برابر تھی۔ علی عثمان کو حسن کی موت کا بھی بہت افسوس تھا اور یہ دکھ کہ اگر وہ خود حسن سے پہلے پہنچ جاتے تو آج حسن ان کے ساتھ ہوتا۔

بہت سارے لوگ، رشتہ دار، دوست احباب گھر میں جمع تھے۔ سب لوگ دونوں میاں بیوی کو صبر کی تلقین کر رہے تھے اور اب دونوں میاں بیوی تو بس اپنی چھوٹی بیٹی شیری کی وجہ سے زندہ تھے۔

اب معصوم شیری ہی ان کی زندگی کی ضمانت تھی۔ علی عثمان کے ایک دوست ان کے پاس تعزیت کے لئے بیٹھے کہ نوکر پاس آیا اور بولا۔

''صاحب......؟''

''ہاں بولو؟''

''صاحب، ڈاکیا آیا ہے اور سحر بی بی کے نام کا یہ خط دے گیا ہے۔''

''سحر کے نام کا خط؟''

''جی صاحب''

''اچھا تم جاؤ''

''خط لے کر علی عثمان نے نوکر کو جانے کا اشارہ کیا اور آنسو پونچھتے ہوئے خط کھولا۔ جوں جوں انہوں نے خط پڑھا تو ان کی حالت بگڑنے لگی۔ پھر وہ دل کے مقام پر ہاتھ رکھ کر وہیں نیچے گر گئے۔ ان کے دوست ان کی حالت پر سخت پریشان ہو گئے اور جلدی سے انہیں اسپتال پہنچایا گیا کیونکہ ان کو شدید دل کا دورہ پڑا تھا۔

ایک نیا غم کا آتش فشاں پھٹ پڑا گھر میں کہرام مچ گیا۔ نزہت علی پر یہ خبر بجلی بن کر گر پڑی اور وہ سکتے کی کیفیت میں آ گئیں۔ ننھی شیری اپنے والدین کی حالت پر چیخ کر رونے لگی اور اپنی والدہ کو جھنجھوڑنے لگی وہ بری طرح رو رہی تھی۔

شام تک ڈاکٹروں کی انتھک محنت اور کوشش سے علی عثمان خطرے سے باہر آ گئے لیکن ان کی حالت بہت نازک تھی علی عثمان کا دوست جو ان کے پاس بیٹھا تھا وہ اس خط کو تلاش کر رہا تھا جسے پڑھ کر علی عثمان کو ہارٹ اٹیک کا دورہ پڑا تھا۔ خط نیچے پڑا مل گیا۔ انہوں نے اٹھا کر خط پڑھنا شروع کیا جس کی تحریر کچھ یوں تھی۔

ہیلو ڈیئر سحر!

آج شدت سے تمہاری یاد آ رہی ہے سوچا تم سے باتیں کروں کیسی ہو؟

کالج کی چھٹیاں ختم ہونے والی ہیں پہلے ہی دن کالج ضرور آنا اوہ! کہیں خونی پرابلم تو نہیں!! ڈیئر مجھے تم سے ایک ضروری بات کرنی ہے جو میں چھٹیوں سے پہلے کرنا چاہتی تھی مگر آخری چند دن تم آئی ہی نہیں۔ دراصل میں نے تمہیں چھٹیوں سے پہلے ایک بات کہی تھی۔ یاد آیا کچھ......؟

میری بھلکو دوست، تم نے کالج کینٹین میں بیٹھ کر امتحان میں میری کامیابیوں کی وجہ پوچھی تھی تو میں نے کہا تھا کہ میں نے انسانی خون پیا ہے..... ! اور میں نے سب کچھ پالیا۔

تو پیاری سحر میں تم سے معذرت چاہتی ہوں کہ اصل میں ایسا کچھ نہیں تھا۔ وہ تو میں نے تمہیں تنگ کرنے کے لئے ایک مذاق کیا تھا، ہاں صرف وہ مذاق تھا اور کچھ نہیں۔ Hopefully تم میرے مذاق کو بہت زیادہ سیریس نہیں لوگی اور ہاں سوری! اس مذاق کے لئے۔ پہلے ہی دن کالج ضرور آنا۔ OK

تمہاری کلاس میٹ ماہم......

ناکام آرزو

آصفہ پروین

میری دادی کہتی ہیں جو لوگ ناکام آرزوئیں لے کر اچانک مر جاتے ہیں ان کی روحیں بھٹکتی رہتی ہیں۔ باجی کیا واقعی ایسا ہوتا ہے؟''

ٹرن...... ٹرن...... ٹرن...... چولہے کی آنچ تھوڑی کم کر کے میں کچن سے باہر نکلی اور ٹیلی فون اسٹینڈ کی طرف بڑھی۔ لیکن یہ دیکھ کر میری جان جل کر رہ گئی کہ فون کے اتنے قریب بیٹھے ہوئے ناصر اخبار کے مطالعے میں مصروف تھے۔ اگر چاہتے تو ہاتھ بڑھا کر ریسیور اٹھا سکتے تھے۔ مگر میں جانتی تھی کہ وہ فریج کے قریب کھڑے ہو کر پانی مانگنے والوں میں سے ہیں۔

میں نے جھنجھلا کر ریسیور اٹھایا۔ تو دوسری طرف سے ایک نامانوس آواز سن کر مزید جان جل گئی اور پہلا خیال یہی آیا کہ یقیناً کوئی رانگ نمبر وقت برباد کرے گا۔

''محترمہ...... کس سے بات کرنی ہے آپ کو۔''

میں نے بیزاری سے کہا۔

''تم سے رابعہ میں زاہدہ بول رہی ہوں'' اور میری بیزاری بھاپ کی طرح تحلیل ہو گئی۔ ''زاہدہ...... ؟''

دماغ میں اچانک شناسائی کی ایک لہر سی اٹھی...... میٹرک ہم دونوں نے ساتھ ہی کیا تھا پھر ایک ہی کالج میں داخلہ لیا۔ لیکن فرسٹ ائیر کا امتحان دے کر وہ نہ جانے کہاں غائب ہو گئی تھی...... سیکنڈ ائیر میں اس نے داخلہ ہی نہیں لیا اور اس سے پھر کبھی ملاقات بھی نہ ہو سکی، جو پتہ چل سکتا کہ اس پر کیا بیتی...... یوں بھی وہ اپنی ذات میں سمٹی رہنے والی لڑکی تھی اور کلاس میں سوائے میرے کسی اور سے اس کی دوستی نہ تھی۔ مجھ سے دوستی میں بھی زیادہ

ہاتھ میری توجہ اور دلچسپی کا تھا...... مجھے وہ اداس اور خوبصورت آنکھوں والی لڑکی بے انتہا اچھی لگی تھی۔ نہ کسی کے معاملے میں خود دخل دیتی نہ ہی کسی کو اپنے معاملے میں مداخلت کی اجازت دیتی...... اس نے گہری دوستی کے باوجود کبھی اپنے گھر کا ایڈریس مجھے نہیں دیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس کی گمشدگی کچھ عرصے تک تو کانٹے کی طرح میرے دل میں کھٹکتی رہی۔ لیکن پھر کچھ عرصے کے بعد میں اسے بھول بھال گئی...... اور نئی دوستوں نے زاہدہ کی دوستی کو ایک بھولا بسرا خواب سا بنادیا۔ گریجویشن کے بعد میری شادی ہوگئی اور اب میری شادی کو بھی چار سال ہو چکے تھے اور اتنے سالوں بعد اچانک ہی زاہدہ کو میری یاد کہاں سے آ گئی۔

"ارے زاہدہ...... تم زندہ ہو......" میں اپنی عادت کے مطابق پرجوش لہجے میں جیسے چیخی...... اس بات کی پرواہ کئے بغیر کہ ناصر کو میرا فون پر تیز آواز میں باتیں کرنا سخت ناپسند تھا۔ اور یقیناً وہ اس وقت مجھے قہر آلود نگاہوں سے گھور رہے ہوں گے۔

"نہیں میں تو کب کی مرچکی" ریسیور میں سے اس کی خوبصورت آواز سنائی دی۔ وہ بہت کم ہنستی تھی مگر جب کبھی ہنستی تھی تو اس کی ہنسی کی آواز بے انتہا خوبصورت لگتی۔ یوں جیسے کہیں قریب ہی گھنٹیاں بج اٹھی ہوں میں اکثر ہی اس کی ہنسی کی تعریف کیا کرتی تھی...... مگر وہ میری تعریف سے ذرا بھی متاثر ہوئے بغیر اسے میرے جھوٹ میں لپٹی محبت کا نام دیتی۔

"قسم سے زاہدہ، میں تو تمہارے بارے میں جاننے کے لئے بے حد بے چین رہی، مگر تم نے بغیر کوئی الوداعی ملاقات کیے کالج چھوڑ دیا...... اور کسی سے نہیں کم از کم مجھ سے تو ملاقات کرتیں۔" میرے لبوں پر بہت مدت سے دل میں پلتی شکایت آ گئی۔

"بس کیا بتاؤں۔" وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولی۔

"شادی ہوگئی تھی، لیکن نبھ نہ سکی۔ طلاق لے کر اماں کے پاس آ بیٹھی اور تب سے اماں کے ساتھ ہی ہوں۔"

مجھے اس کی کہانی سن کر دلی رنج ہوا۔ بہت بدنصیب شخص ہوگا کہ جسے زاہدہ جیسی خوبصورت اور خوب سیرت لڑکی ملی...... اور اس نے قدر نہ کی" ساتھ ہی اس بات کی خوشی بھی ہوئی کہ زاہدہ نے مجھے پہلی بار کچھ بتایا تو سہی۔ ورنہ اسکول کالج میں اس نے ہمیشہ اپنے گھر یا گھر والوں کے ذکر کو یا تو ٹال دیا یا پھر خاموشی اختیار کرلیتی تھی۔ مجھے تو یہ بھی نہیں پتہ تھا کہ اس کے بہن یا بھائی کتنے ہیں اور کیا کرتے ہیں۔

"اور تمہارے والد......؟ میں نے اس سے کریدا۔

"والد کی تو مجھے شکل بھی یاد نہیں رہی۔ وہ بہت ہی مدھم آواز میں بول رہی تھی۔" ان کا انتقال تو میری ابتدائی عمر میں ہی ہوگیا تھا۔ اماں نے ہی محنت مزدوری کرکے مجھے پڑھایا لکھایا...... اور پھر میرے احتجاج کے باوجود مجھے اتر بھی نہیں کرنے دیا اور نواز کے ساتھ میری شادی کردی۔ مجھے تو اس وقت۔ زندگی برتنے اور رشتے نبھانے کا سلیقہ بھی نہیں تھا۔ نواز مجھ سے 20-25 سال بڑا تھا پھر بھی میں نباہ جاتی اگر وہ بدظرف نہ ہوتا۔"

زاہدہ کی آواز جیسے آنسوؤں کے سمندر میں ڈوب گئی۔ اس نے شاید سسکی بھی لی تھی۔ مجھے افسوس ہونے لگا کہ میں نے کیوں اس تلخ موضوع کو چھیڑا۔

"اچھا پرانی باتوں کو چھوڑو یہ بتاؤ...... اب کیسی ہو؟" میں نے قدرے خوشدلی سے کہا تا کہ گفتگو کا بوجھل پن کم ہو۔ "اب...... ٹھیک ہی ہوں اور تم سے بات کررہی ہوں...... اور ہاں کیا بھی کیا جاسکتا ہے" وہ عجیب سے لہجے میں بولی۔

"اماں ٹھیک ہیں" میں نے محتاط لہجے میں پوچھا۔

"ہاں...... اماں بھی میرے پاس ہیں یا یوں کہہ لو کہ میں اماں کے پاس ہوں...... آہ......" وہ بے اختیار کراہی تھی میں بے چین ہوگئی۔

"کیا ہوا زاہدہ...... تم ٹھیک تو ہو؟" نہ جانے کیوں اس کی آواز بھی مجھے کچھ عجیب لگ رہی تھی۔ بہت سرد اور بے تاثر لہجہ تھا۔

"ہاں دراصل میرا ہاتھ زخمی ہوگیا تھا آج کانچ سے، بہت ہی زیادہ خون نکلا۔" اچانک رابطہ منقطع ہوگیا۔

مجھے اپنے کان پر کچھ گیلا گیلا سا محسوس ہوا میں نے ریسیور ہٹا کر ائیر پیس کی طرف دیکھا وہاں سرخ رنگ کے تین چار قطرے سے تھے۔

”دیکھیے یہ کیا ہے؟“ میں نے ریسیور ناصر کو دکھایا۔ انہوں نے آنکھ اٹھا کر ائیر پیس کی طرف دیکھا اور پھر تشویشناک نگاہوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولے۔ ”یہ تو خون معلوم ہوتا ہے تمہارے کان سے خون تو نہیں بہہ رہا ہے۔“

”میرے کان سے“ میں نے بے اختیار اپنے کان پر ہاتھ رکھا اور ساتھ ہی کان کا رخ ناصر کی طرف کر دیا تاکہ وہ بھی دیکھ لیں۔

”ہاں کان پر بھی خون کے دھبے ہیں ہو سکتا ہے کوئی دانہ وغیرہ ہو جو کہ اندر پھوٹ گیا ہو“ ناصر نے رائے ظاہر کی۔

”لیکن...... مجھے تکلیف تو بالکل نہیں، کان کے اندر دانہ ہوتا تو کچھ محسوس ہوتا۔“ میں ریسیور کو کپڑے سے صاف کرتے ہوئے الجھ کر بولی۔

”ہائے...... میں چولہے پر دودھ رکھ کر آئی تھی۔“ اچانک مجھے یاد آیا اور میں سب کچھ بھول بھال کر کچن کی طرف بھاگی۔ شکر ہے چولہے کی آنچ کم ہونے کی وجہ سے دودھ نہیں ابلا تھا۔ میں نے جلدی سے چولہا بند کر دیا پھر میرے ذہن سے سب کچھ نکل گیا معروفیت ہی اتنی تھی۔

شادی کے فوراً بعد اللہ تعالیٰ نے اولاد جیسی نعمت سے میرا دامن بھر دیا تھا۔ اور میں ایک تین سال کے بیٹے ساحل کی ماں تھی۔ بچے کے ساتھ کتنا کام ہوتا ہے ساحل کو میں نے نیا نیا اسکول میں ایڈمیشن کروایا تھا اور اب اسے شام کو بیٹھ کر پڑھانا بھی میری ذمہ داری تھی اور کچن کا کام الگ تھا۔ جسے شیئر کرنے کے لئے کوئی اور ہستی موجود نہ تھی لیکن اتنی معروفیت کے باوجود زاہدہ میرے ذہن سے نکل نہ سکی اس روز لائن کٹ جانے کی وجہ سے میں اس سے اس کا فون نمبر بھی نہیں لے سکی تھی ورنہ ہی یہ پوچھ سکی تھی کہ زاہدہ نے میرا نمبر کہاں سے لیا ہو سکتا ہے اس نے امی کے گھر فون کیا ہو اور وہاں سے میرا نمبر لے لیا ہو لیکن اس کا نمبر میرے پاس نہیں تھا اب میں اس سے کیسے رابطہ کروں گی یہ سوچ سوچ کر کئی دن میں الجھتی رہی اور اس دوران میں ایک بار پھر زاہدہ کا فون آ گیا۔ اس بار بھی اس کی آواز بہت مدھم تھی اور کچھ بیٹھی ہوئی بھی تھی۔

”ہاں زاہدہ...... اس نے تعارف کروایا تو میں خوش ہو کر بولی۔

”یار تم نے اپنا فون نمبر بھی نہیں دیا اور تمہارا ایڈریس بھی مجھے نہیں پتا۔ میں تم سے ملنے آتی۔ بہت دل چاہ رہا ہے تم سے ملنے کو“

”مجھ سے ملنے کی تمنا نہ ہی کرو تو اچھا ہے“ وہ کچھ عجیب سے انداز میں بولی۔ نہ جانے اس کی آواز کھڑ کھڑا رہی تھی یا ٹیلی فون میں کچھ خرابی تھی نہ جانے اس کے فون کرتے وقت ٹیلی فون کو کیا ہو جاتا تھا۔

”بکواس نہ کرو، شرافت سے مجھے اپنا ایڈریس بتا دو، پہلے بھی ہر بار تم اسی طرح کی باتیں کر کے ٹال جایا کرتی تھیں“ میں نے شکایتی لہجے میں کہا۔

”اچھا نوٹ کرو اس کا جواب غیر متوقع تھا۔ میں نے جلدی سے نوٹ بک اٹھائی اور اس کا ایڈریس نوٹ کر لیا۔

”میں آؤں گی تم سے ملنے“ میں نے پر جوش لہجے میں کہا۔ لیکن اس کے جواب میں زاہدہ کی طرف سے کسی قسم کی گرم جوشی نہ تھی۔

”دن میں ہو سکتا ہے، میں نہ ملوں لیکن رات میں، میں ہوتی ہوں“ وہ بے تاثر اور سرد لہجے میں بولی۔

”اچھا۔ غالباً تم نے نوکری کر لی ہوگی۔ ہاں اچھا ہے نا۔ دل بھی بہل جائے گا سنو زاہدہ، تم اپنا فون نمبر دے دو مجھے، میں فون کر دوں گی جب آؤں گی تاکہ تم بھی گھر میں موجود رہو۔“ میں نے مشورہ دیا۔ لیکن اس سے قبل کہ وہ کوئی جواب دیتی ایک بار پھر پہلے کی طرح اپنے آپ ہی رابطہ ختم ہو گیا۔

میں ریسیور کریڈل پر ڈالنے ہی والی تھی کہ اچانک چونک پڑی۔ اس روز کی طرح آج بھی ائیر پیس پر خون کے

قطرے چمک رہے تھے۔ بے اختیار میرا ہاتھ کان پر پڑ گیا وہاں چپچپاہٹ موجود تھی میں اس بار پریشان ہو گئی اور خوفزدہ بھی یہ دوسری مرتبہ تھا کہ زاہدہ کا فون آتا ہے اور میرے کان سے خون کیوں نکلنا شروع ہو جاتا ہے۔ ریسیور کو صاف کر کے میں نے کریڈل پر رکھا اور ایک ٹوتھ پک پر روئی لپیٹ کر کان میں گھما کر دیکھا لیکن روئی بالکل صاف نکلی۔ ”اس کا مطلب ہے کہ کان کے اندر سے خون نہیں نکل رہا ہے تو پھر جب زاہدہ کا فون آتا ہے تو ریسیور سے خون کے قطرے کیوں نکلنا شروع ہو جاتے ہیں یہ خون کہاں سے آتا ہے ائیر پیس پر؟“ میں جتنا سوچ رہی تھی میرا ذہن الجھتا جا رہا تھا ”مجھے جلد از جلد زاہدہ سے ملنا چاہئے شاید اس سے ملنے کے بعد اس الجھن کا کوئی حل نکلے۔“ میں اپنا کان پانی سے صاف کرتے ہوئے سوچ رہی تھی۔

☆......☆......☆

ایک روز میں نے زاہدہ کے گھر جانے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ ناصر آفس گئے ہوئے تھے اور ساحل اسکول میں بآسانی زاہدہ کے گھر پہنچ گئی بس راستے میں ایک دو لوگوں سے پوچھنا پڑا لیکن مجھے اس وقت شدید قسم کی مایوسی ہوئی جب میں نے دروازے پر موٹا سا تالا پڑا ہوا دیکھا میں مایوس ہو کر پلٹی تو مجھے اپنے پیچھے ایک سفید لباس والی بوڑھی سی خاتون نظر آئیں، سفید دوپٹے نے ان کے بال اور ماتھا بھی ڈھانپ رکھا تھا ان کے دونوں ہاتھ بھی دوپٹے کے اندر تھے ”تم زاہدہ سے ملنے آئی ہو؟“ وہ مجھے دیکھ کر مدھم آواز میں بولیں۔

”جی آنٹی آپ...... غالباً......“

”ہاں میں زاہدہ کی ماں ہوں، زاہدہ ہر روز تمہارا انتظار کرتی ہے وہ بہت محبت کرتی ہے تم سے، لیکن مجھے افسوس ہے بیٹا زاہدہ گھر میں نہیں ہے حیدر آباد ایک عزیز کے ہاں شادی میں گئی ہوئی ہے اور آج میں بھی جا رہی ہوں...... افسوس میں نے گھر بند کر دیا ہے۔ اور جلدی میں بھی ہوں لہٰذا تمہیں بٹھا کر تمہاری خاطر مدارت نہ کر سکوں گی وہ حیدر آباد جانے سے پہلے ہی تمہیں فون کرنے کا کہہ رہی تھی لیکن بس اچانک ہی جانا پڑ گیا سب ایسے ہی چلے جاتے ہیں اچانک اور بغیر ارادے کے میں بھی...... وہ بھی...... تم بھی۔“

وہ عجیب بے معنی سی باتیں کرنے لگیں، مجھے کچھ گھبراہٹ سی ہونے لگی، کیونکہ ان کی نگاہیں مجھ پر نہیں تھیں بلکہ خلا میں موجود کسی ان دیکھے نقطے پر مرکوز تھیں اور ان کی آواز بھی زاہدہ کی طرح کسی قسم کے تاثر سے عاری تھی۔

”اچھا میں چلتی ہوں پھر آؤں گی“ میں نے ان سے اجازت لی اور جانے ہی والی تھی کہ اچانک میری نظر زمین پر پڑی اور میں اپنی جگہ منجمد سی رہ گئی۔

زمین پر خون کے قطرے ایک تسلسل سے گر رہے تھے غالباً ان کے ہاتھ سے خون بہہ رہا تھا۔

”آ...... آنٹی...... آپ...... تو زخمی ہیں...... یہ...... یہ خون“ میں خوفزدہ ہو کر بولی، لیکن ان کے سکون میں کوئی فرق نہیں آیا۔

”ہاں...... آج کچن میں میرا ہاتھ زخمی ہو گیا تھا کانچ سے“ انہوں نے اسی اطمینان سے کہا تو میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا ابھی چند روز پہلے زاہدہ نے بھی تو یہی الفاظ کہے تھے۔

”آپ کوئی دوا لگا کر پٹی وغیرہ باندھ لیں اس طرح کیسے سفر کریں گی؟“ میں خوفزدہ ہو کر بولی۔ لیکن وہ اسی اطمینان سے بولیں۔

”پٹی باندھ لی ہے لیکن خون پھر بھی بند نہیں ہوا۔ سفر کرنا تو ضروری ہے بیٹا، اچھا اب تم جاؤ۔ خدا حافظ۔“ انہوں نے جلدی سے کہا اور پلٹ کر سڑک کی طرف چلی گئیں۔ سچی بات تو یہ ہے کہ زاہدہ کی امی سے ملاقات نے ایک بڑا ہی ناخوشگوار تاثر چھوڑا تھا مجھ پر، مجھے جب بھی ان کا سفید سراپا یاد آتا میرے دل میں خوف لہریں لینے لگتا۔

☆......☆......☆

اس بات کو کئی روز گزر گئے۔ تقریباً ایک ماہ ہونے کو آیا تھا کہ مجھے ایک بار پھر زاہدہ سے ملنے کا شوق اٹھا، اس کا کوئی فون بھی نہیں آیا تھا ایک بار مجھے پھر بڑی شدت سے زاہدہ اور اس کے ساتھ گزرے ہوئے لمحے یاد آنے لگے

تھے میں نے اس بار نسبتاً مختلف ٹائم پر چلنے کا فیصلہ کیا۔ میرا خیال تھا کہ شاید وہ کہیں جاب کرتی ہے۔ لہٰذا شام تک گھر آ ہی جاتی ہوگی۔ ناصر اور ساحل اس بار میرے ہمراہ ہی تھے اگرچہ ناصر نے بڑے نخرے دکھائے تھے مگر میں نے انہیں کسی طرح زاہدہ کے گھر جانے کے لئے تیار کر ہی لیا تھا ان کی بائیک زاہدہ کے گھر کے سامنے رکوا کر میں شاداں و فرحاں اتری، لیکن دروازے پر پڑے تالے کو دیکھ کر میرا دل دھک سے رہ گیا۔

''لیجئے، آج پھر غائب ہیں، آپ کی سہیلی صاحبہ۔''

ناصر نے طنزیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔

''ہوسکتا ہے وہ ابھی اپنی جاب سے واپس نہ لوٹی ہو اور اماں کچھ خریدنے نکل گئی ہوں، میں ابھی آتی ہوں، ذرا پڑوس میں معلوم کرتی ہوں۔

میں نے آگے بڑھ کر زاہدہ کے گھر کے دائیں جانب پڑوس کے گھر کی بیل بجائی۔ جواب میں ایک خاتون نے باہر جھانکا۔

''کس سے ملنا ہے؟''

''وہ..... آپ کے برابر والے گھر کے لوگ کہاں ہیں..... آپ کچھ جانتی ہیں، ان کے بارے میں؟''

''یہ..... یہ گھر تو بہت عرصے سے خالی ہے'' انہوں نے بتایا۔

''جی! ایسا کیسے ہوسکتا ہے۔ مجھے تو یہیں کا پتہ دیا گیا تھا اور پچھلی بار میں آئی تھی تو زاہدہ کی والدہ سے میری ملاقات بھی ہوئی تھی۔ وہ حیدرآباد جارہی تھیں۔ کسی شادی میں.....'' ابھی میرا باقی جملہ منہ میں ہی تھا کہ ان خاتون نے دھڑ سے اپنا دروازہ بند کردیا۔ گیٹ بند کرنے سے پہلے میں ان کا سفید پڑتا چہرہ دیکھ چکی تھی۔

''یہ محترمہ تو بڑی بداخلاق ہیں'' میرے پیچھے کھڑے ناصر نے کہا۔

''اب کیا کریں'' میں بڑبڑائی۔

''اچانک میں نے زاہدہ کے گھر کے بائیں جانب کے گھر کا دروازہ کھلتے دیکھا، کوئی سترہ اٹھارہ سال کی ایک نوجوان لڑکی نے جھانکا تو میں تیزی سے اس کی طرف بڑھی۔

''سنیے..... یہ برابر والے گھر کے لوگ کہاں ہیں؟''

میں نے اس کے قریب جاکر کہا۔

''اس گھر میں..... یہاں تو کوئی نہیں رہتا۔ دو سال سے یہ گھر یونہی بند پڑا ہے'' لڑکی نے روانی سے کہا۔ وہ ان خاتون کے برعکس بااخلاق اور خوش گفتار معلوم ہورہی تھی۔

''لیکن زاہدہ اور اس کی امی تو یہیں رہتی ہیں'' میں نے خود کلامی کے انداز میں کہا۔

''زاہدہ باجی دو سال پہلے یہاں رہا کرتی تھیں۔ لیکن پھر ان کے بعد سے یہ مکان خالی ہے''

''تم جانتی ہو! یہ مکان چھوڑ کر زاہدہ کہاں چلی گئی ہے'' میں نے بے صبری سے پوچھا۔

''اللہ میاں کے پاس۔'' وہ بے حد سادگی سے بولی، میں ساکت رہ گئی، وہ تفصیل سے بتانے لگی۔

''بہت ٹریجڈی موت ہوئی ہے، ان دونوں ماں بیٹی کی، وہ حیدرآباد میں اپنے کسی عزیز کے ہاں شادی میں جانے کی تیاری کر رہی تھیں دوپہر ڈھلنے کے بعد وہ دونوں گھر سے نکلیں لیکن ابھی روڈ پر ہی پہنچی تھیں کہ ایک کوچ ڈرائیور کے ہاتھوں بے قابو ہوکر ان کو کچلتی ہوئی فٹ پاتھ پر چڑھ گئی، زاہدہ باجی تو اسی وقت مرگئیں، ان کی اماں اسپتال لے جاتے ہوئے انتقال کرگئیں۔ تب سے یہ گھر خالی پڑا ہے، لوگ کہتے ہیں ان دونوں کی روحیں یہاں چکراتی پھرتی ہیں لیکن مجھے یقین نہیں آتا جب کہ میری دادی کہتی ہیں جو لوگ ناکام آرزوئیں لے کر اچانک مرجاتے ہیں ان کی روحیں بھٹکتی رہتی ہیں۔ باجی کیا واقعی ایسا ہوتا ہے؟''

میں نے کوئی جواب نہیں دیا مجھے لگ رہا تھا کہ میں گر رہی ہوں اور جب میں نیچے گر رہی تھی تو دو مضبوط ہاتھوں نے مجھے سنبھال لیا۔ یہ ہاتھ ناصر کے تھے، اگر اس روز میں ناصر کو نہ لے کر جاتی تو نہ جانے کیا ہوتا۔ اب بھی کبھی فون کی بیل بجتی ہے تو میں تھر تھر کانپنے لگتی ہوں۔

انتظار

شگفتہ ارم درانی



''رانی..... میں ساری عمر تمہارا انتظار کروں گا ہاں رانی تمہیں آنا ہوگا میرے لئے آنا ہوگا اپنے پیار کے لئے..... میں تمہارا انتظار کروں گا مر کر بھی تمہارا انتظار کروں گا۔''

''**میں** تمہیں طلاق دیتا ہوں، میں تمہیں طلاق دیتا ہوں، میں تمہیں طلاق دیتا ہوں'' یہ الفاظ میرے اعصاب پر بجلی بن کر گرے۔ مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔

نوید کا رویہ میرے ساتھ شروع سے ہی اتنا ظالمانہ اور پرتشدد تھا کہ میں خود موت کی دعائیں مانگتی تھیں۔ لیکن ''طلاق'' بدنامی کا ایک ایسا ٹیکہ ہے جو ہمارے معاشرے میں موت سے بھی بھیانک تصور کیا جاتا ہے۔ نوید تو اتنا کہہ کر باہر چلے گئے لیکن مجھے ویرانی و گمراہی کے ایک ایسے کنوئیں میں دھکیل گئے جہاں سے نکلنے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ میں فوراً اپنے کمرے میں آ گئی اور بستر پر اوندھی گر کر اپنی قسمت کا ماتم کرنے لگی۔ بہت دیر تک میری آنکھیں برسات کرتی رہیں۔ ازدواجی زندگی کے ساتھ تلخ سال میری آنکھوں کے سامنے گھوم گئے۔

سسرال میں ایک لمحہ بھی میں نے سکون کا نہیں گزارا تھا۔ ساس کے حکم، سسر کی خدمت اور نندوں کی چکنی چپڑی باتیں سن سن کر میں تنگ آ چکی تھی۔ نوید سارا دن باہر جوا کھیل کر رات کو شراب کے نشے میں دھت گھر آتے تھے انہیں منع کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ صبح ہوتے ہی وہ بھی مجھ پر احکامات صادر کردیتے تھے۔ تکلیف کا سارا کام کاج صرف میرے ذمے تھا۔

یہاں کوئی ایک فرد بھی میرا خیال نہیں رکھتا تھا۔ ہر کسی کو مجھے تکلیف دے کر ایک روحانی خوشی ہوتی تھی۔ مار پیٹ اور گالم گلوچ تو ان لوگوں کا شیوہ تھا اس طرح کی اذیت ناک اور پریشان کن صورتحال کا انجام بالآخر یہی ہونا تھا مجھے فکر تھی تو مستقبل کی۔ ''اب میں کہاں جاؤں گی؟'' میں نے سوچا۔ خدا نے مجھے اولاد سے بھی محروم رکھا تھا جو ایسے مشکل وقت میں جینے کا سہارا بنتی ہے۔ ماں بہت پہلے داغ مفارقت دے چکی تھی بھائی بہن کوئی تھے نہیں اور باپ...... وہ نہ جانے کہاں نشے میں دھت پڑا ہوگا۔ یہی سوچ کر میں پھر رونے لگی۔ ''یاخدا مجھے میری ماں کے ساتھ ہی کیوں نہ بلالیا مجھے دنیا میں اکیلا کس کے لئے چھوڑ دیا۔'' بہت دیر تک میں یونہی بے سدھ ہو کر پڑی رہی۔ تھوڑی دیر بعد ذہن کو کچھ سکون ملا تو میں نے ایک فیصلہ کیا۔ ''مجھے جینے کا کوئی حق نہیں مجھے مرجانا چاہئے۔ ہاں مجھے مرجانا چاہئے۔'' میں نے خود سے ہم کلام ہوتے ہوئے کہا اور سائیڈ ٹیبل کی دراز کھولی جس میں نشہ آور ادویات موجود تھیں۔ میں نے نجانے کتنی گولیاں ہتھیلی پر رکھیں اور پانی کا گلاس دوسرے ہاتھ میں پکڑا ابھی میں گولیاں کھانے ہی لگی تھی کہ ایک نام میرے ذہن کے کسی کونے میں چنگاری بن کر چمکا۔ ''اسلم'' اور گلاس میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔

''اسلم...... میرے بچپن کا ساتھی...... میرا پیار......!'' مجھے آج تک اس کے آخری الفاظ یاد ہیں۔

''رانی...... میں ساری عمر تمہارا انتظار کروں گا ہاں رانی تمہیں آنا ہوگا میرے لئے آنا ہوگا اپنے پیار کے لئے...... میں تمہارا انتظار کروں گا مرکر بھی تمہارا انتظار کروں گا۔''

اسلم ہمارے محلے میں رہتا تھا بچپن سے جوانی تک وہ ہر پل میرے ساتھ رہا ہم اکٹھے کھیلتے، اکٹھے پڑھتے غرض ہر کام ساتھ ہی کرتے تھے جوانی کی دہلیز پر قدم رکھا تو ابا نے اسلم سے ملنے پر پابندی لگادی لیکن اتنا طویل عرصہ تو جانور بھی ساتھ رہیں تو مانوس ہوجاتے ہیں ہم تو پھر انسان تھے۔ پیار کی کلی ہمارے دلوں میں کھل چکی تھی اسلم بہت خوبصورت اور کڑیل جوان تھا خوبصورتی میں، میں بھی کم نہ تھی گاؤں کے کئی جوان میرے راستے میں اپنا دل بچھائے بیٹھے تھے۔ میں کنوئیں پر پانی بھرنے کے بہانے اسلم سے ملنے جاتی تھی۔ ہمارا پیار بہت گہرا تھا ساگر سے بھی زیادہ......!

اسلم کی سب سے بڑی کمزوری اس کی غربت تھی۔ میٹرک تک پڑھنے کے بعد نوکری نہ ملنے پر اس نے گاؤں کے لوگوں کی طرح کھیتی باڑی کا شعبہ اپنالیا وہ اپنی بوڑھی ماں کے ساتھ گھر میں رہتا تھا۔

میرا باپ دولت کا رسیا تھا چاہے انسان جیسا بھی ہو دولت میرے باپ کو اپنی طرف کھینچ لیتی تھی اور اسے دوسرے انسان کے عیب بھی خوبیاں نظر آتے تھے میرا باپ جہاں دولت کا شیدائی تھا وہیں اس کی دوسری بری عادت تھی ''نشہ'' وہ رات کو باقاعدگی سے نشہ کرکے سوتا تھا۔ جوا بھی خوب کھیلتا تھا اکثر ہمارے گھر میں رات کو باہر کے لوگ دیر تک بیٹھے رہتے تھے۔ جوا اور شراب کی محفلیں جمتی تھیں شکر تو اس بات کا تھا کہ ابا نے کسی کو کبھی نہیں بتایا کہ اس کی ایک بیٹی بھی ہے ورنہ نجانے میرا کیا حشر ہوجاتا۔ میں بھی بہت کم گھر سے باہر نکلتی تھی میں شام کو ہی ضرورت کی اشیاء اپنے کمرے میں لے آتی اور دروازہ بند کرلیتی۔ ابا کب آتا، کب محفل ختم ہوتی کب لوگ جاتے اور کب ابا سوتا مجھے کچھ خبر نہ ہوتی۔

نوید امیر باپ کا ایک انتہائی خودسر اور ضدی بیٹا تھا۔ لاڈ پیار نے اسے اتنا بگاڑ دیا تھا کہ وہ جوا کھیلتا اور شراب پیتا تھا وہ ہمارے گھر باقاعدگی سے جوا کھیلنے آتا تھا نجانے کیسے اسے میرے بارے میں معلوم ہوگیا اور اس نے مجھے دیکھنے اور ملنے کی ضد پکڑلی۔

ایک روز رات کو مجھے پیاس محسوس ہوئی پانی کے جگ کی طرف دیکھا تو وہ پہلے ہی خالی ہوچکا تھا میں

نے جگ اٹھایا اور دروازہ کھول کر باہر چلی گئی برآمدے میں پڑے ہوئے گھڑے سے پانی جگ میں انڈیلا اور جونہی مڑی اپنے پیچھے ایک اجنبی کو دیکھ کر ٹھٹھک کر رک گئی رات کے اس پہر میرے سامنے ایک اجنبی کھڑا تھا چہرے مہرے سے امیر زادہ دکھائی دے رہا تھا میں نے فوراً ہی اس کی نظروں کی آلودگی محسوس کرلی اور دوپٹہ اپنے سینے اور سر پر درست کیا اور اسے نظر انداز کرتے ہوئے آگے بڑھنے لگی کہ اس نے پیچھے سے میرا دوپٹہ پکڑلیا۔

''ہمیں یونہی پیاسا لوٹادوں گی کیا......؟'' اس نے سرگوشی کی۔

''پانی سامنے موجود ہے پی لو'' میں نے اسے دیکھے بغیر فوراً جواب دیا۔

''ارے میری پیاس تو پانی سے نہیں بجھے گی'' اور وہ میرے بالکل سامنے آگیا پانی کا جگ میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور ایک زوردار تھپڑ کی آواز فضا میں گونج کر رہ گئی میں اسے دھکا دے کر اپنے کمرے میں آگئی اس نے پیچھے سے کہا ''تیرا یہ غرور خاک میں نہ ملادیا تو نوید نام نہیں میرا'' ابا نجانے کہاں تھا کہ اسے کسی کی آواز ہی نہ آئی۔ بہرحال اس واقعہ کے بعد نوید نے مجھے بہت پریشان کیا کبھی گھر سے باہر تو کبھی گھر آکر اور کبھی تو مدرسے جاتے ہوئے بھی...... ایک مرتبہ تو اس نے تین چار لفنگوں کے ساتھ مل کر مجھے ایک ویران گلی میں روک لیا۔ اگر اسلم وقت پر نہ پہنچتا تو نجانے وہ خبیث لوگ کیا کرتے۔ باپ کو جب بھی میں نوید کے بارے میں کچھ کہنے لگتی وہ الٹا مجھ پر ناراض ہوجاتا اور نوید کی شان میں قصیدے پڑھنے لگتا۔

کیونکہ نوید ہر روز اسے بہت سے روپے دیتا تاکہ وہ اس سے خوش رہے اسلم اور میں الگ پریشان تھے کہ اب کیا ہوگا اسلم نے مجھے کئی مرتبہ بھاگنے کا مشورہ دیا لیکن میں اسے یہ کہہ کر ٹال دیتی ''کیا پتہ قسمت میں ہمارا ملاپ لکھا ہوتو ایسے ہی بھاگ کر بدنامی کیوں مول لیں'' لیکن شاید یہی میری سب سے بڑی غلطی تھی کاش میں اسلم کے ساتھ بھاگ جاتی۔

بہرحال نوید نے مجھے اپنانے کی ضد پکڑلی اور یہ اس جیسے امیر زادے کے لئے کچھ مشکل بھی نہیں تھا میرے ابا کی جیب خوب اچھی طرح گرم کرکے اور نام نہاد نکاح پڑھوا کر مجھے اپنے قید خانے میں لے آیا میں نے کس مصیبت سے یہ کڑوا گھونٹ پیا یہ میں ہی جانتی ہوں۔ ابا نے مجھے میری مری ہوئی ماں کا واسطہ ہی نہ دیا بلکہ اپنی پگ بھی میرے قدموں میں ڈال دی۔ باپ چاہے جیسا بھی ہو ہوتا تو باپ ہی ہے اور بیٹی اپنی جان تو دے سکتی ہے لیکن اپنے باپ کی عزت کا سودا نہیں کرسکتی۔ اور باپ ہی کی عزت کے لئے میں نے اپنے پیار کی قربانی دے دی اور نوید سے شادی کرلی۔

مجھے آج بھی یاد ہے جب آخری مرتبہ میں اسلم سے ملنے کنوئیں پر گئی تھی اس نے مجھے صرف اتنا کہہ کر رخصت کیا تھا ''رانی میں ساری زندگی تمہارا انتظار کروں گا۔ مرکر بھی انتظار کروں گا وعدہ کرو رانی کہ تم ضرور آؤں گی'' اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ میرے ضبط کے بندھن بھی جواب دے گئے اور اپنے آنسو اس سے چھپانے کے لئے منہ دوسری طرف پھیر کر صرف اتنا ہی کہہ سکی۔ ''شاید''

اور اب جب حالات نے مجھے اس موڑ پر پہنچا دیا تھا کہ میں اپنی زندگی ختم کردوں تو مجھے اسلم کا خیال آگیا۔ میں نے ضرورت کا سامان باندھا اور اپنے آبائی محلے کی طرف چل پڑی۔ رکشہ والے کو بھاٹی پور چلنے کے لئے کہا اور تقریباً پون گھنٹے کی مسافت کے بعد میں اپنے محلے میں موجود تھی۔ سب کچھ ویسے کا ویسا تھا میں تقریباً سات سال کے بعد یہاں آئی تھی بیتے زمانے اور اسلم کو یاد کرکے میری آنکھوں میں آنسو آگئے میں نے اسلم کے گھر کی طرف قدم بڑھا دیئے گلی کے موڑ پر کسی عورت سے زوردار ٹکر ہوئی اور ہم دونوں گر پڑیں۔ نجانے وہ کہاں سے بھاگ کر میرے سامنے آگئی تھی میں نے خود کو سنبھالا اور ہم دونوں اٹھ کھڑی ہوئیں۔ لیکن یہ کیا...... میں اس کے چہرے کو

دیکھ کر ساکت سی ہوگئی۔ وہ اسلم کی امی تھیں۔ ''آنٹی کیا ہوا ہے آپ کو...... یہ آپ نے کیا حلیہ بنا رکھا ہے......؟''
ان کا حلیہ واقعی پاگلوں سے کم نہ تھا میلے کچیلے کپڑے جو جگہ جگہ سے پھٹ چکے تھے بکھرے ہوئے بال چہرے پر ویرانی اور وحشت۔

وہ مجھے گھورنے لگیں اور چند لمحوں کے بعد اس خاموشی کو زوردار قہقہے نے توڑا۔ ''ہاہاہا...... تم...... تم وہی ہو ناں...... شہزادی جس سے شہزادے نے پیار کیا تھا۔ ہاں ہاں تم وہی ہو۔ ہاہاہا مجھے دیکھو میں ملکہ عالیہ ہوں ہاں ملکہ ہوں یہ سارا گاؤں میری ملکیت ہے پر میرا بیٹا نجانے کہاں چلا گیا۔ دیکھو ناں...... اپنی ماں سے بھی کوئی ناراض ہوتا ہے بھلا لیکن خیر تم فکر نہ کرو میں اسے ڈھونڈ لاؤں گی ضرور ڈھونڈ لاؤں گی۔ ہاں تم...... تم جانا نہیں اچھا تم نہیں جانا۔ میں ابھی اسے لاتی ہوں...... ہاہاہا...... وہ قہقہے لگاتے ہوئے گلی میں تیزی سے دوڑتی ہوئی دور چلی گئیں جبکہ میں وہیں کھڑی ہو کر سوچنے لگی۔ ''یہ سب کیا ہے؟ آخر یہ کیا ماجرا ہے......؟''

''بہرحال میں اسلم کے گھر کی طرف دوبارہ چل پڑی لیکن وہاں پہنچ کر مجھے مایوسی کا سامنا کرنا پڑا کیونکہ دروازہ مقفل تھا۔ میں نے اسلم کے ساتھ والے گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا جہاں ہماری دور کی رشتہ دار نذیراں خالہ رہتی تھی میں اکثر ان کے گھر جاتی تھی دروازہ نذیراں خالہ نے خود ہی کھولا اور مجھے دیکھ کر حیران رہ گئی۔ ''رانی بیٹی تو...... تو زندہ ہے'' اور آگے بڑھ کر مجھے گلے سے لگا لیا۔ ''آ اندر آ جا'' اور مجھے اندر لے آئی۔

''بیٹا کیسی ہے تو۔ ہم تو سمجھے تھے کہ اس جواہار نے تجھے مار دیا ہوگا۔''

''نہیں خالہ اس نے مجھے موت سے بھی بھیانک سزا دی ہے۔'' اور میں نے شادی سے لے کر طلاق تک کے واقعات مختصراً خالہ کو سنا دیئے پھر ذرا توقف کے بعد میں نے پوچھا ''خالہ مجھ پر جو بیتی سو بیتی تم یہاں کا حال بتاؤ میں نے ابھی اسلم کی ماں کو دیکھا تھا انہیں کیا ہوگیا ہے اور اسلم کے گھر پر تالا کیوں ہے؟''

جواب میں خالہ نے ایک سرد آہ بھری اور بولی کیا بتاؤں بیٹی ان کے گھر پر تو جیسے قیامت ٹوٹ پڑی۔''

''کیوں خالہ......؟ کیا ہوا......؟'' میں نے حیرانی سے پوچھا۔

''بیٹا تم تو پیا کے گھر جا بیٹھی۔ نہ پوچھو کہ ان معصوم ماں بیٹوں کے ساتھ کیا ہوا؟''

''خدا کے لئے خالہ جلدی بتایئے ناں کیا ہوا اور اسلم کہاں ہے؟'' میں نے بے قراری سے پوچھا۔

''آہ اسلم......! وہ اب اس دنیا میں نہیں ہے'' خالہ بولی اور میرے منہ سے چیخ نکل گئی......

''کیا......؟''

''ہاں بیٹی تمہاری شادی کے کچھ عرصہ بعد ہی ان کے گھر رات کے اندھیرے میں چور گھس گئے تھے تھا ہی کیا بے چاروں کے پاس جو لے جاتے اسلم کی ماں کے ساتھ انہوں نے بدتمیزی کی تو اسلم سے رہا نہ گیا اور اس نے چوروں کے سردار کو گریبان سے پکڑ کر مارنا شروع کر دیا اس دوران ایک دوسرے چور نے 6 کی 6 گولیاں اسلم کے سینے میں اتار دیں اسلم کی ماں جس کے لئے اس کی کل کائنات اسلم تھا بیٹے کی موت برداشت نہ کر سکی اور اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھی اب بے چاری سارا دن گلیوں اور سڑکوں پر اپنے اسلم کو تلاش کرتی ہے'' خالہ نے تو سب کچھ بتا دیا لیکن میں تو جیسے سکتے میں آ گئی اور بچوں کی طرح دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔

''نہیں......! یہ نہیں ہو سکتا کہہ دو خالہ کہ یہ سب جھوٹ ہے کہہ دو۔ اسلم نہیں مر سکتا نہیں'' اور اس کے بعد مجھے یاد نہیں کہ کیا ہوا میں بے ہوش ہو کر خالہ کی گود میں گر پڑی۔

ہوش میں آئی تو خالہ کو قریب ہی پایا۔ ''شکر ہے خدا کا تمہیں ہوش تو آیا بیٹا اب کیسی طبیعت ہے۔''
میں نے مصنوعی مسکراہٹ چہرے پر سجاتے ہوئے کہا ''بہتر'' اور خالہ اٹھ کر باورچی خانے میں

جانے لگی کہ میں نے اسے روکا ”خالہ“۔
”کیا بات ہے بیٹی؟“ وہ مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔
”خالہ میں اسلم کے گھر جانا چاہتی ہوں۔“ میں نے کہا۔
اور ان کی آنکھیں حیرت وخوف کے ملے جلے تاثر سے پھیل گئیں۔ ”کیا؟“
”ہاں خالہ میں ادھر جانا چاہتی ہوں“ میں نے دوبارہ کہا۔
”نہیں بیٹی نہیں......! ایسی باتیں مت کرو اسلم کی موت اور اس کی ماں کے پاگل پن کے بعد ان کا گھر سنسان ہو گیا وہاں سے طرح طرح کی آوازیں آتی ہیں کبھی رات کے اندھیرے میں کوئی ہنستا ہے تو کوئی رو پڑتا ہے۔ کئی مرتبہ محلے کے لوگوں نے اسے کرائے پر دینے کی کوشش کی لیکن کوئی وہاں ایک رات سے زیادہ نہ ٹک سکا۔ بیٹا وہاں بھوت پریت کا بسیرا ہو گیا ہے۔“
”لیکن خالہ......“
”بیٹی نہیں تم ادھر مت جانا بھول کر بھی نہیں۔“
”کچھ بھی ہو خالہ میں ادھر ایک مرتبہ ضرور جاؤں گی“ میں نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔
”میں تو ویسے بھی اپنی زندگی سے مایوس ہو چکی ہوں ایک ہی امید کی کرن تھی اور وہ بھی بجھ گئی۔ اب میں زندہ نہیں رہنا چاہتی میں وہاں ضرور جاؤں گی“ اور میں چادر لئے بغیر باہر دوڑ پڑی رات کے دس بجے کا وقت تھا۔ خالہ شاید میرے پیچھے اس لئے نہیں آئی کہ وہ خود کوئی مصیبت مول نہیں لینا چاہتی تھی میں دن کے وقت خالہ کے گھر آئی اور اب رات نکل رہی تھی خالہ نے سوچا ہو گا کہ اپنے شوہر سے میرے آنے کی بات چھپا لے گی جیسے کچھ ہوا ہی نہیں اور اس میں کوئی حرج بھی نہیں تھا میرا ان سے کیا لینا دینا تھا بلکہ میں تو الٹا ان پر بوجھ بن جاتی۔ بہرحال میں پیچھے دیکھے بغیر اسلم کے گھر کی طرف چل دی گاؤں میں لوگ جلدی سونے کے عادی ہوتے ہیں اور بقول خالہ کے اسلم کا گھر اتنی پراسراریت کر چکا تھا کہ شام کے بعد تو یہاں سے کوئی گزرتا بھی نہیں تھا۔
میں دروازے پر پہنچی لیکن اس وقت میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب میں نے دیکھا کہ تالا کھلا ہوا تھا مجھے اچھی طرح یاد ہے دن کو تالا بند تھا خیر میں نے اللہ کا نام لیا کنڈی کھولی اور دروازے کو اندر دھکیلا دروازہ ہلکی چرچراہٹ کے ساتھ کھل گیا مکان کی اندرونی حالت بہت بوسیدہ ہو چکی تھی جگہ جگہ مکڑیوں نے جالے بن رکھے تھے ہر چیز گرد میں اٹی ہوئی تھی ہر طرف گہرا سناٹا اور ہو کا عالم تھا۔ ماحول بہت ہیبت ناک تھا لیکن مجھ جیسے زندگی سے بیزار انسان کے لئے یہ پراسراریت بے معنی تھی۔
میں نے اسلم کے کمرے کی طرف قدم بڑھا دیئے جس کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور روشنی چھن کر برآمدے میں آ رہی تھی جس سے اندازہ ہوتا تھا جیسے اندر لائٹ جل رہی ہے جونہی میں اندر داخل ہوئی ٹھٹھک کر رک گئی اندر کوئی دروازے کی طرف پشت کئے سفید لباس میں ملبوس کھڑا تھا۔ کمرہ روشنی سے چمک رہا تھا یہ کہنا بجا ہو گا کہ کمرہ بقعہ نور بنا ہوا تھا میں نے ہمت کر کے پوچھا ”کون ہو تم......؟“ اور جواب میں اس نے اپنا رخ میری طرف موڑ دیا ایک لمحے کے لئے جیسے وقت کی رفتار تھم گئی میرا دل دھڑکنا بھول گیا مجھ پر تو جیسے حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ آنکھوں پر یقین نہیں آیا کہ یہ حقیقت ہے یا خواب...... میرے سامنے میرا پیار...... اسلم کھڑا مسکرا رہا تھا میں دو قدم پیچھے ہٹ گئی مجھے پہلی مرتبہ خوف محسوس ہوا کیونکہ بقول خالہ کے اسلم تو سات سال پہلے مر چکا تھا تو پھر یہ...... وہ یقیناً اسلم تھا جو ہو بہو وہی...... میری آنکھیں دھوکا نہیں کھا سکتیں میں نے وہاں سے بھاگنے کا ارادہ کیا لیکن میرے قدم جیسے زمین نے پکڑ لیے تھے۔
”تم آ گئی رانی...... تم آ گئی...... میں نے کہا تھا ناں...... کہ تمہیں لوٹنا ہو گا میرے لئے اپنے پیار کے

لئے۔“ اس کی آواز کی جلترنگ میرے کانوں میں کسی ساز کی طرح بجنے لگی مجھے یہ سب ایک خواب لگ رہا تھا۔
”دیکھو رانی مجھے دیکھو...... میں تمہارا اسلم...... تمہارا پیار...... دیکھو میرا پیار کتنا گہرا ہے...... میں آج تک تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔“
”لال...... لل...... لیکن خالہ تو......!“ میں نے ڈرتے ہوئے کہا۔
”ہاں وہ صحیح کہہ رہی تھی میں آج سے سات سال پہلے قتل کر دیا گیا تھا یہ دنیا بڑی ظالم ہے پیار کرنے والوں کو کبھی ملنے نہیں دیتی۔ پہلے تمہارے ابا نے مجھ سے تمہیں چھینا تا کہ ہم نہ مل سکیں اور پھر دنیا والوں نے مجھ سے میرا جسم بھی چھین لیا تا کہ میں تمہارا انتظار نہ کر سکوں لیکن میں نے کہا تھا ناں کہ مر کر بھی تمہارا انتظار کروں گا“ پھر تھوڑے وقفے کے بعد دوبارہ بولا۔ ”ازل سے یہ دنیا پیار کی دشمن ہے لیکن جیت پھر بھی پیار کی ہوتی ہے دنیا نے میرا مادی جسم چھین لیا لیکن میری روح نہ چھین سکی۔ پیار تو نام ہی روحانی سمندر کا ہے دیکھو میرا انتظار ویسے ہی برقرار رہا آج پیار جیت گیا۔“
اور میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اُف خدایا کتنا گہرا پیار تھا اس کا اور میں نے اسلم کے لئے کیا کیا؟ میں وہیں چوکھٹ میں بیٹھ گئی اور رونے لگی۔
”مت روؤ رانی مت روؤ...... آج تو مجھے اتنے عرصہ بعد قرار آیا ہے تمہیں دیکھ کر اور تم رو رہی ہو۔“ اور میں اس کا چہرہ دیکھنے لگی۔
”رانی آج میرا وقت ختم ہوا۔ میرا انتظار ختم ہوا۔ مجھے قرار آ گیا اب میں جا رہا ہوں ہمیشہ کے لئے۔“
”نہیں اسلم نہیں...... تم نہیں جا سکتے مجھے چھوڑ کر...... دیکھو میری طرف بھی دیکھو تم سے بچھڑ کر مجھ پر کیا بیتی تم جانتے ہو کیا؟ نوید نے میرا کیا حشر کیا تمہیں کیا معلوم؟ اس نے مجھے طلاق دے کر اپنی زندگی سے الگ کر دیا ہے۔ میں اب کہاں جاؤں گی۔ میں تو خودکشی کرنے لگی تھی لیکن تم سے کئے ہوئے وعدے کی وجہ سے یہاں چلی آئی۔ تم اکیلے نہیں جاؤ گے اسلم میں تمہیں نہیں جانے دوں گی میں تمہارے ساتھ جاؤں گی مجھے ساتھ لے چلو اسلم اس ظالم دنیا سے بہت دور۔“ میں ایک ہی سانس میں سب کچھ کہہ گئی۔
”نہیں رانی...... قدرت نے شاید ابھی تک ہمارے نصیب میں ملاپ نہیں لکھا تمہیں جینا ہے جاؤ میری بوڑھی ماں کو سنبھالو۔ تمہیں تمہارے پیار کا واسطہ۔ مجھے مت روکو۔ مجھے بہت تکلیف ہو گی مجھے جانا ہے خدا نے چاہا تو ہم دوسرے جہان میں ساتھ ہوں گے اور نوید نے تمہارے اوپر ظلم کیا تمہیں اذیت سے ہمکنار کیا تمہاری ہنستی مسکراتی آنکھوں کو آنسوؤں کا سمندر بنا دیا گنگناتے ہونٹوں سے تبسم چھین لیا تمہیں دکھ مصیبت کی عمیق گہرائی میں دھکیل دیا تمہاری آنکھوں میں اس کے دیئے ہوئے آنسو میرے لئے ناقابل برداشت ہیں نوید کی زندگی میں ویران کر دوں گا بلکہ آج اس کی زندگی کی آخری رات ہے تم دعا کرنا“ اور وہ منہ موڑ کر کمرے کی عقبی دیوار کی طرف چل پڑا۔
”اسلم...... اسلم!“ میں چیخ پڑی اور اٹھ کر اس کے پیچھے دوڑ پڑی۔ ”اسلم خدا کے لئے ایک بار صرف آخری بار مجھے دیکھو۔ Please! اسلم مجھے دیکھو۔“ وہ دیوار کے بالکل قریب پہنچ چکا تھا۔ اچانک اس نے میری طرف اپنا رخ کیا اس کا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا۔ وہ بہت مشکل سے اپنے آنسو روک رہا تھا اس نے ہاتھ فضا میں بلند کیا اور لہراتے ہوئے بولا۔ ”خدا حافظ“
روشنی کا ایک جھماکا سا ہوا اور اسلم کا وجود دھوئیں میں تحلیل ہو گیا۔





بھیانک اقدام

نورین عابد

اس نے پیڈل روک دیئے مگر سائیکل کی رفتار اور بڑھ گئی اترائی ختم ہوتے ہی اس کے کانوں میں ایک زنانی آواز آئی ''کرمو آ گیا تو بہت انتظار کرایا ہے تو نے......''

کرم دین کا ایک کام نہیں تھا جو کام جس نے کہا وہ کر دیا کرتا تھا، شادی بیاہ کے نیوتے (شادی کے بلاوے) دینا ہوں، شادی پر کھانا پکانا ہو، جانور کا چارا کاٹنا ہو، کھانا کھلانا ہو یا کہیں پہنچانا ہو موت میت کی خبر دینا ہو ہر کام وہ کرتا تھا اس سے پہلے اس کا باپ یہ کرتا تھا۔ یہی اس کا روزی روزگار تھا۔

جب کوئی کام نہ ہوتا تو بڑوں کی بے گار اس کو کرنا پڑتی بال کاٹنے سے لے کر مل مل نہلانے تک کے کام اس کو کرنا ہوتے تھے فرصت تو اس کے مقدر میں تھی ہی نہیں۔

وہ گھر میں بھی ہوتا تو کوئی آ جاتا۔

''کرمو اوئے کرمو اوئے! کیا گھر میں موجاں کر رہا ہے جلدی چل چوہدری صاحب بلا رہے ہیں''

اور وہ اس کے ساتھ چل پڑتا۔ چوہدری اس کو دیکھ کر ناک سکوڑتا اور کہتا۔

''ارے گھر والی کے پاس پڑا رہتا ہے کچھ کام کی فکر بھی ہے چربی چڑھ گئی ہے شاید، دانے بند کر دوں گا تو پتہ لگ جائے گا۔''

کرم دین گردن جھکائے کھڑا رہتا زبان کو کھول ہی نہیں سکتا تھا وہ زبان کیا کھولتا زبان تو اس کے باپ نے نہیں کھولی دادا نے نہیں کھولی پھر اس کی جرأت کس طرح ہو سکتی تھی یہ زبان بندی بھی اس کے ہنر کا ایک حصہ تھی اگر وہ زبان پر قابو نہ کرتا تو اس کے سر پر چوہدری کا بھاری جوتا پڑ جاتا۔

اس کے گھر کا چولہا ٹھنڈا ہو جاتا وہ خاندانی غلام تھا۔ چوہدری کہتا ''اوئے کیا منہ میں باجرہ بھرا ہوا ہے کہ بولتا نہیں''

''حکم کرو سرکار'' وہ بڑی مشکل سے کہہ پاتا۔

''اوئے تیری گھر والی دن بھر کیا کرتی ہے گھر میں'' چوہدری بولا۔

''پتہ نہیں جی'' وہ بڑی عاجزی سے بولا۔

''اس کو کہہ دے چوہدرائن کے پاس آ جایا کرے حویلی میں کام بہت ہے'' چوہدری بولا۔

''ٹھیک ہے جی کہہ دوں گا'' کرم دین بولا۔

''اور تو سن جوڑی کا ایک بیل بیمار ہو گیا ہے اس کو گوجرانوالہ لے جا ڈاکٹر کے پاس دھیان سے دن بھر روٹیاں توڑتا رہتا ہے کام بھی کر لیا کرو اور شام کو مجھے آ کر بتا اب چل جا۔''

کرمو گردن جھکا کر حویلی سے باہر آ گیا باہر آتے ہی منشی مل گیا۔ بولا۔

''اوئے کرمو کہاں مر گیا تھا سرکار نے یاد کیا تھا''

''ان کے پاس سے ہی آ رہا ہوں'' وہ بولا۔

''آ میرے ساتھ میں نکل تیرے حوالے کر دوں۔ ذرا ہوشیاری سے لے جانا بڑی مہنگی جوڑی کا ہے اور شام تک آ جانا اور رپورٹ بتانا''

کرمو کے ذمہ ہر قسم کے کام تھے اس کی زبان پر

کسی کام کے لئے انکار نہیں تھا وہ کی تھا۔ اس کو تو کام کرنا تھا اس کو بھی بتایا گیا تھا کہ کر کے دکھایا گیا تھا۔

رات کے دس گیارہ کا وقت تھا کسی نے کرمو کو آواز دی، کرمو نے دروازہ کھول کر پوچھا۔ ”کون ہے بھائی“

”میں ہوں شکور چاچا جلدی چل سرکار نے یاد کیا ہے“

”اس اندھیری رات میں کیا کام پڑ گیا۔ چاچا“ کرمو بولا۔

”میں کیا جانوں حویلی میں چلت پھرت نظر آ رہی ہے“

”اچھا چل“ پھر اس نے آواز دے کر کہا۔ ”نہتو دروازہ بند کر لے میں حویلی جا رہا ہوں۔“

اور وہ دونوں چل پڑے۔

حویلی کے دروازے پر ہی چوہدری کھڑا تھا بولا۔ ”اتنی دیر لگا دی حرام خور دن بھر چرتا ہے کام کے وقت پڑا ہوا سو رہا ہے تیرا علاج کرنا پڑے گا“

کرمو اور شکو دونوں سہم کر خاموش کھڑے رہ گئے۔ وہ پھر بولا ”کرمو دوڑ کر جا اور برابر کے پنڈ میں میری گھر والی کی تائی زینب رہتی ہے تو نے اس کا گھر تو دیکھا ہے نا“

کرمو بولا ”دیکھا ہے جی“

”سائیکل پکڑ کسی کی اور دوڑ کر جا ذرا کہیں رکنا نہیں ہے سویرے اس کو لے کر آ جا“

”سائیکل مجھے کون دے گا منشی کو کہہ دیں“ کرمو بڑی مشکل سے بولا۔

”منشی کو بلا کے لا چل جلدی کر“

سائیکل کا انتظام ہوتے ہوتے ساڑھے گیارہ ہو گئے وہ گاؤں جہاں اس کو جانا تھا دس میل دور تھا پکا روڈ نہیں تھا کچے راستے پر جانا تھا، راستے میں دو نہروں کے پل کراس کرنا تھے کچے راستے کے دونوں طرف گنے کے کھیت تھے اس لئے کچے راستے پر جاتا آدمی دور سے نظر نہیں آتا تھا اور اس پر رات بھی اندھیری تھی سائیکل پرمٹی کے تیل کی بتی لگی تھی اور کیریئر بھی نہیں تھا اس نے سائیکل دیکھ کر منشی سے کہا تھا ”منشی تائی کو بٹھا کر کیسے لاؤں گا کیریئر تو ہے نہیں“

”ابے تو پورا گھامڑ ہے ڈنڈے پر بٹھا لینا“

”اور جو وہ ڈنڈا پر نہ بیٹھی تو“ کرمو بولا۔

”کہنا چوہدری کا حکم ہے بیٹھ جائے گی اب چل جا وقت برباد نہ کر۔“

کرمو محنت کرنے والا جوان تھا چھ فٹ کے لگ بھگ قد تھا اور محنتی جسم تھا ایک وقت میں اتنا کھاتا تھا کہ شہری صرف دیکھ کر حیران رہ جائے مگر خوراک کے ساتھ ساتھ اس کے کام بھی محنت کے تھے ایسے کڑیل جوان صرف دیہاتوں میں ہی نظر آتے ہیں اس کے باوجود اس کو کبھی یہ احساس نہیں ہوا کہ وہ کتنا طاقتور ہے چوہدری اور منشی جانتے تھے کہ کرمو طاقتور بھی ہے اور دلیر بھی ہے اسی لئے وہ اس کو ہر کام سونپ دیا کرتے تھے اور کرمو کر بھی لیا کرتا تھا۔ دس میل کچے راستے پر اندھیری رات میں جانا اور پھر سائیکل پر کسی عورت کو لانا آسان نہیں تھا۔

کرمو روانہ ہو گیا گاؤں سے باہر آتے ہی اس کو اندازہ ہو گیا کہ رات کتنی کالی ہے اس کے پاس ایک چاقو تھا وہ اس کو منشی نے دے دیا تھا۔

اس کے پیر پیڈل پر تیزی سے چل رہے تھے دور دور تک کسی روشنی کا نام نہیں تھا زمین ناہموار تھی سائیکل ہچکولے لے رہی تھی کچے راستے کے دونوں طرف کھیت تھے کبھی کبھی کوئی جانور کچے راستہ پر آ جاتا تھا۔

اب وہ نہر کے پل کے قریب تھا پل کے ایک طرف کوٹھڑی بنی تھی اور ایک پیپل کا درخت کھڑا تھا کوٹھڑی میں لالٹین کی روشنی تھی وہ چار میل سفر کر کے یہاں پہنچا تھا۔

کرمو نے سائیکل کھڑی کر دی اور کنڈا بجایا اندر سے آواز آئی۔ ”کون ہے رے“

”میں کرمو ہوں رادھے شام“ وہ بولا۔

”اچھا رک کھولتا ہوں“ پھر وہ دروازہ کھل گیا۔

”اوئے تو اتنی رات کو کیوں آیا ہے“ رادھے شام بولا۔

”چوہدری کا ایک کام پڑ گیا ہے کسی کو لینے جا رہا ہوں“ کرمو بولا۔

”سویرے دن میں آ جاتا اندھیری رات میں کیا آفت آئی تھی کہ چل پڑا“ وہ بولا۔

”تو تو ہے سرکاری نوکر اور میں ہوں چوہدری کا کمی میرے کام میں نہ تو ہے ہی نہیں چوہدری کا حکم ہے تو کرنا پڑے گا“ کرمو بولا“

”اچھا پانی پی لے اور اگر لسی پینی ہے تو بول سویرے کی ہے“ رادھے شام نے کہا۔

”نہیں میں صرف پانی پی لوں گا“ کرمو بولا۔

”اور تو نکل ہی پڑا ہے تو میری بات سن لے چھ میل کے بعد ایک پلیا ہے یہ تو مجھے پتہ ہے اس پر رات میں کوئی نہیں رہتا ہے اچھی جگہ نہیں ہے کوئی تجھے تیرے نام سے بھی آواز دے تیری منت بھی کرے تو رکنا نہیں وہ آواز دور تک تیرا پیچھا کرے گی مگر ہرگز نہ رکنا“

رادھے شام نے سمجھایا۔

”کون ہے وہ یہ تو بتا“ کرمو بولا۔

”ایک زنانی ہے تجھے دور سے بڑی خوبصورت لگے گی پر تجھے رکنا نہیں ہے“ رادھے شام بولا۔

”میں تو خود جلدی میں ہوں رکوں گا کیوں“ کرمو بولا۔

”تو جوان آدمی ہے، جوان آدمی جلدی عورت کے چکر میں آ جاتا ہے اس لئے بتا رہا ہوں“ رادھے بولا۔

”تیرا بڑا شکریہ اب چلتا ہوں رب راکھا“

اور کرمو روانہ ہو گیا اب گنے کے کھیت دونوں طرف تھے اس کے پیر پیڈل پر بہت تیزی سے گردش کر رہے تھے ہوا میں خنکی ضرور تھی مگر اس کا بدن پسینے سے تر تھا ہینڈل پر لگی بتی جل رہی تھی اس کی بہت معمولی روشنی زمین تک آ رہی تھی اس گھپ اندھیری رات میں اتنی روشنی بھی بہت تھی گنے کے کھیت ختم ہو گئے تھے اب دونوں طرف کھیت تھے اور اس کے سامنے نہر کا دوسرا پل تھا ذرا سی چڑھائی تھی اور پھر پل سے اترنے میں اترائی تھی۔

اس نے اپنی رفتار پہلے ہی بڑھا لی تھی تا کہ آسانی سے چڑھائی چڑھ جائے۔

وہ تیزی سے پلیا پر چڑھ گیا اب دوسری طرف اترائی تھی ڈھلان تھی اس نے پیڈل روک دیئے مگر سائیکل کی رفتار اور بڑھ گئی اترائی ختم ہوتے ہی اس کے کانوں میں ایک زنانی آواز آئی ”کرمو آ گیا تو بہت انتظار کرایا ہے تو نے“

کرمو آواز سن کر چونک پڑا رادھے کے الفاظ اس کے کانوں میں آئے ”رکنا نہیں ہے“

کرمو نے پیڈل پر اور زور بڑھا دیا۔

”ارے ٹھہر تو میری بات تو سن لے دیکھ تیرے لئے میں نے اصلی گھی کے پراٹھے بنائے ہیں وہ تو کھاتا جا“ آواز پھر اس کے قریب سے آئی۔

مگر اس کے ذہن میں رادھے شام کے الفاظ گردش کر رہے تھے وہ اور تیز ہو گیا۔

آواز آتی رہیں مگر اس کے سامنے کوئی نہیں آیا اس نے زنانی آوازیں سنیں مگر کسی زنانی کو دیکھا نہیں اور پھر آہستہ آہستہ آوازیں دور ہوتی گئیں۔

کرمو کا پورا بدن گیلا تھا پسینہ اس کے انگ انگ سے نکل رہا تھا راستہ اب بھی سنسان تھا اور کرمو کی رفتار میں بھی فرق نہیں آیا تھا پھر گاؤں کے آثار نظر آنے لگے تھے۔

کسان بھی کھیتوں کی طرف جاتے نظر آ رہے تھے اب اس کو حوصلہ ہو گیا تھا اس نے رفتار کم کر دی اور گاؤں میں داخل ہو گیا گاؤں کی گلیوں سے گزرتا ہوا وہ ایک مکان کے دروازے پر کھڑا ہو گیا سائیکل ایک طرف کھڑی کر کے اس نے دروازے پر دستک دی اندر سے کسی عورت کی آواز آئی۔ ”کون ہے“

کرمو نے کہا ”میں ہوں کرمو، چوہدری رحمت کے پاس سے آیا ہوں“

”ہائے ربا کی گل ہے اتنے سویرے“ اندر سے آواز آئی اور دروازہ کھل گیا۔

عورت نے کہا ”اندر آ جا اتنے سویرے کیسے آیا“

عورت جوان تھی زیادہ سے زیادہ اس کی عمر تیس

سال ہو گی۔
کرمو تو سمجھا تھا کہ تائی ہے تو کوئی بڑھیا ہو گی مگر وہ دور کے رشتے کی تائی لگتی تھی اور دائی کا کام بھی کرتی تھی۔
"مجھے تو پتہ نہیں جی کہ چوہدری کو کیا ضرورت آپ کی پڑ گئی ہے میں تو آپ کو لینے آیا ہوں" وہ بولا۔
"اس کی گھر والی کیسی ہے" عورت بولی۔
"مجھے کیا پتہ" کرمو نے کہا۔
"اچھا تو بیٹھ روٹی کھا لسی پی میرا گھر والا کھیت پر گیا ہے آتا ہی ہو گا وہ آ جائے تو پھر گل ہو گی" اور وہ کرمو کو بٹھا کر چلی گئی۔
کچھ ہی دیر میں ایک بوڑھا آدمی اندر آ گیا اور آتے ہی بولا کون ہے بھئی کیوں بیٹھا ہے؟"
"میں کرمو ہوں چوہدری رحمت کے پاس سے آیا ہوں" کرمو نے کہا۔
چوہدری رحمت کا نام سن کر وہ ٹھنڈا پڑ گیا بولا "چنگا بھئی کی حال ہیں چوہدری کے؟"
"ٹھیک ہیں" کرمو نے کہا۔
"ٹھیک تو ہونا ہے وڈے آدمی ہیں" وہ بولا۔
کرمو نے پوچھا تم "کون ہو تم نے بتایا نہیں؟"
"میں، ارے میں گھر والا ہوں رضو کا ہور کون" وہ بولا۔
کرمو ذرا سا چونکا مگر بولا کچھ نہیں رضو ایک ڈلیہ میں روٹی اور لسی لے آئی اور بولی "لے کھا مکھن بھی میں نے لگا دیا ہے"
رضو کھڑی رہی اور وہ دونوں کھانا کھانے لگے کھانے کے بعد رضو نے کہا۔
"چوہدری کی گھر والی کو کچھ پریشانی ہے یہ مجھے لینے آیا ہے تو کیا کہتا ہے"
وہ بولی۔ بوڑھے نے یہ سن کر ناک سیکڑ کر منہ بنایا اور بولا "میں نے تجھ سے یہ کام چھڑوا دیا ہے تو نہیں جا"
"تجھے پتہ ہے تو کیا کہہ رہا ہے تیرا ناس مار دے گا چوہدری اس کا دیا کھاتا ہے اور اکڑ دکھاتا ہے کچھ تو اس نوالے کی شرم کر" رضو نے کہا۔
"بوڑھا نرم پڑ گیا بولا "تو جائے گی تو آنے کا پتہ نہ ہو گا کہ کب آئے میں اکیلا کیا کروں گا"
"میں اپنی مرضی سے نہیں جا رہی اور نہ مرضی سے آ سکتی ہوں تجھے برداشت کرنا ہو گا" رضو نے کہا۔
"ٹھیک ہے تو جا میں چوہدری کی بات موڑ نہیں سکتا۔
"یہ تو سائیکل لایا ہے میں پیدل جاؤں گی" رضو نے کہا۔
"ہاں سائیکل پر نہ بیٹھنا" بوڑھا بولا۔
رضو نے اپنے گھریلو کام نمٹائے اور گیارہ بجے دن کو ہم واپس روانہ ہوئے۔
گھر سے کچھ دور تک بوڑھا ہمارے ساتھ آیا اور پھر لوٹ گیا۔
میں نے سائیکل کا ہینڈل پکڑا ہوا تھا رضو میرے برابر چل رہی تھی اس نے بھی ایک ہاتھ سے ہینڈل پکڑا ہوا تھا اس کے کپڑوں کی ایک پوٹلی میں نے ہینڈل سے باندھ دی تھی دوسری اس نے ہاتھ میں لٹکائی ہوئی تھی گاؤں کی پگڈنڈی ختم ہو گئی تھی کچا راستہ آ گیا تھا دھوپ میں بھی تیزی آ گئی تھی رضو کا رنگ صاف تھا اس لئے دھوپ میں وہ اور سرخ ہو گئی تھی میں نے اس کو سائیکل پر بیٹھنے کا نہیں کہا کیونکہ وہ پہلے ہی انکار کر چکی تھی۔ میں نے اس کا چہرہ دیکھ کر کہا۔ "تھک جائے تو بتا دینا"
وہ ہنس کر بولی "تھک تو میں ابھی گئی ہوں"
"تو پھر رک جاتے ہیں ذرا آرام کر کے پھر آگے چلیں گے" میں نے کہا۔
"ہاں یہ ٹھیک ہے بھوک بھی لگ رہی ہے میں کھانے کو لے آئی ہوں آم کا اچار اور آلو والے پراٹھے ہیں تجھے اچھے لگیں گے" رضو بولی۔
ایک درخت کے سائے میں، میں نے سائیکل کھڑی کر دی۔ رضو نے گٹھری کھول کر ایک چادر نکالی اور اس کو زمین پر ڈال دیا اور بولی۔
"لے اب تو بھی بیٹھ جا میں روٹی دیتی ہوں"
اچار کے ساتھ پراٹھے بہت اچھے لگ رہے تھے

چار موٹے موٹے پراٹھے وہ دونوں کھا گئے کھانے کے بعد رضو نے کہا۔
"تو کب سے چوہدری کے پاس" وہ اس کا یہ سوال سن کر ہنس پڑا تو وہ پھر بولی۔
"اس میں ہنسنے والی کیا بات ہے بتا نا؟"
"میرا باپ چوہدری کے پاس تھا اس سے پہلے اس کا باپ تھا میں اپنے باپ کی جگہ پر ہوں ہی لوگ تو خاندانی خدمت گار ہوتے ہیں میرے بعد میری اولاد یہی کرے گی جو میں کرتا ہوں" میں نے جواب دیا۔
"میں نے تجھے نہیں دیکھا تھا اس لئے پوچھ لیا" رضو بولی۔
"تو یہ بتا تو اس کی گھر والی کی تائی ہے" میں نے پوچھا۔
"نہیں میں اس کی گھر والی کی کچھ نہیں ہوں اس کی گھر والی جس پنڈ کی ہے اسی پنڈ کی میں ہوں چوہدری کی اس پنڈ میں بھی زمینداری ہے وہ وہاں پر آتا جاتا تھا اس کی خدمت میں اور وہ دونوں کیا کرتی تھیں جو اس کی گھر والی ہے اس کا نام کول ہے بڑی چالاک عورت ہے اور ساتھ ساتھ خوبصورت بھی ہے اس نے چوہدری پر ایسا چکر چلایا کہ چوہدری اس کا دیوانہ ہو گیا مگر وہ کول سے بیاہ نہیں کر سکتا تھا اس نے ہم دونوں کو پنڈ میں رکھا ہوا تھا خوب خرچ دیا کرتا تھا میرا تو کوئی آگے پیچھے تھا ہی نہیں کول کے باپ کو اس نے دبا رکھا تھا مگر کول کے ذہن میں تو حویلی سما گئی تھی چوہدری کو آخر اس نے مجبور کر دیا کہ وہ اپنی بیوی کو طلاق دے دے اور کول سے شادی کر لے اور کول نے آخر اپنی منزل پا لی اور وہ حویلی چلی گئی میں پنڈ میں اکیلی رہ گئی مگر میرا خرچ چوہدری دیتا رہا اس نے اس معاملے میں کبھی کنجوسی نہیں کی میں نے جو مانگا اس نے دیا وہ ہفتہ پندرہ دن میں میرے پاس آتا تھا میں اس کی خدمت بیوی کی طرح کرتی تھی کول کو پتہ تھا کہ چوہدری میرے پاس آتا ہے۔
عورت جب بیوی بن جاتی ہے تو وہ اپنے آدمی کو پلو میں باندھ کر رکھنا چاہتی ہے پھر وہ اس کے قریب کسی

آیت کریمہ سے مشکلات کا حل

بدخوابی کے لئے: جو نیند کی حالت میں پریشان خواب دیکھتا ہو وہ اس آیت کو لکھ کر گلے میں ڈالے یا سوتے وقت پڑھ لیا کرے تو انشاء اللہ خواب بد سے محفوظ رہے گا۔ لَهُمُ الْبُشْرٰى فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ لَا تَبْدِيْلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ. (سورۃ یونس۔ 10 آیت۔ 64) لا الہ الا انت سبحانک انی کنت من الظلمین.

درد سے نجات کے لئے: جسم کی لمبائی کے برابر کچے سوت کا نیلا دھاگہ سات مرتبہ ناپیں اور اس کو اتنا چھوٹا کر لیں کہ گلے میں ڈالا جا سکے۔ اب ایک مرتبہ سورہ یاسین (36) ایک مرتبہ بسم اللہ الرحمن الرحیم، فبای الاء ربکما تکذبن. لا الہ الا انت سبحانک انی کنت من الظلمین پڑھیں اور دھاگہ میں ایک گرہ دیں۔ اسی طرح اکیس گرہیں لگائیں اور یہ گنڈا مریض کے گلے میں ڈال دیں۔ شفایابی کے بعد گنڈا اتار کر نہر یا دریا میں یا سمندر میں بہا دیں۔

قوت حافظہ کے لئے: صبح نہار منہ وضو کر کے دس مرتبہ لا الہ الا انت سبحانک انی کنت من الظلمین پڑھیں اور تین مرتبہ رب یسر ولا تعسر پڑھیں اور پانی پر دم کر کے پی لیں۔ اس عمل کو چالیس روز تک برقرار رکھیں۔ اگر کسی وجہ سے ناغہ ہو جائے تو دن شمار کر کے بعد میں پورے کر لیں۔

عورت کو پسند نہیں کرتی یہ وہی کومل تھی جو میرے ساتھ چوہدری کی خدمت کرتی تھی مگر اب اس کو اچھا نہیں لگتا تھا کہ میں چوہدری کے قریب جاؤں مگر چوہدری ایک مرد تھا اس کو عیاشی کرنی تھی مرد کی فطرت تو یہ ہے کہ عورت جب تک اس کی محبوبہ رہتی ہے وہ اس کے لئے آسمان سے تارے توڑنے کو تیار رہتا ہے اور جب وہی محبوبہ اس کی بیوی بن جاتی ہے تو پھر اس میں سو کیڑے اس کو نظر آنے لگتے ہیں کومل اب بھی خوبصورت ہے مگر چوہدری کی نظر میں اب ایسی نہیں رہی میں کومل سے انیس ہوں مگر چوہدری کی نظر میں بیس ہوں میں خود چوہدری سے جان چھڑانا چاہتی ہوں مگر کیا کروں نہیں چھڑا سکتی" رضو نے کہا۔

"اور تمہارا گھر والا جو ہے اس کو پتہ ہے یہ سب"

"وہ میرا گھر والا کیا ہے صرف دنیا کو دھوکہ دینے کو چوہدری نے اچھی طرح دیکھ بھال کر اس کو میرے متھے مارا ہے اگر وہ مضبوط اور کماؤ مرد ہوتا تو میں چوہدری کی غلامی کیوں کرتی"

"کومل تو تجھے اب پسند نہیں کرتی ہوگی پھر تو حویلی میں کس طرح رہتی ہے" میں نے پوچھا۔

"کومل چوہدری کی بیوی تو بن گئی ہے مگر ابھی تک کمزور ہے" وہ بولی۔

"کمزور یہ کیا بات ہوئی" میں نے پوچھا۔

"تو مرد ہے نہیں جانتا عورت کمزور اس وقت تک رہتی ہے جب تک اس کو اولاد نہیں ہوتی"

"اور اگر کومل ماں بن گئی تو پھر تیرا راستہ بند" میں نے کہا۔

"کومل کبھی ماں نہیں بن سکتی یہ مجھے اچھی طرح معلوم ہے کچھ دنوں کی بات ہے کہ کومل باہر اور میں حویلی میں ہوں گی" رضو نے بتایا۔

"تو نے یہ سب پروگرام سے کیا ہے" میں نے پوچھا۔

"ہاں پوری تیاری اور پروگرام سے کیا ہے"

"تو بہت گہری عورت ہے مگر عورت پھر عورت ہے مرد کے التفات کی بھوکی مرد ذرا التفات کا اظہار کرے تو عورت موم ہو جاتی ہے۔ اپنا دل نکال کر سامنے رکھ دیتی ہے" میں نے کہا۔

"تیری یہی بھول ہے سب کچھ عورت کبھی نہیں نکالتی۔ کچھ نہ کچھ بچا کر ضرور رکھتی ہے" رضو بولی۔

"میں عمر میں تیرے برابر ہی ہوں گا مگر شاید تجربے میں تو زیادہ ہے اب چلنے والی کر و دیر ہوگئی تو میری شامت آ جائے گی" میں نے کہا۔

"میرے ہوتے ہوئے تیرا کچھ نہیں ہوگا تجھ سے ایک ضروری گل کرنی ہے بول کروں۔" رضو بولی۔

"کر لے مگر ذرا جلدی کر چوہدری معاف کرنے والا بندہ نہیں ہے" میں نے کہا۔

"کومل اور میرے علاوہ اس کی اپنی جورو بھی تھی اور نہ جانے کہاں کہاں چوہدری نے منہ مارے ہیں مگر اب چوہدری کمزور ہو چکا ہے مگر مجھے حویلی میں اپنا راج قائم کرنا ہے میری جڑیں اس حویلی میں اس وقت ہی ہوں گی جب میں چوہدری کو اولاد دوں گی۔ چوہدری سے مجھے ذرا امید نہیں کہ وہ میرا ساتھ دے گا اس لئے تجھے میرا ساتھ دینا ہوگا" رضو نے مسکرا کر کہا۔

رضو کی مسکراہٹ میں ایک دعوت تھی مرد کی عقل پر عورت ایک منٹ میں پردہ ڈال دیتی ہے لوگ کہتے ہیں عورت ماں بننے کے معاملے میں عقل سے کم اور جذبات سے زیادہ کام لیتی ہے۔

مگر یہ بڑی ہوشیار عورت تھی جو پورا پروگرام بنا کر قدم آگے بڑھا رہی تھی ہر طرف اس کی نظریں تھیں کوئی خانہ خالی نہ نہیں چھوڑ رہی تھی میں کچھ دیر خاموش رہا پھر بولا۔

"تو قدرت سے لڑ رہی ہے اگر اس پر بھی اولاد نہ ہوئی تو تیرا حشر بھی کومل جیسا ہوگا جس طرح کومل کا نشہ چوہدری سے اتر گیا ہے تیرا بھی اتر نہیں جائے گا پھر تو کیا کرے گی"

"تقدیر سے کون لڑ سکتا ہے مگر کوشش تو کرنا ضروری ہے" وہ بولی۔

"تو نے بڑا اچھا پروگرام بنایا ہے تیرے ذہن میں پہلے سے تھا" میں نے پوچھا۔

"پہلے سے تھا مگر صاف نہیں تھا میں نے تجھے دیکھا تو پورا پروگرام خود بخود میرے سامنے آ گیا میں جانتی ہوں کومل کا اب وقت پورا ہو گیا ہے چوہدری نے آخری ملاقات میں مجھے کہا تھا میں اور زیادہ انتظار نہیں کر سکتا اور میں نے اسی رات یہ اندازہ کر لیا تھا کہ اب چوہدری اٹل قدم اٹھائے گا۔ مگر میں نے پھر بھی اس کی حویلی آباد کرنے کا پروگرام نہیں بدلا میری اولاد اس حویلی کی وارث ہوگی یہ میری تمنا ہے میرا خواب ہے میں اس خواب کو تمہارے ذریعے پورا کروں گی" وہ بولی۔

"وراثت تو باپ کے نام سے چلتی ہے نام تو چوہدری رحمت کا ہی رہے گا میں کس خانے میں رہوں گا"

"تیری یہ بات درست ہے تو ایک کمی ہے مگر پھر کمی نہیں رہے گا تجھے عزت کا مقام دلاؤں گی تو چوہدری تو نہیں بن سکتا مگر چوہدری سے کم بھی نہیں ہوگا تو شہر جا کر کمی نہیں رہے گا جو لوگ اپنے گھر میں اپنے پنڈ میں بے نام و نشان ہوتے ہیں باہر جا کر نام والے اور عزت والے ہو جاتے ہیں شہر میں کون جانے گا کہ تو ایک کمی ہے شان سے رہنا میں تیری مدد کروں گی میرے بچے بھی تجھ سے کوئی رشتہ قائم کر لیں گے اور تو ان کو بھی دیکھ سکے گا یہ معاملہ تیرا اور میرا ہوگا" رضو نے کہا۔

"تیرے پروگرام تو بہت لمبے ہیں" میں نے حیرت سے کہا۔

"تیری صورت دیکھتے ہی سارا پروگرام میرے سامنے آ گیا" رضو نے کہا۔

"اچھا اب چلنے والی کر بہت دیر ہو گئی ہے" میں نے کہا۔

"تو پہلے یہ بتا تیری کیا مرضی ہے۔ اگر تو نا کرے گا تو پھر مجھے پورا پروگرام بدلنا ہوگا مگر جواب دینے سے پہلے خوب غور کر لے منع کرے گا تو تیرا ٹھکانا گاؤں میں نہیں رہے گا ہاں کرے گا تو میرے ساتھ ساتھ تو بھی عیش کرے گا دونوں باتیں بتا دی ہیں میں تو کوئی اور راستہ نکال ہی لوں گی تو نہ ہوا تو کوئی اور تیری جگہ آ جائے گا تو اپنی سوچ تیرا کیا بنے گا" رضو نے کھلی دھمکی دیدی۔

"عورت بڑی ہٹ دھرم ہوتی ہے" میں نے سوچا "اگر منع کر دوں تو یہ ضرور میرا بیڑا غرق کرا دے گی"

"میں تجھ سے نا تو کر ہی نہیں سکتا تو نے مجھے ہر طرف سے گھیر لیا ہے" کرمو نے کہا۔

"تو منع کر سکتا ہے میری فکر نہ کر میں نے پوری بات کسی بھروسے پر ہی بتائی ہے میں جانتی ہوں کہ تو میرا راز کسی پر ظاہر نہیں کر سکتا اور کرے گا تو خود اپنے پیروں پر کلہاڑی مارے گا میرا کچھ نقصان نہیں ہوگا"

"چل اب میں ڈنڈے پر بیٹھوں گی اور تو سائیکل چلائے گا" رضو نے دلفریب مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"میں کھڑا ہو گیا میں نے سائیکل ہینڈل سے پکڑ کر کھڑی کر لی اور رضو آگے ڈنڈے پر بیٹھ گئی راستہ کچا تھا ریت میں پیڈل پر بہت زور لگانا پڑ رہا تھا اس کا جسم میرے بازوؤں کے درمیان تھا میں پیڈل چلانے کو پیروں پر زور ڈالتا تھا تو اس کے جسم پر زور پڑتا تھا۔

"تو میرے اندازے سے کچھ زیادہ ہے" رضو بولی۔

"ابھی سے تو نے اندازہ کر لیا" میں نے کہا۔

"عورت مرد کی ایک نگاہ کا ٹھیک ٹھیک اندازہ کر لیتی ہے اسی طرح اس کے اندازے ہر معاملے میں ٹھیک ہوتے ہیں میرا جو اندازہ ہے وہ بھی ٹھیک ہوگا"

باتیں کرتے شام پانچ بجے ہم پنڈ کے قریب آ گئے تو رضو بولی "اچھا اب پیدل چل اگر چوہدری پوچھے کہ دیر کیوں ہوئی تو کہنا میں پیدل آئی ہوں سائیکل پر نہیں بیٹھی دو تین جگہ رک کر آرام بھی کیا تھا میں بھی یہی کہوں گی پھر اس کو یقین آ جائے گا اور میرا وقار بھی بڑھے گا کہ میں تیرے ساتھ سائیکل سے نہیں آئی

ہوں دونوں کی عزت بڑھ جائے گی"

واہ ری عورت میں نے سوچا ہر بات کا جواب پہلے سے تیار کر کے رکھا ہے۔

چوہدری میرا انتظار کر رہا تھا میری شکل دیکھتے ہی بھڑک گیا بولا "اوئے کہاں مر گیا تھا"

"سرکار پیدل آیا ہوں رکتا رکتا" میں نے کہا۔

"سائیکل تو تیرے پاس تھی پھر رکتا رکتا کیوں؟ وہ بولا۔

"جی وہ رضو بی بی نے سائیکل پر بیٹھنے سے انکار جو کر دیا تھا دونوں پیدل ہی آئے ہیں" میں نے کہا۔

"اچھا ٹھیک ہے چل دفع ہو" اور چوہدری اندر چلا گیا۔

عورت ہی عورت کی دشمن ہوتی ہے بزرگوں کا کہا ہوا پورا ہوا اور کومل کی جگہ رضو آ گئی کومل نے ہر شرط مان لی تھی مگر رضو نے صرف ایک شرط چوہدری کے سامنے رکھی تھی کہ کومل کو طلاق دے پھر نکاح کروں گی۔

چوہدری کے سر سے کومل کا بھوت اتر چکا تھا۔

چند دن میں رضو بیگم کے ٹھاٹ ہی کچھ اور ہو گئے اس نے پرانے اور بوڑھے ملازمین کو حویلی سے دور کر دیا بہت آہستہ آہستہ کرمو کا آنا جانا بڑھتا گیا۔

چوہدری آزاد طبیعت کا آدمی تھا حویلی میں رات کو رہتا تھا دن بھر کورٹ کچہری اور نہ جانے کہاں کہاں پھرتا رہتا رات کو آتا تو بیگم بن ٹھن کر اس کے لئے دستر خوان لگاتی اور اس کی سارے دن کی تھکن اتار دیتی کومل میں یہ خوبی نہیں تھی وہ حسین زیادہ تھی اس لئے کچھ لا پرواہ بھی تھی عورت حسین ہو تو اپنے مرد سے چاہتی ہے اس کی تعریف کرے اگر وہ تعریف کر دے تو سمجھتی ہے یہ تو اس کا حق ہے اور اگر نہ کرے تو خود میں کمی محسوس کرتی ہے اور یہی احساس دھیرے دھیرے اس کا سکون برباد کر دیتا ہے۔

کومل کے برعکس رضو بڑی ہوشیار تھی اس نے چوہدری کو خوب پڑھا تھا نکاح سے پہلے بھی اور نکاح کے بعد بھی، تو وہ چوہدری کو بہت دور تک جان گئی تھی اس کی ہر کمزوری اور خوبی پر اس کی نظر تھی چوہدری کے روز کے معمولات اس کے سامنے تھے۔

چوہدری کے جانے کے بعد کرمو آتا تھا۔ حویلی میں اندر کوئی نہیں ہوتا تھا صرف دروازے پر ایک آدمی رہتا تھا کرمو کے ذمہ بظاہر یہ کام تھا کہ کمرے کو چیک کرے اندر باہر کی صفائی کروائے مگر وہ سات بجے آ جایا کرتا تھا جبکہ صفائی کرنے والی نو بجے آیا کرتی تھی حویلی کے باہر کچھ ہو اندر کوئی نہیں آتا تھا کرمو نے جو کام کرنے ہوتے تھے وہ کرتا تھا اب کرمو کے پاس زیادہ کام نہیں تھے۔

سات بجے سے وہ رضو کی خدمت میں رہتا تھا اور پھر اپنے کام کرتا تھا اس کے لئے حویلی کا باورچی خانہ کھلا پڑا تھا وہ جو چاہتا تھا اس کا ہاتھ کون روکتا۔

رضو نصیب کی دھنی تھی اس نے چوہدری کو تین ماہ کے بعد ہی خوشخبری سنا دی۔

چوہدری اس خبر کو سننے کو بے چین تھا دو بیویاں جو خبر نہ سنا سکیں وہ رضو نے سنا دی اس کے سامنے رضو کا مقام بہت بلند ہو گیا اور اس نے رضو کی خدمت کو اور انتظامات کر دیئے۔ کرمو کی عزت میں اضافہ رضو نے کر دیا اس کو پوری حویلی کا انچارج بنا ڈالا۔

اب کرمو بات بات پر دوڑتا نہیں پھرتا تھا وہ دوسرے نوکروں پر حکم چلا کر ان سے کام لیتا تھا۔

اب چوہدری بھی زیادہ وقت حویلی میں رہتا تھا اور کرمو کی ڈیوٹی رضو کے پاس کم ہو گئی تھی۔

وہ چوہدری کی موجودگی میں اس کے پاس جاتا تھا اور چوہدرائن کے کام کرتا تھا۔

رضو بیگم جب سے چوہدرائن بنی تھی اس کے طور طریقوں میں تبدیلی آ گئی تھی ایسا لگتا تھا کہ اس نے پہلے سے چوہدرانی بننے کی ریہرسل کر رکھی تھی اس نے اپنے پلان کے مطابق سارے کام کیے تھے۔ کرمو کو اس نے اپنے پروگرام کے مطابق استعمال کیا ابھی کرمو کا کردار باقی تھا اس نے اس کو باقی رکھا ہوا تھا۔

اور ٹھیک نو ماہ کے بعد رضو نے ایک لڑکے کو جنم دیا۔

حویلی میں خوشیوں کا سیلاب آ گیا۔ چوہدری کا وارث پیدا ہو گیا رضو بیگم کا وقار آسمان سے باتیں کرنے لگا چوہدری نے دل کھول کر خوشی منائی۔

چوہدرائن کی جڑیں حویلی کے بہت نیچے تک چلی گئیں اب وہ ایک تناور درخت تھی اس کا حکم چوہدری اور پوری حویلی پر چلتا تھا چوہدری اس کے حکم کا غلام تھا۔

کرمو اپنے کام کر رہا تھا دوسرے سال پھر چوہدری کو خوشی مل گئی یعنی چوہدرائن نے پھر ایک لڑکے کو جنم دیا مگر اس کے ساتھ یہ بھی ہوا کہ کرمو کی گھر والی نے ایک لڑکی کو جنم دیا کرمو کا کردار ابھی باقی تھا۔

اور اس طرح چوہدرائن نے چار لڑکے پیدا کر دیئے رضو پوری طرح چوہدرائن بن گئی۔

اسی طرح کرمو کی بیوی نے چار لڑکیاں پیدا کر دیں۔

اب کرمو کا کردار اس ڈرامے میں ذرا کم ہوا اس کو بھی احساس ہو گیا تھا۔

مگر رضو بیگم کے ساتھ رہ کر اس کو کچھ عقل آ گئی تھی اور کچھ عقل اس کی بیوی نے پہلی بچی پیدا ہوتے ہی اس کو دے دی تھی اس کے بعد پانچ سالوں میں اس نے بیوی کو اتنا کما کر دے دیا تھا کہ سب کے لئے کافی تھا۔

شہر بسنے رہنے کی صلاح تو رضو بیگم اس کو بہت پہلے دے چکی تھی کہ اس کے دماغ میں یہ بات بھی تھی اس نے اس کو بھی ذہن میں رکھ کر پلان بنایا تھا پلان بنانا اور اس پر عمل کرنے کا طریقہ بھی اس نے رضو سے سیکھا تھا رضو کا پلان اس کے سامنے تھا مگر اس نے جو پلان بنایا تھا وہ اس نے کسی کو نہیں بتایا تھا۔

وہ انتظار کر رہا تھا کہ رضو بیگم خود اپنی زبان سے کچھ کہے اس لئے اس کا پلان تو پورا ہو چکا تھا اس پلان کا آخری حصہ کرمو ہی تھا اور کرمو خود سے کچھ کہنا نہیں چاہتا تھا اس لئے کہ پلان تو چوہدرانی کا تھا اس کو ہی پلان پورا کرنا تھا اور کرمو کا کردار اس ڈرامے سے ختم کرنا تھا۔

مگر اس انتظار میں پانچ سال گزر گئے بچے بڑے ہونے لگے کرمو نے بہت کچھ جمع کر لیا تھا شہر میں مکان خرید لیا آتے وقت کی تیاری میں وہ لگا تھا شہر میں اور بھی کچھ اس نے خریدا مگر اس کی ہوا کسی کو نہیں لگنے دی۔

رضو بیگم نے اس کی طرف سے کبھی ہاتھ نہیں روکا اس کے اختیارات کم نہیں ہوئے صرف اتنا ہوا کہ اب اس کا آنا جانا چوہدرانی کے کمرے میں کم ہو گیا تھا۔ رضو نے اس کو گاؤں میں عزت کا مقام دلا یا وہ کرمو سے کرم دین بن گیا اور چوہدری کا خاص آدمی بن گیا۔ اس کا کہا ہوا چوہدری بھی مانتا تھا مگر وہ اندر سے بے چین تھا اور انتظار کرتا کہ آج چوہدرانی مجھے شہر جانے کو کہے گی مگر شام ہو جاتی آہستہ آہستہ اس کی بے چینی میں اضافہ ہوتا گیا وہ ہر وقت کھویا کھویا سا رہنے لگا۔

اندر کی پریشانی چہرے پر تو ظاہر ہو ہی جاتی ہے رضو نے اس کا چہرہ فوراً پڑھ لیا "کیا بات ہے کرم دین تم کچھ پریشان لگتے ہو" رضو نے پوچھا۔

"ہاں چوہدرانی میں پریشان ہوں" کرمو نے جواب دیا۔

"مجھے بتاؤ کیا پریشانی ہے" چوہدرانی بولی۔

"میرا خیال ہے میرا کام ختم ہو گیا ہے اب تک میں نے جو کیا وہ تمہارے پروگرام میں تھا میں نے اس سے ہٹ کر کوئی کام نہیں کیا اب اگر اس عمر میں ذرا سی چوک ہو گئی تو میں یہ سوچ کر بے چین ہوں میں سمجھتا ہوں اب میرا یہاں رہنا کسی طرح ٹھیک نہیں ہو گا میں تمہارے کہنے کا انتظار پانچ سال سے کر رہا ہوں مگر تم نے اپنے پروگرام کے آخری حصہ پر اب تک عمل نہیں کیا" کرمو نے کہا۔

چوہدرانی نے بڑے سکون سے کرمو کی بات سنی۔ پھر بولی۔

"میرے چوہدری تم ہو میرے بچوں کے باپ تم ہو، بے شک۔ میرا پلان تھا کہ تم کو شہر میں آباد کروں گی مگر میں تم کو خود سے جدا نہیں کر سکتی تم وہ ہو جو چوہدری نہیں ہے تم سمجھتے ہو گے کہ میرا پلان بہت کامیاب ہے مگر

میرے پلان میں یہ نہیں تھا جواب میرے سامنے آیا ہے میں تم سے محبت کرنے لگی ہوں تم کو اپنے قریب رکھنا چاہوں گی یہ میرے پلان میں نہیں تھا دیکھو کیسی عجیب بات ہے نہ تم اس عمر میں ہو کہ محبت کا کھیل رچاؤ نہ میں اس عمر میں ہوں کہ یہ سوچوں مگر ایسا ہی ہوا ہے میرے دل میں تمہارے لئے یہ جذبہ کیوں پیدا ہو گیا اور پیدا ہوا تو اس وقت کیوں پیدا ہوا اگر اس پیڑ کے سائے میں ہو جاتا جہاں پر بیٹھ کر ہم نے اچار سے پراٹھے کھائے تھے تو میں کتنی آزادی تھی فوراً تمہارے ساتھ لگ جاتی۔

اگر اس وقت پیدا ہوتا جب ہم پہلی بار کمرے کی تنہائی میں ملے تھے تو میں ہمیشہ کے لئے تمہارے پاس آ جاتی میرا پلان پورا ہوا تمہارا کام ختم ہوا مگر اب تم کو جدا کرنے کا تصور بھی میرے لئے جان لیوا ہے میں تم سے جدا نہیں رہ سکتی" رضو نے کہا۔

"تم جانتی ہو کہ تم آگ سے کھیل رہی ہو۔ آگ کے پاس بارود کو نہیں رکھا جاتا اس لئے کہ سب جانتے ہیں کسی لمحے بھی دھماکہ ہو سکتا ہے" کرمو نے کہا۔

"ہاں جانتی ہوں خوب جانتی ہوں تم جس آگ کی بات کرتے ہو اس آگ سے زیادہ بڑی آگ میرے اندر ہے میں اس آگ سے ڈرتی ہوں مجھے اب کچھ نہیں چاہئے نہ اولاد، نہ دھن دولت نہ راج پاٹ میرے اندر کی آواز صرف ایک ہے تم میرے ہو جاؤ میں تمہاری بن جاؤں" رضو بولی۔

چوہدرانی کے لب و لہجے سے کرمو ڈر گیا۔

کرمو نے کہا "آہستہ بولو چوہدرانی دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں ایسی طوفانی محبت کرنے کی نہ تمہاری عمر ہے نہ میری اس قسم کی باتیں تم کو بدنام کر دیں گی تمہاری عزت کی دھجیاں بکھیر دیں گی۔ میری زندگی ختم کر دیں گی میری نسلیں بھی برباد ہو جائیں گی ذرا ہوش کرو تم تو بہترین پروگرام بناتی ہو تمہارے پروگرام تو فیل ہوتے ہی نہیں پھر کوئی ایسا پروگرام بناؤ جس کے ذریعے تم اپنا مقصد پورا کر لو" رضو نے بڑے غور سے کرمو کی بات سنی اور پھر بولی۔

"تم نے اچھا راستہ بتایا میں اس پر ضرور غور کروں گی اور تم کو بتاؤں گی" وہ بولی۔

ذرا سکون ہوا جس تیزی سے باز آ رہی تھی اس کا رخ کرمو نے موڑ دیا تھا کرمو کے سامنے یہ ایک نئی صورتحال آ گئی تھی ایسا تو اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔

سفید بالوں میں کالک لگانے والی صورتحال تھی پہلے اس نے سوچا خاموشی سے یہاں سے چلا جائے مگر پھر اس نے یہ ارادہ بدل دیا عورت کی طوفانی محبت بڑی بُری چیز ہے وہ ضد پر آ جائے تو بڑی خطرناک ہو جاتی ہے خود کے لئے بھی اوروں کے لئے بھی میرے جانے کے بعد اس نے میرے بارے میں چوہدری کو غلط راہ دکھا دی تو چوہدری کے لئے شہر دور نہیں ہوگا سوچوں کے رخ بدلتے کیا دیر لگتی ہے عورت مرد کو ہر طرف دوڑا سکتی ہے مرد کی لگام عورت کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔

رضو کے اندر جتنی شدت سے محبت کا جذبہ پیدا ہوا اگر اتنی ہی شدت سے انتقام کا جذبہ بیدار ہو گیا تو بھی برا حشر ہوگا میں آخر ہوں تو کمی ہی گاؤں والوں کی نظر میں کچھ عزت بن گئی ہے تو وہ بھی رضو کی ہی مہربانی ہے اگر وہ بگڑ گئی تو میں کہیں کا بھی نہیں رہوں گا اب میرے لئے زیادہ سوچ بچار کا کام ہے میں اکیلا نہیں چار چار لڑکیاں ہیں سارے لڑکے رضو لے گئی میرے حصے میں لڑکیاں رہ گئیں کرمو نے اپنی سوچ کے گھوڑے کو بے لگام کر دیا تھا اچھے برے نہ جانے کیسے خیالات آ رہے تھے مگر اس کے پاس ان حالات پر کنٹرول کا کوئی فارمولا نہیں تھا۔

کرمو کی عمر گزر گئی جوانی نے بستر باندھ لیا۔ بڑھاپا سر پر کھڑا تھا مگر اب تک عورت شناسی نہیں آئی اس نے زندگی میں دیکھی ہی کتنی تھیں ایک اس کے باپ نے اس کو دی تھی وہ اللہ کی گائے جس تھان پر کھڑا کر دیا کھڑی تھی جو دے دیا اس میں ہی گزارہ کر لیا اس کی نس نس میں اس کی ماں نے اور معاشرے نے غلامی بھر دی تھی کرمو اچھا شوہر تھا کہ خود محنت کرتا تھا اس نے کبھی جورو کو کچھ کرنے کو نہیں کہا تھا اور اگر کہتا تو وہ انکار نہیں

کرتی اس لئے کرمو اس کے لئے بہترین شوہر تھا دوسری کرمو نے رضو کو دیکھا جو گھاٹ گھاٹ کا پانی پی چکی تھی اس نے لاکھ کوشش کی مگر وہ اس کو ذرا بھی نہیں سمجھ سکا وہ کیا سمجھتا وہ تو ایک معمولی کمی تھا نہ اسکول اس نے دیکھا نہ کسی اچھے آدمی نے اس کو پاس بٹھایا زیادہ سے زیادہ اس سے حقہ بھروا لیا کوئی کام کروا لیا۔

رضو تو چوہدری رحمت جو کہ لوگوں کو اپنے حکم پر نچاتا تھا بڑے بڑے جوڑ توڑ کرتا تھا کرسی اقتدار پر بیٹھنے والا بھی نہیں سمجھ سکا اس کا دماغ اور وہ دونوں رضو کے قابو میں تھے وہ تو صرف اس بات سے ہی خوش تھا کہ اس کو رضو نے چار بیٹوں کا باپ بنا دیا تھا چوہدری کی مونچھیں اور سیدھی ہو گئی تھیں "میرے چار شیر ہیں ہوشیار ہو جانے دو پھر دیکھنا" وہ فخر سے کہتا تھا۔

اس کے ساتھ ساتھ جو کچھ بھی ہوا اس کو ذرا پتہ نہ تھا وہ بھی رضو کو نہیں سمجھ سکا۔

کرمو غلام تو پیدا ہی ہوا تھا خدمت کرنا، جی سرکار جی حضور کہنا تو اس نے بچپن میں ہی سیکھ لیا تھا مگر جو غلامی اس کے حصے میں آئی تھی اس کی نوعیت ہی الگ تھی ہر وقت تلوار کی نوک اس پر اس نے ایک غلطی کی اور جب وہ سمجھا کہ اس کی غلامی ختم ہونے والی ہے وہیں سے دوسری تلوار اس کے سر پر لٹک گئی وہ درمیان میں لٹک گیا نہ وہ چنڈ چھوڑ سکتا تھا اور نہ رہ سکتا تھا چھوڑنے میں یہ ڈر کہ رضو پھر کوئی نئی کروٹ غصے میں نہ لے لے۔ رضو کے نئے حکم نے اس کو نئی مصیبت میں مبتلا کر دیا تھا اب اس کو حویلی میں ہی کام کرنا تھا رضو کے سامنے ہی رہنا تھا اس نے کوشش شروع کر دی کہ وہ رضو کی نظروں میں کم سے کم آئے مگر اس کی یہ کوشش کامیاب نہیں تھی وہ کسی نہ کسی بہانے اس کو اپنے پاس طلب کر لیا کرتی تھی رضو کو اب اس کی ضرورت اس طرح کی نہیں تھی جیسے پہلے تھی مگر وہ اس کو بلاتی ضرور تھی دو چار باتیں کرتی، کوئی کام بتاتی اور پھر مسکرا کر کہتی "تو خوش رہا کر کوئی ضرورت ہو تو مجھے ضرور بتانا"

کرمو اندر ہی اندر گھل رہا تھا ہر وقت اس کے سامنے اپنا انجام نظر آ رہا تھا۔

اچھی خوراک اور آرام بھی اس کے لئے فائدہ مند نہ تھا دن بدن اس کی صحت خراب ہو رہی تھی آنے والے وقت کے ڈر اور احساس گناہ نے اس کی نیند اڑا دی تھی۔ اس کا چہرہ پیلا پڑتا جا رہا تھا بڑھاپا بہت تیزی کے ساتھ اس پر حاوی ہو رہا تھا ہر وقت وہ کسی سوچ میں مبتلا نظر آتا تھا چہرے پر ہوائیاں اڑتی تھیں اس کی یہ حالت رضو سے بھی چھپی نہ رہی ایک دن اس نے کرمو کو اپنے پاس بلایا اور کہا۔

"کی گل اے کرمو تو پریشان ہے بیمار بھی نظر آتا ہیں" رضو نے پوچھا۔

کرمو نے اجنبی نگاہوں سے رضو کو دیکھا اور بولا۔

"چوہدرانی میں اچھا ہوں تمہاری مرضی ہے کہ میں تمہاری حویلی میں تمہاری خدمت کرتے کرتے مروں تو مجھے یہ بھی منظور ہے یہ تو میں بھی جانتا ہوں کہ جو پیدا ہوا ہے اس کو ایک دن مرنا ہے"

"تو کیسی روکھی باتیں کر رہا ہے تو کیوں اتنی جلدی مرے گا ابھی تو تو نے اپنے پودوں کو درخت بنتے دیکھنا ہے ان پر پھل پھول لگتے دیکھنا ہیں" رضو بولی۔

"چوہدرانی میرا دیکھنا اور نہ دیکھنا سب برابر ہے میں تو کمی ہوں مزدور ہوں۔ میں تو پیدائشی مزدور ہوں میری حیثیت کیا ہے" کرمو نے کہا۔

"تیری حیثیت میرے دل میں ہے کسی کو تیری اہمیت کا پتہ نہیں مجھے تو ہے تو نے میرے خواب پورے کرائے ہیں تو نے میرے راز کو چھپا رکھا ہے تو کوئی معمولی آدمی نہیں ہے اسی لئے تو میں تجھے اپنے قریب رکھنا چاہتی ہوں خود سے جدا نہیں کرنا چاہتی میرے دل میں تیرے لئے محبت ہے میں تیرے ہر دکھ کو سمیٹ لینا چاہتی ہوں میں نے کیا تیری عزت اور وقار میں اضافہ نہیں کیا کیا تو اس حویلی کا کرتا دھرتا نہیں ہے کیا تیرا حکم کوئی ٹال سکتا ہے مگر تیرے دل میں شاید یہ خیال آ گیا ہے کہ میں تجھے باندھ کر رکھ رہی ہوں" رضو نے کہا۔

”پنجرے میں قید پنچھی کو اچھے سے اچھا کھلا دو تو بھی وہ خوش نہیں ہوتا۔ میں نے پوری زندگی قید میں گزاری نے تم نے مجھ پر مہربانی کی ہے میں نے اپنا ایک آشیانہ ایک ٹہنی پر بنایا ہے مگر میں اس کو آباد نہیں کر سکتا کیونکہ میرے پیروں میں صدیوں سے پڑی زنجیر ہے اس کو میں توڑ نہیں سکتا میری آنے والی نسلیں بھی وہی کریں گی جو میں کر رہا ہوں حالات کچھ ہوں میرے حالات میں تبدیلی نہیں آئے گی ہر قسم کی مجبوری صرف میرے لئے ہے میں سمجھا تھا شاید ہوا کا رخ بدل گیا ہے میری زنجیر ٹوٹ جائے گی مگر پھر ایک نئی مجبوری میرے سامنے تمہاری صورت میں کھڑی ہے اگر اب یہ زنجیر نہ ٹوٹی تو پھر صدیوں کا چکر پڑ جائے گا۔ تمہارے خواب پورے ہو جائیں گے میری زبان پر آج بھی تالا ہے اور آگے بھی رہے گا تم یہ بتاؤ تم نے مجھے اپنے خواب پورے ہونے کی یہ سزا دی ہے کہ میں اس قید خانے میں پھر صدیوں کے لئے قید ہو جاؤں“ کرمو کا لہجہ بدل گیا تھا اس کی آواز میں فریاد تھی دکھ تھا کرب تھا۔

رضو نے بڑے سکون سے اس کی بات سنی اور پھر بولی۔ ”تم یقین کرو تم کو روکنے میں میری خود غرضی کو دخل نہ تھا میری محبت کا دخل تھا چوہدری میرا مالک ضرور ہے مگر وہ ایسا ہی مالک ہے جیسا کوئی فیکٹری کا مالک ہوتا ہے اس کے نام پر فیکٹری چلتی ہے مگر پروڈکشن تو مزدور ہی دیتا ہے مشینوں کے بارے میں وہی جانتا ہے مجھے اندازہ نہیں تھا تم جب جانا چاہو عزت کے ساتھ چلے جانا میں نے تمہارے لئے کچھ رکھا ہے پیڑ کے پھل تم نہیں کھا سکتے مگر اس کی سوغات تو لے سکتے ہو میں نے جو کچھ کیا ہے اس کا پتہ صرف تم کو ہے اور مجھ کو ہے جس طرح تم نے میری لاج رکھی ہے میں بھی رکھوں گی میری طرف سے تم پر پابندی نہیں ہے۔“ رضو نے کہا۔

کرمو کو ایسا لگا جیسے اس کے سر پر رکھا بھاری وزن اچانک اتر گیا ہو اس کا چہرہ ہشاش بشاش ہو گیا چہرے پر رونق آ گئی اور وہ بے ساختہ بولا۔

”تم نے جو کہا ہے دوبارہ کہو مجھے یقین نہیں آ رہا آج صدیوں کا وزن اترا ہے“

”ہاں کرمو تم آزاد ہو جہاں دل کرے چلے جاؤ تم کو کوئی نہیں روکے گا“ رضو نے کہا۔

☆......☆......☆

شہر میں کرمو کا عاجزانہ انداز نرم رویہ بہت کام آیا مکان تو اس نے پہلے ہی خرید رکھا تھا بازار میں ایک دکان لے کر کاروبار شروع کر دیا کچھ ہی دنوں میں دکان چل نکلی اور کاروبار بڑھ گیا لڑکیاں بڑی ہو رہی تھیں شہر کے رنگ دیکھ کر اس نے ان کو اسکول میں داخل کرا دیا شہر آ کر اس نے اسی طرح رہنا شروع کر دیا جس طرح شہری لوگ رہتے ہیں۔

کاروبار اور بڑھا تو اس نے ایک بڑی دکان خرید لی دو چار ملازمین رکھ لئے اب وہ شیخ کرم دین تھا بہت بڑا سیٹھ لاکھوں کا مال خریدتا تھا اور فروخت کرتا تھا لڑکیوں نے بھی اس کو مایوس نہیں کیا وہ کالج میں پہنچ گئیں۔

جمیلہ بڑی تھی اس کے بعد شکیلہ تھی دونوں کالج جاتی تھیں دونوں میں ایک سال کا فرق تھا وہی فرق دونوں کی کلاسوں میں تھا۔

جمیلہ کی کلاس میں ایک لڑکا فخر بھی پڑھتا تھا کسی بڑے باپ کا بیٹا تھا پڑھتا کم اور کھلاڑی زیادہ تھا اس کا باپ صوبائی اسمبلی کا ممبر تھا اور بہت بڑا زمیندار تھا گاڑی اس کے پاس تھی کالج بھی وہ تفریح کے لئے آتا تھا باپ کی طرح یونین کی سیاست میں زیادہ رہا کرتا تھا۔

کالج میں بڑا شور تھا یونین کے انتخاب ہونے والے تھے دو گروپ تھے ایک گروپ کا لیڈر فخر تھا اور جنرل سیکریٹری کے لئے الیکشن لڑ رہا تھا ہر طرف لڑکوں کی ٹولیاں نظر آتی تھیں جمیلہ اور شکیلہ دونوں جیسے ہی کالج کے مین گیٹ سے اندر داخل ہوئیں لڑکوں کی ایک ٹولی ان کی طرف بڑھی اس ٹولی کا لیڈر فخر تھا۔

”میرا نام چوہدری فخر ہے میں جنرل سیکریٹری کے لئے کھڑا ہوں اور انشاء اللہ جیت بھی جاؤں گا میں آپ دونوں بہنوں کو جانتا ہوں آپ شیخ کرم دین کی لڑکیاں ہیں مجھے پتہ ہے کہ آپ دونوں کالج کی کسی ایکٹی ویٹی میں حصہ نہیں لیتی ہو صرف پڑھتی ہو مگر اب آپ مجھے ووٹ دیں گی یہ میرا حکم نہیں ہے درخواست ہے طلباء کی مشکلات اور تفریح میں سب کا خیال رکھوں گا“

جمیلہ تو کم گو تھی ماں کی طرح مگر شکیلہ ذرا تیز تھی بولی۔

”بے شک آپ نے جو کہا ہے درست ہو گا مگر دیکھنا یہ ہو گا کہ آپ سے بہتر امیدوار کوئی اور تو نہیں اگر ہوا تو ہم اس پر غور کرنے کا حق تو رکھتے ہیں۔“

”ضرور آپ ایسا ہی کریں مگر پہلے میرے بارے میں پتہ کر لیں میرے کردار کے بارے میں چال چلن کے بارے میں بھی پتہ کریں اور آپ پوری طرح مطمئن ہو جائیں تو ووٹ دیں۔“ فخر نے کہا۔

جمیلہ نے کہا۔ ”آپ کا رویہ بڑا معقول اور ووٹ مانگنے کا طریقہ اچھا ہے۔“

”آپ کا بہت شکریہ۔“ فخر نے کہا۔

”آپ بے فکر رہیں ووٹ تو ہم آپ کو ہی دیں گے۔ میں نے تو محض ایک بات کی تھی“ شکیلہ بولی۔

فخر نے پھر ان کا شکریہ ادا کیا اور ایک طرف چلا گیا۔

اس کے جانے کے بعد شکیلہ نے کہا۔ ”لوگ تو اس کے بارے میں نہ جانے کیا کیا کہتے ہیں مگر ہم سے تو بڑے معقول طریقہ پر اس نے گفتگو کی ہے۔“

”ابھی اس کو ہمارے ووٹ کی ضرورت ہے شاید اس لئے کی ہو گی“ جمیلہ بولی۔

”ہو سکتا ہے مگر باجی کچھ اپنا سا لگتا ہے آپ نے غور نہیں کیا“ شکیلہ بولی۔

”اچھا اب زیادہ اس کے بارے میں غور نہ کرو، ہم لوگ پڑھنے آتے ہیں فالتو خرافات میں نہیں پڑنا“ جمیلہ نے جواب دیا۔

”خرافات نہیں باجی ہمارا کوئی بھائی ہوتا تو کیا وہ ایسا نہ ہوتا“ شکیلہ بولی۔

”ہوتا تو نا مگر نہیں ہے“ جمیلہ بولی۔

”ہاں باجی یہ بات تو درست ہے ابا کو بھی یہی غم ہے ابا دن بھر کاروبار میں اکیلے پڑے رہتے ہیں ہم لوگ ان کی مدد بھی نہیں کر سکتے ان کا کاروبار ہی اس قسم کا ہے کہ مردوں سے واسطہ ہے دن بھر میرا دل کرتا ہے ابا کی مدد کروں مگر کس طرح یہ سمجھ میں نہیں آتا“ جمیلہ بولی۔

”پہلے اپنی تعلیم پوری کرو پھر سوچیں گے۔“ شکیلہ بولی۔

”تعلیم پوری ہوتی مجھے تو نظر نہیں آتی“ شکیلہ بولی۔

”کیوں نظر نہیں آتی“ جمیلہ بولی۔

”اماں ابا سے کہہ رہی تھیں کہ لڑکے تلاش کرو دونوں کی ایک ساتھ شادی کر دیتے ہیں زیادہ پڑھانے سے کیا کرنا ہے کوئی نوکری تو نہیں کرنی ہے“ شکیلہ نے بتایا۔

”ہائے میں مر گئی یہ تو تم نے بری خبر سنائی۔“ جمیلہ بولی۔

”باجی لڑکیوں کے ساتھ تو یہی ہوتا ہے نئی بات تو نہیں ہے“ شکیلہ نے کہا۔

”زبان سے تو ہم کچھ کہہ نہیں سکتے“ جمیلہ نے کہا۔

الیکشن ختم ہو گئے فخر اور اس کا پورا پینل جیت گیا جیت کے بعد جو دھوم دھڑکا ہوتا ہے وہ ہوا بڑا اچھا فنکشن کرایا گیا۔

جمیلہ کے مقابلے میں شکیلہ زیادہ حسین تھی بدصورت تو جمیلہ بھی نہیں تھی مگر دونوں ایک ساتھ ہوں تو نظر شکیلہ پر ہی رکتی تھی۔

اور پھر ایک دھماکہ ہوا چوہدری رحمت کے بیٹے فخر نے شکیلہ کو پرپوز کر دیا شکیلہ کو بھی برا نہیں لگا اس نے جمیلہ کو بتایا تو اس نے کہا ”اس کو کہو ہمارے گھر رشتہ لے کر آئے“ دوسرے دن ہی اس نے ماں کو بتا دیا۔ ماں نے پوچھا ”کون ہے وہ؟“

"جمیلہ نے بتایا بہت بڑے گھر کا لڑکا ہے زمیندار ہے۔"

"ٹھیک ہے میں تمہارے باپ سے ذکر کروں گی۔" ماں نے کہا۔

رات کو اس نے کرم دین سے کہا "ایک رشتہ آیا ہے شکیلہ کے لئے۔"

"اچھا کون لوگ ہیں؟" کرم دین نے پوچھا۔

"جمیلہ بتا رہی تھی کہ بہت بڑے زمیندار کا لڑکا ہے۔" ماں نے جواب دیا۔

"ارے اللہ رکھی بات تو پوری بتایا کر نام پتہ کیا ہے۔" کرم دین بولا۔

"ایسا کرتے ہیں ان کو بلائے لیتے ہیں تم خود پوچھ لینا سب کچھ" ماں بولی۔

تین چار دن بعد فخر دو چار دوستوں کے ساتھ ان کے گھر آ گیا کرم دین نے پوچھا۔ "اچھا تو بیٹا یہ بتاؤ تمہارے باپ کا کیا نام ہے؟"

"میرے باپ کا نام چوہدری رحمت ہے" وہ فخر سے بولا۔

چوہدری رحمت کے نام پر کرم دین کو جھٹکا لگا۔

"اور تمہاری زمینداری کہاں پر ہے" کرم دین بولا۔

"گوجرانوالہ کے پاس ہمارا چک ہے" اور اس نے وہی نام بتایا جو کہ کرم دین نہیں سننا چاہتا تھا۔

کرم دین کے ہاتھ پیر ٹھنڈے ہونے لگے اس کے چہرے پر مردنی چھا گئی آج اس کے سامنے دنیا کی سب سے انوکھی حقیقت کھڑی تھی ایک بھائی بہن کا رشتہ مانگ رہا تھا مگر اس میں اس کا کیا قصور تھا۔ قصور تو کرم دین کرمو کا تھا جس شدت سے اس کو آج اپنے گناہ کا احساس ہوا اتنا تو کبھی نہیں ہوا تھا اس کا سر شرم سے جھک گیا۔

اس کی حالت دیکھ کر فخر بھی پریشان ہو گیا۔ بولا۔

"چاچا جی آپ بہت پریشان ہو گئے میں نے کوئی غلط بات تو نہیں کر دی ہے"

"نہیں بیٹا تم نے کچھ نہیں کیا میرے ساتھ وقت نے مذاق کیا ہے۔"

"آپ بتائیں تو شاید میں آپ کی کوئی مدد کر سکوں۔" فخر بولا۔

"میری مدد کوئی نہیں کر سکتا تم جیسے جوان کو میں مایوس کر رہا ہوں تمہارا رشتہ شکیلہ سے نہیں ہو سکتا تم یہ سوال نہ کرنا کہ کیوں نہیں ہو سکتا اور کرو گے تو جواب نہیں ملے گا" کرم دین بڑی مشکل سے بولا۔

"یہ سوال تو قدرتی طور پر میری زبان پر آئے گا ہی" فخر نے کہا۔

"آئے گا مگر میں جواب نہیں دوں گا تم اپنے گھر جاؤ اور اپنی ماں سے کہنا کہ میں کرم دین عرف کرمو کی لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہوں وہ تم کو اس کا جواب دے دیں گی مگر صرف اپنی ماں سے سوال کرنا باپ سے نہیں ان کا جو، جواب ہوگا وہی میرا بھی جواب ہوگا" کرم دین بولا۔

فخر کو اندازہ نہیں تھا کہ اس کو اس قسم کی گفتگو سے سابقہ پڑے گا اس کا تجسس ایک دم بڑھ گیا اور ایک قدرتی امر تھا وہ بولا "چاچا آپ نے مجھے حیرتوں کے سمندر میں غرق کر دیا ہے آپ ہی کچھ بتا دیں تو مہربانی ہوگی۔"

"بیٹا میرے پاس اگر جواب ہوتا تو ضرور دیتا" کرم دین بولا۔

فخر تذبذب میں گرفتار تھا بولا "میں آپ کے سوال کو انکار خیال کروں یا کچھ اور"

"میں نے کہا نا جو جواب تم کو تمہاری ماں دے وہی میرا جواب ہوگا" کرم دین اٹھ کھڑا ہوا اس کا مطلب تھا آگے بات نہیں کرے گا۔

فخر اور اس کے دوست بھی کھڑے ہو گئے ایسا عجیب و غریب جواب اس کو ملے گا اس کا کسی کو پتہ نہ تھا اگر اس کو منع کر دیا جاتا اس کی ذات میں خرابیاں بتائی جاتیں تو بھی شاید وہ اتنا پریشان نہ ہوتا جس طرح وہ اب پریشان ہوا۔ اس کے ساتھیوں اور اس کے چہرے

پر بہت سوالات تھے مگر وہ خاموش تھا۔

رات اس نے نہایت کرب کے عالم میں گزاری اور سویرے ہی گاؤں روانہ ہو گیا۔

دن کے گیارہ بجے وہ گھر پہنچا چوہدری رحمت گھر پر نہیں تھا وہ سیدھا ماں کے پاس چلا گیا ماں اس کو دیکھ کر حیران ہوئی اور بولی۔

"کیا بات ہے پتر؟ سویرے سویرے بغیر اطلاع کے آ گئے۔"

"ماں بات ہی ایسی ہے مجھے تو رات کاٹنی مشکل ہو گئی تھی" وہ بولا۔

"کیا بات ہے؟ جلدی بتا تو نے مجھے بھی پریشان کر دیا۔"

"ماں بات یہ ہے کہ میرے ساتھ ایک لڑکی پڑھتی ہے اس کا نام شکیلہ ہے دو بہنیں ہیں بڑی کا نام جمیلہ ہے مجھے شکیلہ پسند ہے میں نے اس کو پرپوز کر دیا اس نے گھر بلا لیا میں کل شام اس کے گھر گیا تھا مگر اس کے باپ نے انکار کیا نہ اقرار کیا اور کہا کہ تم اپنی ماں کے پاس جاؤ اور اس کو کہنا کہ میں کرم دین عرف کرمو کی لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہوں جو جواب تمہاری ماں دیں گی وہی میرا جواب ہوگا میں تو اس کے جواب کو سن کر حیران رہ گیا ہوں۔" فخر نے ایک ہی سانس میں پوری روداد بیان کر دی۔

وہ تو کہہ کر خاموش ہو گیا مگر رضو یہ سن کر شکیلہ کرمو کی لڑکی ہے اور کرمو کون ہے اس سے زیادہ کون جا سکتا تھا رضو کی آواز بند ہو گئی چہرہ پیلا پڑ گیا۔ وہ ہائے کہہ کر بیٹھ گئی۔ فخر گھبرا گیا جو حالت کرم دین کی ہوئی تھی اس سے بدتر حالت اس کی ماں کی ہو گئی۔

"کیا ہوا اماں آپ اس قدر کیوں گھبرا گئیں؟" وہ حیرت سے بولا۔

"تو میرا بیٹا ہے نا" رضو نے پوچھا۔

"اس میں کیا شک ہے" فخر بولا۔

"اگر میں تجھ سے کہوں کہ تو شکیلہ کا دھیان چھوڑ دے تیری شادی اس سے کسی حالت میں نہیں ہوگی" رضو نے کہا۔

"مگر بلاوجہ تو میں آپ کی بات تسلیم نہیں کروں گا۔" فخر نے کہا۔

"اگر میں تیری ماں ہوں اور تو میرا بیٹا ہے تو میری ہر اچھائی برائی تجھے تسلیم کرنا ہوگی اگر تو تسلیم نہیں کرے گا تو کھوٹا سکہ کہلائے گا اس لئے اس بارے میں کوئی سوال نہ کر میں جواب نہیں دے سکوں گی۔" رضو نے کہا۔

"ماں اس سوال کا جواب تو آپ کو دینا ہوگا۔ مجھے نہیں تو کسی اور کو دینا ہوگا آج نہیں تو کل آپ اس سوال سے نہیں بچ سکتی ہیں" فخر نے آواز متوازن اور حد ادب میں رکھی۔

"میرے پاس اس کا صرف یہ جواب ہے کہ ریشم میں ٹاٹ کا پیوند کبھی نہیں لگتا گارے کی اینٹ کو چوپارے پر نہیں لگایا جاتا کرمو اس حویلی کا کمی تھا اس کی کچھ حیثیت بن گئی ہے تو بھی ہمارے برابر نہیں ہے میں ہرگز برداشت نہیں کروں گی" رضو نے بات بتائی۔

"بس اتنی سی بات ہے، میں ابا سے بات کر لوں گا ان کو منا لوں گا۔" فخر بولا۔

"تم کسی سے بھی بات کرو، میری زندگی میں یہ نہیں ہوگا" رضو نے کہا۔

"ماں اب وقت بدل رہا ہے بڑے چھوٹے کا فرق نہیں رہا ہے اگر کرم دین اس حویلی کا کمی تھا تو اب تو نہیں ہے اس کی اولاد تو کمی نہیں ہے" فخر نے کہا۔

"مگر میں اس احساس سے چھٹکارا نہیں پا سکتی" رضو نے کہا۔

"آپ نے اگر ضد کر لی ہے تو یاد رکھیں میں بھی شکیلہ کو اپنی ضد بنا سکتا ہوں" فخر بولا۔

"ایسا نہ کرنا بیٹے تجھے اندازہ نہیں تیری ضد کتنی زندگیاں تباہ کر ڈالے گی۔ کتنا بڑا طوفان آ جائے گا موت کو خوشی سے کون قبول کرتا ہے مگر بعض حالات میں انسان بڑی خوشی سے موت کو گلے لگا لیتا ہے اور زیادہ کرید نہ کر میرے کم کہے کو بہت جان لے" رضو نے

عاجزی سے کہا۔

"میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا میں نے کیا انوکھا کام کر دیا ہے شادی ہی تو کرنا چاہتا ہوں" فخر بولا۔

"تو ضرور شادی کر ایک سے ایک خوبصورت لڑکی پڑی ہے تیرے لئے لاؤں گی مگر کرم دین کے دروازے پر تو نہیں جائے گا" رضو نے کہا۔

فخر کے چہرے پر اضطراب نمایاں تھا۔ وہ دونوں ہاتھ مسل رہا تھا ہونٹ ہل رہے تھے مگر الفاظ زبان پر نہیں آ رہے تھے۔ یہ کیسا جواب تھا جس کے سر اور پیر کا پتہ نہ تھا۔

آخر وہ بڑی مشکل سے بولا۔ "میں ابا سے بات کروں گا۔"

"ہرگز نہ کرنا تیری ضد اس کو اگر راضی کر لے گی تو میرے ساتھ کئی اور زندگیاں برباد ہو جائیں گی۔ جو تو نہیں جانتا، اس کو مت جان" رضو نے گمبھیر لہجے میں کہا۔ "ابھی وقت تیرے ہاتھ میں ہے جہاں ہے وہیں رک جا اور جو میں کہتی ہوں مان لے طوفان آ گیا تو بڑی تباہی آ جائے گی اس تباہی کو روکنا تیرے باپ کے بس کا روگ نہیں ہوگا۔ ہر بات کو جاننا ضروری نہیں ہوتا آگہی بڑی ظالم چیز ہے۔

میری بات مان لے میں تیری شادی خود کروں گی اور تیری پسند سے کروں گی تو بڑا ہے تو جو کرے گا وہی ریت پڑ جائے گی میں تجھے اس ریت کی وجہ سے منع نہیں کر رہی ہوں اگر بات اتنی ہی ہوتی تو بھی میں گوارہ کر لیتی مگر حقیقت اس سے بھی زیادہ بھیانک ہے میں اس بھیانک شکل کو تمہارے سامنے کھول کر لاؤں گی تم نے زندگی گزارنی ہے اس حویلی کو آباد کرنا ہے میرے لال ایسی ضد نہ کر جس کو میں پوری نہیں کر سکتی۔ میری لاج تیرے ہاتھ میں ہے اس سے زیادہ اور کیا کہوں۔" رضو رو کر بولی اس کے آنسو رخساروں پر رواں تھے اور اس کا چہرہ دھواں دھواں ہو رہا تھا۔

فخر نے ماں کی حالت دیکھی تو وہ ایک دم گم ہو گیا۔ بولا "انسان جان بوجھ کر نادانی نہیں کرتا اپنی خوشی سے آگ میں چھلانگ نہیں لگاتا۔ مگر جب آگ انسان کے اندر جل اٹھتی ہے تو پھر وہ کیا کرتا ہے مجھے پتہ نہیں"

فخر کے جسم میں آتش فشاں کا دہانہ کھل گیا اس کو بار بار اپنی ماں کے الفاظ یاد آ رہے تھے اس کے آنسو...... اس کا مرجھایا ہوا بے بسی کی تصویر بنا چہرہ اس کی زبان بند کر رہا تھا۔

"ایسی ضد نہ کر جس کو میں پورا نہیں کر سکتی اگر بات صرف خاندانی نام اور وقار کی ہوتی تو ماں باپ کا حوالہ دیتی اس کو منانے راضی کرنے کی بات کرتی مگر اس نے تو باپ سے بات کرنے کو بھی منع کر دیا تھا۔

اس کی عقل یہاں پر شل ہو جاتی تھی باپ سے بات کرتا ہے تو کیا ہوگا باپ راضی ہو گیا تو ماں کہتی ہے پھر بھی بہت بڑا طوفان آ جائے گا۔

وہ گھر سے نکل گیا اس کا ایک بچپن کا دوست تھا اس کے ساتھ وہ ہر قسم کی بات کر لیا کرتا تھا انور ایک غریب گھرانے کا لڑکا تھا میٹرک تک اس کے ساتھ تھا مگر اس کی غربت نے اس کو آگے نہیں پڑھنے دیا اور وہ باپ کے ساتھ کھیتوں میں کام کرتا تھا۔

فخر کو پتہ تھا کہ اس وقت انور کھیت میں کام کر رہا ہوگا وہ پیدل ہی اس کے پاس چلا گیا۔

انور وہیں تھا فخر کو دیکھ کر بولا۔

"کیا بات ہے، اج تو پروگرام کے بغیر ہی گاؤں آ گیا۔"

"ہاں یار کچھ کام پڑ گیا تھا" فخر نے جواب دیا۔

"اچھا بول تیری پڑھائی کا کیا عالم ہے میرا خیال ہے تو شہر میں سیاست زیادہ اور تعلیم کم کر رہا ہے۔ فخر زندگی میں انسان کو صرف ایک بار موقع ملتا ہے تیرے پاس موقع ہے اپنی تعلیم پر توجہ دے" انور نے کہا۔

"تو مجھے ہمیشہ یہی سبق پڑھاتا ہے مگر تو نے تعلیم چھوڑ دی میں نے کہا تھا تو میرے خرچ پر پڑھ مگر تیری خودداری کو میں کیا کہوں تو نے ایک بات میری نہ مانی" فخر نے کہا۔

"فخر میرے ساتھ میری مجبوریاں تھیں میں سب سے چھوٹا ہوں میری چار چار بہنیں تھیں اور اکیلا میرا بوڑھا باپ تھا اگر میں اس کے کاندھے سے کاندھا نہ ملاتا تو وہ وقت سے پہلے ہی ڈھے جاتا، بے شک میں پڑھ جاتا مگر میری بڑی بہنیں گھر میں پڑی رہ جاتیں میں نے باپ کو حوصلہ دیا اور اس نے ان سب کو اپنے اپنے گھر روانہ کردیا اس کے کاندھے کا وزن اتر گیا میری خود غرضی میرے خاندان کو برباد کرسکتی تھی میرے نصیب میں جتنی تعلیم تھی میں نے پالی، تیرے ساتھ تو ایسی کوئی بات نہیں ہے تو خوب پڑھ وکیل بن جا میری یہ خواہش ہے۔" انور بولا۔

"تو نے ٹھیک کہا میرے ساتھ وہ پریشانی نہیں جو تیرے ساتھ تھی مگر دنیا میں شاید ہی کوئی ہو جو یہ کہہ سکے کہ اس کو کوئی پریشانی نہیں ہے ہر کسی کی نوعیت الگ الگ ہوتی ہے یہ دوسری بات ہے یہی حال میرا بھی ہے" فخر نے کہا۔

"اس کا مطلب ہوا کہ تم بھی کافی پریشانی میں آئے ہو" انور نے کہا۔

"ہاں یہ درست ہے تمہارے پاس اپنی مدد کے لئے آیا ہوں" فخر بولا۔

"بتاؤ کیا بات ہے میں اب فارغ ہوں اب میرے گھر میں ماں باپ کے علاوہ صرف میں ہوں میں ہر طرح تمہاری مدد کروں گا" انور نے پرجوش انداز میں کہا۔

فخر نے پوری روداد کرم دین اور شکیلہ سے شروع کر کے اپنی ماں تک سب بیان کردی۔

انور خاموش بیٹھا رہا خیالات کی آندھیاں اس کے وجود کو اڑاتی رہیں پھر وہ بولا۔

"میرا خیال ہے فخر اب تیرے باپ سے اور ماں سے بات کرنے کی گنجائش نہیں ہے بات اتنی نہیں ہے جتنی نظر آتی ہے تیری خواہش پر تیری ماں کا ری ایکشن اور کہانی بیان کرتا ہے مگر صرف خاندانی وقار کی بات ہوتی تو وہ تیرے باپ کا حوالہ ضرور دیتی مگر اس نے تو بات کرنے تک کو منع کردیا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ بات صرف خاندانی وقار کی ہے تو اس کو اتنی شدت سے اس کا احساس نہیں ہونا چاہئے تھا ہاں اگر باپ کو ہوتا تو کچھ سمجھ میں آجاتا تھا حالانکہ اس نے بھی تیری ماں سے شادی خاندانی وقار سے ہٹ کر کی تھی اس کا بھی کمزور پہلو تیرے حق میں پلس پوائنٹ تھا۔ مگر بات یہ ہے ہی نہیں۔ میں اس پر غور کروں گا۔" انور بولا۔

"تیری نظر میں کوئی بندہ ایسا ہے کہ اس گانٹھ کو کھول سکے۔"

"بندے تو بہت مل جاتے ہیں تلاش کرنا ہوں گے۔" انور بولا۔

"تو پھر دونوں تلاش کرتے ہیں۔" فخر نے کہا۔

"ایک بندے کے بارے میں، میں نے سنا ہے اس کی تلاش میں سندھ جانا پڑے گا" انور بولا۔

"سندھ کونسا دور ہے چلتے ہیں" فخر نے کہا۔

"کراچی کے قریب ایک ضلع ہے بہت قدیم آبادی ہے ٹھٹھہ وہاں جانا ہوگا" فخر نے کہا۔

"میں اب فارغ ہوں۔ ابا کو بتانا ہے بس تو جب کہے گا میں چل پڑوں گا۔ تو اپنی کہہ" انور نے پوچھا۔

"تو تیاری کرلے دو چار جوڑے کپڑے رکھ لینا کل کا دن تیاری کا پرسوں کے ٹکٹ منگوائے لیتا ہوں پہلے کراچی چلیں گے اور پھر ٹھٹھہ جائیں گے۔"

اور دونوں کراچی کو روانہ ہوگئے کراچی میں ایک دن ایک ہوٹل میں انہوں نے قیام کیا اور پھر صبح کے وقت ٹھٹھہ کی بس پکڑی۔ ٹھٹھہ کے بازار میں انہوں نے ایک ہوٹل میں چائے وغیرہ پی اور پھر انور نے ہوٹل والے سے پوچھا "یہاں پر ایک جوگی ہوا کرتا تھا اس کا نام شاید جوگی دینا ناتھ تھا اس کے بارے میں تم کچھ جانتے ہو ذرا غور کر کے بتاؤ ہم لوگ اس کی تلاش میں پنجاب سے آئے ہیں۔"

ہوٹل والے بندے نے بہت دیر غور کیا پھر بولا۔

"بات یہ ہے بابا کہ میں زیادہ تر کراچی میں رہتا ہوں میرا باپ یہ ہوٹل چلاتا ہے میں آجاتا ہوں تو اس کی مدد کرنے کو بیٹھ جاتا ہوں اس کو ضرور اس کے بارے میں پتہ ہوگا ابھی وہ خریداری کرنے کراچی گیا ہے شام تک آجائے گا تم لوگ پردیسی ہو اور چارپائی بستر پر آرام کرو باپ آئے گا تو میں آپ کو ان سے ملوادوں گا" بلوچ نے کہا۔

انور بولا "ٹھیک ہے ہم انتظار کرتے ہیں۔"

بلوچ نے کہا "آؤ میرے ساتھ" ہوٹل کے اندر سے ہی زینہ تھا وہ ان کو لے کر اوپر چلا گیا اوپر کئی بڑے بڑے پلنگ پڑے تھے اس نے ایک آدمی کو کہا تو ان پر صاف ستھری رلیاں اس نے ڈال دیں اور بڑے نرم اور صاف تکئے لگا دیئے۔ بلوچ نے کہا۔

"ابھی کھانے کا وقت ہونے والا ہے بولو آپ لوگ کیا کھائیں گے"

"آپ جو پسند کریں ہم کھالیں گے" انور نے جواب دیا۔

بلوچ ہنس پڑا۔ "آپ لوگ ہمارے مہمان ہو ہم بلوچ لوگ مہمان کے معاملے میں ذرا جذباتی ہوتے ہیں آپ کی خدمت کرنا میری ڈیوٹی ہے ذرا کمی ہوگئی تو میرا باپ مجھے معاف نہیں کرے گا" بلوچ بولا۔

"ارے آپ اتنے جذباتی بھی نہ ہوں ہم اپنی ضرورت سے آئے آپ کے بلاوے پر نہیں آئے" فخر نے کہا۔

"یہ بات آپ کی برحق ہے میرے دوست مگر ہماری خصلت یہی ہے کہ ہم ہر ایک سے مہمان کا سلوک کرتے ہیں میرا باپ ہوٹل چلاتا ہے مگر اس کا انداز بالکل ایسا ہے جیسے وہ مہمانداری کررہا ہو" بلوچ نے کہا۔

"بہت عظیم لوگ ہیں آپ۔" انور نے کہا۔

اور بلوچ مسکراتا ہوا نیچے چلا گیا۔

دوپہر کو ان کو بہترین کھانا کھلایا گیا شام کو بلوچ ایک بوڑھے آدمی کے ساتھ اوپر آگیا اس آدمی کی عمر ساٹھ اور ستر کے درمیان تھی سر پر سندھی ٹوپی تھی اور چہرے پر بڑی نورانی داڑھی صحت عمر کے حساب سے بہت اچھی تھی چہرہ سرخ و سفید تھا۔

"یہ میرے والد ہیں" بلوچ نے کہا۔ "آپ لوگ اپنا تعارف کرادیں۔"

"میرا نام انور ہے اور یہ میرا دوست فخر ہے ہم لوگ پنجاب سے کسی کی تلاش میں آئے ہیں۔"

"ہاں مجھے میرے لڑکے نے بتایا ہے جوگی دینا ناتھ پہلے ادھر ہوتا تھا مگر پھر اچانک چلا گیا وہ میرے پاس آتا تھا میں نے اس سے پوچھا تھا کہ وہ کیوں جارہا ہے تو اس نے کہا اب میرا یہاں کام نہیں اس نے اس وعدے پر مجھے بتایا تھا کہ وہ کہاں جارہا تھا کہ میں کسی کو نہ بتاؤں۔

مگر تم لوگ پردیسی ہو دور سے آئے ہو تو بتاتا ہوں کہ جوگی ناتھ ضلع ٹھٹھہ میں ہی ہے مگر شہر میں نہیں ہے ادھر سے بس جاتا ہے گھوڑا باڑی تحصیل ہے ادھر ایک سمندر کے کنارے گاؤں ہے تم کو تلاش کرنا پڑے گا اگر زندہ ہے تو مل جائے گا...... ہم نے سائیں تمہارا خیال کر کے وعدہ توڑا ہے تم اس کو بتادینا"

"آپ کی بڑی مہربانی کہ آپ نے ہماری مشکل آسان کردی" انور نے کہا۔

اور پھر دونوں گھوڑا باڑی کی طرف روانہ ہوگئے بس گیارہ بجے دن آخری اسٹاپ پر کھڑی ہوگئی سب کے ساتھ وہ بھی اتر گئے بس کے اسٹاپ پر دو تین دکانیں تھیں زیادہ بڑی آبادی نہیں تھی۔

انور نے ایک دکاندار سے پوچھا "سائیں ادھر سمندر کے قریب کوئی گوٹھ ہے۔"

"اڑے ابھی اور قریب کونسا گوٹھ ہوں گا یہی ہے بولو اڑے کیا بات ہے۔"

"ہم کو ایک آدمی کی تلاش ہے" فخر نے کہا۔

"نام تو بتاؤنی ہم لوگ ادھر کا پرانا باڑوں ہے سب کا پتہ ہے ہم کو بولو۔" دکاندار بولا۔

"اس کا نام جوگی دینا ناتھ ہے" انور بولا۔

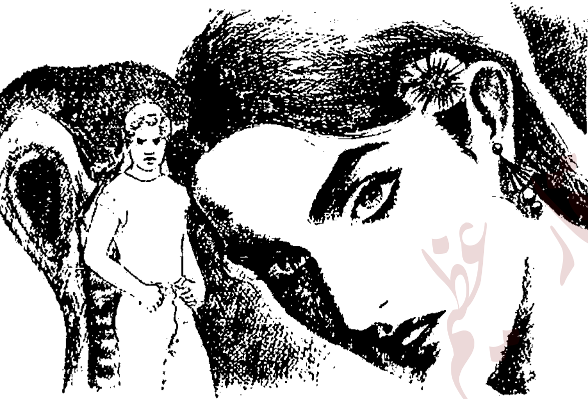
"ارے کیا بولا...... جوگی اڑے وہ ادھر نہیں اے" وہ جلدی سے بولا۔

"مگر اس کا پتہ تو یہی بتایا گیا ہے" انور بولا۔
"ہم تم کو بتاتا ہے تم یہ دیکھتا ہے کیا ہے" وہ بولا۔
"کوئی پرانا قلعہ معلوم ہوتا ہے مگر سب گر گیا ہے" فخر نے کہا۔
"ابھی سب گر گیا ہے اس کے اندر سمندر کا پانی بھرا پڑا ہے تم اس کے کنارے کنارے آگے جائیں گے تو آگے تم کو ایک ٹیلہ ملیں گا اس کے پاجو میں وہ جوگی ہے تم نہیں جاؤ تو اچھا ہے" دکاندار بولا۔ مگر انور اس کے بتائے راستے پر چل پڑا زیادہ نہیں دس پندرہ منٹ کے بعد واقعی ایک ٹیلا آ گیا اور دونوں اس کے قریب پہنچ گئے۔ اس ٹیلے کے برابر ہی ایک بڑے پتھر کے نیچے ایک آدمی بیٹھا تھا اس کے سر اور جسم پر بالوں کا گھنا جنگل تھا صرف آنکھیں چمکتی نظر آ رہی تھیں۔
وہ دونوں اس کے قریب چلے گئے وہ ان کو دیکھ کر بولا "آخر اس نے اپنا وعدہ توڑ دیا نا" اس کی آواز بڑی بھاری اور رعب دار تھی۔
"ہم اس کی طرف سے معافی مانگتے ہیں اس نے بھی معافی مانگی ہے" انور نے کہا۔
"تو بتا کیوں آیا ہے" وہ بولا۔
فخر نے اپنی مشکلات بتائیں اور پوچھا "آپ صرف یہ بتا دیں کہ یہ چکر کیا ہے؟"
اس نے ماں اور باپ کا نام پتہ کیا اس کا نام پتہ کیا اور زمین پر حساب کرتا رہا پھر ہوا میں ہاتھ لہرا کر اور آسمان کی طرف دیکھ کر بڑبڑاتا رہا اور پھر بولا۔
"ایسا کبھی نہیں ہوا کہیں پر گڑبڑ ہے۔ تو تیرا باپ اور ماں کہیں بل نہیں کھاتے۔ میرے حساب سے تیرا باپ تیرا باپ نہیں، تیری ماں ہے میں نے ہر طرف سے حساب نکالا ہے کہیں پر بڑی گڑبڑ ہے مگر تو میرے حساب کو آخری نہ سمجھنا یہ حساب کی بات ہے بھول چوک میں کر سکتا ہوں میرے حساب کے بھروسے سے کسی کو دوشی اور کسی کو نردوش نہ بنانا خود اپنی آنکھ کھولنا اب جا۔"
اور وہ دونوں حیرت سے اس کو دیکھتے ہوئے کھڑے ہو گئے۔
فخر کا چہرہ مارے غم کے پیلا پڑا ہوا تھا انسان جب رنج و غم کی آخری منزل پر ہوتا ہے تو اس کی آواز بند ہو جاتی ہے اس کے سوچنے سمجھنے کی قوت ختم ہو جاتی ہے دماغ میں سائیں سائیں کی آوازوں کے سوا کچھ نہیں آتا یہی حالت فخر کی تھی۔
جوگی کے الفاظ سنتے ہی انور پریشان ہو گیا فخر کی حالت کا اندازہ اس کو تھا اس نے اپنی زبان بند کر لی تھی کوئی سوال اس کے پاس نہیں تھا مگر ہر سوال کا جواب اس کو مل رہا تھا۔
ساری کڑیاں جڑتی جا رہی تھیں اس کی ماں کے الفاظ اور کرم دین کے الفاظ اب صاف صاف کہانی بیان کر رہے تھے فخر بھی سمجھ رہا تھا اس کا غم اپنی جگہ تھا۔ دونوں کے پاس کہنے کو کچھ نہیں تھا دونوں کراچی آ گئے دوسرے دن فخر نے کہا "انور تم واپس چلے جاؤ میں اب واپس نہیں جاؤں گا۔"
"میں جانتا ہوں تمہارا فیصلہ درست ہے مگر تم کراچی میں کیا کرو گے۔"
"میں کراچی میں نہیں رہوں گا میں آگے بڑھ جاؤں گا" فخر نے جواب دیا۔
انور واپس چلا آیا اس کے بعد فخر کا پتہ نہ چلا اس نے انور کی پوزیشن صاف کرنے کو اس کی ماں کو خط لکھا۔
"نہ میں تمہاری شکل دیکھ سکتا ہوں نہ دکھا سکتا ہوں تم نے لوگوں کو دھوکہ دیا مگر یاد رکھنا سب کو دھوکہ نہیں دیا جا سکتا انور واپس آ جائے گا تم سے کوئی پوچھے گا نہیں میں بھی نہیں پوچھتا مگر روز حساب تم سے پوچھا ضرور جائے گا...... یہ بات تم یاد رکھنا میں اس ملک کو چھوڑ رہا ہوں دل تو کرتا تھا کہ دنیا کو چھوڑ دوں مگر میں وہ گناہ نہیں کرنا چاہتا تھا جو میری معافی کے سارے راستے بند کر دے انور میرا دوست ہے اگر زندگی میں کبھی واپس آیا تو اس سے ملوں گا اور میرا کوئی نہیں ہے۔"
تمہارا بدنصیب بیٹا..........



ناگ کا تحفہ

مہرین فاطمہ



نہر پر جا کر اس نے دیکھا کہ وہ نہر کے کنارے بے ہوش پڑی ہے۔ اس نے فوراً پانی کے چھینٹے اس کے منہ پر مارے تو وہ ہوش میں آ گئی اور خوفزدہ ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگی

ہری رام اور چندرا کی شادی کو چودہ طویل برس گزر چکے تھے۔ مگر ان کے آنگن میں ابھی تک کوئی پھول نہیں کھلا تھا۔ جس کی وجہ سے وہ بے حد پریشان رہتے تھے۔ شادی کے پندرہویں سال ایک شام انہیں آخر یہ خوشخبری مل ہی گئی۔

☆......☆......☆

اتنا ڈراؤنا خواب دیکھنے کے بعد چندرا کی آنکھ اچانک ہی کھل گئی وہ پسینے میں شرابور تھی اس کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا خواب بھی تو اتنا خوفناک تھا اس نے دیکھا کہ ایک انتہائی سیاہ ناگ اس کی چارپائی کے گرد چکر کاٹ رہا ہے اور پھر بین اس کے سامنے زک کر ایسے اسے دیکھنے لگا جیسے وہ بہت خوشی محسوس کر رہا ہو اور پھر ایک دم چھلانگ لگا کر وہ اس کے اوپر بیٹھ گیا اور جھومنے لگا۔ اس کے ساتھ ہی چندرا کی آنکھ کھل گئی تھی اب وہ کمرے میں ادھر ادھر دیکھ رہی تھی کہ اسے ایک کونے میں چمکتی ہوئی کوئی چیز دکھائی دی۔ اور پھر اس کی چیخ نکل گئی جب اس نے یہ دیکھا کہ اس کونے میں وہی ناگ بیٹھا تھا۔
چیخ سن کر ہری رام ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا اس نے دیکھا کہ چندرا پسینے میں بھیگی ہوئی تھی اور رو رہی تھی وہ چندرا کے قریب گیا۔ تو اس نے ایک کونے میں اشارہ کیا اس نے وہاں دیکھا تو وہاں کچھ بھی نہ تھا۔ "وہاں سیاہ

ناگ بیٹھا ہے" اس نے دوبارہ اشارہ کیا۔

"وہاں کچھ نہیں ہے تمہیں وہم ہوا ہوگا۔"

چندرا نے اسے ساری بات بتائی تو وہ اسے اس کا وہم گردان کر اسے مطمئن کرنے لگا آخر چندرا پھر سوگئی۔

دو مہینے گزر چکے تھے کہ چندرا پانی بھرنے کے لئے نہر پر جارہی تھی گاؤں میں پانی کی سہولت نہ ہونے کی وجہ سے لوگ کنوؤں، نہروں سے ہی پانی بھرنے جاتے تھے اس نہر کا پانی بے حد صاف شفاف، ٹھنڈا اور میٹھا تھا۔ اسی وجہ سے زیادہ تر لوگ پانی اسی نہر سے بھرتے تھے۔ چندرا نے پانی بھر کر گھڑا ایک طرف رکھا اور اپنے پاؤں دھونے لگی ابھی وہ فارغ ہی ہوئی تھی کہ اس نے دیکھا وہی ناگ گھڑے سے تھوڑے فاصلے پر بیٹھا اسے گھور رہا تھا۔ چندرا کی بے اختیار چیخ نکل گئی جب اس نے ناگ کو اپنی طرف بڑھتے دیکھا تو خوف کی شدت سے بے ہوش ہوگئی۔

شام ہونے والی تھی اور چندرا ابھی تک گھر نہیں پہنچی تھی۔ جس پر ہری رام کو تشویش ہونے لگی وہ اس کی تلاش میں گھر سے نکل پڑا۔ نہر پر جا کر اس نے دیکھا کہ وہ نہر کے کنارے بے ہوش پڑی ہے۔ اس نے فوراً پانی کے چھینٹے اس کے منہ پر مارے تو وہ ہوش میں آگئی اور خوفزدہ ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگی پوچھنے پر اس نے ساری بات بتادی۔ تو ہری رام جو پہلے اس کا وہم سمجھا تھا اب تشویش میں پڑ گیا شام ڈھل چکی تھی وہ گھر کو چل دیئے۔

دن گزرتے رہے اور مہینوں میں بدلتے رہے اس دوران پھر کوئی قابل ذکر واقعہ نہ ہوا اور آخر ان کے گھر ایک پھول سی بیٹی نے جنم لیا۔ جس کا نام انہوں نے روپ رکھا۔ ابھی روپ ایک مہینے کی ہوئی تھی کہ چندرا اور ہری رام کو پھر تشویش میں مبتلا ہونا پڑ گیا۔ جب انہوں نے ناگ کو روپ کے پاس بیٹھے ہوئے دیکھا ہری رام فوراً روپ کے پاس گیا تو وہ ناگ غائب ہوگیا۔

اس دن ہری رام گاؤں سے باہر گیا ہوا تھا چندرا گھر کے کام کاج میں مصروف تھی کہ اس کی نظر دو سال کی روپ پر پڑی جو کھیل رہی تھی اور وہی ناگ اس کے پاس بیٹھا تھا چندرا فوراً بھاگی اور روپ کو اٹھا لیا اٹھانے کی دیر تھی کہ ناگ غائب ہوگیا اور روپ رونے لگی۔ چندرا نے اسے چپ کرانے کی ہر ممکن کوشش کی مگر وہ کسی طرح سے چپ ہونے میں نہ آتی تھی اسی دوران شام ہوگئی اور ہری رام واپس آگیا۔ "کیا ہوا ہے چندرا اسے؟ روپ کیوں رو رہی ہے؟" ہری رام نے جب روپ کو یوں مچل مچل کر روتے دیکھا تو فکرمند ہو کر پوچھا۔

"وہ ناگ پھر روپ کے پاس بیٹھا تھا جب میں نے اسے اٹھایا تو وہ غائب ہوگیا اور یہ رونے لگی میں نے اسے چپ کرانے کی ہر کوشش کرلی مگر یہ چپ نہیں ہورہی" وہ بھرائے ہوئے لہجے میں بولی۔

"اے بھگوان! پتا نہیں یہ ناگ ہمارے پیچھے کیوں پڑ گیا ہے۔"

"تم ٹھیک ہی کہتی ہو پہلے تو ہم نے زیادہ توجہ نہ دی تھی۔ پر اب کچھ کرنا ہی پڑے گا۔ ہم سورج نکلتے ہی دوسرے گاؤں میں پنڈت جوگی ناتھ کے پاس چلیں گے"

ہری رام کے کہنے پر چندرا نے تیاری شروع کردی جبکہ روپ روتے روتے سوگئی تھی پنڈت جوگی ناتھ پنڈت ہونے کے ساتھ ساتھ ایک جوگی بھی تھا وہ بہت نیک انسان تھا اور ان کی مدد کرسکتا تھا سورج نکلتے ہی وہ دوسرے گاؤں جانے کے لئے روانہ ہوگئے روپ اب بالکل نارمل تھی۔

تین چار گھنٹوں بعد وہ دوسرے گاؤں پہنچ گئے، پنڈت جوگی ناتھ اپنی کٹیا کے باہر آنکھیں بند کیے بیٹھا تھا جیسے ہی وہ لوگ وہاں پہنچے اس نے اپنی آنکھیں کھول دیں۔

"نمستے پنڈت جی" ہری رام کے کہنے پر اس نے تینوں کو دیکھا اور جیسے ہی روپ پر اس کی نظر پڑی وہ چونک کر کھڑا ہوگیا۔ ہری رام گھبرا کر بولا "پنڈت جی کیا بات ہے؟"

"یہ تمہاری بیٹی ہے، لیکن میں اس میں ایک ناگن دیکھ رہا ہوں"

"کیا مطلب پنڈت جی" ہری رام اور چندرا پہلے ہی پریشان تھے یہ سن کر اور گھبرا گئے۔

"سب بتاؤں گا تفصیل سے بتاؤں گا۔ پر یہ بتاؤ تم لوگ کیسے آئے ہو۔"

"سرکار ہم بڑی مصیبت میں گرفتار ہیں" چندرا نے روتے ہوئے کہا اور ہری رام نے تمام تفصیل بیان کردی۔

"یہ سب ایک ہی واقعے کی کڑی ہے اس ناگ کا اس بچی سے گہرا تعلق ہے۔" جوگی ناتھ نے آسمان پر دیکھتے ہوئے بتانا شروع کیا۔

"سو سال پہلے ناگ اور ناگن کا ایک جوڑا بہت ہنسی خوشی اپنی دنیا میں رہتا تھا۔ یہ جوڑا روپ دھاری تھا اور ہر قسم کا روپ دھار سکتا تھا۔ یہ جوڑا حسن میں سب ناگوں سے بڑھ کر تھا۔ ناگ اور ناگن ایک دوسرے سے شدید محبت کرتے تھے۔ ایک دن ناگن زخمی حالت میں ناگ کو ملی۔ اس وقت ناگن انسانی روپ میں تھی ناگ بھی انسانی روپ میں آگیا اور اس سے اس کی حالت کا سبب پوچھنے لگا تو وہ بتانے لگی۔

"میں انسانی روپ میں ایک پہاڑ پر گئی تھی اور وہاں سے اچانک نیچے گر گئی" ناگن نے کہا پھر اس کی آنکھیں بند ہونے لگیں اور اس کی حالت خراب ہوگئی۔ اچانک ہی وہ ناگن کے روپ میں آگئی اور مرگئی۔ ناگ بہت شدت سے رویا اور اس نے عہد کرلیا کہ ناگن کو زندہ کرکے رہے گا۔ اسی مقصد کے لئے اس نے ناگ دیوتا کے کہنے پر کڑی تکلیفیں اور مشکلات اٹھائیں۔ کئی چلے کاٹے۔ اپنی جان جوکھوں میں ڈال کر مختلف زمانوں میں جا کر چلے کیں اور بڑی پرارتھنا اور محنت کے بعد آخر اس کی محنت رنگ لائی اور تمہاری گود ہری ہوگئی۔ ناگ دیوتا نے اسے کہا تھا کہ ان کڑی مشکلات کے بعد اس کی ناگن کسی انسان کے روپ میں پیدا

آسیب سے نجات کے لئے

اگر کسی پر آسیب کا اثر ہو اور اس کی وجہ سے وہ بہت زیادہ پریشان ہو تو کسی دوسرے کو چاہئے کہ وہ باوضو ہو کر اول سات سو مرتبہ لا الـه الا انت سبحانک انی کنت من الظلمین پڑھے پھر سات مرتبہ ان کلمات کا ورد کرے۔

وَلَقَدْ فَتَنَّا سُلَيْمٰنَ وَاَلْقَيْنَا عَلٰى كُرْسِيِّهٖ جَسَدًا ثُمَّ اَنَابَ. سورۃ ص۔ 38۔ آیت 34۔

ان کلمات کو پڑھنے کے بعد سات مرتبہ لا الـه الا انت سبحانک انی کنت من الظلمین پڑھے اور مریض کے بائیں کان میں پھونک مارے۔ انشاء اللہ تعالیٰ بہت جلد آرام آجائے گا۔

ہوگی۔ اور سولہ برس کی عمر میں دوبارہ مرے گی جس کے بعد وہ مرتے ہی دوبارہ ناگن کے روپ میں زندہ ہوجائے گی۔

جب اس کی محنت رنگ لائی تو ایک دن چندرا کو خواب میں وہ ناگ دکھائی دیا وہ بہت خوشی میں تھا اور اس کی چارپائی کے اردگرد چکر لگا رہا تھا وہ اپنی کامیابی پر خوش تھا وہ خواب میں نہیں بلکہ اصل میں چندرا کے پاس آیا تھا۔ پھر ایک دفعہ نہر پر دکھائی دیا۔ اس کے بعد روپ پیدا ہوگئی تو ناگ اس کے پاس آنے لگا۔ تم لوگوں کو تو وہ صرف دو یا تین دفعہ دکھائی دیا ہے مگر حقیقت میں وہ روز روپ کے پاس آتا اور اس کا خیال رکھتا ہے روپ روتی بھی اس سے جدائی کی وجہ سے تھی۔ اب بہتر یہی ہے کہ تم لوگ اسے مرنے دو اور دوبارہ زندہ ہونے دو اسی میں تمہاری بہتری ہے۔ ورنہ ناگ تم لوگوں کو بھی زندہ نہ چھوڑے گا۔"

"مگر ہم تو پھر بے اولاد ہوجائیں گے۔ اسے بچانا ہے ہر حال میں بچانا ہے" ہری رام نے روتے

ہوئے کہا۔

''وہ صرف تم لوگوں کو ہی نہیں پوری دنیا کو تباہ کر دے گا۔ قہر بن جائے گا۔ یہ چلے صرف اس کی ناگن کو واپس لانے کا ہی سبب نہیں بنے تھے بلکہ وہ شکتیوں سے بھی مالا مال ہو گیا ہے لیکن اگر تم اسے بچانا چاہتے ہو تو پھر میں اس سے بات کرتا ہوں تم رات یہیں گزارو۔ میں آج کی رات اس سے بات کروں گا۔''

پنڈت نے انہیں کٹیا میں جانے کا اشارہ کیا اور خود اٹھ کر جنگل میں چلا گیا۔ شام ڈھل گئی تھی تو وہ واپس آیا اور ایک درخت کے نیچے بیٹھ گیا رات ہوتے ہی اس نے منتر پڑھنا شروع کر دیا کچھ دیر گزری تھی کہ سانپوں کی پھنکاریں شروع ہو گئیں اور وہ ناگ نمودار ہو گیا اس کے نمودار ہوتے ہی دھواں پھیلنے لگا اور وہ انسانی روپ میں آ گیا۔

''راجن تم سے ایک بحث چھڑے گی راملہ کی وجہ سے'' جوگی ناتھ نے بات شروع کی۔

''میری راملہ ناگن کی وجہ سے کیوں پنڈت'' ناگ نے کہا۔

''راجن ایک منٹ میں ہری رام کو بلواتا ہوں'' جوگی ناتھ اٹھ کر اندر گیا اور ہری رام کے ساتھ واپس آ گیا۔ ''یہ چاہتا ہے کہ تم راملہ کو دوبارہ زندہ نہ کرو تا کہ یہ بے اولاد نہ ہو'' جوگی ناتھ نے دوبارہ کہنا شروع کیا۔

''زندہ اسے میں نے ہر حال میں اور ضرور کرنا ہے۔ ورنہ میں روپ کو یہاں سے لے جاؤں گا اور میرا عمل جاری رہے گا۔''

''مگر کوئی اور طریقہ نہیں ہے کہ ہمیں ہماری اولاد سے بھی ہاتھ نہ دھونا پڑے اور تمہاری خواہش بھی پوری ہو جائے۔'' ہری رام بولا۔

ناگ راجن کو ایک دوست کی حیثیت سے بلایا گیا تھا اسی لئے انہیں کسی حصار کی ضرورت نہ تھی اور وہ آرام سے اس سے بات چیت کر رہے تھے۔ ''اگر تم بے اولاد ہونا نہیں چاہتے ہو تو اس کے لئے ایک شرط ہے کہ یہ بات ہم تینوں کے درمیان ہی رہے۔ میرا عمل پورا ہونے دو پھر تمہاری بات بھی پوری ہو جائے گی۔''

راجن انہیں باقی تفصیلات بتاتا رہا۔

روپ اب سولہ برس کی ہو گئی تھی۔ چودھویں کی رات تھی اور اس کا حسن بھی بے مثال تھا آج کی رات اس نے مرنا تھا رات ہو گئی اور ناگ راجہ بھی آ گیا۔ اچانک روپ گر پڑی اور مر گئی تھوڑی دیر بعد اس کا جسم ناگن کے جسم میں بدلنے لگا اور وہ ناگن بن گئی اور انسانی روپ میں آ گئی راجن بے اختیار ناچنے لگا کیونکہ اس نے راملہ کو دوبارہ پا لیا تھا۔ وہ دونوں وہاں سے چلے گئے چندرا اداس ہو گئی۔ اس نے کئی دفعہ ہری رام سے وہ گفتگو پوچھی تھی مگر اس نے کوئی جواب نہ دیا تھا۔ ایک ماہ اور گزر گیا اور انہیں دوبارہ آنگن میں پھول کھلنے کی نوید ملی اور یہ امید کی کرن مہکتا ہوا چاند بن گئی۔ جب ان کے گھر میں ایک ننھی سی بچی نے جنم لیا۔ وہ ہو بہو روپ کی طرح تھی انہوں نے اس کا نام روپ رکھا ایک سال گزر گیا اور ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب ایک سال کی ننھی روپ سترہ سال کی لڑکی میں بدل گئی۔ رات کو جب وہ سوئے تو روپ ایک سال کی تھی صبح اٹھے تو وہ سترہ سال کی لڑکی بن گئی تھی اور ہو بہو پہلی والی روپ کی طرح خوبصورت تھی ہو بہو وہی تھی۔

یہی تو وہ بات تھی جسے بتانے سے راجن نے منع کیا تھا۔ راجن نے کہا تھا کہ روپ کے ناگن بننے کے بعد ایک ماہ کے وقفے سے ان کو دوبارہ ماں باپ بننے کی نوید ملے گی اور ان کے گھر جو بچی جنم لے گی وہ ہو بہو روپ سے ملتی ہو گی اور ایک سال کے بعد وہ ستر سال کی لڑکی بن جائے گی۔ چونکہ پہلی بیٹی سولہ سال کی ہونے پر انہوں نے کھوئی تھی اس لئے دوسری سترہ سال کی ہو جائے گی اور ہو بہو ویسے ہی ہو گی۔

اور یہ راجن نے اپنا عمل کامیابی سے پورا ہونے کے لئے انہیں تحفہ دیا تھا تا کہ وہ بھی بے اولاد نہ ہوں اور اسے اس کی راملہ بھی مل جائے۔

رنگ دھنک

آپ کی بیاض، پسندیدہ اشعار کا انتخاب

وفا کی راہ بڑی پرخار سی لگتی ہے
زیست آنسوؤں کی دیوار سی لگتی ہے
زندگی ڈھل گئی پھر سے غم کے سانچے میں
تیری ہر خوشی ہمیں یادگار سی لگتی ہے
(کائنات حبیب۔گوجرانوالہ)

تمہارے ساتھ رہنا بھی مشکل ہے بہت
اور بن تمہارے بھی ہم رہ نہیں پاتے
کیسے کہہ دوں کہ مجھے چھوڑ دیا ہے اس نے
بات تو سچ ہے مگر بات ہے رسوائی کی
(فلک زاہد۔لاہور)

مانا کہ آج ہم اکیلے رہ گئے
جدائی کے آنسو آنکھوں سے بہہ گئے
روتے رہے تو کون چپ کرائے گا ہمیں
جو چپ کراتے تھے وہی رونے کو کہہ گئے
(اقصیٰ آصف۔کراچی)

طلب کریں تو یہ آنکھیں بھی ان کو دے دوں میں
مگر یہ لوگ ان آنکھوں کے خواب مانگتے ہیں
(فرزانہ عابد۔لاہور)

ہم محبت کی قدر محبت سے کیا کرتے ہیں
ہم پہ جو مرے اس کے لئے جیا کرتے ہیں
سوال ہو جو لئے دینے کا
ہم کانٹے لیا کرتے ہیں پھول دیا کرتے ہیں
(نرگس۔کراچی)

میری غربت اڑاتی ہے میرے فن کا مذاق
تیری دولت نے تیرے عیب چھپا رکھے ہیں
(سحرش سلیم۔ٹنڈو آدم)

تنہائیوں کا اک الگ مزا ہے
اس میں ڈر نہیں ہوتا کسی کے چھوڑ جانے کا
(سنبل ماہین۔سرگودھا)

تو شاید کبھی یہ اشارہ نہیں ہونے والا
کہ اب عشق سے چھٹکارا نہیں ہونے والا
میں تو بس تمہیں ہی یہ دل دے چکا ہوں اویس!
مجھے اب کوئی تم سے پیارا نہیں ہونے والا
(شہلا کرن۔حیدر آباد)

صبا کی طرح نہ کوئی قرار کو ترسے
تمام عمر چلے لیکن دیار کو چلے
گلوں کے نام پیار بہار جولائے
قدم قدم شجر سایہ دار کو ترسے
(ارم حلیم۔میاں چنوں)

ہے مجھ میں بھی بہت سی غلط فہمیاں
کہ جب بھی کسی کو سمجھا اپنا ہی سمجھا
(ماہم خان۔پشاور)

لوگوں کو اکثر کہتے سنا ہے کہ زندہ رہے تو پھر ملیں گے
تم سے مل کے ایسا لگا کہ ملتے رہے تو زندہ رہیں گے
(علیمہ محسن۔کوٹھا کلاں)

سو جاؤں تو تیرے خواب جگا دیتے ہیں
اندھیری راتوں میں ہم چراغ جلا دیتے ہیں
یہاں کوئی بھی نہیں اپنا یہ دیکھا ہے جاوید
سرد راتوں میں ہم تجھے دعا دیتے ہیں
(کوثر جہاں......فیصل آباد)

بہت بے کیف لمحے ہیں عجب بوجھل سا جیون ہے
نہ غم سے دل بہلتا ہے، نہ خوشیاں راس آتی ہیں
(تانیہ ملک......ٹنڈو آدم)

میں کھلونا ہوں مجھے ہاتھ مت لگاؤ تم
کسی شوکیس میں رکھ کر مجھے سجا لو تم
میری آنکھوں میں کبھی دیکھو بھی
میرے چہرے پہ کبھی پیاری سی نظر ڈالو تم
(صائمہ جبیں......لاہور)

نہ ستاؤ ہمیں ہم ستائے ہوئے ہیں
جدائی کا تیری ہم غم اٹھائے ہوئے ہیں
کھلونا سمجھ کر ہم سے یوں نہ کھیلو دوست
ہم بھی تو اسی خدا کے بنائے ہوئے ہیں
(زینت نذیر......کھپرو سندھ سے)

☆☆

غزل

آپ کی پسندیدہ غزلوں کا انتخاب

☆☆اپنے دکھ درد کو دنیا سے چھپانے کے لئے
ہنستا رہتا ہوں میں اب یوں ہی زمانے کے لئے
پھر کوئی خواب محبت کا دکھاؤ مجھ کو
خلقت شہر ہے بے تاب فسانے کے لئے
شعر تخلیق میں کرتا ہوں جگر کے خوں سے
خواب غفلت سے زمانے کو جگانے کے لئے
زندگی اس کو شب و روز دعا دیتی ہے
وقف کرتا ہے جو ہر سانس زمانے کے لئے!
اپنی نظروں سے مجھے آپ گرانے کے لئے
مجھ پہ کرتا ہے وہ احسان جتانے کے لئے
ہوگئیں شور میں معدوم صدائیں میری
کوئی آیا نہ مری جان بچانے کے لئے
نیند آنکھو میں شب و روز بھری رہتی ہے
کوئی آتا نہیں اب خواب چرانے کے لئے
عمر بھر جھوٹ کا چھوڑا نہیں دامن اس نے
اپنے ایک جھوٹ کو زمانے سے چھپانے کے لئے
(انتخاب: اسماعلی۔کراچی)

حصار میں ہے یہ دنیا سنہرے جالوں کے
طیور تک نہیں آزاد اب خیالوں کے
اندھیرے روشنیوں میں نہ ہوسکے تبدیل
سفید ہوگئے ہاں رنگ سر کے بالوں کے
نہ فتح ہوسکے افسوس نفرتوں کے محاذ
جواب دے گئے سب حوصلے جیالوں کے
یہ صورتیں بڑی سوہان روح ہوتی ہیں
زوال دن نہ دکھائے خدا کمالوں کے
جواب دیتی ہے دنیا مگر درست نہیں
جبیں وقت پہ لکھے ہوئے سوالوں کے
دلوں کے آئینے اللہ با صفا کردے
بڑے خلوص و محبت سے ملنے والوں کے
وہ دن گئے کہ معزز تھے نیک اب واجد
سیاہیاں ہیں لعبیوں میں خوش خصالوں کے
(انتخاب: نگینہ......کراچی)

آنکھ سے آنسو نمایاں نہیں ہوتے
تیری بے وفائی سے ہم پریشان نہیں ہوتے
تم سلامت رہو ہمیشہ پھولوں کی طرح
گزرے ہوئے لمحے پھر مہرباں نہیں ہوتے
تیری دید میں کیسے زخم پائے ہیں
کسی طرح ہم یوں بھی حیراں نہیں ہوتے
بدلی ہے آسماں نے نگاہ ہم سے آج
اپنی سوچوں سے ہم جواں نہیں ہوتے
سحر ہوئی تو ہمیں نیند آنے لگی پھر
فاصلے وفا کے تیرے میرے درمیاں نہیں ہوتے
فریب دے گیا کسی کا سایہ بھی ہمیں جاوید
بھولے سے تیری ذات سے ہم بدگماں نہیں ہوتے
(لائبہ اکرم۔کراچی)

میری آنکھوں سے تیری یاد کا سایہ نہیں جاتا
میں نے مان لیا تم کو بھلایا نہیں جاتا
اک مدت سے تیرا نام لکھا ہے دل پہ
میں کیا کروں وہ مجھ سے مٹایا نہیں جاتا
ہونے والے تو خود ہی اپنے ہوجاتے ہیں
کسی کو کہہ کر اپنا بنایا نہیں جاتا
مدت ہوئی تیرے ہجر میں جلتے ہوئے
آؤ کہ اب ان آنکھوں کو اور رلایا نہیں جاتا
زرد چہرہ، بکھرے بال، خاموش لب اور نم آنکھیں
حالت زار کو اب مزید چھپایا نہیں جاتا
امیر شہر سے کہہ دو اپنی اوقات میں رہے
مجھ سا شخص دولت سے مٹایا نہیں جاتا
زمانے کے داؤ سیکھنے میں صائم کچھ دیر تو لگے گی
کوئی بچہ ماں کے پیٹ سے سکھایا نہیں جاتا
(گریز خان۔ڈیرہ اسماعیل خان)

بستر کرب پہ جب نیند جلائی میں نے
تب کسی خواب کی بنیاد اٹھائی میں نے
زخم ایسے تھے کہ ہر شخص کے آگے رکھے
بات ایسی تھی کہ خود سے بھی چھپائی میں نے
حرمت غم کے لئے خود کو اذیت بخشی
پھر اسی درد سے تسکین بھی پائی میں نے
میں نے زخموں کو کریدا انہیں تازہ رکھا
جب کہیں دشت میں کی نغمہ سرائی میں نے
اپنی کھڑکی سے یونہی خود کو پکارا کل شب
اور پھر خود کو وہ آواز سنائی میں نے
جانے والے سے رگ جاں کا بھی رشتہ تھا سمیر
یہ سمجھنے میں بہت دیر لگائی میں نے
(فرزانہ۔ٹنڈوالہ یار)

سب سے اونچی ہے تری شان رسول عربی
آپ جیسا کوئی کہیں انسان رسول عربی
ہو کرم اس پہ کہ کٹ جائے مصیبت اس کی
آج امت ہے پریشان رسول عربی
مل گئی آپ کی امت کو فضیلت کتنی
ہم پہ ہے آپ کا احسان رسول عربی
ہو کرم اور ملے اذن حضوری مجھ کو
میں بنوں آپ کا مہمان رسول عربی
مجھ سا کم ظرف بھلا کیسے ثنا خوانی کرے
جب خدا خود ہے ثنا خوان رسول عربی
مجھ گناہگار پہ ہو نظر عنایت آقا
مشکلیں ہوں مری آساں رسول عربی
نعت گوئی کی سعادت جو ملی ہے مجھ کو
میری بخشش کا ہے سامان رسول عربی
(قمرالنساء۔منگلا ڈیم)

عنا دل کے مضامیں، حیلۂ صیاد رہنے دو
نہیں ہے داد کی خواہش مجھے بے داد رہنے دو
نہ پہنچا آسماں تک جو کبھی وہ نالہ دل ہوں
مرا نغموں سے کیا رشتہ مجھے فریاد رہنے دو
مجھے انسانیت کی قبر پہ آنسو بہانے میں
اصول و مذہب و قانون سے آزاد رہنے دو
بنا ہے میرا کعبہ اس کو بے دردی سے مت ڈھاؤ
مرے ٹوٹے ہوئے دل میں کسی کی یاد رہنے دو
نئی تہذیب کے چارہ گرو، میرے مسیحاؤ
مبارک تم کو آبادی، مجھے برباد رہنے دو
ریحانہ اردو زباں کے شاعروں میں ہے دھڑے بندی
نہیں موقوف کراچی پہ، حیدر آباد رہنے دو
(ریحانہ عرفان۔چیچہ وطنی)

ہر شخص میں ہیں جاناں کچھ باتیں کئی قصے
جس کسی سے ملے ہم، سنے عاشقی کے قصے
کبھی شوخیوں نے کرلیا دل میں بسیرا
اور کہیں ہیں لبوں پہ سادگی کے قصے
کوئی پہلو یار کو تسکین فردوس کہے
کسی سمت ہیں بس دیوانگی کے قصے
کسی کی نظر میں یار ہے خدا
اور دل میں ہے سمائے عاجزی کے قصے
کوئی بن گیا ہے رانجھا جوگی عشق میں
اور کوئی سناتا پھرے آوارگی کے قصے
کہیں نظر آیا فقط پیار ہی پیار
اور کہیں ہیں دکھے بے رخی کے قصے
بہت کچھ دیکھا ہے طیب اور اتنا ہی بس سمجھا
جن کے لبوں پر رہتی ہیں عشق ووفا کی باتیں ہیں بس دل لگی کے قصے
(رضیہ ابراہیم۔چھوکی)

کسی بخشش کا سامان ہوا پھرتا ہے
شہر سارا پریشان ہوا پھرتا ہے
کل تک جو مشہور تھا زمانے میں رستم بن کر
آج اپنی ہی ذات میں گمنام ہوا پھرتا ہے
ایک بارودی جیکٹ اور نعرہ تکبیر
راستہ جنت کا دیکھو تو آسان ہوا پھرتا ہے
جانے کون کسے مار دے کافر کہہ کر

اسی ڈر سے شہر سارا مسلمان ہوا پھرتا ہے
(ثنا کریم......لاہور)

عالم عجب ہاں، دشت کا سماں ہے
خوف ہے چہروں پہ، جسم لرزاں ہے
بھگدڑ مچی ہے ایسی، ہے سب کو ڈر
نہیں کسی کو خبر، جائے تو جائے کدھر
نہ تھا یقین کہ یہ ساعت آئے گی
آخر انہیں بھی مات ہوجائے گی
دور حاضر کے انسان کیا گل کھلا رہے ہیں
سبھی شیطان خود کو انسان سے چھپا رہے ہیں
کار ابلیس میں لگ گیا حضرت انسان
ہم کریں کیا، شیطان ہیں نوحہ کناں
(سلطانہ رفیق......گھوٹکی)

وہ اپنی شاعری بھی کاش میرے نام دے ڈالے
مجھے ایسے کوئی چاہے کہ مجھ پر جان دے ڈالے
میں پھر اس کی محبت کے بھنور میں ڈوبتا جاؤں
کبھی جو اٹھاتا وہ نظر کا جام دے ڈالے
وہ ہستی زندگی کی شب میں اک قندیل جیسی ہو
جلا کر دل کو اپنے روشنی ہر شام دے ڈالے
میری پلکوں سے اس کی یاد میں موتی اگر برسیں
ستارے گنگناتے ہوں، ہوا پیغام دے ڈالے
مجھے وعدہ ہو یاد اپنا اولیں وہ بھی بھلائے نہ
کہانی جب سنے کوئی، وفا کا نام دے ڈالے!
(عابدہ اسلم......میرپور ماتھیلو)

پوچھو تو سماں میں کیا رکھا ہے
ہر وقت ہونٹوں پر تیرا نام سجا رکھا ہے
تم تھوڑی سی حرارت پہ تڑپتے ہو
ہم نے سینے میں بھانبھڑ مچا رکھا ہے
تم ایک دو آنسو بہا کر تھک جاتے ہو
ہم نے آنکھوں میں نلکا چلا رکھا ہے
تم اپنی زلفیں شیمپو سے سنوارتے ہو
ہم نے لسی میں تیل ملا رکھا ہے

تم کسی اور کے ہوجاؤ تو کوئی غم نہیں
ہم نے یہ پھر کسی اور سے بھی چلا رکھا ہے
ہم دل تو کسی اور کو دے چکے ہیں
تمہارے لئے گردہ بچا رکھا ہے
(آصفہ خان......لاہور)

وہ وعدہ اپنا عہد وفا نبھا نہ سکے چلے گئے
ہم حسرت دیدار کے تھے طالب مگر وہ چلے گئے
زندگی یوں بھی آسانی سے نہ کٹ رہی تھی
اس پر بھی اک نیا داغ لگا کے وہ چلے گئے
امید وفا بہت تھی مجھ غریب کو ان سے
بیچ رستے میں چھوڑ کے وہ ہاتھ چلے گئے
چھوڑیے کیا کہیے یہ تو دنیا کی ریت ہے پرانی
گرتی ہوئی دیوار کو وہ لگا کر دھکا چلے گئے
جو باقی ہے سانس وہ واپس لے لو
سونپ کے یادوں کے انبار وہ چلے گئے
الہی حسن کو وفا میں سمویا ہے بہت کم آپ نے
اب آصف شہزاد کا کر کچھ علاج وہ چلے گئے
(شائستہ بھٹی......قصور)

عجب اک بیقراری ہے کرے کوئی تو کیا آخر
پریشاں قوم ساری ہے کرے کوئی تو کیا آخر
حکومت کی پذیرائی میسر ہے لیٹروں کو
ستم لوگوں پہ جاری ہے کرے کوئی تو کیا آخر
امن لئے کہاں جائیں مساجد تک نہیں چھوڑی
عجب حالت ہماری ہے کرے کوئی تو کیا آخر
یہاں دھرنا وہاں دھرنا ستاؤ دیس سے غربت
یہی فرمان جاری ہے کرے کوئی تو کیا آخر
وہی ہے راہنما اپنا جو مخلص نہیں ہے خود سے بھی
مروت سے جو عاری ہے کرے کوئی تو کیا آخر
یہ بیچ مہنگا پہلے تھا ان پہ ٹیکس بھی بلا تھا
ان کی اب تو باری ہے کرے کوئی تو کیا آخر
کوئی تو ان میں ایسا ہو جو بابا قائد جیسا ہو
عباس دعا ہماری ہے کرے کوئی تو کیا آخر
(منورہ گلزار......کامرہ کلاں)

☆☆

پراسرار دنیا

قارئین کے بھیجے گئے پراسرار واقعات

قدیم چینی بندوق

شاہی دور کے مارک والا پہلا چینی آتشیں ہتھیار جو نیلامی کے لیے پیش کیا جانے والا اب تک کا پہلا آتشیں ہتھیار ہے، 2.5 ملین امریکی ڈالر میں فروخت ہوگیا ہے۔ نیلام گھر سوتھبے ہائیز لندن نے ایک بیان میں کہا ہے کہ نیلام کی جانے والی بندوق جو انتہائی مہارت کے ساتھ ڈیزائن اور بہترین طریقہ پر بنائی جانے والی توڑے دار بندوق جو امپیریل ورکشاپ میں چنگ خاندان کے شہنشاہ چیان لونگ کے لیے بنائی گئی تھی، بلاشبہ یہ چینی تاریخ کے آرٹ کا نمونہ اور زبردست کولیکٹر ہے اس کو ایک ایشیائی نجی کولیکٹر کو فروخت کر دیا گیا، سوتھبے ہائیز لندن نے چینی فنون لطیفہ کے سینئر ڈائریکٹر رابرٹ براڈلو نے کہا کہ اس بندوق کا شمار نیلامی کے لیے آنے والے انتہائی اہم چینی خزانوں میں ہوتا ہے، یہ نتیجہ دیگر معمولی اشیا کی تاریخی فروخت کے ساتھ یاد رکھا جائے گا۔ یہ اشیا چنگ خاندان کے دوران شاہی فن دستکاری کے کلس کا نمونہ ہیں۔

(زرین خان......پشاور)

حیرت انگیز دریافت

پانی سے متعلق حیرت انگیز دریافت

سائنسدانوں نے پانی کی ایک نئی حالت دریافت کرلی۔ تحقیق میں یہ دریافت ہوا ہے کہ پانی ٹھوس، مائع اور گیس کے علاوہ بھی ایک اور حالت اختیار کرسکتا ہے۔ ماہرین کا کہنا ہے کہ پچاس سے ساٹھ سینٹی گریڈ درجہ حرارت پر پانی کی خصوصیات میں تبدیلی دیکھی گئی ہے۔ اس دریافت کے حساب سے مائع حالت میں پانی کی دو شکلیں ہوسکتی ہیں، اس تحقیق نے سب کو حیرت میں ڈال دیا۔

(ماریہ علی......ساہیوال)

ڈائنوسار کی جلد پر رنگین نمونے دریافت

سائنس دانوں نے ایک ڈائنوسار کی کھال پر رنگوں کے نمونے دریافت کیے ہیں جو آج کے دور کے جانوروں کے کیموفلاج کی مانند ہیں۔ بہترین حالت میں محفوظ شدہ ایک چینی فوسل سے ظاہر ہوتا ہے اس جانور کے جسم کا نچلا حصہ ہلکے، جب کہ اوپری حصہ گہرے رنگ کا تھا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ جانور کسی ایسی جگہ رہتا تھا جہاں روشنی منتشر ہوتی ہے، مثلاً کسی جنگل میں۔ تحقیق کے شریک مصنف جیکب وِنتھر کہتے ہیں کہ اس ڈائنوسار میں کیموفلاج کے نمونے سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کی مدد سے اسے شکاریوں سے چھپنے میں مدد ملتی ہوگی۔

(رخسانہ حمید......ڈیپالپور)

ڈائنوسار کا 8 کروڑ سال پرانا پروٹین

ختم ہوجانے والے قدیم جانداروں پر کام کرنے والی ایک سائنسدان نے ڈائنوسار کا 8 کروڑ سال قدیم پروٹین دریافت کیا ہے جو اس کی ہڈیوں میں موجود تھا۔ اس دریافت کو غیر معمولی قرار دیا جارہا ہے، جس میں لمبی گردن والے ایک سبزی خور ڈائنوسار کا پروٹین حاصل کیا گیا ہے۔ ابتدائی تجزیے کے مطابق یہ پروٹین 8

کروڑ سال قدیم ہے۔ ماہرین کے مطابق یہ ڈائنوسار 8 کروڑ سال قدیم ہے۔ ماہرین کے مطابق یہ ڈائنوسار 30 فٹ بلند تھا۔ یہ نارتھ کیرولینا اسٹیٹ یونیورسٹی کی ڈاکٹر میری شوائٹزر کی دریافت ہے جو کئی دہائیوں سے ڈائنوسار کی کھال، خون اور پروٹین کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔ ڈائنوسار کا تعلق لیولینگو سارس کی نسل سے ہے اور اس کے خون کا تجزیہ تائیوان کی تجربہ گاہوں میں کیا گیا۔ ڈائنوسار کی پسلیوں کے اندر ہڈیوں سے جڑا زم ریشہ اور فولاد سے بھرپور پروٹین دیکھا گیا ہے جو پسلیوں کی دیواروں پر چپکا ہوا تھا۔ ماہرین نے اس دریافت کو حیرت انگیز قرار دیا ہے۔ لیوفینگو سارس کا ڈھانچہ جنوب مغربی چین سے ملا ہے اور اس جگہ سے مزید درجنوں ڈائنوسار کے ڈھانچے بھی ملے ہیں۔ اسی ٹیم نے ڈائنوسار کا قدیم ترین بیضہ (انڈا) بھی دریافت کیا تھا۔

(جیا لرحمان......کراچی)

بچے اور انڈے دینے والے جانور

سائنسدانوں کو پہلی مرتبہ اس بات کا ثبوت ملا ہے کہ جانوروں کا گروہ جس میں ڈائنوسارز اور مگرمچھ بھی شامل ہیں ماضی میں بچے بھی دیتے تھے۔ برطانوی نشریاتی ادارے کے مطابق جانوروں کے اس گروپ کو آرکوسارومورفا کہا جاتا ہیں اور آج کے دور میں اس میں شامل تمام جانور انڈے دیتے ہیں۔ اس پر سائنسدانوں کے ذہن میں یہ خیال پیدا ہوا کہ کیا ان کی حیاتیاتی بناوٹ میں ہی یہ بات شامل ہے کہ یہ بچے نہیں دے سکتے۔ لیکن لمبی گردن والے ساڑھے 24 کروڑ سال پرانے چین کے بحری ریپٹائل کے باقیات پر پتہ چلا کہ اس جانور کے پیٹ میں ایک بچہ پل رہا تھا۔ محقق جون لیو نے بتایا کہ یہ جاندار تین سے چار میٹر لمبا ہوسکتا ہے اور اس کی گردن تقریباً پونے دو میٹر لمبی تھی۔ ان کے مطابق اس کے پیٹ میں نطفہ تقریباً نصف میٹر لمبا رہا ہوگا جو کہ ڈائنوسیفلوسارس کے فوسل کی پسلیوں کے درمیان تھا۔ تحقیق کرنے والوں نے اس امکان پر بھی غور کیا کہ پسلیوں کے درمیان پایا جانے والا چھوٹا جانور اس بڑے جانور کی آخری غذا بھی ہوسکتا ہے۔ لیکن اس کا چہرہ آگے کی جانب ہے جب کہ نگلے ہوئے جانور کا چہرہ عموماً پیچھے کی طرف ہوتا ہے براہ راست بچہ پیدا کرنے کا دوسرا ثبوت یہ تھا کہ بڑے جانور کے پیٹ میں جو چھوٹے جانور کے باقیات ملے ہیں وہ واضح طور پر اسی نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔

(سونیا عمر دراز......نواب شاہ)

ڈھائی ہزار سال پرانا مگرمچھ

ڈھائی ہزار سال پرانے ایک حنوط شدہ مگرمچھ نے اس وقت نیدرلینڈز کے ماہرین کو حیران کردیا جب اس کے نئے اسکین سے یہ معلوم ہوا کہ اس کے اندر درجنوں حنوط شدہ مگرمچھ کے بچے بھی موجود ہیں۔ 3 میٹر لمبا یہ مگرمچھ 1828ء سے نیدرلینڈز کے شہر لائڈن کے نیشنل میوزیم آف اینٹکس میں موجود ہے اور مصری گیلری میں نمائش کے لیے رکھا گیا ہے۔ مقامی میڈیا کے مطابق 1990ء میں کیے جانے والے سکین سے معلوم ہوا تھا کہ اصل میں یہ دو لپٹے ہوئے مگرمچھ ہیں لیکن اس وقت یہ معلوم نہیں ہوسکا تھا کہ اس میں کم از کم 47 چھوٹے مگرمچھ بھی موجود ہیں۔ یہ اس وقت معلوم ہوا جب سویڈن کی ٹیکنالوجی کمپنی انٹرا اسپیکٹرل نے اس کا 3 ڈی سی ٹی اسکین کیا۔ کیوریٹر ڈاکٹر لارا ویکس کا کہنا ہے کہ پرانے سی ٹی اسکین میں آپ صحیح سے نہیں دیکھ سکتے کہ دیگر مگرمچھ بھی اس کے اندر موجود ہیں اور ہمیں اس کی امید بھی نہیں تھی۔ میوزیم نے اسے غیر معمولی دریافت قرار دیتے ہوئے کہا ہے کہ چھوٹے اور بڑے مگرمچھ کے استعمال سے موت کے بعد زندگی کے قدیم مصری عقائد جھلکتے ہیں۔ واضح رہے کہ لندن کے برٹش میوزیم کے (برطانوی عجائب گھر) سائنسدانوں کو 2015ء میں یہ معلوم ہوا تھا کہ ایک بڑے حنوط شدہ مگرمچھ کی پشت کے ساتھ 20 نوزائدہ جڑے ہوئے ہیں۔ یہ دریافت بھی سی ٹی اسکین کرنے سے ہی ہوئی تھی جسے 80 سینٹی میٹر کے حصے پر کیا گیا تھا کیونکہ وہ حنوط شدہ مگرمچھ بہت بڑا تھا۔

(سحرش اسلم......کراچی)

سب سے بڑا اور محفوظ آبی حیاتیاتی مقام

انٹارکٹیکا آبادی سے خالی برفیلہ خطہ نہیں بلکہ یہاں سمندری حیاتیات سے تعلق رکھنے والے ایسے انوکھے جاندار موجود ہیں جنھیں اب تک مکمل طور پر سمجھا اور دریافت ہی نہیں کیا گیا ہے۔ اچھی خبر یہ ہے کہ اب اسے دنیا بھر میں آبی حیات کا سب سے بڑا تحفظاتی مقام کا درجہ دیا جارہا ہے اور اس کی بین الاقوامی توثیق ہوچکی ہے۔ معاہدے کے تحت دسمبر 2017ء سے انٹارکٹیکا کے جنوب میں واقع Ross سمندر کا چھ لاکھ مربع میل کا علاقہ زیر تحفظ ہوگا جہاں 72 فیصد رقبے پر تجارتی ماہی گیری پر مکمل پابندی عائد ہوگی کیونکہ اس سے قبل یہاں دنیا بھر کے بڑے بڑے جہاز مچھلیوں کا بے دریغ شکار کررہے تھے۔ بقیہ 28 فیصد علاقے پر محدود پیمانے پر مچھلیوں کے شکار کی اجازت صرف سائنسی تحقیق اور مطالعے کے لیے دی جائے گی۔ اس کا اعلان انٹارکٹکا میں آبی حیات کے کمیشن نے کیا ہے جو ایک بین الاقوامی تنظیم ہے۔ اس طرح یہ دنیا کا سب سے بڑا آبی خطہ ہے جسے بین الاقوامی تحفظ حاصل ہوگا۔ دنیا بھر میں جانوروں کے تحفظ کی تنظیموں نے اس اقدام کو سراہا ہے اور امید ظاہر کی ہے اس سے خطے میں موجود کئی اہم اور نایاب جانداروں کو بچانے میں مدد ملے گی۔

(فاطمہ نصیر......کراچی)

ہزاروں سال پرانا انسانی ڈھانچہ

اسکاٹ لینڈ میں ماہرین آثار قدیمہ ہزاروں سال پرانی غار میں انسانی ڈھانچہ دیکھ کر حیران رہ گئے۔ برطانوی اخبار ڈیلی اسٹار کی رپورٹ کے مطابق غار کے اندر ایک قدیم انسان کا ڈھانچہ پڑا تھا جسے اس وقت بے دردی سے مار مار کر قتل کیا گیا تھا۔ اس ڈھانچے کی ٹانگیں کراس (X) کی پوزیشن میں تھیں اور اس کی ٹانگوں اور بازوؤں پر بھاری پتھر رکھے ہوئے تھے۔ ڈھانچے کے ٹیسٹ کرنے سے معلوم ہوا ہے کہ اس انسان کا تعلق 430ء سے 630ء کے درمیان کے زمانے سے ہے۔ بلیک آئیل کے علاقے میں واقع اس غار کے اندر یہ حیران کن دریافت یونیورسٹی آف ڈنڈی کے ماہرین نے کی۔ تجربات کے بعد ماہرین نے بتایا کہ اس شخص کو 5 پتھر مارے گئے جس سے اس کے چہرے اور سر پر شدید چوٹیں آئیں اور اس کی ہلاکت ہوگئی۔

(نادیہ عباس......شاہ پور چاکر)

گلابی رنگ کا نایاب ہیرا

گلابی رنگ کے دنیا کے نایاب ترین ہیروں میں سے ایک جو ناشپاتی کی شکل کا ہے کو گزشتہ روز 18 ملین ڈالر کے عوض نیلام کردیا گیا ہے تاہم ہیرے کو خریدنے والی شخصیت کی شناخت ظاہر نہیں کی گئی۔ یہ نیلامی سوئٹزرلینڈ کے شہر جنیوا میں معروف نیلام گھر کرسٹیز میں عمل میں آئی۔ کینسی ہیوڈ نام گلابی رنگ کے ایسے ہیرے دنیا میں بہت ہی کم دستیاب ہیں اور ایسے ہی ایک قیمتی پتھر کے لیے ادا کی جانے والی 18 ملین ڈالر کی قیمت دنیا بھر میں ایسے کسی ہیرے کے لیے آج تک ادا کی گئی دوسری سب سے بڑی قیمت ہے۔ ماہرین کے مطابق دنیا بھر میں تمام ہیروں میں سے محض ایک فیصد جواہر اس قسم کے ہوتے ہیں۔ 9.14 قیراط وزن کا یہ ہیرا پوری دنیا میں گلابی رنگ کا دوسرا سب سے بڑا ہیرا ہے۔

(کلثوم ندیم......لاہور)

34 کلو وزنی موتی

فلپائن کے سمندر سے ایک ماہی گیر کو ملنے والے دنیا کے سب سے وزنی موتی کا نام گینز بک آف ورلڈ ریکارڈز میں شامل کرلیا گیا ہے۔ ماہرین کے مطابق یہ قیمتی موتی 34 کلو وزنی ہے۔ اس دیوہیکل موتی کی

قیمت ایک اندازے کے مطابق سو ملین ڈالر ہے۔ ذرائع کا کہنا ہے کہ فلپائن سے تعلق رکھنے والے ایک ماہی گیر نے سمندر سے دنیا کا سب سے بڑا موتی ڈھونڈ نکالا اور قسمت بدلنے کی امید لیے اس موتی کو دس سال تک اپنے پاس چھپائے رکھا تھا تاہم جب ایک دن اپنے دوست سے اس بارے میں بات کی تو پتہ چلا کہ دنیا کا سب سے بڑا موتی ہے جو اب عالمی ریکارڈ قائم کر چکا ہے۔

(شمیم اختر......گوجرانوالہ)

برفانی تودے کی دراڑ

انٹارکٹیکا میں ایک بڑا برفانی تودہ ٹوٹنے کے قریب ہے اور اس میں پائی جانے والی دراڑ بڑھتی جارہی ہے۔ لارسن سی شیلف نامی تودے کی دراڑ میں یکم جنوری سے دس کلومیٹر اضافہ ہوا ہے۔ اگر اس دراڑ میں 20 کلومیٹر مزید اضافہ ہوا تو ویلز کے رقبے جتنا یہ بڑا تودہ الگ ہوجائے گا۔ سوانزی اور ابراشوتھ یونیورسٹیوں اور برٹش (برطانوی) انٹارکٹیکا سروے کے محققین کے مطابق اگر ایسا ہوگیا تو اب تک دیکھا جانے والا یہ سب سے بڑا تودہ ہوگا۔ لارسن سی برفانی تودہ انٹارکٹیکا کے سب سے شمالی حصے میں واقع ہے اور اس کی موٹائی 350 میٹر ہے۔ طویل عرصے سے موجود دراڑ دسمبر کے مہینے میں اچانک بڑھ گئی تھی اور اس پانچ ہزار مربع کلومیٹر لمبے تودے کا صرف 20 کلومیٹر حصہ برفانی خطے سے جڑا ہوا ہے۔ سوانزی میں موجود محققین کے مطابق اگر یہ برفانی تودہ ٹوٹ جاتا ہے تو مستقبل میں پورے شمالی خطے کے ٹوٹ جانے کا اندیشہ ہے۔ سوانزی یونیورسٹی کے پروفیسر ایڈرین لکمین کہتے ہیں کہ ڈیٹا سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس دراڑ میں 175 کلومیٹر کا اضافہ ہوا ہے اور اب دیکھنا یہ ہے کہ 5000 مربع کلومیٹر کا یہ رقبہ ٹوٹ کر کب الگ ہوتا ہے۔ سائنسدان کہتے ہیں کہ یہ شگاف اور برفانی تودے کا ٹوٹنا ایک جغرافیائی عمل ہے اور اس کا ماحولیاتی تبدیلی سے بظاہر تعلق نہیں ہے۔ ان کے مطابق ایسا ممکن ہے کہ شاید ماحولیاتی حرارت بڑھنے کی وجہ سے لارسن سی شگاف کے بڑھنے کے عمل میں تیزی آئی ہو لیکن اس بات کو ثابت کرنے کے لیے کوئی ٹھوس شواہد موجود نہیں ہیں۔

(زاہدہ......کوئٹہ)

ٹوائلٹ کھودنے سے میوزیم دریافت

اٹلی کے ایک شہری لوسیانو فیکیانو نے جب ایک عام سی عمارت خریدی تو وہ وہاں ایک اٹالین ریستوراں (اطالوی طعام گاہ) کھولنا چاہتے تھے مگر ایک ٹوائلٹ (پاخانہ) جس میں سے مستقل گندا پانی رس رہا تھا ان کے لیے ایک مسئلہ بن گیا۔ مسٹر فیکیانو نے اپنے بیٹوں کو تحقیق کرنے پر لگا دیا۔ وہ سمجھ رہے تھے اس کام میں ایک ہفتہ لگے گا مگر جو کام 2000ء میں شروع ہوا تھا وہ ابھی تک جاری ہے۔ سب سے پہلے ٹوائلٹ کے نیچے سے انڈر گراؤنڈ کاریڈور اور دوسرے کمرے دریافت ہوئے پھر کئی وہ کھودتے رہے اور تلاش جو ایک سیوریج پائپ کی جستجو سے شروع ہوئی تھی وہ انھیں قبل از مسیح کے زمانے میں لے گئی اور اب تک وہ میساپین ٹومب، رومن اناج مرکز، ایک فرانسسکن چیپل اور دیگر قدیم آثار دریافت کر چکے ہیں اور ان کی یہ عمارت جہاں وہ ریستوراں بنانا چاہتے تھے، ایک میوزیم (عجائب گھر) کی صورت اختیار کر گئی ہے اور اس کے نیچے سے آثار قدیمہ دریافت ہونے کا سلسلہ جاری ہے۔

(سمرین کیریو......حیدرآباد)

5 زردیوں والا انڈہ

چین کے صوبے ہوبی میں رہنے والی تانہ نامی خاتون نے ناشتہ بنانے کے لیے جونہی انڈا توڑا تو ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب انڈے میں سے 5 زردیاں نکل آئیں۔ تاؤ کے گھر والوں کے مطابق 5 زردیوں کا نکلنا انتہائی خوش نصیبی کی بات ہے۔

(بتول...سیالکوٹ)

